اسلامک اکیڈمی مانچسٹر کا ایک اور علمی تحفہ

عبقات

سینکڑوں عنوانوں کے گرد گھومتی ہوئی
ایک علمی، تاریخی اور تحقیقی پیشکش

تالیف
ڈاکٹر علامہ خالد محمود ڈائریکٹر اسلامک اکیڈمی مانچسٹر

دارالمعارف
الفضل مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

۰- زین العابدینؒ نے یزید کی حکومت کو تسلیم کر لیا تھا - ابن الزبیرؓ کا ساتھ نہ دیا اور نہ ہی مختار ثقفی کا ساتھ دیا بلکہ اسکی مخالفت کی ص ۸۵-۸۴

۰- بسا اوقات کثرت طرق روایت ضعف کی تلافی کا باعث ہو جاتے ہیں اضافہ کرتے ہیں علامہ زیلعیؒ ص ۲۹۳

۰- حضرت علیؓ کا مجبوری دور ص ۳۲۵

نام کتاب ——— عبقات
مصنف ——— علامہ خالد محمود صاحب
کتابت ——— حنیف الحق صدیقی
صفحات ——— ۴۸۸
ناشر ——— دارالمعارف لاہور
تعداد ——— گیارہ سو
قیمت اعلیٰ مجلد ——— ۱۲۰ روپے
ممالک یورپ ——— ۸ پونڈ

ملنے کے پتے

دفتر دارالمعارف ۱/۲ دیو سماج روڈ سنت نگر لاہور
جامعہ ملیہ اسلامیہ لاہور توحید پارک نزد امامیہ کالونی لاہور

Address in England:
19 Charlton Terrace Off Upper Brook Street
Manchester- U.K.

پتہ انگلینڈ میں : اسلامک اکیڈمی آف مانچسٹر

فہرست

عبقات من باب الاستفسارات

تعارف

الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین محمد وآلہ الطیبین واصحابہ اجمعین اما بعد

۲۲ جون ۱۹۸۷ء کی شام تھی۔ راقم الحروف حافظ محمد اسلم رشیدی نے مانچسٹر سے لاہور فون کیا اور حضرت علامہ خالد محمود صاحب سے "عبقات" کو دوبارہ شائع کرنے کی گذارش کی۔ علامہ صاحب ان دنوں پاکستان گئے ہوئے تھے۔ آپ نے اسی وقت وعدہ فرمالیا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ اس تجویز و تحریک کا ثمرہ اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بعید نہیں کہ وہ اس عاجز کو الدال علی الخیر کفاعلہ کے ابر کرم میں امن کا سایہ دے۔

علامہ خمینی کے برسر اقتدار آنے کے بعد حالات نے عجیب انگڑائی لی ہے۔ ایران کی یہ تحریک دراصل ایک سیاسی تحریک تھی۔ وہاں کے شاہی نظام کے خلاف ایک جمہوری آواز تھی۔ امریکہ اور روس کے درمیان ایک تیسری صدا تھی۔ یورپ کے مقیم مسلمان جو اس سیاسی کروٹ میں ان کے ہمنوا تھے اس انقلاب سے بہت متاثر ہوئے اور ہر طرف امام خمینی کی آوازیں اُٹھنے لگیں۔ مگر علامہ خمینی قائد انقلاب ہونے کے باوجود شیعیت کی گلی سے نہ نکل سکے۔ مولوی ہونے کے ناطے وہ شیعیت کو پورے عالم اسلام پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے حرمین شریفین کی فضاؤں میں بھی سیاسی نعرے لگوائے اور احتجاجی جلوس نکالے۔ حالانکہ وہاں ہر شخص زندگی کی سیہ کاریوں کو دھونے کے لیے جاتا ہے۔ یہ عبادت کی جگہیں ہیں شرارت کے مرکز نہیں۔ وما کان لهم ان يدخلوها الا خائفين۔ ان کا حق نہ تھا کہ خشیت الٰہی کے بغیر اور کسی جذبے سے وہاں داخل ہوتے۔

یہاں انگلینڈ کے جو لوگ ایران کی اس سیاسی کروٹ سے خوش ہیں مگر وہ شیعہ فرقہ واریت اور فقہ جعفری کو دل سے اچھا نہیں سمجھتے۔ ان کے لیے یہ عجیب دور ابتلاء ہے۔ ایران سے جو لٹریچر آرہا ہے وہ اہل السنۃ والجماعۃ کے اسلامی مسلمات کے سخت خلاف ہے اور جو نوجوان تیز مذہبی حس نہیں رکھتے وہ شیعہ فلسفہ حیات میں بڑی تیزی اور افسوسناک بے خبری میں کھوئے جارہے ہیں۔

شیعہ مذہب یہود و مجوس کی مشترکہ پیداوار ہے جس کا مقصدِ وجود ہی یہ ہے کہ اسلام کے نام پر اسلام اور امتِ اسلامیہ کو جہاں تک ممکن ہو تباہ و برباد کیا جائے۔

ان کے عقائد اسلامی نقطۂ نظر سے شرک و کفر کی حدوں کو چھوتے ہیں۔ اس مذہب میں ائمہ اہلبیت کو انبیاء کے مقام سے بلند اور خدائی تصرفات کا مالک بنا دیا گیا ہے۔ قرآن اور صحاح ستہ کے بے مثال مجموع ہائے حدیث کو ناقابلِ اعتبار قرار دیا گیا ہے۔ جھوٹ اور فریب دہی کو اخلاقیات کا بنیادی پتھر ٹھہرایا گیا ہے اور اسلامی کیرکٹر کی تباہی کے لیے متعہ جیسی حیا سوز بدکاری کو صرف یہی نہیں کہ رواج عام دیا گیا ہے بلکہ اس کی فضیلت اور خوبیوں کے سلسلے میں بے شمار احادیث و آثار گھڑ لیے گئے ہیں۔

دوسری طرف امتِ مسلمہ کی بربادی کے لیے ان لوگوں نے وحیِ الٰہی کے مخاطبینِ اوّل اور اسلام کے اصل حاملین یعنی رسول اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ اور خاصانِ خاص کو کافر و مرتد قرار دے کر ان کی اور ان کے صحیح پیروکاروں کی عداوت اور دشمنی اور ان کی ایذا رسانی و بربادی کو اپنا اصل الاصول قرار دیا ہے اور اس مقصد کے لیے رذالت کی آخری حدوں تک چلے جانے کو بھی یہ لوگ باعثِ ثواب سمجھتے ہیں۔ امت کی تاریخ میں تباہی و بربادی کے جتنے بڑے بڑے حادثات پیش آئے ہیں ان کے پیچھے انہی لوگوں کا ہاتھ کارفرما رہا ہے۔

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی انہی کی بدولت ہوئی تھی جس میں تنہا بغداد اور نواحِ بغداد میں ایک کروڑ چھ لاکھ مسلمان مارے گئے تھے۔ دُور کیوں جایئے! خود ہمارے ہندوستان میں مسلمانوں کی بڑی بڑی تباہیاں انہی کے طفیل ہوئیں۔ میر جعفر، میر صادق، میر قاسم، قاسم علی وغیرہ جن کی وجہ سے بنگال میں سراج الدولہ اور میسور میں شیرِ میسور سلطان ٹیپو کی مسلم سلطنتیں انگریزوں کے ہاتھوں میں چلی گئیں اور معلوم نہیں کتنی صدیوں کے لیے ہندوستانی مسلمانوں کے گلے میں ذلت و رسوائی کا طوق پڑ گیا۔ یہ سارے کے سارے غدارانِ ملک و ملت اور ننگ ہائے دین و ملت کون تھے؟ جن کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

جعفر از بنگال و صادق از دکن ننگِ ملت، ننگِ دیں، ننگِ وطن

غرض شیعہ مذہب کا مقصدِ وجود ہی یہ ہے کہ حقیقی اسلام اور حقیقی مسلمانوں کو روئے زمین سے ختم کر دیا جائے اور یہودی شریعت اور مجوسی قوم پرستی کے معجونِ مرکب کو اسلام کے نام پر اقتدار اور سربلندی عطا کی جائے۔

اس طرح کے مسلسل تجربات کی روشنی میں اسلام کی مکمل تباہی کا منصوبہ محمد بن حسن عسکری (امام غائب اور مہدی مزعوم) کی آمد سے وابستہ کر رکھا ہے اور خود اندھیرے اور اُجالے میں لعنت و ملامت کے الفاظ اور تبرّا آمیز جملوں اور طعنوں سے لذتِ کام و دہن لیتے ہیں۔ چونکہ ان کے عقیدے کے مطابق اسلام اور

اہلِ اسلام کی اس ہمہ گیر تباہی کے لیے جو جنگی کارروائی ہوگی اسی کا نام جہاد ہے۔ اس لیے انہوں نے جہاد کو بھی امام غائب سے وابستہ کر رکھا ہے اور علامہ خمینی کی آمد کو وہ اسی کی تمہید سمجھتے ہیں۔ اور محض محلاتی سازشوں کے ذریعہ اہلِ سنت کی بربادی کے سامان مہیا کر رہے ہیں۔ علامہ خمینی نے آتے ہی اجرائے جہاد (یعنی اہلِ سنت کے خلاف شیعوں کی مذہبی فوج کشی) کا فتویٰ دیا تھا۔ مگر افسوس کہ اب بھی ہمارے بہت سے بھائی ایران کے اس انقلاب کو سمجھ نہیں پائے۔

ہمارے دینی کارکنوں نے جب کہیں شیعیت کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے بند باندھنے کی کوشش کی تو شیعہ علماء اور ان کے سیاسی کارکن پھر ان شبہات اور اعتراضات کو سامنے لے آتے ہیں جن کے جوابات امت بارہ سو سال سے دیتی آ رہی ہے۔ اب یہاں ضرورت آ لگی ہے کہ ان سوالات کے جوابات محققانہ، مخلصانہ اور متین انداز میں نوجوانوں اور سیاسی کارکنوں میں پھر سے پھیلائے جائیں اور انہیں سمجھایا جائے کہ وہ سیاسی ہم آہنگی میں اپنے عقائد و نظریات کو شیعیت کی بھینٹ نہ چڑھائیں۔ یہ وہ داعیہ تھا جس کے باعث میں نے حضرت علامہ خالد محمود صاحب کو فون کیا کہ آج ان کی کتاب عبقات کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ عبقات میں اثنا عشری شبہات اور سوالات کے جوابات اس انداز میں دیئے گئے ہیں کہ عصرِ حاضر کی اُداس نسلیں ان سے فائدہ اُٹھا سکتی ہیں اور مسلمان نوجوانوں کی ذہنی تربیت کے لیے یہ جوابات اکسیر کا درجہ رکھتے ہیں۔

تقریباً پچیس برس پہلے یہ کتاب لاہور میں بڑی آب و تاب سے شائع ہوئی تھی۔ راقم الحروف نے جامعہ رشیدیہ ساہیوال کے شیخ الحدیث مولانا محمد عبداللہ صاحب سے بارہا اس کتاب کی تعریف سُنی۔ فاضل رشیدی مولانا حبیب اللہ صاحب فاضل دیوبند طلبہ اور شہری حلقوں میں اس کتاب کے بہت بڑے منّاد تھے۔ انہی دنوں میں نے یہ کتاب دیکھی اور جیسا اپنے اکابر سے سُنا تھا، اس کتاب کو اس سے بڑھ کر پایا۔

ایران کے اس انقلاب پر یہاں کے بہت سے حلقے شیعیت کی براہِ راست زد میں ہیں۔ ری یونین Re-Union میں مڈغاسکر کے تاجروں کی آمد سے وہاں کی اعتقادی زمین بُری طرح ہل رہی ہے۔ وہاں کے سنّی علماء ان موضوعات اور شبہات کے بارے میں بار بار اسلامک اکیڈمی مانچسٹر کی طرف رجوع کر رہے ہیں اور ماہنامہ "الہلال" مانچسٹر کو ان اطراف سے سینکڑوں خطوط آ رہے ہیں۔ خود انگلینڈ میں ایران کے گوریلے بڑی تیزی سے مصروفِ کار ہیں۔ ایران سے انہیں ہدایات ملتی ہیں اور وہ اپنے سیاسی نشے میں کفر و الحاد کی وہ گولیاں بھی نگل جاتے ہیں جن کے بعد ایمان کی موت ہے۔ مرکزِ اسلام کعبہ سے بغاوت

ہے اور جاں نثاران رسولؐ سے زندگی بھر کی عداوت ہے۔ اعاذنا اللہ منہا۔

میں نے علامہ صاحب سے عرض کی کہ عبقات کی نئی اشاعت میں ان سوالات و جوابات کو بھی شامل کرلیں جو ہفت روزہ دعوت میں اس کے بعد چھپے ہیں۔ اس سے کتاب کی افادیت میں اور بھی قابلِ قدر اضافہ ہوگا۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس کا انگریزی، فرانسیسی اور فارسی میں بھی ترجمہ ہوجائے تاکہ علامہ خمینی کے کردارِ شیعیت کا عالمی سطح پر مطالعہ کیا جاسکے۔

ہفت روزہ دعوت میں سب سوالات شیعیت سے متعلق ہی نہ ہوتے تھے۔ دعوت کا موضوع قادیانیت بھی رہا ہے۔ علامہ صاحب کا خیال تھا کہ انہیں ایک علیحدہ کتاب کی صورت میں مرتب کیا جائے مگر راقم الحروف نے کہا کہ قادیانیت بھی تو شیعیت کی ہی ایک بدلی ہوئی صورت ہے سو ان سوالات کو یہیں رہنا دیا جائے۔ اب یہ سوالات بھی مجموعۂ استفسارات میں شامل ہیں۔

جب تک ایران میں یہ مذہبی انقلاب نہیں آیا تھا۔ اہل سنت حضرات ہر قومی تحریک میں شیعوں کو ساتھ لے کر چلتے رہے ہیں۔ کسے خبر نہیں کہ ١٩٥٢ء کی کراچی کی مختلف الفرق میٹنگ میں شیعہ علماء بھی ساتھ تھے۔ پھر تحریک ختم نبوت میں سب اکٹھے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک لوگوں نے شیعیت کو صرف کتابوں میں پڑھا تھا اور ان میں تقیہ کی اساس پر ہر طرح کی روایات مل جاتی تھیں۔ یہ معلوم کرنا خاصا مشکل تھا کہ اصل شیعہ مذہب کیا ہے؟ علامہ خمینی کے مذہبی انقلاب اور ولایت الفقیہ کے مذہبی خاکے سے اب شیعیت کھل کر لوگوں کے سامنے آگئی ہے۔ اب علماء نے خود دیکھ لیا ہے اور خود ایران جاکر دیکھ لیا ہے کہ شیعیت کی مذہبی دلالتیں عربی نہیں، ایرانی ہیں اور اس مذہب کی اساس تولا پر نہیں اولین امت کی عداوت پر ہے۔ ان حالات میں ہمارا ان کو ساتھ لے کر چلنا مشکل ہوگیا ہے اور اگر علامہ خمینی ہمیں ساتھ رکھنے کے داعی ہیں تو وہ اپنی ماتحتی میں رکھ کر ہمارا ساتھ لینا چاہتے ہیں اور قم کی تاریک فرقہ وارانہ فضا سے نکلنے کے لیے وہ قطعاً تیار نہیں ہیں اور ظاہر ہے کہ ہم نے ایمان کا سودا کسی سے نہیں کیا۔ اللہ تعالےٰ سب مسلمانوں کو ایمان کی سلامتی عطا فرمائے۔ سیاسی آوازیں سطحی ہوتی ہیں۔ مگر ایمان کی رگیں فولادی ہوتی ہیں جن کا کٹنا بہت مشکل ہے۔

اگر آپ اپنے ایمان کی حفاظت، اپنے سماج کی اصلاح اور اپنی نئی نسلوں کا ایمانی تحفظ چاہتے ہیں تو عبقات کو اپنے حلقوں میں عام کریں۔ اسے بار بار پڑھیں اور دوسروں کو سنائیں — اگر شیعہ طلبہ بھی اسے پڑھیں تو اللہ رب العزت سے قوی امید ہے کہ وہ بھی ایمان کی حقیقی دولت پالیں اور اختلافات کے جھگڑوں سے نکل کر دین کی اصل راہ پر آنکلیں۔ وما ذٰلک علی اللہ بعزیز۔

حق میں کوئی پیچیدگی نہیں اور باطل میں کوئی صفائی نہیں اسلام کے اصول کتنے سادہ اور واضح ہیں۔ یہ ایک کھلی کتاب ہے قد تبین الرشد من الغی۔ اور شیعیت کی راہیں کتنی پیچیدہ اور اُلجھی ہوئی ہیں۔ اس کی آواز درونِ غار سے اب بھی سُنی جارہی ہے۔ شرط یہ ہے کہ کان ہوں جو ادھر لگیں اور دل ہو جو حاضر ہو لمن کان لہ قلب او القی السمع وھو شہید۔

توحید کے ساتھ عدل کی بندش   رسالت کے ساتھ امامت کا عہد   آخرت کے ساتھ رجعت کا بند اور قرآن کے ساتھ ترتیبِ نزول کا پیوند۔ یہ وہ پیچیدہ راہیں ہیں جس نے شیعیت کو ایک بالکل نیا مذہب بنا کر رکھ دیا ہے۔ وہ نوجوان جو آج کل مذہب سے دُور ہو رہے ہیں وہ ان دیو مالائی داستانوں کو کہاں تک تسلیم کرسکیں گے یہ فیصلہ وقت کرے گا۔

جب تک ان کی کتابیں عام نہ تھیں اور اپنے دین کو چھپانا ان کا دینی عہد تھا مسلمان انہیں اپنے سے زیادہ دُور نہ سمجھتے تھے۔ لیکن اب جب کہ یہ کتابیں عام ہوچکی ہیں اور مسلمانوں نے ایران میں ان کی ایک خالص مذہبی حکومت کے جلوے بھی دیکھ لیے۔ انہیں تقیہ کے دوران ان کی اصل شکل میں دیکھ لیا ہے تو اب ان کو سمجھنا کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں رہا   ان کے مذہب میں بے شک پیچیدگی ہے۔ لیکن انہیں سمجھنے میں ایک صاحبِ نظر کے لیے اب کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔

ایک عامی کے لیے رسالت کو سمجھنا آسان ہے کہ یہ خدائی احکام کی ایک ایجنسی ہے مگر اس کے لیے رسالت اور آسمانی عہدِ امامت میں فرق کرنا مشکل ہے۔ سچ اور جھوٹ کو سمجھنا آسان ہے مگر جھوٹ اور تقیے میں فرق کرنا مشکل ہے۔ نکاح اور زنا کو سمجھنا آسان ہے مگر زنا اور متعہ میں فرق کرنا مشکل ہے۔ قیامت اور آخرت کو سمجھنا آسان ہے مگر قیامت سے پہلے رجعت کو سمجھنا خاصا مشکل ہے۔ مصیبت اور صدمے کے وقت آنسوؤں کا بہہ نکلنا لائق تسلیم ہے لیکن صدیوں کے صدمے پر ہر سال آنسو بہانا اور اپنے آپ کو مارنا آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اس کے لیے بڑے بڑے مجتہدوں کی خدمات خریدنی پڑتی ہیں۔

کھُلی کتابوں پر ایمان لانا کوئی مشکل بات نہیں۔ لیکن غار میں رکھی کتاب پر ایمان لانے اور نہ لانے میں فرق کون کرسکے گا۔ مذہب روشنی دیتا ہے اور اندھیرے میں نہیں لے جاتا۔ اس کے پیرائے مثبت ہونے چاہئیں۔ دوسروں سے امتیاز خود بخود ہوجاتا ہے۔ آپ نے اب تک کوئی ایسا مذہب نہ سُنا ہوگا جس کی اساس ہی تبرا پر ہو۔ جب تک تم ان فلاں فلاں بزرگوں کو بُرا نہ کہہ لو تم اپنے مذہب کی لائن پر آہی نہ سکو۔ وہ مذہب ہی کیا جس کی بناء دوسروں سے نفرت پہ ہو۔

ایسی باتوں پہ داناؤں نے بریں عقل و دانش بباید گریست کہا تو ان دوستوں نے اسے بھی ماتم

کا اشارہ سمجھا اور رونا چاہیئے کہ ایک مستقل مذہب بنالیا۔

اس پس منظر اور صورتِ حال میں ان بکھرے کانٹوں کو اٹھانا اور پھیلائے گئے شبہات کو مٹانا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ حضرت علامہ کے قلم حقیقت رقم نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے رکھ دیا ہے۔

دین کی یہ غیر فطری دعوت عالمی سطح پہ دس فیصد سے زیادہ لوگوں کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکی۔ یہ تناسب ایران کو ساتھ رکھ کر ہے۔ اگر اسے نکال دیں تو اُن کا اہلسنّت سے عالمی تناسب دو تین فیصد سے زیادہ نہیں اور ایران میں جو انہوں نے اکثریت بنائی ہے وہ علم و تبلیغ کی راہ سے نہیں صفوی عہد کے جبر و تشدد نے وہاں انہیں یہ اکثریت دی ہے۔ یہ جہاں بھی کچھ اُبھرے ہیں سازش کی راہ سے اُبھرے ہیں۔ دانش کی راہ سے نہیں۔

مسٹر نکی کیڈے اینڈ جان آر آئی کول نے اہلسنّت کا عالمی تناسب نوّے فیصد بتایا ہے اور لکھا ہے کہ ایران صفوی عہد سے پہلے کوئی شیعہ سٹیٹ نہ تھا **Nikki Keddie and Juan R.I. Cole** لکھتے ہیں

The majority Sunni Branch with 90 percent of Muslim holds that after the passing of Muhammad four rightly guided caliphs were elected by community leaders. P.2.

The Sofavid dynasty conoverted Iran to Shi'ism after 1501. P.2.

Twelver Shi'ism developed ... in the ninth century P.5.

One cannot speak of twelver Shi'ism before the doctrihe developed of the disappearance of the infant twelfth Imam. P.5

W. Montgomery Watt has agreed convincingly that it became established Imami dactrine only some time after the deatlr of the eleventh Imam. P.5.

Shi'ism P.2. ibid, P. 2 Shi'ism P.2. ibid, P. 2 ibid, P. 5. ibid, P. 5.

علامہ خالد محمود صاحب نے خلفائے راشدین کے خلاف اپوزیشن کی جملہ تحریکیں ایک ایک کر کے مسترد کر دی ہیں۔ ہفت روزہ دعوت کے صدیق اکبرؓ نمبر، فاروق اعظمؓ نمبر، عثمان غنیؓ نمبر اور علی مرتضیٰؓ نمبر خلفائے راشدین کے نام سے یکجا چھپ چکے ہیں —— یہ باب الاستفسارات دراصل انہی شخصیات کریمہ کے گرد ایک حفاظت کا پہرہ ہے۔ کتنا ہی اچھا ہو اگر اسے عبقات کے نام کے ساتھ ساتھ خلفائے راشدین جلد دوم کا نام بھی دیا جائے۔ تاکہ مخالفین نے خلفاء راشدین کے خلاف تاویلات و وساوس کے جو تانے بانے بُنے ہیں وہ تار تار ہو جائیں۔ واللہ ہو الموفق

حافظ محمد اسلم رشیدی اسلامک اکیڈمی مانچسٹر

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مادی قدروں کا خمار ایسے سعادت مندوں کا بہت کم پتہ دیتا ہے جنہیں اپنے مسلک کی پوری خبر اور آخرت کی کچھ فکر ہو۔ عصرِ حاضر کا معاشی توازن اس قدر بگڑا ہوا ہے کہ کسی طبقے کی نگاہ "دنیوی ضروریات اور ہل من مزید" کی جولانگاہ سے آگے نہیں بڑھتی۔ ایسی سعید روحیں بہت کم ہیں جنہیں دنیا کی بڑی سے بڑی مشکل یا بڑی سے بڑی راحت، آخرت کا محض ایک پل دکھائی دے اور جن کا پختہ اعتقاد یہ ہو کہ ہمیشہ کا گھر صرف آخرت ہی ہے۔

ان الدار الاخرۃ لھی الحیوان لو کانوا یعلمون۔ (پ ۲۱ عنکبوت ع ۷)

پھر دینی دوائرِ فکر بھی بیشتر سکون اور چین سے خالی ہیں۔ یہاں الحاد کے اتنے کانٹے ہیں کہ بہت سے دامن انہی میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ ایسے ماحول میں دین کی آواز اور حق و انصاف کی بات، ایک ایسا چراغ ہے جسے ہر طرف سے تیز و تند آندھیوں نے گھیر رکھا ہو۔

بایں ہمہ اسلام کی حفاظت خود خدائے رب العزت نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے اور وہ ہر دور میں ایسے اسباب پیدا فرما دیتے ہیں جو اسلام کی تعلیمات کو الحاد کے ہر ساز اور وقت کے ہر فتنے سے پوری طرح محفوظ کریں اور اگر کوئی ایسا وقت بھی آجائے کہ حق کی آواز کفر و الحاد کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ایک کرمک شب تاب کے برابر ہو تو بھی مایوسی کو کوئی راہ نہ ملے۔ حق بہرحال حق ہے اور روشنی کی شان یہ ہے کہ وہ غالب آئے گو کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو۔

ان ازمنہ اخیرہ میں اللہ تعالیٰ نے مرکز تنظیم اہل سنت کو یہ توفیق بخشی ہے کہ اس نے اوّلین امت کے باب میں عقائد اسلام کا علم و استدلال کی پوری قوت سے دفاع کیا ہے۔ خطیبوں نے زورِ خطابت سے اور مناظرین نے زورِ برہان سے اور تنظیمی شعراء نے زورِ کلام سے ملک کے ہر حصے، ہر شہر و دیہہ، ہر محفل اور ہر مجلس اور قریہ قریہ میں توحید و سنّت اور ناموسِ صحابہؓ کی عظمت و رفعت کے وہ چراغ روشن کیے اور کفر و الحاد کے سیاہ اندھیروں میں اسلام کی وہ اہم خدمات سرانجام دی ہیں کہ تمام فرقہائے باطلہ نے اپنے منہ آستینوں میں کر لیے ہیں۔ فللہ الحمد ظاہرًا و باطنًا و اولًا و آخرًا۔

قرآن کی بشارت ہے۔ وَقل جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا۔ (پ۱۵ بنی اسرائیل ع۹)

ملتِ حقہ اہل سنت و جماعت میں تبلیغی انجمنوں، تدریسی اداروں اور سیاسی جماعتوں کی کمی نہیں۔ لیکن عصرِ حاضر کے تقاضے کچھ اور قسم کے ہیں۔ محض تدریسی مجلسوں اور تقریری محفلوں سے کفر و الحاد کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے بند نہیں باندھے جا سکتے۔ الحاد پرور لٹریچر کے مقابلے میں صحت مند لٹریچر کی بھی اشد ضرورت ہے اور جماعتی زندگی کے نشو و نما اور جد و جہد للبقاء کے لیے نشر و اشاعت کے نئے انداز اپنانے بس لازمی ہیں۔

آج سے تقریباً تیس برس پہلے اہل سنت کے چند درد مند اور مخلص حضرات نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور سردار احمد خاں صاحب پتافی رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں اہل سنت کا تنظیمی پلیٹ فارم وجود میں آیا۔ جماعت نے پہلے ہفت روزہ تنظیم اہل سنت کے نام سے اور پھر سہ روزہ دعوت کے نام سے مسلکی نشر و اشاعت اور دفاعِ ملت کی ذمہ داری ادا کی۔ تنظیم نے پوری کوشش کی کہ تقریر کے مقابلے میں تقریر، تحریر کے جواب میں تحریر اور لٹریچر کے مقابلے میں لٹریچر پیش کیا جائے۔

پچھلے چند سال مالی اور انتظامی مشکلات کے سبب جماعتی ترجمان بند رہا لیکن مقام شکر ہے کہ اللہ رب العزت نے پھر ہمیں توفیق عطا فرمائی اور ۱۹۶۲ء سے مرکز تنظیم اہل سنت پاکستان کا جماعتی ترجمان ہفت روزہ "دعوت" پھر سے افقِ صحافت پر طلوع ہو گیا۔

مرکز کو اس کے مالی بوجھ سے بچانے کے لیے اس کا انصرام ادارہ حفظ معارفِ اسلامیہ کے سپرد ہوا۔ ادارہ نے ۱۹۶۲ء سے ہفت روزہ "دعوت" کو نہایت کامیابی سے چلایا اور گو اب اسے بعض دوسری اہم مصروفیات کے باعث ہفت روزہ کی بجائے ماہنامہ کر دیا گیا ہے۔ تاہم اس جماعتی رسالہ کے اجراء اور البقاء میں احبابِ تنظیم نے اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ ہم اس مقام پر جناب سردار عبدالرحیم خاں صاحب پتافی کا شکریہ ادا کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتے۔ جن کی سرپرستی "دعوت" کے ہمیشہ شامل حال رہی اور "دعوت" نے اپنے اس دورِ جدید میں مندرجہ ذیل خصوصی نمبر بڑی آب و تاب سے شائع کیے۔ ہم خدا کے حضور میں ہدیہ تشکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے انہیں ہماری توقعات سے بہت بالا مقبولیت عطا فرمائی۔

(۱) رسول کریمؐ نمبر ۱۹۶۲ء (۲) صدیق اکبرؓ نمبر ۲۱ دسمبر ۱۹۶۲ء (۳) فاروق اعظمؓ نمبر ۱۹۶۲ء (۴) عثمان غنیؓ نمبر ۷ مئی ۱۹۶۳ء
(۵) علی مرتضیٰؓ نمبر ۱۳ جنوری ۱۹۶۴ء (۶) رسول کریمؐ نمبر ۱۹۶۴ء (۷) خاتم النبیینؐ نمبر وغیرہا۔

ہفت روزہ "دعوت" نے اپنے اس دورِ جدید میں پاک و ہند کے اکابر مسلک کی نظر میں جو مقام پایا اس کی ایک جھلک مندرجہ ذیل تحریروں میں ملاحظہ کیجیے:۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا علامہ قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند (انڈیا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قدر الشھادۃ قدر الشھود عربی کی مشہور ضرب المثل ہے۔ کسی تصنیف و تالیف کی عظمت اور خوبی اس کے مؤلف کی عظمت و شخصیت سے جانی جا سکتی ہے۔ "دعوت" کی تالیف اور سنجیدہ علمی مضامین کی عظمت و مقبولیت کے لیے یہ کافی ہے کہ فاضلِ محترم علامہ خالد محمود صاحب کا اسم گرامی لے لیا جائے جو اس کی سرپرستی اور نگرانی کا مبارک کام سرانجام دے رہے ہیں۔ اس پرچہ کے اصلاحی اور محققانہ مضامین خود ہی اس کی خوبی کی ضمانت ہیں۔ "دعوت" اسم بامسمیٰ ہے اس کے علمی اور دینی مضامین حقیقی معنی میں اسلام اور دین کی دعوت ہیں اس دورِ پُرفتن میں اسلام کی صحیح اور معتدل آواز الحمدللہ اس پرچہ کے ذریعہ سے بلند ہو رہی ہے۔ امید ہے کہ وہ روز بروز بلند سے بلند تر اور مقبول سے مقبول تر ہوتی رہے گی۔ حق تعالیٰ توفیق دے کہ طالبانِ علم و صداقت ایسے پرچوں کی قدر پہچانیں اور اس کی دعوت کو عام سے عام کرنے کی کوشش کریں۔

محمد طیب غفرلہٗ مدیر دارالعلوم دیوبند[۱]

صدر الافاضل حضرت مولانا العلامہ عبدالکبیر صاحب شیخ الحدیث مدینۃ العلوم حضرت بل سری نگر کشمیر کی رائے گرامی

ہفت روزہ "دعوت" لاہور جو تنظیم اہل سنت کے زیرِ اہتمام اور فاضل محترم جناب علامہ خالد محمود صاحب کی سرپرستی میں شائع ہوتا ہے۔ ماشاء اللہ بہت علمی اور دینی خدمت کر رہا ہے۔ مادہ پرستی کے اس دور میں ایسے رسالے کا چل نکلنا ایک بہت ہی بڑا کام اور اسلام کا ایک زندہ اعجاز ہے۔ پاکستان میں دینی رسائل اور اخبارات تو بہت ہوں گے لیکن "دعوت" جس علمی امتیاز اور ادبی انداز سے چل رہا ہے اس کی مثال ملنی محال ہے۔ جہاں تک میں اس رسالے کو دیکھ سکا ہوں تحقیق کے نقطۂ نظر سے "دعوت" کا بیان حرفِ آخر ہوتا ہے پاکستان کے اہل سنت مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے کہ وہاں علامہ خالد محمود صاحب جیسے حضرات جن کے علم و فضل پر علماء کے اونچے طبقے کو پورا اعتماد ہے۔ علم دینی کی نشر و اشاعت اور تبلیغ شرع متین میں پوری طرح کوشاں ہیں میرا تمام مخلصین احباب اور خاص طور پر علماء اور طلبہ کو یہ مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ اس مؤقر جریدہ کے معلومات سے ہر طرح مستفید ہونے کی کوشش کریں۔

احقر العباد عبدالکبیر
صدر مدرس مدینۃ العلوم حضرت بل سرینگر کشمیر[۲]

---

[۱] منقول از دعوت ۲۲ مئی ۱۹۶۴ء [۲] دعوت ۲۵ جنوری ۱۹۶۳ء

مقدام العلماء شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا عبدالحق صاحب اکوڑہ خٹک سابق مدرس دارالعلوم دیوبند کا مکتوب گرامی

مکرمی فاضل اجل حضرت علامہ صاحب زید مجدکم ——— السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

امید ہے مزاج گرامی بالخیر ہوں گے۔ ہفت روزہ "دعوت" کے کئی پرچے موصول ہوئے ہیں اور دل ودماغ کے لیے باعثِ فرحت وانبساط بنے۔ اس نازک دور میں اتنا وقیع اور ایسا سنجیدہ اور ٹھوس علمی مضامین سے لبریز پرچہ نکالنا اور اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا بڑے دل گردے اور حوصلے کا کام ہے۔ مگر نزاکت حالات اور کام کے مشکل ہونے کے باوجود دین وعلمِ دین اور مسلکِ اہل سنّت والجماعت کے اشاعت وحفاظت وقت کا اہم ترین فریضہ اور ضرورت ہے۔ ماشاء اللہ آپ کا علمی وتبلیغی پرچہ مسلمانوں کے مسلک اعتدال اور صحیح جذبات واحساسات کی علم برداری کر رہا ہے اور بڑی خصوصیت اس کا علمی اندازِ بیان اور عالمانہ رنگ اور محققانہ شان ہے۔ پھر ان تمام خصوصیتوں کے ساتھ ساتھ تبلیغی واصلاحی فوائد کے پہلو بھی لیے ہوئے ہے۔ مجھے تمام مسلمانوں سے عموماً اور اہلِ علم حضرات سے خصوصاً امید ہے کہ اس علمی وعملی، تبلیغی اور اصلاحی گراں قدر پرچہ کا گرمجوشی سے خیر مقدم کریں گے۔ اللہ تعالیٰ اس کے منتظمین اور کارکناں کو مزید جوش وخروش اور للٰہیت واخلاص سے مالا مال فرمائے اور آپ کا پرچہ ان تاریکیوں میں روشنی کا مینار ثابت ہو۔ والسلام

بندہ عبدالحق غفرلہٗ

مہتمم وشیخ الحدیث دارالعلوم حقّانیہ اکوڑہ خٹک

○

مخدوم العلماء والصلحاء شیخ المشائخ حضرت مولانا خان محمد صاحب دامت برکاتہم سجادہ نشین خانقاہ سراجیہ کندیاں شریف کا مکتوب گرامی

بعد الحمد والصلوٰۃ وارسال التسلیمات والتحیات۔ فقیر خان محمد کی طرف سے مکرم منیجر صاحب مطالعہ فرمائیں کہ آپ کا والا نامہ موصول ہوا۔ حضرت علامہ صاحب اور آپ کی یاد فرمائی کا بہت بہت شکریہ جزاکم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

"دعوت" کے مطالعہ سے بھی مشرف ہوا۔ مضامین اعلیٰ اور معلومات افزا ہیں۔ کتابت وطباعت معیاری اور دیدہ زیب ہے۔ گویا کہ دعوت کا پرچہ اپنے اندر دعوت کا پورا مفہوم ادع الیٰ سبیل ربك بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن لیے ہوئے ہے۔ ظاہر ومعنوی خوبیوں سے آراستہ ہے اللہ تعالیٰ اپنا فضل وکرم شاملِ حال رکھے اور منتظمینِ دعوت کے اخلاص میں ترقی نصیب فرما دے اور کام میں برکت

عطا فرما دے اور خدمت واشاعتِ دینِ متین کی مزید برآں توفیق کرامت فرما دے اور جملہ فرق باطلہ کے تردید کی ہمت واستقامت مرحمت فرمائے (آمین)۔ فقیر کو اپنا مستقل دعاگو اور "دعوت" کا ہمیشہ کے لیے خریدار تصور فرمایئے اور "دعوت" کو فقیر کے نام پہ جاری رکھیں۔ فقیر بفضلہ تعالیٰ عافیت سے ہے۔ والحمد للہ علیٰ ذلك۔ فقیر کی طرف سے حضرت علامہ صاحب کو سلام مسنون۔

از خانقاہ سراجیہ کندیاں[1]

○

علامہ زماں محققِ دوراں حضرت مولانا اطہر علی صاحب بانی وصدر جامعہ امدادیہ کشور گنج میمن سنگھ از مشرقی پاکستان کی رائے گرامی

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ہفت روزہ "دعوت"، عین روانگی کراچی کے وقت سامنے آیا۔ بہت دنوں سے اس دینی پرچے کی شہرت سن رکھی تھی۔ لیکن مطالعہ کا موقعہ نہیں آیا تھا۔ اس وقت اس کے چند پرچے دیکھے ہیں اس کی تحقیقات بڑی عالمانہ اور طریق بہت معتدل ہے۔ ہر کتاب اور ہر پرچے کی عظمت اس کے مصنف اور نگران کی شخصیت سے ظاہر ہوتی ہے۔ "دعوت" کے اعتماد اور عظمت کے لیے اتنا علم ہی کافی ہے کہ یہ پرچہ جناب علامہ خالد محمود صاحب کی سرپرستی میں شائع ہوتا ہے۔ مغربی پاکستان میں دینی کام کرنے والے بہت سے علماء، اربابِ قلم اور کارکن لوگوں کو میں ملا ہوں۔ ان میں علامہ خالد محمود صاحب کو میں نے نہایت عمیق العلم متوازن دماغ، معتدل مسلک اور گہری فکر کا مالک پایا ہے۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ کی رائے گرامی بھی میں نے دیکھی ہے ہفت روزہ "دعوت" کے متعلق حضرت کے ارشاد گرامی سے بھی حرف بہ حرف موافق ہوں اور اس پرچے کے لیے دعا کرتا ہوں۔

اطہر علی غفرلہ ۳۰ رمئی ۱۹۶۴ء

○

فاضل اجل صدر الافاضل حضرت مولانا شمس الحق صاحب از جیسور مشرقی پاکستان کا ارشاد گرامی:

ہفت روزہ "دعوت" لاہور جو تنظیم اہل سنّت پاکستان کی سرپرستی اور ادارہ حفظ معارف اسلامیہ کے اہتمام میں شائع ہوتا ہے۔ مسلکِ اہل سنّت کا نہایت بلند پایہ علمی آرگن ہے۔ مشرقی پاکستان میں یہ پرچہ مقبول ترین ایک دینی پرچہ ہے۔ جس پر یہاں کے اہلِ علم کو پورا پورا اعتماد ہے۔ باب الاستفسارات کے ذریعہ اس پرچہ نے جو خدمت سرانجام دی ہے وہ علمی دنیا پر ایک احسانِ عظیم ہے۔ ایک بڑا کتب خانہ بھی وہ کام نہیں کرسکتا۔

---

[1] منقول از دعوت ۵ راکتوبر ۶۲ء و تقریظ حضرت مولانا عبدالحق محدث اکوڑوی از دعوت ۱۴ ردسمبر ۱۹۶۲ء

جواب "دعوت" کے باب الاستفسارات کے ذریعہ ہو رہا ہے۔ سب سے بڑی بات جو مجھے پسند آئی ہے وہ اس کا مسلک اعتدال ہے۔ جو فرقہ بندی کی تنگ نظری سے بالکل بالا ہے۔ اس میں کسی دوسرے فرقہ پر عامیانہ حملے نہیں ہوتے۔ اپنے عقائد اور مسائل کا مثبت اور شستہ بیان ہوتا ہے۔ مشرقی بنگال میں "دعوت" کی عظمت کے لیے یہ کافی ہے کہ حضرت علامہ صاحب کا نام لیا جائے۔

میں نے اس کے فائل باقاعدہ جلد بنا رکھے ہیں۔ چند دنوں تک میرا مصر جانے کا ارادہ ہے کوشش کروں گا کہ جامعہ ازہر یونیورسٹی میگزین میں اس کے باب الاستفسارات کا قسط وار عربی ترجمہ شائع کراؤں۔ میں ڈھاکہ، چٹاگانگ، میمن سنگھ، کھلنا اور جیسور کے مسلمانوں بلکہ پورے پاکستان کے مسلمانوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس علمی رسالہ کی معلومات سے مستفید ہوں اور اپنے حلقۂ احباب میں اس دینی اور ادبی رسالہ کو جاری کرائیں۔

کمترین خلائق بندہ محمد شمس الحق غفرلہ موضع باڑیالی ڈاک خانہ پاشا پول ضلع جیسور[1]

○

مخزنِ علوم و عرفان حافظ الحدیث حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب درخواستی امیر جمعیۃ علماء اسلام مغربی پاکستان کا ارشاد گرامی

ہفت روزہ "دعوت لاہور" مسلک اہلسنت والجماعت کے عقائد و نظریات کا صحیح ترجمان ہے اور ماشاء اللہ نشر و اشاعت مسلک حقہ کا خوب کام کر رہا ہے۔ میں اپنے تمام متعلقین اور تلامذہ کو خصوصاً تاکید کرتا ہے کہ وہ ہفت روزہ "دعوت" کا ہمیشہ مطالعہ کریں۔ موجودہ فتنوں کے دور میں اس کی آواز کو مضبوط بنانا اور اس کے ساتھ تعاون کرنا بہترین خدمتِ اسلام ہے۔ مبارک ہے ان کو جو دینی کام کرتے ہیں۔ دعا ہے کہ خدا اُسے زیادہ سے زیادہ دین کی خدمت کی توفیق دے۔ آمین

محمد عبداللہ درخواستی[2]

○

مولانا عبدالرشید ارشد فاضل خیر المدارس ملتان

ہفت روزہ "دعوت" نے وقت کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے جو جرأت مندانہ اداریئے سپرد قلم کیئے وہ ہمارے پلیٹ فارم کی جان اور تنظیمی موقف کے روشن عنوان ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ "دعوت" کا دُنیائے صحافت میں تعارف ہمارے انہی کالموں کا رہین احسان ہے۔ اسی طرح دعوت کے باب الاستفسارات مسلکِ اہل سنت کی جان اور علوم و حقائق کے وہ بحر بیکراں ہیں کہ انہیں ان مختصر کالموں میں سمونا حضرت علامہ خالد محمود صاحب ہی کے قلم حقیقت رقم کا کام تھا اور اہلِ علم حضرات سے ان کالموں کی قدر و منزلت مخفی نہیں۔ ان کا

---

[1] منقول مختصراً از دعوت ۱۰ جولائی ۱۹۶۴ء [2] منقول از دعوت ۱۷ اپریل ۱۹۶۴ء

حضرت علامہ صاحب کی طرف نسبت ہونا ہی ان کی علمی اور فکری شان کی ایک کافی ضمانت ہے۔

بعض بزرگوں اور دوستوں کی رائے تھی کہ وہ دعوت کے اداریئے جو مسلکی حقوق و مطالبات کو شامل ہوں اور مستقل افادی شان کے حامل ہوں انہیں منتخب کر کے ایک علیحدہ کتابی صورت دے دی جائے تاکہ وہ ملی صحافت کے لیے ایک کلید مفید اور دعوتِ تنظیم کے لیے ایک اچھی یادگی صورت میں باقی رہیں۔ انشاء اللہ اس پر عمل ہو گا۔

اسی طرح تنظیمی حلقوں کا اشد اصرار اور احباب کا مسلسل تقاضا ہوا کہ "دعوت" کا باب الاستفسارات بھی یکجا کتابی صورت میں زیورِ طباعت سے آراستہ کیا جائے۔

الحمد للہ کہ ادارہ حفظ معارف اب ہفت روزہ "دعوت" کے پہلے دو سالوں کے باب الاستفسارات "عبقات" کے نام سے شائع کر رہا ہے اور رب العزت نے توفیق عطا فرمائی تو آئندہ کسی وقت دعوت کے منتخب اداریئے بھی "نظرات" کے نام سے یکجا اشاعت پذیر ہو سکیں گے۔

دعوت کے باب الاستفسارات "دعوت" کے مقبول ترین کالم ہیں اور مفکر اسلام حضرت علامہ صاحب کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں ــــــ ان کا گہرا مطالعہ عقائد اسلام کے تحفظ کی ضمانت اور اسلاف اسلام کے ایمان و عمل کی معقول و منقول سے ایک قوی شہادت ہے۔ اس وقت یہاں ہم مدرسہ عربی قاسم العلوم فقیر والی کے صدر شعبہ تبلیغ مولانا ملی محمد صاحب کا وہ مکتوب گرامی نقل کرتے ہیں جو ۱۳ جولائی ۱۹۶۴ء کے "دعوت" میں شائع ہوا تھا۔ فاضل مکتوب نگار باب الاستفسارات کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> علامہ صاحب ادیبوں میں ادیب، خطیبوں میں خطیب، مصنفوں میں مصنف، عالموں میں عالم، مناظروں میں مناظر اور مفکروں میں مفکر ہیں۔ ان کی زبان صداقت کی ترجمان ہے۔ ان کا قلم حقیقت رقم ہے اور وہ قوتِ حافظہ، وسعتِ مطالعہ، فصاحت و بلاغت اور علوم جدید و قدیم میں مہارت تامہ کے باعث طبقہ علماء میں اپنے شرف و امتیاز کے بلاشرکتِ غیرے مالک ہیں۔ یہ حقیقت بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اُن کی صداؤں نے ڈھلتی راتوں کے تاریک سناٹوں میں بھی اصحابِ رسولؐ کا نام بلند کیا ہے۔ انہوں نے نامعلوم کتنے دماغوں میں توحید ختم نبوت کا اجالا پھیلایا ہے اور نامعلوم کتنے اَن گنت دل ایسے ہیں جن میں انہوں نے صحابہ کرامؓ کی عظمت ثبت کر دی ہے۔ حق یہ ہے کہ ان کی شخصیت ع نگہ بلند سخن دلنواز، جاں پُرسوز ــــــ کا حسین مرقع ہے۔ باب الاستفسارات تو بالخصوص زبان و بیان اور علمی و تحقیقی لحاظ سے شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ حضرت علامہ خالد محمود صاحب کی ذہانت کا آئینہ دار اور ان کے تبحر علمی کا ترجمان ہوتا ہے۔ باب الاستفسارات پڑھ کر اُلجھے ہوئے مسائل کا قدرتی

اور علمی و تحقیقی سلجھاؤ سامنے آجاتا ہے۔ حق کے متلاشیوں کے لیے یہ باب خضرِ راہ ہے لیکن وہ لوگ جن کے قلوب زنگ آلود ہو چکے ہیں اور جن کی فکری صلاحیتیں اور دماغی توانائیاں ان کے تنورِ شکم کی بھوکی صلاحیتوں نے مفلوج کر رکھی ہیں وہ اس سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ مجھے اس سے اتنا فائدہ پہنچا ہے کہ اس کے بیان سے پائے قلم لنگ ہے۔ بہت سے شکوک و شبہات جو میرے قلب میں خار کی طرح کھٹک رہے تھے اس کے پڑھنے سے وہ یک قلم کافور ہو گئے۔

بہر حال ہفت روزہ "دعوت" گم کردہ راہ لوگوں کے لیے خضرِ راہ اور ظلم و ضلالت کی وادیوں میں بھٹکنے والوں کے واسطے روشنی کا مینار ہے۔ اس محبوب پرچے کے انتظار میں ہفتہ بھر بے چینی رہتی ہے"

از مدرسہ قاسم العلوم فقیر والی ضلع بہاولنگر

مدرسہ قاسم العلوم ہی نہیں حضرت علامہ خالد محمود کے بارے میں یہی نقوش پذیرائی اور احساسات آپ کو جامعہ اشرفیہ لاہور، جامعہ رشیدیہ ساہیوال، خیر المدارس ملتان، نصرۃ العلوم گوجرانوالہ، سراج العلوم سرگودھا، مخزن العلوم خان پور اور دیگر مدارس پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان میں ملیں گے۔ مدارس کے علماء اپنے اپنے علاقے میں ارشاد و افتاء کا مرکز ہوتے ہیں۔ جس دینی پرچہ یا تحریک کو ان حضرات کی سرپرستی، اعتماد اور تائید حاصل ہو جائے تو وہ مسلمانوں کے لیے بلا خوف و خطر دین کی صحیح راہ ہے۔ دار العلوم دیوبند کی رائے آپ ابھی حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم کے بیان میں پڑھ آئے ہیں۔

ایک ضروری گذارش

حضرت علامہ خالد محمود صاحب کے فاضلانہ قلم نے اس باب میں جو جوابات تحریر فرمائے ہیں وہ ان کے علمی تبحر اور فکری گہرائی کے آئینہ دار ہیں۔ ضروری نہیں کہ سب اکابر ملت جواب کی ہر تعبیر سے متفق ہوں لیکن یہ ضرور ہے کہ مسلک کا مجموعی مفاد ان میں پوری طرح محفوظ ہے اور یہ اکابر سے پوری طرح تائید یافتہ ہے۔ ان حضرات کے مذکورہ سابقہ بیانات ہمیں اس باب میں بے خوف و خطر کر رہے ہیں۔

دعا ہے اللہ رب العزت ادارہ حفظ معارف اسلامیہ کی اس تحقیقی پیش کش کو زیادہ سے زیادہ مقبول فرمائے اور اس سے مسلک حق کی نشر و اشاعت کا پورا کام لے۔ آمین ثم آمین۔

(حافظ) عبد الرشید ارشد

مہتمم ادارہ حفظ معارف اسلامیہ لاہور

مقدمہ

الحمد للہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد:۔

اللہ تعالیٰ نے جس دین کو حضور ختمی مرتبت پر مکمل فرمایا اس کی تاریخ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع ہوتی ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اسلام کی گنتی شروع ہوئی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر اسلام کا پہلا چلہ پورا ہوا۔ سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بنو امیہ کی سیادت اور وجاہت سے رسولِ ہاشمی کے خدمت گزار بنے اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نبوت کے زیر سایہ جوان ہوئے۔ ان چار حضرات کے علاوہ اور کئی صحابہ رضی اللہ عنہم بھی برسرِ اقتدار آئے (جیسے حضرت حسن، حضرت امیر معاویہ اور حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم) لیکن ان پہلے چار بزرگوں میں خلافت افضلیت کے ساتھ ساتھ چلی اس لیے ان چار حضرات کو جو شرف و کمال ملا وہ عقائد اہل السنۃ والجماعۃ کی اساس ہے اور اس کے گرد پہرہ دینا وہ اپنا دینی فرض سمجھتے ہیں۔ ان کے ذمہ ہے کہ وہ ان پاکبازوں کے گرد بچھائے گئے کانٹوں کو ایک ایک کر کے چنیں اور ابن آدم کو بتائیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو بطور طبقہ اخلاق فاضلہ کی جلا بخشی تھی اور انہیں کفر، گناہ اور نافرمانی سے دوری صرف از حکم شریعت نہیں از راہ طبیعت حاصل ہو چکی تھی۔ شریعت کے تقاضے ان کی طبیعت بن چکے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ایمان کو ان کے دلوں کی طلب اور زینت بنا دیا تھا۔ ہمارے اس عقیدہ پر قرآن کریم کی کھلی شہادت موجود ہے:۔

ولکن اللہ حبب الیکم الایمان وزینہ فی قلوبکم وکرّہ الیکم الکفر والفسوق والعصیان اولٰئک ہم الراشدون۔ (پ ۲۶ الحجرات)

ترجمہ: پر اللہ تعالیٰ نے محبت ڈال دی تمہارے دلوں میں ایمان اور کھبا دیا اس کو تمہارے دلوں میں اور لائق نفرت بنا دیا تمہارے دلوں میں کفر، گناہ اور نافرمانی۔ وہ ہیں راشدین۔

ان تمام پیش بندیوں کے باوجود اگر اتفاق سے مسلمانوں کی دو جماعتیں باہم لڑ پڑیں تو وہ رہیں گی مومن ہی ــــ ان کے اختلاف کا منشاء غلط فہمی تو ہو سکتا ہے لیکن بدنیتی نہیں سوءِ اعتقاد نہیں۔ ایمان اپنی بنیادی شان سے ان کے دلوں میں جگہ پا چکا ہے۔ ان میں خون ریزی تک دیکھو تو بدگمانی کو راہ نہ دو۔ یہ سب بھائی بھائی ہیں بدگمانی سے انتہا تک بچو۔

ان میں سے کسی سے بڑے سے بڑا گناہ دیکھو تو بھی بدگمانی نہ کرو۔ اس کا ظہور بتقاضائے فسق نہیں ہوا۔ محض اس حکمت سے وجود میں آیا ہے کہ اس پر شریعت کی ہدایت اترے اور یہ لوگ تکمیل شریعت کے لیے استعمال ہو جائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی وقت نماز کی رکعتوں میں بھولنا ازراہ غفلت نہیں تھا۔ اس حکمتِ الٰہی کے تحت تھا کہ لوگوں پر سجدہ سہو کا مسئلہ کھلے اور شریعت اپنی پوری بہار سے کھلے۔

سوا ایسے جو امور شانِ نبوت کے خلاف نہ تھے ان کے حالات حضور پر ڈالے گئے اور جو گناہ کی حد تک پہنچتے تھے انہیں بعض صحابہؓ پر ڈالا گیا اور وہ حضرات اس طرح تکمیل شریعت کے لیے بطور سبب استعمال ہو گئے ان حالات سے گزرنے کے بعد ان کا وہ تقدس بحال ہے جو انہیں بطور صحابی کے حاصل تھا اور ان کی بھی بدگوئی کسی پہلو سے جائز نہیں۔ اعتبار ہمیشہ اواخر امور کا ہوتا ہے۔ اس کے بغیر ان امور اور واقعات کی قرآن کریم سے تطبیق نہیں ہوتی۔ یہ بات بالقطع والیقین حق ہے کہ صحابہ میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو غیر ثقہ ہو یا جو دین میں کوئی غلط بات کہے۔ سرخیل محدثین حضرت علامہ عینیؒ (۸۵۷ھ) لکھتے ہیں:-

لیس فی الصحابۃ من یکذب وغیر ثقۃ۔[۱]

جب کوئی حدیث کسی صحابی سے مروی ہو اور اس کے نام کا پتہ نہ چلے تو وہ راوی کبھی مجہول الحال نہ سمجھا جائے گا صحابی ہونے کے بعد کسی اور تعارف یا تعدیل کی حاجت نہیں۔

علامہ ابن عبدالبر مالکی (۴۶۳ھ) لکھتے ہیں:-

ان جمیعھم ثقات مامونون عدل رضی فواجب قبول ما نقل کل واحد منھم و شھدوا بہ علی نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم۔[۲]

ترجمہ: سب صحابہ ثقہ اور امانت دار ہیں عادل ہیں اللہ ان سے راضی ہوا ان میں سے ہر ایک نے جو بات اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی اور اس کے ساتھ اپنے نبی کے عمل کی شہادت دی (لفظاً ہو یا عملاً) وہ واجب القبول ہے۔

صحابیت میں سب صحابہ راشد اور مہدی تھے۔ مگر ان میں سے ایسے حضرات بھی ہوئے جو نظم امور سلطنت میں بھی راشد اور مہدی ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد اپنی امت کو ان کے نقش پا پر چلنے کی دعوت دی:-

علیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین او کما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

یہ حضرات وہی نفوسِ قدسیہ ہیں جنہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چار یار کہا جاتا ہے۔ حضرت مولانا

---

[۱] عینی علی البخاری جلد ۱ صفحہ ۱۰۵ [۲] کتاب التمہید جلد ۴ صفحہ ۲۶۳

اسماعیل شہیدؒ لکھتے ہیں۔ دیکھئے صراط مستقیم صفحہ ۱۱۵

طالب کو چاہیئے کہ اپنے تہ دل سے اعتقاد کرلے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے چار بڑے یار رضی اللہ عنہم اجمعین تمام بنی آدم سے بہتر ہیں اور اہل سنت کے عقیدہ کے مطابق ان کی آپس میں ایک دوسرے پر فضیلت خلافت کی ترتیب کے موافق ہے مسلمان کو چاہیئے کہ اسی ترتیب پر افضلیت کا اعتقاد رکھے اور وجوہ تفضیل کو نہ ڈھونڈے کیونکہ وجوہ تفضیل کو ڈھونڈنا دین کے واجبوں اور مستحبوں میں سے بھی نہیں۔

ان چار یار کے علاوہ باقی صحابہ میں تفضیل کی یہ بحث نہیں۔ آسمان ہدایت کے سب ستارے ہیں اور یہ بات ظاہر ہے کہ ستارے ایک جیسے نہیں چمکتے۔ چمک ہر کسی کی اپنی اپنی ہے لیکن ہے ہر کسی میں روشنی اور ناب، اندھیرا ان میں سے کسی میں نہ ملے گا۔

انبیاء علیہم السلام کے بعد صحابہ ہیں جو بطور طبقہ محمود و منصور ہیں۔ عام طبقات انسانی میں اچھے برے کی تقسیم ہے۔ علماء تک میں علماء حق اور علماء سوء کی دو قطاریں لگی ہیں لیکن صحابہ میں یہ تقسیم نہیں۔ صحابہ سارے کے سارے اچھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے باطن کی خبر دی ہے اور فرما دیا کہ کلمہ تقوےٰ ان میں اتار دیا گیا اور بیشک وہ اس کے اہل تھے:-

والزمھم کلمۃ التقویٰ وکانوا احق بھا و اھلھا۔ (پ ۲۶ الفتح ع ۳)

حدیث میں کلمۃ التقویٰ کی تفسیر لا الٰہ الا اللہ سے کی گئی ہے۔ سو یہ بات ہر شک اور شبہ سے بالا ہے کہ کلمہ اسلام ان کے دلوں میں اتارا گیا تھا اور اس کے لیے ان کے دل کی دنیا بلاشبہ تیار اور استوار تھی کہ اس میں یہ دولت اترے اور یہ انہی کا حق تھا کہ یہ دولت پا جائیں۔

سو یہ حضرات ہم احادِ امت کی طرح نہیں۔ ان کا درجہ ہم سے اوپر اور انبیاء کرام کے نیچے ہے۔ انہیں درمیانی مقام میں سمجھو کہ یہ حضرات ہم پر اللہ کے دین کے گواہ بنائے گئے ہیں اور اللہ کا رسول ان پر اللہ کے دین کا گواہ ہے جس طرح کعبہ قبلہ نماز ہے یہ حضرات قبلہ اقوام ہیں:-

وکذٰلک جعلناکم امۃ وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیداً۔

(پ ۲ البقرہ ع ۱۷ آیت ۱۴۳)

خطیب بغدادی (۴۶۳ھ) لکھتے ہیں کہ صحابہ کرام مخلوق میں سے کسی کی تعدیل کے محتاج نہیں۔ یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ جو ان کے باطن پر پوری طرح مطلع ہے ان کی تعدیل کر چکا ہے:-

فلا یحتاج احد منھم مع تعدیل اللہ لھم المطلع علی بواطنھم الی تعدیل

احد من الخلق له۔[1]

ترجمہ۔ صحابہ میں سے کوئی بھی مخلوقات میں سے کسی کی تعدیل کا محتاج نہیں اللہ تعالیٰ جو اُن کے قلوب پر مطلع ہے اس کی تعدیل کے ساتھ اور کسی کی تعدیل کی ضرورت نہیں۔

ہر وہ قول اور فعل جو اُن سے منقول نہیں بدعت ہے۔ سو یہ حضرات خود بدعت کا موضوع نہیں ہو سکتے ان کے کسی عمل پر بدعت کا حکم نہیں کیا جا سکتا۔ حافظ ابن کثیرؒ (۷۷۴ھ) لکھتے ہیں :۔

کل فعل و قول لم یثبت عن الصحابۃ رضی اللہ عنہم ھو بدعۃ۔[2]

ترجمہ۔ دین کے بارے میں کوئی قول اور کوئی فعل جو صحابہ سے ثابت نہ ہو بدعت ہے۔

صحابیِ رسول حضرت حذیفہ بن الیمانؓ (۳۶ھ) فرماتے ہیں :۔

کل عبادہ لم یتعبدھا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلا تعبدوھا۔[3]

ترجمہ۔ دین کا ہر وہ عمل جسے صحابہ نے دین نہیں سمجھا اسے تم بھی دین نہ سمجھنا۔

جب دین انہی سے ملتا ہے تو ان حضرات کی تعظیم اس امت میں حق کی اساس ہو گی۔ انہی سے قافلۂ امت آگے بڑھا ہے اور پوری امت جمعہ اور عید کے ہر خطبہ میں ان کی ثنا خوانی کرتی آئی ہے۔ یہ حضرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے وفادار رہے کہ ان کی مثال نہیں ملتی —— بقول مولانا ابو الکلام آزاد :۔

دنیا میں انسانوں کے کسی گروہ نے کسی انسان کے ساتھ اپنے سارے دل اور اپنی ساری روح سے ایسا عشق نہیں کیا ہو گا جیسا کہ صحابہ نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے راہِ حق میں کیا انہوں نے اس محبت کی راہ میں وہ سب کچھ قربان کر دیا جو انسان کر سکتا ہے اور پھر اس راہ سے انہوں نے سب کچھ پایا جو انسانوں کی کوئی جماعت پا سکتی ہے۔

اہل حق ہمیشہ سے صحابہ کی عظمتوں کے گرد پہرہ دیتے آئے ہیں جہاں کسی نے شک کا کوئی کانٹا لگایا، اہل حق نے ان کے تزکیہ کی کھلی شہادت دی جہاں کہیں تبرا کی آواز اٹھی اہل حق تولا کی دعوت سے آگے بڑھے اور نفاق کے بت ایک ایک کر کے گرا دیئے۔

جماعتِ اہلحدیث کے مقتدر بزرگ مولانا عبداللہ روپڑی بھی لکھتے ہیں :۔

اقوال صحابہ کے ساتھ استدلال کرنا ٹھیٹھ اسلام میں داخل ہے۔

اور پھر آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

صحابی کے اس قول کو جو اجتہاد و استنباط کی قسم سے ہو اس کو قرآن و حدیث سے الگ نہ سمجھنا

---

[1] الکفایہ صفحہ ۴۶ [2] تفسیر ابن کثیر جلد ۴ صفحہ ۵۵۶ [3] الاعتصام للشاطبی صفحہ ۵۴

چاہیئے۔ بلکہ قرآن و حدیث میں داخل سمجھنا چاہیئے ۔۔۔۔ صحابہ آپ کے طرزِ استدلال کو دیکھتے تھے اور آپ کے کنایہ اور اشارے کو خوب سمجھتے تھے اور جتنی باتیں مشاہدہ سے تعلق رکھتی ہیں ان سے خوب واقف تھے اور بعد کے لوگ ان باتوں سے محروم ہیں اس لیے پچھلوں کے اجتہاد پر صحابہ کے اقوال کو مقدم کرنا ضروری ہے اور صحابہ چونکہ ان باتوں میں برابر ہیں اس لیے ان کے اقوال آپس میں ایک دوسرے کو ماننے لازم نہیں۔[1]

حضرت امام اوزاعیؒ (۱۵۷ھ) نے حضرت امیر معاویہؓ کی خلافت (جو حضرت حسنؓ کی صلح کے بعد منعقد ہوئی تھی) کے برحق ہونے پر صحابہ کی موجودگی سے استدلال کیا ہے اس میں ان کی اسی حیثیت کا اقرار ہے کہ یہ لوگ کبھی باطل پر جمع نہیں ہو سکتے تھے۔ حافظ ابوزرعہ الدمشقی (۲۸۲ھ) لکھتے ہیں :۔

عن الاوزاعی قال ادرکت خلافۃ معاویۃ عدۃ من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منہم سعد واسامۃ وجابر بن عبداللہ وابن عمر وزید بن ثابت ومسلمۃ بن خالد وابو سعید وابو رافع بن خدیج وابوامامۃ وانس بن مالک ورجال اکثر ممن سمیت باضعاف مضاعفۃ کانوا مصابیح الدجیٰ واوعیۃ العلم حضروا من الکتاب تنزیلہ واخذوا عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تاویلہ[2]

ترجمہ۔ امام اوزاعی کہتے ہیں حضرت معاویہؓ کی خلافت بہت سے اصحابِ رسول نے پائی ہے ان صحابہ میں حضرت سعد، حضرت اسامہ، حضرت جابر، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت زید بن ثابت، حضرت مسلمہ بن خالد، حضرت ابو سعید الخدری، حضرت رافع بن خدیج، حضرت ابوامامہ حضرت انس بن مالک اور کئی اور حضرات صحابہ جو ان حضرات سے کئی گنا زیادہ ہیں جن کے میں نے نام لیے یہ سب حضرات اندھیروں کے چراغ تھے علم کے مٹکے تھے، نزولِ قرآن کے موقعوں پر حاضر و موجود تھے اور انہوں نے حضورؐ سے براہِ راست مرادِ قرآن سمجھی ہے۔

یہ حضرات کسی پہلو سے بھی بدعت کا موضوع نہیں ہیں۔ اُن پر لب کشائی کرنا اور زبان کھولنا خود بدعت ہے۔ علم کلام کے مقتدر عالم علامہ ابوشکور السالمی لکھتے ہیں۔ بدعت کے پانچ انداز ہیں۔ ۱۔ خدا کی ذات و صفات پر اظہارِ رائے۔ ۲۔ قرآن کو مخلوق کہنا۔ ۳۔ اللہ کی قدرت پر بحث کرنا۔ ۴۔ اللہ کے پیغمبروں پر کلام کرنا۔ ۵۔ صحابہ کرام پر رائے زنی۔

الکلام فی البدعۃ علی خمس اوجہ الکلام فی اللہ و الکلام فی کلام اللہ والکلام

---

[1] ضمیمہ رسالہ اہلحدیث صفحہ ۲، صفحہ ۷، صفحہ ۸ [2] تاریخ ابوزرعۃ جلد ۱ صفحہ ۳۰۹

فی قدرۃ اللہ والکلام فی عبید اللہ والکلام فی اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم[1]

جب ان حضرات پر کلام کرنا خود بدعت ہے تو یہ خود بدعت کا موضوع کیسے ہوسکتے ہیں۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح لکھتے ہیں :۔

پس ہر چہ خلفائے راشدین بداں حکم کردہ باشند..... اطلاق بدعت برآں نتواں کرد۔[2]

ترجمہ: پس خلفائے راشدین نے جو جو احکام دیئے بدعت کا اطلاق ان میں سے کسی پر نہیں کیا جاسکتا۔

صحابہ کا باہمی اختلاف اصول کا نہیں فروع کا ہے۔ حق و باطل کا نہیں وسعتِ عمل کا ہے۔ ان میں سے جس کی بات چاہو لے لو لیکن دوسرے پر جرح نہ کرو نہ اسے باطل پر کہو۔ ان حضرات کے جملہ اعمال و افکار کسی نہ کسی جہت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی استناد رکھتے ہیں۔ حافظ ابن تیمیہ رح (۷۲۸ھ) نے ائمہ مجتہدین کے مختلف فیہ مسائل کو صحابہ کے اعمال سے سند بنایا ہے اور صحابہ کے اختلاف کو امت کی وسعتِ عمل ٹھہرایا ہے

حافظ ابن تیمیہ رح سنتِ جمعہ کی بحث میں ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

فان السلف فعلوا ھٰذا و ھٰذا و کان کلا الفعلین مشہورًا بینہم کانوا یصلون علی الجنازۃ بقرأۃ و بغیر قرأۃ کما کانوا یصلون تارۃ بالجہر بالبسملۃ وتارۃ بغیر جہر وتارۃ باستفتاح وتارۃ بغیر استفتاح وتارۃ برفع الیدین فی المواطن الثلٰثۃ وتارۃ بغیر رفع وتارۃ یسلمون تسلمتین وتارۃ تسلیمۃ واحدۃ وتارۃ یقرأون خلف الامام بالسر و تارۃ لا یقرأون..... کان فیہم من یفعل ھٰذا و فیہم من یعمل ھذا کل ھذا ثابت عن الصحابۃ۔[3]

ترجمہ: سلف صالحین نے اس طرح بھی کیا اور اُس طرح بھی کیا اور دونوں طریقے ان میں معروف تھے۔ نمازِ جنازہ میں کبھی قرأت کرتے کبھی نہ پڑھتے۔ نماز میں کبھی بسم اللہ بلند آواز سے پڑھتے اور کبھی اسے بغیر جہر پڑھتے۔ کبھی رکوع کو جاتے رکوع سے اُٹھتے اور نئی رکعت شروع کرتے رفع یدین کر لیتے اور کبھی ان تین مواقع میں رفع یدین نہ کرتے۔ کبھی دونوں طرف سلام پھیرتے اور کبھی ایک سلام پر ہی اکتفاء کر لیتے۔ کبھی امام کے پیچھے سری طور پر قرأت کر لیتے اور کبھی بالکل نہ پڑھتے..... ان میں ایسے حضرات تھے جو اس طرح کرتے اور ایسے بھی تھے جو اُس طرح کرتے اور ان میں سے ہر طریق کسی نہ کسی صحابی سے ضرور ثابت ہے۔

جن مؤرخین نے صحابہ پر جرح کی ہے یا ان سے ایسے اُمور نقل کیے ہیں جو ان پر موجب جرح ہیں

[1] التمہید لابی شکور صفحہ ۱۸۹ [2] اشعۃ اللمعات جلد ۱ صفحہ ۱۳۰ [3] فتاوی ابن تیمیہ جلد صہ الانصاف لرفع الاختلاف صفحہ ۱

انہوں نے انہیں قرآن و حدیث کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ حق یہ ہے کہ قرآن نے انہیں خیر امۃ کہا ہے اور وہ واقعی خیر امت تھے جرح ان کی طرف راہ نہیں پا سکتی اور ان سے کوئی بات خلاف شرع آ نہیں آسکتی۔ ابن اثیر الجزری (۶۳۰ھ) اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ صحابہ جرح سے بالا کیوں ہیں؟ لکھتے ہیں :۔

والصحابۃ یشارکون سائر الرواۃ فی جمیع ذٰلک الا فی الجرح والتعدیل فان کلہم عدول لا یتطرق الیہم الجرح لان اللہ عزوجل ورسولہ زکاھم وعدلاھم وذٰلک مشہور لا نحتاج لذکرہ۔[1]

ترجمہ: اور صحابہ دوسرے راویوں کے ساتھ ہر بات میں شریک ہیں مگر جرح و تعدیل میں وہ دوسروں کے درجے میں نہیں یہ سب کے سب عادل ہیں جرح ان کی طرف راہ نہیں پاتی کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پاک نے ان کا تزکیہ کر دیا ہے اور ان کی تعدیل کر دی ہے اور یہ بات اتنی روشن ہے کہ اس کے دُہرانے کی ضرورت نہیں۔

صحابہ کو قرآن و حدیث کے آئینہ میں دیکھنا اصل دین ہے اور انہیں تاریخ کے دریچہ سے جھانکنا یہ صرف انہی لوگوں کی راہ ہے جنہوں نے تاریخ کے کوچہ میں تحقیق کی گردپیمائی نہیں کی۔ یہ صحیح ہے کہ تاریخ کا معیار محدثین کا سا نہیں۔ لیکن تاریخ کی وہ روایات جو عقائد کی سرحدوں کو چھُوتی ہوں ان کی جانچ پڑتال واقعی اسی انداز پر ہوگی جس انداز پر محدثین اثباتِ دین میں چلے ہیں۔ اس پہلو سے صحابہ کی تاریخ اسلام کا وہ روشن باب ہے کہ آئندہ آنے والے مسلمان تاریخ کے ہر دور میں انہی ستاروں کی روشنی میں چلے ہیں۔

یہاں بے اختیار دل چاہتا ہے کہ مولانا ابو الکلام آزاد کے الفاظ میں حضرات صحابہ کرام کے ایمان و اخلاص کی ایک جھلک ہدیۂ قارئین کی جائے آپ لکھتے ہیں :۔

ہر شخص جو اُن کی زندگی کا مطالعہ کرے گا بے اختیار تصدیق کرے گا کہ انہوں نے راہِ حق کی مصیبتیں صرف جھیلی ہی نہیں بلکہ دل کی پُوری خوشحالی اور روح کے کامل سرور کے ساتھ اپنی زندگیاں ان میں بسر کر ڈالیں۔ ان میں جو لوگ اول دعوت میں ایمان لائے تھے ان پر شب و روز کی جانکاہیوں اور قربانیوں کے پُورے تیئس برس گزر گئے لیکن اس تمام مدت میں کہیں سے بھی یہ بات دکھائی نہیں دیتی کہ مصیبتوں کی کڑواہٹ ان کے چہروں پر کبھی کھُلی ہو۔ انہوں نے مال و علائق کی ہر قربانی اس جوش و مسرت کے ساتھ کی گویا

[1] اسد الغابہ جلد ۱ صفحہ ۲

دُنیا وجہان کی خوشیاں اور راحتیں ان کے لیے فراہم ہوگئی ہیں —— اور جان کی قربانیوں کا وقت آیا اس طرح خوشی خوشی گردنیں کٹوادیں گویا زندگی کی سب سے بڑی خوشی زندگی میں نہیں اس موت میں تھی۔[1]

تیرہ سو سال سے ایک یہودی لابی ان حضرات قدسی صفات (صحابہ کرام) کے خلاف مصروف جرح ہے اور یہ لوگ خود ان تاریخی روایات میں وارد ہیں جن کی رُو سے بعض سُنی کہلانے والے بھی آج صحابہ پر تنقید کرنے سے نہیں چوکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اخلاف New generations اسلاف کے خلاف سرکش ہو رہے ہیں اور قوم ماضی سے کٹ رہی ہے۔ مگر افسوس کہ یہ غلط تاریخی روایات ہمارا پیچھا ہی نہیں چھوڑتیں۔ افسوس یہ لوگ نہیں سوچتے کہ قرآن وحدیث کے بالمقابل وضعی اور بے سروپا روایات کسی درجہ میں قابل قبول نہیں ہوسکتیں۔

عبقات میں اسی وضع وجرح کے بکھرے کانٹوں کو اُٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ عبقات میٹھی خوشبوؤں Sweet flavours کو کہتے ہیں جو فضا کو تعفن سے پاک کریں۔ یہ کتاب عبقات تبرا کے تعفن کے خلاف تولا کی دلگداز صدا ہے جس سے اصحاب رسول کی عظمتوں کے گرد احقاق وتحقیق کا پہرہ دیا گیا ہے ہم نے اپنی بساط کے مطابق تقیہ وتبرا کے ظلمت کدہ میں حق وصداقت کے چراغ جلائے ہیں اور اللہ رب العزت سے اس دین کی وفا کے عہد باندھے ہیں جسے اللہ رب العزت نے صحابہ کی نسبت سے کامل کیا تھا اور وہی حضرات تکمیل دین کی بشارت سے نوازے گئے تھے۔ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی میں دین کی اضافت صریح طور پر صحابہ کی طرف ہے اور ان کا دین ہی اللہ رب العزت کی نعمت تھا۔ جو اُن پر تمام ہوئی۔

دین جب تک ان حضرات سے آئے گا اُن میں خیر رہے گی اور جب انہیں چھوڑ کر اس دور کے نئے نئے مجتہد پیشوا بنیں گے تو سمجھو کہ ملت کی تباہی کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ سیدنا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (۳۲ھ) کہتے ہیں :-

لایزال الناس صالحین متماسکین ما اتاہم العلم من اصحاب النبیؐ ومن اکابرہم فاذا اتاہم من اصاغرہم ھلکوا۔[2]

ترجمہ۔ جب تک علم اصحاب رسول سے اور ان کے اکابر سے آئے گا لوگ نیک اور اسلام پر قائم رہیں گے اور جب علم ان اصاغر سے اُبھرنے لگے جو اُوپر والوں سے علم نہیں لیتے۔

---

[1] ترجمان القرآن سورۃ التوبہ جلد ۲ صفحہ ۱۴۳ [2] المصنف لعبدالرزاق جلد ۱۱ صفحہ ۲۴۶

خود مسئلہ بنا لیتے ہیں تو یہ قوم کے لیے ہلاکت کی راہ ہے۔

باب الاستفسارات ہفت روزہ "دعوت" کا مقبول ترین کالم تھا یہ پھول وہیں سے چُنے گئے ہیں اور یہ انہیں کی خوشبو کی مہکیں ہیں جو ہدیۂ قارئین کی جا رہی ہیں۔

آپ کو اس میں کچھ سوالات قادیانیوں کے بارے میں بھی ملیں گے۔ قادیانیت کی تردید بھی دعوت کے مطامح میں تھی۔ ہم نے اسے بھی صحابہ کی خدمت سمجھتے ہوئے اس کتاب میں ساتھ رکھا ہے۔ قادیانیوں کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مرزا غلام احمد کا مرتبہ ہے۔ بلکہ وہ اسے حضور ختمی مرتبت کا ہی ظہور سمجھتے ہیں اور عقیدہ رکھتے ہیں کہ آپ کا یہ دوسرا ظہور پہلے سے زیادہ کامل تھا۔ ان کے کلمہ اسلام میں یہ دوسرا ظہور مراد ہوتا ہے جب وہ محمد رسول اللہ پڑھتے ہیں تو مرزا غلام احمد کو ساتھ رکھتے ہیں اس صورت میں یہ کلمہ اسلام نہیں کلمہ کفر بن جاتا ہے۔

نادان مسلمان ان لفظوں سے دھوکہ کھا جاتے ہیں وہ یہ نہیں جانتے کہ ان الفاظ سے مسلمان کیا مراد لیتے ہیں اور قادیانی کیا مراد لیتے ہیں۔ آج یہ جاننا ضروری ہے کہ اس سے کون کیا مراد لیتا ہے۔

نبوت کے اس اضافہ سے صحابہ دوسری صف میں نہ رہے تیسری صف میں چلے گئے۔ قادیانیوں کے ہاں حضورؐ کے بعد مرزا غلام احمد ہے۔ جب کہ مسلمانوں کے نزدیک حضورؐ کے بعد آپ کے صحابہ کرام ہیں۔ راہِ حق ماانا علیہ واصحابی میں حضور ختمی مرتبت کے بعد دوسرا درجہ صحابہ کا ہے اور علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین میں صریح طور پر ہم حضورؐ کے بعد انہی کے نقشِ پا پر چلنے کے پابند کئے گئے ہیں۔

یہ پس منظر ہے جس کے باعث مرزا غلام احمد نے صحابہ پر تنقید شروع کی۔ اس پہلو سے قادیانیت شیعیت کی ہی ایک شاخ ٹھہرتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مذکورہ بالا ارشاد مرزا غلام احمد کو صفِ اسلام سے خارج کرتا تھا تو مرزا غلام احمد نے آپ کے خلاف اس طرح دل کی بھڑاس نکالی اور ساتھ ہی حضرت امیر معاویہؓ پر دو دو ہاتھ جھاڑ دیئے۔ مرزا غلام احمد لکھتا ہے :-

حق بات یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ایک معمولی انسان تھا۔ نبی اور رسول تو نہیں تھا اس نے جوش میں آکر غلطی کھائی۔ . . . . حضرت معاویہؓ بھی صحابی تھے جنہوں نے خطا پر جم کر ہزاروں آدمیوں کے خون کرائے۔ اگر ابن مسعودؓ نے خطا کی تو کون سا غضب آگیا۔[1]

یہودی لابی کبھی یہ تسلیم کرسکتی ہے کہ یہودی دُنیا سے کبھی ناپید ہو جائیں گے؟ نہیں —— سیدنا حضرت ابوہریرہؓ کہیں یہ کہہ بیٹھے۔ اب ان کے خلاف مرزا غلام احمد کو پڑھیئے :-

---

[1] ازالہ اوہام قطع کبیر صفحہ ۲۲۱ قطع صغیر صفحہ ۵۹۶

ابوہریرہ کہتا ہے کہ یہود کا استیصال بکلی ہو جائے گا اور یہ سراسر مخالفت قرآن شریف ہے
جو شخص قرآن شریف پر ایمان لاتا ہے اس کو چاہیئے کہ ابوہریرہ کے قول کو ایک ردی
متاع کی طرح پھینک دے۔[1]

اور یہ بھی لکھا ہے:۔

بعض نادان صحابی جن کو درایت سے کچھ حصہ نہ ملا تھا وہ بھی اس عقیدہ سے بے خبر تھے
کہ کل انبیاء فوت ہو چکے ہیں۔[2]

صحابہ کی مخالفت کا باعث یہ ہے کہ وہ حیات مسیح کا عقیدہ کیوں رکھتے ہیں کیوں یہ بات نہیں مانتے کہ کل انبیاء فوت ہو چکے ہیں ہمیں اس وقت عقیدہ حیات مسیح سے بحث نہیں۔ یہاں صرف یہ بتلانا ہے کہ اثنا عشریوں کے بعد قادیانی ایسا گروہ ہیں جو برملا صحابہ پر تنقید کرتے ہیں۔ سو ضروری تھا کہ عبقات میں ان سے متعلقہ سوالات باقی رکھے جائیں۔ یہ جوابات دعوت میں بھی چھپتے رہے اور اب یہاں بھی یہ ہدیۂ قارئین ہیں۔

اہل بدعت بھی صحابہ کے مقام Status اور عام افراد امت کے مابین فرق نہیں کرتے۔ اپنی بدعات کو جواز مہیا کرنے کے لیے وہ صحابہ کے اجتہاد و استحسان کو دین میں اضافہ کرنے کی سند بناتے ہیں ان کے ایک مفتی کا اعلان ملاحظہ ہو:۔

خلفائے راشدین ائمہ مجتہدین نے بے شمار اضافے نہ صرف قبول کیے بلکہ ان کو فروغ دیا۔[3]

ائمہ مجتہدین نے تو اجتہاد کی راہ سے مسائل غیر منصوصہ کا حکم دریافت کیا۔ یہ شریعت میں اضافہ نہیں۔ دریافت ہے Invention نہیں Discovery ہے۔ استحسان بھی مجتہد کی سرپرستی میں چلتا ہے سو اجتہاد دین میں کوئی اضافہ نہیں۔ قرآن و حدیث کا ہی ایک پھیلاؤ ہے۔ لیکن اس سے یہ بات کیسے نکل آئی کہ مقلدین واعظین اور نعت خواں حضرات بھی نئے مسائل ترتیب دینے کا حق رکھتے ہیں اور وہ بھی اپنے دور کے مجتہد ہیں۔ مفتی مذکور کا یہ گمان غلط ہے۔

ہمیں اس سے بھی اس وقت بحث نہیں ہم یہاں صرف اس امر کا شکوہ کر رہے ہیں کہ مفتی صاحب نے خلفائے راشدین کے اختیار و اجتہاد کو دین میں اضافہ کیوں کہہ دیا۔ کیا یہ حدیث انہیں معلوم نہ تھی کہ میری اور خلفائے راشدین کی سنتوں کو اپنے اوپر لازم پکڑو۔ اس نص صریح کے ہوتے ہوئے کیا خلفائے راشدین کے عمل و طریق کو اپنے اضافے جاری کرنے کی سند بنایا جا سکتا ہے۔ مفتی صاحب کے اس فیصلے

---

[1] ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ ۵ ص ۲۳۵ [2] ایضاً ص ۱۲۰ [3] جاء الحق ص ــــ

کو اگر کچھ بھی اہمیت دی جائے تو صحابہ کو عام احادِ امت پر جو امتیاز حاصل ہے اس کا سراسر انکار ہو جاتا ہے۔ حضورؐ نے آسمانِ ہدایت کے ستارے انہی حضرات کو فرمایا ہے۔ مولویوں کا یہ مقام نہیں کہ ان میں سے ہر ایک خود ستارہ بن بیٹھے۔ اور بدعات ایجاد کرنے لگے۔

پھر مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ اسلام میں بے شمار اضافے ہوئے ہیں۔ اسلام کے روشن چہرے اور اس کے ایک مکمل ضابطہ حیات ہونے پر کیا کھلا حملہ نہیں۔ مفتی صاحب نے اپنی بدعات کو استناد مہیا کرنے کے لیے نہ اسلام پر کچھ رحم کھایا اور نہ خلفائے راشدین کے مقام کو پہچانا ـــــ سو ضرورت تھی کہ امت کی صحابہ سے مخلصانہ وابستگی کے لیے کچھ ان بھائیوں کی بھی اصلاح ساتھ ساتھ کی جائے۔ تاکہ وہ شوقِ بدعات میں کہیں تبرائیوں کے بھائی بھائی ہونے کا اعلان نہ کر دیں وہ ہمارے بھائی ہیں اور انہیں ہمارا بھائی ہی رہنا چاہیئے۔

ایک معذرت

بعض اوقات ایسا ہوا کہ ایک سوال مختلف حضرات سے مختلف پیرایوں میں آیا ہے ایسے موقعوں پر عام طریق یہ رہا کہ انہیں دعوت کے اس خاص پرچے کی نشاندہی کر دی جاتی جس میں اس کا جواب پہلے آ چکا ہو اور اگر سوال کچھ زیادہ تفصیل کا مقتضی ہوتا تو پھر نئے سرے سے اس کا جواب دعوت میں آ جاتا۔ لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ سوال تو مکرر آیا ہے جس کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے۔ مگر اس خاص پرچے کی تاریخ یاد نہیں آ رہی۔ ایسی صورتوں میں ان سوالات کا جواب پھر نئے سرے سے دیا گیا۔ قارئین اگر کسی جگہ تکرار پائیں تو اسے اس صورتِ عمل پر محمول کریں۔ بایں ہمہ آپ اس تکرار جواب میں کچھ نہ کچھ زیادتی بھی پائیں گے اور انشاء اللہ العزیز اس میں بوریت نہ ہوگی۔

ایک گذارش

عبقات میں استفسارات کے جو جوابات دیئے گئے ہیں ان میں کسی فرد یا طبقے کی دل آزاری مقصود نہیں۔ افہام و تفہیم سے حق دلوں میں اتارنے کی طالب علمانہ سعی ہے۔ ایک مخلصانہ صدا ہے اور قوم کو ایک مرکز نبوت کے گرد جمع کرنے اور جوڑنے کی ایک کوشش ہے۔

من کجا نغمہ کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

اصحاب رسول کے گرد بکھیرے گئے کانٹوں کو جب تک ایک ایک کر کے نہ چنیں ہم کبھی قمر رسالت

کے ہالہ تلے نہیں آسکتے۔ آسمانِ ہدایت کے یہی ستارے ہیں اور دنیائے اسلام میں قوموں نے انہی کی روشنی میں چلنا ہے۔ اللہ رب العزت ہمیں ان کے نقش پا پر چلائے اور سعادت اُخروی سے نوازے۔ وماذٰلک علی اللہ بعزیز۔

صحابہؓ کی پیروی میں یہ نہ دیکھا جائے کہ وہ سابقین اولین میں سے ہی ہوں۔ بہارِ نبوت کے جو پھول آخر میں کھلے وہ بھی اسی گلستانِ نبوت کے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا وعدۂ جنت دونوں سے ہے:۔

لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل ط اولئک اعظم درجة من الذین انفقوا من بعد وقاتلوا وکلا وعد اللہ الحسنیٰ۔ (پ۲۷ الحدید آیت ۱۰)

ترجمہ: تم میں برابر نہیں وہ جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے خرچ کیا اور جہاد کیا۔ وہ مرتبہ میں ان سے بڑے ہیں جنہوں نے فتح مکہ کے بعد خرچ کیا اور جہاد کیا اور جنت کا وعدہ اللہ کا ان دونوں سے ہے۔

سابقین اولین اور فتح مکہ کے بعد ایمان لانے والے دونوں شرفِ صحابیت رکھتے ہیں۔ جو طبقہ ان کے پیچھے چلا وہ تابعین کہلایا۔ یہ حضرات تابعین اسی لیے بنے کہ صحابہ سب کے سب متبوعین ہیں اور امت کے ذمہ ہے کہ ان کے نقشِ پا سے زندگی کی راہیں روشن کرے۔

نبوت اور صحابیت کے درمیان صرف دیکھنا شرط ہے اتباع ضروری نہیں۔ جس نے ایمان سے آپ کے جمالِ جہاں آرا کو دیکھا صحابیت پاگیا لیکن اگلوں کے لیے صرف دیکھنا کافی نہیں اتباع بھی لازم ہے۔ لفظ تابعین اس پر لغوی طور پر دلالت کرتا ہے۔ سو جن لوگوں نے صحابہؓ کو دیکھا مگر ان کی راہ پر نہ چلے وہ ہرگز تابعین میں سے نہیں ہیں۔ اس طرح عام افرادِ امت جو اصحاب رسول کو قبلہ اقوام نہ جانیں راہ حق کے مسافر نہیں بن سکتے۔ اللہ رب العزت ہم سب کو ان کے قدموں میں جگہ دے جنہیں حضورؐ کی اتباع طبعاً حاصل ہو چکی تھی۔

خالد محمود عفا اللہ عنہ

نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم ط

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

سوال: بخدمت حضرت علامہ خالد محمود صاحب دامت برکاتہ، السلام علیکم

ہفت روزہ دعوت کے رسول کریم نمبر میں ایک حدیث لکھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اور ابوبکرؓ اور عمرؓ ایک ہی مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں۔ ایک دوست نے پوچھا ہے کہ یہ حدیث کہاں ہے وہ یہ بھی کہتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نور تھے تو پھر مٹی سے پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ اس کی تفصیل فرمائیں؟

عبدالصمد نور بازار خانیوال

جواب: آپ کے جس دوست نے یہ سوال اُٹھایا ہے وہ غالباً سبائی ہوگا۔ حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے ایک ہی مٹی سے پیدا ہونے اور پھر ایک ہی مٹی میں دفن ہونے کا بیان ہے اور ظاہر ہے کہ اس میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی وہ فضیلت نکلتی ہے کہ اس میں ان کا کوئی سہیم اور برابر نہیں۔ آپ کے دوست کو اصل میں تو اس حقیقت کا انکشاف پسند نہ ہوگا کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کس مٹی سے بنے تھے اور ظاہر میں اس نے نور و بشر کا سہارا لے لیا ہوگا۔

خطیب بغدادی (۴۶۲ھ) نے کتاب المتفق والمفترق میں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت کی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:۔

ما من مولود الا وفی سرته من تربته التی خلق منها حتی یدفن فیها وانا وابوبکرؓ وعمرؓ خلقنا من تربة واحدة وفیها ندفن۔

ترجمہ: "ہر بچہ کے ناف میں اس مٹی کا حصہ ہوتا ہے جس سے وہ بنایا گیا۔ یہاں تک کہ اس میں دفن ہو جائے اور میں اور ابوبکرؓ اور عمرؓ ایک ہی مٹی سے بنے ہیں اور اسی میں دفن ہوں گے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو نور کہا جاتا ہے وہ باعتبارِ صفات اور باعتبارِ رشد و ہدایت کے ہے نور کیا آپؐ تو منیر تھے یعنی دوسروں کو نور بنانے والے۔ جس آفتابِ رشد و ہدایت نے لاتعداد دلوں کو نورِ ایمان سے منور کر دیا اس کے اپنے نور ہونے میں کیسے کلام ہو سکتا ہے۔ ہاں ذات کے لحاظ سے اور نوع کے اعتبار سے آپؐ یقیناً انسان تھے اور نوعِ بشر میں سے تھے۔ امام ربانی سیدنا مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ سرہند شریف والے ارشاد فرماتے ہیں:۔

اے برادر! محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باآں علو شان بشر بود۔[1]

ترجمہ "اے بھائی! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر بلند شان کے باوجود بشر تھے۔"

مقام غور: اس حدیث سے حضورؐ کا اور حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کا ایک ہی خمیر سے پیدا ہونا اور اپنی ذات میں ایک ہونا از خود واضح ہو جاتا ہے۔ آپ کے دوست بے شک حضورؐ کو نور کہیں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ اس کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو بھی نور ہی مانیں خواہ اپنے اپنے درجہ کے ــــ اور یاد رکھیے کہ ایسے نور کا دعوے جس میں بشریت کا انکار ہو یہ اہل سنت کے اپنے گھر کی آواز نہیں۔ بلکہ غیروں نے حضرت ابوبکرؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے الگ کرنے کے لیے ان مسئلوں کو ہوا دے رکھی ہے۔ تاکہ وہ پھر یہ نتیجہ پیدا کر سکیں کہ "جب حضورؐ نور تھے تو پھر ان کا جانشین بشر کیسے ہو سکتا ہے۔ پھر تو ان کا جانشین یطہرکم تطھیرا کا مصداق "نورانی وجود مسعود" ہی ہونا چاہیئے۔"

ہفت روزہ "دعوت" کا مسلک یہی ہے کہ ہر وہ کوشش جو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا کرے وہ غلط ہے اور نوعِ بشریت میں یہ تینوں ہستیاں برابر کی شریک ہیں۔ تفاضل اپنی اپنی صفاتِ کاملہ کے اعتبار سے قائم ہے۔ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں:۔

"بدانکہ بینی کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات با عامہ در نفس انسانیت برابر اند و در حقیقت و ذات ہمہ متحد تفاضل باعتبار صفات کاملہ آمدہ است۔"[2]

پھر یہ بھی یاد رکھیے کہ اس مسئلہ میں اہل سنت کے مختلف مکاتبِ فکر میں کوئی اختلاف نہیں۔ مفتی نعیم الدین صاحب مراد آبادی بریلوی مکتبِ فکر کے مسلّم بزرگ اور پیشوا ہیں۔ وہ کتاب العقائد میں تصریح فرماتے ہیں:۔

"انبیاء وہ بشر ہیں جن کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہے۔"[3]

اور پھر آپ نے ہفت روزہ "دعوت" کے رسول کریمؐ نمبر کے حوالہ سے جو حدیث پوچھی ہے۔ کہ حضورؐ اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ ایک ہی مٹی سے پیدا کیے گئے وہ حدیث خود مولوی احمد رضا خاں صاحب نے بھی اپنے فتاویٰ افریقہ میں نقل کی ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ امام حدیث حکیم ترمذی کی نوادر الاصول سے یہ الفاظ بھی نقل کیے ہیں:۔

ویاخذ التراب الذی یدفن فی بقعتہ ویعجن بہ نطفتہ فذلک قولہ تعالیٰ منھا خلقناکم وفیھا نعیدکم۔[4]

---

[1] دفتر اول نمبر ۱۷۳، ص ۱۷۱ [2] مکتوبات شریف جلد ۱ ص ۳۲۹ [3] کتاب العقائد نبوت کا بیان ص ۶ طبع دہم ۱۳۵۳ھ
[4] فتاوے افریقہ ص ۸۵

ترجمہ "فرشتہ وہاں کی مٹی لیتا ہے جہاں اسے دفن ہونا ہوتا ہے اسے نطفہ میں ملا کر گوندھتا ہے یہ ہے مولیٰ تعالیٰ کا ارشاد کہ زمین ہی سے ہم نے تمہیں بنایا اور اسی میں پھر تمہیں ہم لے جائیں گے۔"

مسند عبد بن حمید میں عطائے خراسانی سے روایت ہے کہ فرمایا:۔

ان الملک ینطلق ویاخذ من تراب المکان الذی یدفن فیہ فیذرہ علی النطفۃ فیخلق من التراب ومن النطفۃ وذٰلک قولہ تعالیٰ منھا خلقناکم وفیھا نعیدکم۔

ترجمہ "فرشتہ جا کر اس جگہ کی مٹی لا کر اس نطفہ پہ چھڑکتا ہے تو آدمی اس مٹی اور بوند سے بنتا ہے اور یہ ہی ہے مولا تعالیٰ کا ارشاد کہ ہم نے تمہیں زمین سے ہی بنایا اور اسی میں تمہیں پھر لیجائیں گے۔"

شیعہ کے مشہور مقتدا و پیشوا مولوی مقبول احمد دہلوی اپنے ترجمہ قرآن کے حاشیہ پر ائمہ اہلبیت سے بھی اس آیت شریفہ کی تفسیر اسی طرح نقل کرتے ہیں:۔

"کافی میں جناب امام جعفر صادق سے منقول ہے کہ نطفہ جب رحم میں پہنچ جاتا ہے تو خدا تعالیٰ ایک فرشتے کو بھیج دیتا ہے کہ وہ اس مٹی میں سے جس میں یہ شخص دفن ہونے والا ہے تھوڑی سی لے آئے۔ چنانچہ وہ فرشتہ لا کر اس نطفہ میں ملا دیتا ہے اور اس شخص کا دل ہمیشہ اسی مٹی کی طرف مائل ہوتا رہتا ہے جب تک کہ اس میں دفن نہ ہو جائے۔"[1] (ص ۶۲۷ پ ۱۲)

پس اس یقین سے چارہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا خمیر طیب ایک ہی پاک مٹی سے اٹھایا گیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ حضرت عمرؓ اس وقت ایمان لائے جب ۳۹ افراد ایمان لا چکے تھے چالیسویں آپ تھے۔ صفِ اسلام کا پہلا حلقہ آپؓ پر پورا ہوا۔ لیکن اس کی حیثیت بالکل اسی طرح ہے۔ کہ سونے پر گرد پڑی ہو اور اس کی چمک دکھائی نہ دے۔ کسی کامل نے پھونک لگائی اور وہ گرد اڑ گئی سونا اپنی چمک سے دمک اٹھا۔ سو آپ کا دیر میں اسلام لانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ سے یک خمیر ہونے کے منافی نہیں۔ آپ جس خاندان سے تھے وہ عہدِ جاہلیت میں بھی شرک سے طبعاً متنفر تھا۔ ممکن ہے اس کی وجہ بھی یہی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: شیعہ کے ہاں بارہ امام جو مامور من اللہ سمجھے جاتے ہیں کون کون ہیں؟ ان کے سن ہائے وفات، زندگی اور اسماء و کنیٰ سے مطلع فرمائیں؟ یہ بھی بتلائیں کہ ان میں سے کون کون حکمران ہوئے؟

نیز یہ بھی بتلائیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا تھا کہ اس امت میں بارہ امیر ہوں گے کہ ان کے عہد میں قلعہ اسلام مضبوط رہے گا اور ان کے وقت میں سب مسلمان ایک جھنڈے تلے ہوں گے۔ کیا شیعہ کے یہ بارہ امام اس حدیث کا مصداق بن سکتے ہیں؟

سائل۔ عبدالحق سنت نگر لاہور

الجواب: اثنا عشری شیعہ ان حضرات کو مامور من اللہ امام سمجھتے ہیں:۔

①	حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ	کنیت ابو الحسن	وفات ۴۰ھ	عمر ۶۳ سال	دفن نجف اشرف
②	حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ	کنیت ابو محمد	وفات ۴۹ھ	عمر ۴۷ سال	دفن مدینہ منورہ
③	حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ	کنیت ابو عبداللہ	وفات ۶۱ھ	عمر ۵۷ سال	کربلا، سر بدمشق
④	حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ	کنیت ابو محمد	وفات ۹۵ھ	عمر ۵۷ سال	دفن مدینہ منورہ
⑤	حضرت امام باقر رضی اللہ عنہ	کنیت ابو جعفر	وفات ۱۱۴ھ	عمر ۵۷ سال	دفن مدینہ منورہ
⑥	امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ	کنیت ابو عبداللہ	وفات ۱۴۷ھ	عمر ۶۵ سال	دفن مدینہ منورہ

یہاں تک اسماعیلی شیعہ بھی اثنا عشریوں کے ساتھ ہیں۔ اسماعیلی فرقے کے ہاں ساتویں امام حضرت امام جعفر صادق کے بڑے بیٹے اسماعیل ہیں اور اثنا عشریوں کے ہاں امام جعفر کے دوسرے بیٹے موسیٰ کاظم۔ آغاخاں اسی اسماعیل مذکور کی اولاد میں سے ہے۔ یہ امام حاضر کے قائل ہیں اور اثنا عشری امام غائب کے معتقد ہیں۔

⑦	امام موسیٰ کاظم	کنیت ابو محمد	وفات ۱۸۳ھ	عمر ۵۵ سال	دفن بغداد
⑧	امام علی رضا	کنیت ابو الحسن	وفات ۲۰۳ھ	عمر ۵۵ سال	دفن طوس
⑨	امام جواد (تقی)	کنیت ابو جعفر	وفات ۲۲۰ھ	عمر ۲۵ سال	دفن بغداد
⑩	امام ہادی (نقی)	کنیت ابو الحسن	وفات ۲۵۴ھ	عمر ۴۲ سال	دفن ایران
⑪	امام حسن عسکری	کنیت ابو محمد	وفات ۲۶۰ھ	عمر ۲۸ سال	سر من رای
⑫	امام مہدی		ولادت ۲۵۶ھ	عمر سینکڑوں سال	غار سر من رای میں زندہ موجود

ہیں انہیں امام منتظر اور قائم آل محمد بھی کہتے ہیں۔

نوٹ: پہلے ساتویں آٹھویں اور دسویں امام کی کنیت ابو الحسن ہے۔
دوسرے چوتھے ساتویں اور گیارہویں امام کی کنیت ابو محمد ہے۔
تیسرے اور چھٹے امام کی کنیت ابو عبداللہ ہے۔
پانچویں اور گیارہویں امام کی کنیت ابو جعفر ہے۔ نویں امام کی بھی۔

جواب جز ۲: ان میں خلیفہ اور حکمران مندرجہ ذیل تین ہوئے باقی کو زیر حکومت یا امارت کا ایک دن بھی نہیں آیا۔

۱	حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ	چھ سال کے قریب خلیفہ رہے۔
۲	حضرت حسن رضی اللہ عنہ	چھ ماہ کے قریب خلیفہ رہے اور پھر آپ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں دستبردار ہو گئے۔
۳	امام مہدی	قیامت کے قریب خلیفہ ہوں گے مگر معلوم نہیں کس کے جانشین ہوں گے۔

جواب جز ۳: یہ بارہ حضرات بارہ امیر والی روایت کا مصداق نہیں۔ حدیث کا مصداق بارہ خلفاء ہیں جو حکمران ہوں گے، امیر ہوں گے، خلیفہ ہوں گے اور ان بارہ میں صرف تین حکومت والے ہیں اور بارہ خلفاء میں سے ہر ایک پر پوری قوم کا اتفاق ہوگا اور ظاہر ہے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ پر پوری قوم کا اتفاق نہ تھا —— ہاں آپ کے خلافت سے دستبردار ہونے سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر پوری امت کا اتفاق ہو گیا تھا۔ سو آپ اس بارہ امام والی روایت کے یقیناً ایک رکن ہیں۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

سوال

۱۔ اگر یہ بارہ حضرات جنہیں اثنا عشری شیعہ مامور من اللہ امام سمجھتے ہیں۔ اس بارہ خلفاء والی حدیث کا مصداق نہیں تو انہیں امام کیوں کہا جاتا ہے؟

۲۔ علمی مسائل میں کتابوں میں جو لفظ حسن آتا ہے جیسے قال الحسن یا عن الحسن اس سے کون سے امام مراد ہوتے ہیں۔ کیا یہ حسن بن علی ہیں؟ یا کوئی اور حسن ہیں؟

۳۔ واقعہ کربلا کے بعد حضرت علی بن الحسین زین العابدین کا سیاسی کردار کیا رہا ہے؟ کیا یہ صحیح ہے کہ آپ نے یزید کی حکمرانی تسلیم کر لی تھی؟

الجواب: ۱۔ یہ بارہ حضرات نہ بارہ خلفاء والی روایت کا مصداق ہیں نہ مامور من اللہ امام —— لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ باغ نبوت کے خوشبو دار پھول تھے مُرجھائے ہوئے نہیں علم و عمل اور اخلاق و مروت میں ان سے خانوادۂ نبوت کی خوشبو آتی تھی۔ علم و تقویٰ میں انہیں امام کہنا یہ شیعہ اصطلاح سے ہرگز موافقت نہیں ہے اور ہمارے بزرگوں میں سے حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے امام جعفر صادق وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

امام زین العابدین کا حدیث میں کیا مرتبہ تھا؟ کان ثقۃ مامونا کثیر الحدیث[1] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد[2] تھے اور امام زہری کے استاد۔ فقہ میں کیا مرتبہ تھا؟ مدینہ کے سات مشہور فقہاء کے بعد آپ ہی کا نام آتا ہے[3]۔ کثرت عبادت کی وجہ سے زین العابدین کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں[4]۔ آپ کے وقت میں بنو ہاشم میں آپ سے آگے کوئی اور نہ تھا[5]۔ اس تعارف میں آپ کو امام کہنا یہ کوئی بڑی غلطی نہیں ہے۔ ذرا وسعت قلبی سے کام لیجئے۔

حضرت امام باقر کا نام تو محمد تھا لیکن علمی گہرائی نے انہیں باقر کا لقب دے رکھا تھا۔ عرب کہتے ہیں

---

۱ طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۱۶۴ ۲ تہذیب جلد ۷ ص ۳۰۴ ۳ اعلام الموقعین لابن القیم جلد ۱ ص ۲۲ ۴ تہذیب جلد ۷ ص ۳۰۶
۵ تہذیب الاسماء للنووی جلد ۱ ص ۲۴۳

بقر العلم (وہ علم کو پھاڑ کر اس کی تہہ میں پہنچ گیا) امام نووی انہیں امام بارع (ماہر فن امام) کہتے ہیں[1] اور مدینہ کے فقہا میں سے شمار کرتے ہیں۔ امام نسائی کی جلالتِ قدر سے کسے اختلاف ہے۔ وہ آپ کو فقہاء تابعین میں ذکر کرتے ہیں۔ ان حالات میں آپ کو امام کہنا یہ کوئی بڑی غلطی نہیں ہے۔

حضرت امام جعفر صادق کو کیا علامہ ذہبی نے امام اور احد السادۃ الاعلام[2] نہیں لکھا؛ ابن سعد نے کیا آپ کو کثیر الحدیث نہیں لکھا[3]؛ کیا امام مالک اور امام ابو حنیفہ نے آپ کی جلالتِ علم کا اعتراف نہیں کیا[4]؟ امام ربانی مجدد الف ثانی نے کیا آپ کو امام نہیں لکھا[5]؟ اگر آپ کو علم، حلم اور زہد و تقوے میں امام کہا جائے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کون سی بڑی غلطی ہے۔ جن حلقوں میں امام زفر، امام حسن بن زیاد، امام غزالی اور امام رازی اور امام ابن الہمام اور امام ابن نجیم، امام شاہ ولی اللہ اور امام مولانا محمد قاسم نانوتوی کے اطلاقات عام ہوں وہاں ان بزرگوں کے نام کے ساتھ امام لکھنے سے شیعہ اصطلاح سے توافق کا ابہام پیدا ہو گا یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔

۲۔ علمی کتابوں میں جہاں لفظ حسن آتا ہے وہاں عام طور پر امام حسن بصری (م ۱۱۰ھ) مراد ہوتے ہیں صحابیِ رسول ہونے کی شان کو اگر ایک طرف رکھیں تو تفسیر حدیث اور فقہ میں آپ کی خدمات حضرت حسن بن علیؓ سے کہیں زیادہ ہیں۔ ہاں حضرت حسن بن علیؓ نے مسلمانوں کے جھنڈے کو پھر سے ایک کرنے کی جو عظیم قومی اور ملی خدمت انجام دی اس کا مقابلہ ہفت اقلیم نہیں کر سکتے ——— فقہ حنفی کی کتابوں میں جہاں قال الحسن آجائے تو اس سے حضرت امام ابو حنیفہ کے شاگرد حسن بن زیاد مراد ہوتے ہیں۔

۳۔ واقعہ کربلا کے بعد حضرت امام زین العابدین نے یزید کی حکومت کو تسلیم کر لیا تھا[6]۔ یہ اسی درجے میں تسلیم کرنا تھا جس طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے یزید کی حکومت تسلیم کی تھی کہ مزید خونریزی نہ ہو اور عوام خطرے میں نہ پڑیں۔ یہ نہیں کہ یہ دونوں حضرات یزید سے خوش تھے۔

امام زین العابدین اپنے اس سیاسی موقف پر ثابت قدمی سے قائم رہے۔ یزید کے خلاف نواسۂ صدیق حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اٹھے اور اہل حجاز نے انہیں خلیفہ مان لیا اور اموی حکام کو حرمین شریفین سے نکال دیا گیا تو امام زین العابدین ان مجاہدین کے ساتھ قطعاً شامل نہ ہوئے اور حکومت سے وفا کا جو عہد باندھا تھا اس پر برابر قائم رہے۔ مدینہ میں یزید کے فوجی جنرل مسلم بن عقبہ نے ان سے ملاقات کی اور آپ کا بہت شکریہ ادا کیا۔

---

[1] تہذیب الاسماء جلد ۱ ص۸۷ [2] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص۱۴۹ [3] نقلہ ابن حجر فی التہذیب جلد ۲ ص۱۰۴ [4] ایضاً [5] مکتوب نمبر ... [6] فروع کافی جلد ۳ ص۱۱۱ کتاب الروضہ طبع لکھنؤ

پھر مختار بن ابی عبید ثقفی واقعہ کربلا کا بدلہ لینے کے لیے یزید کے خلاف اٹھا لیکن آپ نے اس کا قطعاً ساتھ نہ دیا۔ پھر آپ نے مسجد نبوی میں جا کر اس کے خلاف تقریر کی۔ آپ کو علم تھا کہ سینکڑوں کذاب اور منافق حضرت حسینؓ کی عزاداری میں اٹھیں گے اور ان میں سے کوئی مخلص اور صادق العمل نہ ہو گا۔ عبدالملک بن مروان نے جب خلافت سنبھالی تو آپ نے اس سے بھی صلح کر لی اور ان لوگوں سے کلیتہً احتراز کیا جو حبِ اہل بیت کے نام سے امت میں تفریق و انتشار پیدا کرنا چاہتے تھے۔

سو آپ کا یزید کی حکومت کو تسلیم کرنا ان حالات میں آپ کا فقہی فیصلہ تھا۔ یہ نہیں کہ آپ اس وقت یزید کے سیاسی کردار سے خوش تھے۔ یا یہ کہ آپ اپنے باپ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سیاسی کردار کو غلط سمجھتے تھے۔ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ واللہ اعلم بالصواب

کتبہ۔ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: پچھلے سوال کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ ائمہ اہل بیت جیسے امام زین العابدین، امام باقر، امام جعفر صادق اور امام موسیٰ کاظم یہ سب اہل سنت تھے۔ شیعوں نے ان پر غلط طور پر شیعیت کی چھاپ لگا رکھی ہے۔ اگر بات اسی طرح ہے تو یہ حضرات پھر ہمارے دوسرے ائمہ و محدثین سے دور کیوں رہے؟ آپس میں کیوں ملتے جلتے نہ تھے؟

جواب: یہ صحیح نہیں کہ یہ حضرات ہمارے دوسرے ائمہ سے کنارہ کش تھے۔ ان کی روایات ہماری حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں اور یقیناً موجود ہیں۔ اگر کم ہیں تو کیا حضرت عثمانؓ سے، حضرت زبیرؓ سے اتنی روایات ہیں جتنی حضرت ابو ہریرہؓ سے ملتی ہیں تو کیا اسے حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ سے دوری اور بعد پر محمول کیا جائے گا۔ نہیں بات اس طرح نہیں ہے۔

البتہ شیعوں نے انہیں ہمارے دوسرے اکابر ائمہ سے دور کر رکھا ہے۔ مگر دروغ گو را حافظہ نباشد۔ پھر بھی یہ اپنی کتابوں میں کہیں کہیں ان کا ملنا ذکر کرتے ہیں ——— ایسی چند روایات بھی ان کی کتابوں سے مل جائیں تو اندر کی صورتِ حال کا صاف پتہ مل جاتا ہے۔ اب آیئے قدماء شیعہ سے اپنے اس مؤقف کی تائید حاصل کریں۔

بغداد کی جامع مسجد میں خطیب کون ہوتا ہو گا؟ یہ آپ اندازہ کریں ——— اہل السنۃ والجماعۃ ——— کیا وہاں یہ حضراتِ اہل بیت جمعہ پڑھنے نہ جاتے تھے یا نہ جاتے ہوں گے؟ اگر جاتے تھے اور ان ائمہ کے ساتھ ان کے پیچھے نماز پڑھتے تھے تو کیا یہ سب ایک نہ تھے؟ ملا محمد بن یعقوب کلینی (۳۲۹ھ) نے امام علی رضا کا جامع مسجد میں جمعہ کے لیے جانا اور آپ کا وہاں جمعہ پڑھنا الکافی جلد ص۱۹۸ میں صاف لکھا ہے۔ امام باقر اور

امام ابوحنیفہ رح کی ملاقات الکافی جلد ۱ ص۵۸ جلد ۲ ص۲۸۵ میں دیکھئے۔ امام ابویوسف (۱۸۲ھ) اور امام موسیٰ کاظم (۱۸۳ھ) کی ملاقات کا تذکرہ الکافی جلد ۴ ص۳۵۲ پر موجود ہے۔ امام باقر امام ابوحنیفہ کو وقت کے علماء میں شمار کرتے ہیں۔ اسے الکافی جلد ۸ ص۲۹۲ پر ملاحظہ کیجئے۔ امام قتادہ (۱۱۸ھ) اور امام جعفر صادق (۱۴۸ھ) کے اکٹھے طواف کرنے کا ذکر الکافی جلد ۴ ص۴۰۴ پر موجود ہے۔ پھر ان کا ذکر ص۵۲۱ پر بھی دیکھئے۔ امام نافع (۱۱۷ھ) اور امام باقر کے ملنے کا ذکر الکافی جلد ۸ ص۱۲۱، ص۳۵۱ پر موجود ہے۔

امام ابوحنیفہ کا ذکر اس کتاب کی جلد ۲ ص۲۲۳ جلد ۳ ص۱۶، ص۹۲، ص۲۹۷ جلد ۴ ص۲۵۹، ص۵۴۶ جلد ۵ ص۴۴۹ جلد ۷، ص۶۳ ص۱۳۷ ص۴۰۴ جلد ۸ ص۲۹۲ پر مسلسل دیکھتے جائیے۔ امام ابویوسف کا ذکر آپ کو اس کتاب کی جلد ۵ ص۳۸۷ جلد ۷، ص۶۱، ص۴۰۴ اور جلد ۱ ص۹۵ پر ملے گا۔ امام ابوحنیفہ نے امام جعفر صادق سے روایت لی ہے۔ اسے الکافی جلد ۴ ص۵۴۶ جلد ۷ ص۱۰۴ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

یہ چند اشارے احقر نے ذکر دیئے ہیں ورنہ اس کی تائیدات کے لیے ایک پورا دفتر درکار ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ سب حضرات اہل السنۃ والجماعۃ تھے اور ان کے باہمی اس طرح کے تعلقات تھے جو ایک پیغمبر کے مختلف امتیوں میں ہونے چاہئیں۔

ہاں اس بات میں شک نہیں کہ ان ائمہ اہلِ بیت کے گرد اس قدر منافقین اور اسلامی لباس پہننے والے یہود و مجوس جمع رہے کہ ان حضرات کی صحیح روایات اور تعلیمات بہت کم آگے پہنچیں۔ سو اس لحاظ سے یہ حضرات مظلوم ہیں اور انتہائی مظلوم کہ ان کے نام پر ایک پورا مذہب وضع کر لیا گیا ہے ـــــ ان کے گرد جمع ہونے والے اصل رواتِ حدیث ان کو امام مامور من اللہ نہ سمجھتے تھے اور جس طرح وہ امام مالک اور امام احمد کے گرد طلب حدیث میں پہنچتے۔ اسی طرح وہ ان حضرات سے بھی روایت لیتے اور علمی استفادہ کرتے۔ البتہ ان حضرات سے روایت لینے میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ تاکہ ان کے نام پر تیار کیا ہوا وضعی مذہب اسلام کی جگہ نہ پا سکے، نہ اسے اس مقدس نام سے چلایا جا سکے۔

سوال: شیعہ علماء نے ائمہ اہلبیت کے نام سے جو مذہب وضع کیا ہے۔ بتایا جائے کہ انہوں نے یہ کام ائمہ کرام کے کتنا عرصہ بعد شروع کیا؟ سائل: عبداللہ از بھکر

جواب: ائمہ اہل بیت پر جھوٹ ان کی زندگی میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ حضرت علیؓ پر ان کے سامنے جھوٹ باندھا گیا۔ عبداللہ بن سبا نے انہیں خدا کہنا شروع کر دیا تھا۔ پھر آپ کے بعد آپ پر اس قدر جھوٹ باندھے گئے کہ العیاذ باللہ۔

ابو اسحٰق کہتے ہیں:-

لما احدثوا تلك الاشياء بعد علی قال رجل من اصحاب علی قاتلهم الله ای علم افسدوا۔[1]

ترجمہ۔ جب انہوں نے یہ باتیں حضرت علی کے بعد گھڑ لیں تو حضرت علیؓ کے شاگردوں میں سے ایک نے کہا۔ کتنے قیمتی علم کو ان لوگوں نے برباد کر ڈالا ہے۔

شیعہ کے مشہور ماہر رجال علامہ مامقانی امام جعفر صادق سے نقل کرتے ہیں:۔

ان المغیرة بن سعید دس فی کتب اصحاب ابی احادیث لم یحدث بها ابی۔[2]

ترجمہ۔ مغیرہ بن سعید نے میرے باپ (امام باقر) کے کتابوں کی کتابوں میں بہت سی وہ روایات داخل کر دی ہیں جو میرے باپ نے ہرگز بیان نہ کی تھیں۔

اصول کافی سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ائمہ پر جھوٹ ان کی زندگی میں ہی شروع ہو گیا تھا۔[3]

سوال: شیعہ حدیث ثقلین کو کتاب اللہ و عترتی سے بیان کرتے ہیں اور اہل سنت، کتاب اللہ وسنتی بتلاتے ہیں۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ شیعہ آنحضرتؐ کی سنت کو دین کا ماخذ نہیں سمجھتے اور اس کی بجائے وہ امامت کا عقیدہ رکھتے ہیں؟

جواب: شیعہ حجیتِ حدیث کے منکر نہیں ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ انہوں نے کتبِ حدیث اور مرتب کر رکھی ہیں۔ ان کا قرآن بھی ہم سے مختلف ہے۔ کتب حدیث بھی ہم سے جدا ہیں اور ان کا اہل بیت کا تصور بھی ہم سے جدا ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ یہ لوگ حجیتِ حدیث کا انکار نہیں کرتے۔ شریف رضی نقل کرتا ہے کہ حضرت علی مرتضیٰؓ فرماتے ہیں:۔

واستنوا بسنته فانها اهدی السنن۔[4]

ترجمہ "حضورؐ کی سنت کو عمل میں لاؤ۔ یہ بے شک سب سے بہتر راہ ہے"۔

حضورؐ نے فرمایا: لاعذر لكم فی ترك سنتی۔[5]

ترجمہ "میری سنت چھوڑنے کی تمہارے لیے کوئی راہ نہیں ہے"۔

پھر فرمایا: من ترك كتاب الله وقول نبيه كفر۔[6]

اور یہ بھی فرمایا: من خالف كتاب الله وسنة محمدٍ كفر۔[7]

علیكم بآثار رسول الله وسنته۔[8]

---

[1] مقدمہ صحیح مسلم ص۱۰ [2] رجال مامقانی جلد ۱ ص۱۷۴ [3] دیکھئے جلد ۱ ص۲۳۲ المدخل فی علم الحدیث ص۲۶ [4] نہج البلاغۃ جلد ۱ ص۲۰۷ [5] معانی الاخبار ص۱۵۷ [6] الکافی جلد ۱ ص۵۶ [7] ایضاً ص۷۰ [8] الکافی جلد ۸ ص۸

یارب، انا اخذنا بکتابك وسنة نبيك[1] ـــــ کتاب الله وسنة نبيه[2]
کتاب الله وقول نبيه[3] ـــــ علیٰ سنة الله وسنة رسوله[4]
فرمایا: من رغب عن سنّتی فلیس منی[5]
اور یہ بھی کہا: من اخذ دینه من کتاب الله وسنة نبيه زالت الجبال قبل ان یزول[6]
اور یہ بھی ہے: قول ربنا وسنة نبینا[7]

ان روایات کی روشنی میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہ لوگ حجیت حدیث کے منکر نہیں ہیں۔ حدیث ثقلین میں انہوں نے جو "سنّتی" کا لفظ روایت نہیں کیا "عترتی" کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سنّت اور حدیث کو وہ براہِ راست حجت نہیں سمجھتے۔ حدیث ان کے ہاں امام کی وساطت سے حجت بنتی ہے۔

اصل حجج اللہ فی الارض ائمہ کرام ہیں اور اصل قوتِ حاکمہ امامت کی ہے نبوت کی بات اس کے ماتحت ہے۔ کتاب اللہ کے برابر کا ماخذ عترت ہے۔ حدیث اور سنّت ان کے (عترت کے ماتحت) تسلیم کی جائے گی۔ ہم یہاں صرف یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ لوگ اصل حجتِ الٰہی امام کو سمجھتے ہیں رسالت کو نہیں۔

ملّا باقر مجلسی نے مرآۃ العقول میں کتاب الاحتجاج سے نقل کیا ہے کہ اختلافِ حدیث میں مدار سند پر نہیں، اپنے اصحاب پر ہے۔ کلینی لکھتا ہے:۔

لا نجد شیئاً احوط ولا اوسع من رد علم ذلك كله الى العالم[8]

ترجمہ: اس سے زیادہ احتیاط کے قریب اور وسعتِ عمل کے لائق کوئی بات نہیں کہ ان اُمور کا علم سب امام کی طرف لَوٹا دیا جایا کرے۔

ہم اہل سنّت کی کتابوں میں روایت کتاب اللہ وعترتی جہاں بھی ہے ضعیف السند ہے۔ اور اس کے راویوں میں کوئی نہ کوئی شیعی ضرور کھڑا نظر آتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

سوال: شیعہ قدماء میں رجال پر لکھنے والے کون کون سے مشہور لوگ گزرے ہیں؟

جواب: محمد بن حسن بن علی نے کتاب الرجال لکھی۔ حمزہ بن قاسم نے امام باقر کے رجال لکھے۔ ابن عقدہ (۳۳۲ھ) نے بھی رجال لکھے۔ رجال کشی ۳۷۰ھ کے قریب لکھی گئی۔ کشی ابن قولویہ (۳۶۹ھ) کا معاصر تھا۔

---

[1] الکافی جلد ۴ صفحہ ۲۹۲، صفحہ ۴۹۴ [2] الکافی جلد ۲ صفحہ ۵۳۷، جلد ۷ صفحہ ۲۰۵ [3] ایضاً جلد ۱ صفحہ ۵۲ [4] ایضاً جلد ۵ صفحہ ۲۴۱ [5] الکافی جلد ۲ صفحہ ۸۵ [6] ایضاً جلد ۱ صفحہ ۷ [7] رجال مامقانی جلد ۱ صفحہ ۱۷۴ [8] الکافی جلد ۱ صفحہ ۹

رجال نجاشی (۴۵۰ھ) رجال طوسی (۴۶۰ھ) اور فہرست محمد بن حسن طوسی اس دور کی کتب بیان کی جاتی ہیں۔ متاخرین میں جامع الرواۃ اور رجال مامقانی اس فن پہ مفصل کتابیں ہیں۔ کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: ہفت روزہ "دعوت" کی ۱۹ اکتوبر کی اشاعت میں امیر معاویہؓ کے متعلق جو کچھ آپ نے فرمایا ہے اس سے بہت سے لوگوں کے عقیدے صحیح ہو گئے ہیں۔ لیکن بعض دوست اس بات پر اصرار کر رہے ہیں کہ حضرت امیر معاویہؓ کے فضائل میں کوئی حدیث مروی نہیں۔ ایسی اگر کوئی حدیث منقول ہو تو اگلے شمارہ میں اسے بھی بیان فرمائیں۔ سائل اقبال ظفر صدر تنظیم اہل سنّت سیالکوٹ

جواب: حضرت امیر معاویہؓ کاتبِ وحی، ام المؤمنین حضرت ام حبیبہؓ کے بھائی تھے۔ جن کے دست مبارک پر سیدنا حضرت امام حسنؓ اور امام حسینؓ نے بیعت فرمائی اور جتنا عرصہ حضرت امیر معاویہؓ زندہ رہے امام حسنؓ اور امام حسینؓ ان کے تابعدار رہے اور حضرت امیر معاویہؓ کے دیئے ہوئے وظائف قبول فرماتے رہے اور ان کی گزر اوقات زیادہ تر اسی وظیفہ مقدسہ پر رہی۔ اب ایسی ہستی کے متعلق لب کشائی کسی طرح مناسب نہیں۔ حضورؐ کا یہ ارشاد حضرت امیر معاویہؓ کے متعلق حق اسلام کی ایک کافی وافی شہادت ہے:۔

اللّٰهم اجعل معاوية هاديًا ومهديًا۔ (اخرجه احمد والترمذی)

ترجمہ۔ اے اللہ! تو معاویہؓ کو ہدایت پھیلانے والا اور ہدایت یافتہ فرما۔

یاد رہے کہ ایسے ہی الفاظ مسند احمد کی روایت میں حضرت علی المرتضیٰؓ کے متعلق بھی منقول ہیں پس ان الفاظ کے مبنی بر فضیلت ہونے سے ہرگز انکار نہیں ہو سکتا۔ ورنہ اس روایت میں جا کر بھی ان الفاظ کا وہی وزن لیا جائے گا جو یہاں لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ فرمایا اگر تم علیؓ کو امیر بناؤ گے تو اسے ہادی اور مہدی پاؤ گے ـــــ اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ ان صفات کا پورا ظہور حکومت پر آنے سے ہی ہوتا ہے۔ سو کیا یہ پہلی روایت امیر معاویہؓ کے برسرِ حکومت آنے کا اشارہ نہیں؟ ہاں آپ کے اصرار کی وجہ سے ایک اور حدیث پیش کی جاتی ہے:۔

يبعث الله معاوية يوم القيمة وعليه رداء من نور الايمان[1]

ترجمہ۔ اللہ تعالیٰ امیر معاویہؓ کو قیامت کے دن اس طرح اٹھائیں گے کہ ان پہ نورِ ایمان کی ایک چادر ہو گی۔

فضائل میں کسی حدیث کا کمزور یا ضعیف ہونا عیب نہیں سمجھا جاتا اور یہی محدثین کا فیصلہ ہے۔ ہاں اثباتِ عقیدہ امرِ دیگر ہے۔ والله اعلم بالصواب وعلمه اتم واحكم فی كل باب۔

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ

---

[1] کنز العمال جلد ۶ صفحہ ۱۹۰

حضرت امیر معاویہؓ کے متعلق

غوث الثقلین سیدنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

اور

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ارشادات کی روشنی میں

تین سوالوں کا جواب

حضرت قبلہ محترم جناب علامہ خالد محمود صاحب دامت برکاتہم

سلام مسنون!

سوال: ۱۔ راجہ بازار کا ایک شخص جو اپنے آپ کو سُنی کہتا ہے حضرت امیر معاویہؓ کے متعلق بدگمان ہے وہ کہتا ہے کہ امیر معاویہؓ کوئی اختلافی شخصیت نہیں، شیعہ اور سنی دونوں انہیں نہیں مانتے۔ اہل سنت کے اپنے اکابر بزرگ انہیں اچھا نہیں جانتے۔ میں جب امیر معاویہؓ کی صفائی پیش کرتا ہوں تو وہ کہتا ہے۔ کہ امیر معاویہؓ کی شان بیان کرنا تنظیم والوں کی بدعت ہے یا مولانا محمود احمد عباسی کی اختراع ہے۔ اکابر علماء اس بدعت سے بیزار ہیں وغیرہ وغیرہ۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ امیر معاویہؓ کے ساتھ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہ لکھنا چاہیئے اس کی وضاحت فرمائیں؟

۲: میں نے کہا تھا کہ حضرت امام حسنؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کی بیعت کرلی تھی۔ مگر وہ دوست کہتا ہے کہ بیعت نہیں صرف صلح کی تھی۔ مطلع فرمائیں کہ حقیقت کیا تھی؟

۳: معترض مذکور یہ بھی کہتا ہے کہ حضرت امام حسنؓ کا امیر معاویہؓ کے ساتھ مل جانا ایک اصولی غلطی تھی۔ چنانچہ بعد کے حالات نے بتا دیا کہ اس سے اہل بیت پہ اور مظالم ہوئے۔ اس کی بھی تحقیق چاہیئے کہ امام حسنؓ کا یہ عمل اسلام کے لیے مضر تھا یا بہتر تھا؟ سائل محمد اقبال ظفر صدر تنظیم اہلسنت سیالکوٹ

جواب ۱: یہ لوگ حضرت امیر معاویہؓ کی شان میں گستاخی کرتے ہیں اور اپنے آپ کو سنی بھی کہتے ہیں۔ اُن کے ساتھ گفتگو کا رُخ اس طرف ہونا چاہیئے کہ اس باب میں خود اہل سنت کا مذہب کتابوں میں کیا لکھا ہے حضرت امیر معاویہؓ کے خلاف جو وسوسے دماغ میں اٹھتے ہیں اور جو تاریخی وہم پیدا ہوتے ہیں وہ سب اُمور اہلسنت کے مسلمہ بزرگوں کے سامنے بھی تھے۔ ان کے علم وفضل اور فکر ونظر سے واقعات کے وہ پہلو ہرگز مخفی نہ

تھے جن کے پیش نظر ہمارے موجودہ بعض دوستوں کو یہ شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ سیدنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت امام مجدد الف ثانیؒ اور امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے لے کر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ تک یہ سب بزرگ حضرت امیر معاویہؓ کی بزرگی کے اقرار کو سُنی ہونے کی علامت اور ان کی شان میں بے ادبی کو اہلسنت سے نکلنے کا نشان قرار دیتے ہیں۔ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ تو وہ بزرگ ہیں جنہیں حق گوئی کی پاداش میں نور جہاں کی سازش نے برسوں قلعہ گوالیار میں قید رکھا اور حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی حق گوئی تو اب تک اہل بدعت کے سینوں کو زخمی کر رہی ہے۔ پس ان بزرگوں کا حکومت یا عوامی خلفشار سے مرعوب ہونا کبھی متصور نہیں ہو سکتا۔ یقین کیجیئے کہ ان کی دیانت کسی اندازِ فکر میں مشتبہ نہیں۔ پھر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ تو سب کے سردار ہیں اور مابعد کے تمام اولیاء کی گردنوں پر ان کا قدم ہے۔ ایسے بزرگوں کے متعلق جن کی پوری زندگی تقیہ کے دامن کو تار تار کرتی رہی۔ جنہوں نے حق گوئی کے باب میں کبھی مصلحت پسندی سے کام نہ لیا اور جن کے علم وفضل اور تقوے پر آج تک اہل سنت کو کامل اور مکمل اعتماد ہے۔ ان کے اجماعی فیصلوں میں کون شک کر سکتا ہے۔ آپ کے اس سنی نما دوست کے ذہن میں جو وسوسے اٹھتے ہیں اور جن واقعات کو وہ اپنے دلائل سمجھ کر بیان کرتا ہے یہ سب امور ان بزرگوں کے سامنے بھی موجود تھے بس چاہیئے کہ اس دوست کے دلائل میں اُلجھنے کی بجائے موضوع سخن یہ بنائیں کہ حضرت امیر معاویہؓ کے متعلق اہلسنت کا مذہب کیا ہے؟ اگر وہ اقرار کرے کہ سنی نہیں اور صرف اہل سنت کو دھوکہ دینے کے لیے اور حضرت امیر معاویہؓ کے متعلق بدگمانی پھیلانے کے لیے وہ اپنے آپ کو سنی کہہ رہا ہے۔ تو پھر دلائل اور واقعات کے باب میں ہم بحمد اللہ سیدنا امام حسنؓ کے ہم مسلک ہیں۔ آپ کے سوال کا جواب فقط اتنا ہی ہے کہ پہلے آپ اپنے اس دوست کے ساتھ گفتگو کا رُخ متعین کریں۔ پھر انشاء اللہ العزیز ہفت روزہ "دعوت" آپ کی پُوری خدمت کرے گا۔ ہاں تتمیماً للفائدہ امداد الفتاوے جلد۴ ص۱۳۲ سے اہل سنت مکتب فکر کا قطعی فیصلہ سوال وجواب کی صورت میں ملاحظہ فرمالیجیئے:۔

سوال: حضرت معاویہؓ بن ابی سفیانؓ صحابی اند یا نہ ودر فضیلت بوصف صحابیت سہیم وشریک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہستند یا نہ وایشاں را بالقب حضرت ودعائے رضی اللہ عنہ یاد کردن شعار اہل سنت است یا نہ وکسے کہ در تعظیم ایشاں تقصیرے نماید ومردماں را تخصیص وترغیب بر قبائح ایشاں سازد در رافضی بودن ایں کس تامل است یا نہ؟

ترجمہ۔ امیر معاویہؓ صحابی ہیں یا نہ اور اس وصف صحابیت میں وہ دوسرے صحابہؓ کے ساتھ برابر شریک ہیں یا نہیں؟ انہیں حضرت اور رضی اللہ عنہ کے ساتھ ذکر کرنا اہل سنت کا نشان ہے

یا نہ ؟ اور جو شخص ان کی شان میں کمی کرے اور لوگوں کو ان کی کمزوری کی طرف متوجہ کرے اس کے رافضی ہونے میں کوئی تامل ہے یا نہیں ؟

الجواب : معاویہ رضی اللہ عنہ صحابی بن صحابی اند. در صحابیت و فضیلت او شاں کرا کلام است مگر کہ رافضی باشد و ملقب حضرت و تحیۃ رضی اللہ عنہ او شان را یاد کردن شعار اہل سنت و جماعت ست و کسی کہ در شان والائے ایشاں طعنے یا تشنیع بر زبان راند شعبہ از رفض وارد و قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی اصحابی لا تتخذوھم من بعدی غرضا من احبھم فبحبی احبھم ومن ابغضھم فببغضی ابغضھم وقال علیہ السلام فی معاویۃ اللھم اجعلہ ھادیا ومھدیا و آنچہ مشاجرات و منازعات فیما بین واقع شدہ ایں را بر محامل صحیحہ و تاویلات مقبولہ حمل تواں کرد از حضرت غوث الثقلین قدس سرہٗ منقول است کہ اگر در رہ گذر حضرت معاویہؓ نشینم و گرد سم اسپ جناب بر من افتد باعث نجات من شناسم پس تعجب است کہ چنین بزرگان دین چناں خیال فرمایند و چند کساں و ناکسان زبان دراز ے کنند صدق من قال ؎ چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد ۔ میلش اندر طعنۂ پاکان برد [1]

فقط : ۱۲ رجمادی الاولی ۱۳۰۱ھ

ترجمہ. امیر معاویہؓ خود بھی صحابی ہیں اور صحابی کے بیٹے ہیں. ان کے صحابی ہونے اور ان کی بزرگی میں سوائے رافضی کے اور کسی کو شک نہیں ہو سکتا. حضرت اور رضی اللہ عنہ کے اعزاز کے ساتھ ان کا تذکرہ کرنا اہلسنت ہونے کا نشان ہے اور جو شخص ان کی شان میں کسی قسم کا طعنہ یا بدگوئی کرے اس میں رافضی ہونے کا پہلو موجود ہے. حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "میرے صحابہؓ کے بارے میں خدا سے ڈرو. میرے بعد انہیں اعتراضات کا نشانہ نہ بنانا جو ان کے ساتھ محبت کرے گا وہ میری محبت کی وجہ سے محبت کرے گا اور جو ان کے بارے میں دل میں بغض رکھے گا وہ میرے ساتھ بغض رکھنے کی وجہ سے ایسا کرے گا اور حضورؐ نے حضرت معاویہؓ کے حق میں فرمایا. اے اللہ! معاویہؓ کو ہدایت دینے والا اور ہدایت یافتہ فرما" اور صحابہؓ کرام کے باہمی اختلافات جو واقع ہوئے ان سب کی صحیح توجیہات اور ایسی تشریحات کی جا سکتی ہیں کہ (ان میں سے کسی کے دامن پر کوئی دھبّہ نہ آئے) اور حضرت غوث الثقلین سیّدنا حضرت عبدالقادر جیلانیؒ سے منقول ہے کہ اگر میں حضرت امیر معاویہؓ کے راستے میں بیٹھ جاؤں اور حضرت امیر معاویہؓ

[1] امداد الفتاوی جلد ۴ صـ ۱۳۲

کے گھوڑے کے سُم کا غبار مجھ پر پڑے تو میں اُسے اپنی نجات کا وسیلہ سمجھتا ہوں. تعجب کی بات ہے کہ ایسے بزرگ تو یہ ارشاد فرمائیں اور چند عوام نا اہل حضرت امیر معاویہؓ پر طعن شروع کر دیں (معاذ اللہ) کسی کہنے والے نے صحیح کہا ہے "جب خدا چاہتا ہے کہ کسی کو بے آبرو کرے تو اُسے پاکباز لوگوں کی طعن و تشنیع میں لگا دیتا ہے"

سوال ۱ کا جزو ۲ : زید کہتا ہے کہ میں حضرت امیر معاویہؓ سے بدعقیدہ ہوں اور کسی طرح جی نہیں چاہتا کہ ان کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ کہوں. مگر اب تک کہا ہے اور کہتا ہوں اور کہوں گا. زید یہ بھی کہتا ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ تھے تو صحابی، مگر دل میں سلطنت کی محبت رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح سے سلطنت یا خلافت اب میرے ہی خاندان میں رہے. اسی بنا پر انہوں نے اپنے بیٹے یزید سے کہہ دیا تھا کہ حضرت امام حسینؓ کو مار ڈالنا. پھر زید اس اخیر جملہ کے خلاف ایک روایت بیان کرتا ہے کہ انہوں نے (حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ) حضرت امام حسینؓ کے مار ڈالنے کا یزید کو نہیں کہا تھا غرض زید مختلف روایتیں بیان کرتا ہے اور غالبًا اول روایت کو صحیح جانتا ہے. زید اپنے خیالات کی تائید میں یہ بھی پیش کرتا ہے کہ شمس التواریخ کے مصنف نے بھی اپنی تصنیف میں جا بجا حضرت امیر معاویہؓ طعن کئے ہیں. زید یہ بھی کہتا ہے کہ حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ پکے مسلمان نہ تھے. البتہ مرتے وقت پکے مسلمان ہو گئے تھے ؟

اب دریافت طلب یہ ہے کہ زید جو اپنے کو سنّی اور حنفی کہتا ہے تو ان عقائد اور خیالات کے رکھنے سے اس کی سنیّت اور حنفیت میں کچھ نقصان آتا ہے یا نہیں اور ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنے میں اور اس کی محفلوں اور جلسوں میں بیٹھنے سے کچھ خرابی تو نہیں آتی. اور یہ ارشاد فرمائیے کہ اہل سنت و جماعت کو حضرت امیر معاویہ اور حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہما سے کیا عقیدہ رکھنا چاہئے اور شمس التواریخ اور اس کے مصنف جو اکبر آبادی ہیں اور غالبًا ابھی زندہ ہوں گے اسلام میں کیا رتبہ رکھتے ہیں. آیا ان کی تصانیف قابل اعتبار ہیں یا نہیں ؟

جواب : (بقلم حقیقت رقم حکیم الامّت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ)

حدیث میں ہے، لا تسبوا اصحابي فلو ان احدکم انفق مثل احد ذھبا ما بلغ مد احدھم ولا نصیفہ متفق علیہ۔

اور حدیث میں ہے، اکرموا اصحابي فانھم خیارکم رواہ النسائی.

اور حدیث میں ہے: لا تمس النار مسلما رأنی او رای من رأنی رواہ الترمذی.

اور حدیث میں ہے: فمن احبھم فبحبی احبھم ومن ابغضھم فببغضی ابغضھم رواہ الترمذی.

اور حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ صحابی یقیناً ہیں۔ اس لیے احادیث مذکورہ ان کو شامل ہوں گی۔ پس ان کا اکرام اور محبت واجب ہوگی اور ان کو بُرا کہنا اور ان سے بغض و نفرت رکھنا یقیناً حرام ہوگی اور ان سے جو کچھ منقول ہے بعد تسلیم صحتِ نقل ان اعمال پر ان کے نیک اعمال ان پر غالب ہیں۔ بلکہ خود ایک وصفِ صحابیت ایسا ہے جو سب پر غالب ہے۔ ارشاد نبویؐ فلو ان احدکم الخ اس پر دال ہے اور اسی بناء پر لا تمس النار الخ فرمایا ہے جو وسوسہ و خطرہ بلا اختیار دل میں پیدا ہوا وہ لائق عفو ہے اور جو عقیدہ اور تعلق اختیار سے ہو اس کی اصلاح واجب ہے اور جو شخص باختیار بدگمانی یا بدزبانی یا بغض و نفرت رکھے گا لامحالہ وہ احادیث نبویہ کا مخالف اور خارج از اہلسنت وجماعت ہے۔ جیسا کہ کتب اہلسنت سے ظاہر ہے۔ اس لیے اس کی امامت بھی مکروہ ہے اور اختلاط بلا ضرورت ممنوع۔ وفی شرح العقائد ص۱۱۲

وما وقع بينهم من المنازعات والمحاربات فله محامل وتاويلات فسبهم والطعن فيهم ان كان مما يخالف الادلة القطعية فكفر كقذف عائشة رضى الله عنها والا فبدعة وفسق[1] اھ۔

ترجمہ: "صحابہؓ میں جو اختلافات اور محاربات واقع ہوئے ان سب کے اپنی اپنی جگہ حل موجود ہیں اور ان کی ایسی توجیہات کی جا سکتی ہیں کہ ہر ایک کا اپنا مقام برقرار ہے۔ ان بزرگوں کی شان میں طعن کرنا اگر دلائل قطعیہ یقینیہ کے خلاف ہو جیسا کہ حضرت عائشہ پر بہتان باندھنا تو یہ تو یقیناً کفر ہے اور اگر دلائل قطعیہ کی مخالفت نہیں اخبار احاد کے خلاف ہے تو یہ بھی بدعت اور بدکاری ہے۔"

شمس التواریخ نظر سے نہیں گزری اور نہ مصنف کا حال معلوم ہوا۔ واللہ اعلم

سوال ۲: کیا حضرت امام حسنؓ نے حضرت امیر معاویہؓ سے صلح کی تھی یا ان کی بیعت بھی کی تھی؟

جواب: حضرت امام حسنؓ نے حضرت امیر معاویہؓ سے صلح ہی نہ کی تھی، امیر معاویہؓ کی بیعت بھی فرمائی تھی۔ بلکہ ان کے ساتھ حضرت امام حسینؓ نے بھی حضرت امیر معاویہؓ کی بیعت کی تھی۔ رجال کشی میں حضرت امام جعفر صادقؒ سے روایت ہے کہ امام حسنؓ، امام حسینؓ اور قیس بن سعد بن عبادہؓ انصاری وغیرہ جب شام آئے تو:-

فاذن لهم معاويةؓ واعد لهم الخطباء فقال يا حسنؓ قم فبايع ثم قال للحسينؓ قم فبايع فقام فبايع[2]

[1] امداد الفتاوی جلد ۴ ص۱۲۹ جلد ۵ ص۲۹۵ جدید [2] بحار الانوار جلد ۱۰ ص۱۲۴ ایران۔

ترجمہ: پس امیر معاویہؓ نے انہیں آنے کی اجازت فرمائی اور ان کے اعزاز میں خطیب بلائے۔ اور امام حسنؓ سے کہا کہ کھڑے ہو کر بیعت فرمائیں۔ امام حسنؓ کھڑے ہوئے اور امیر معاویہؓ کی بیعت کی۔ پھر امام حسینؓ سے کہا کہ آپ کھڑے ہوں اور بیعت فرمائیں: امام حسینؓ کھڑے ہوئے اور حضرت امیر معاویہؓ کی بیعت فرمائی۔

حضرت امام حسنؓ کا امیر معاویہؓ کی بیعت کرنا ہرگز غلطی نہ تھا۔ بلکہ اسی مصالحت نے انہیں "سید" ہونے کی شان سے ممتاز فرمایا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

"میرا یہ بیٹا سید" ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کی دو جماعتوں میں اصلاح فرمائیں گے۔" (حدیث نبوی)

یہ امر بھی پیشِ نظر ہے کہ یہاں لسانِ نبوت سے امیر معاویہؓ اور ان کی جماعت کے لیے بھی مسلمان ہونے کے الفاظ وارد ہیں۔ پس یہ اختلافات کوئی کفر و اسلام کے اختلافات نہ تھے محض انتظام و معاملات کے تھے۔ غور کیجئے کہ امام حسنؓ کا یہ عمل اگر غلط ہوتا تو حضورؐ اس پر انہیں "سید" ہونے کی بشارت نہ دیتے۔ پھر حضرت امام باقر کا ارشاد ہے:-

والذى صنعه الحسنؓ بن علىؓ كان خيرًا لهذه الامة مما طلعت عليه الشمس[1]

ترجمہ: امام حسنؓ نے جو کچھ کیا وہ اس امت کے لیے ہر اس چیز سے بہتر تھا جس پر کبھی سورج طلوع ہوا۔

آپ ہی غور کریں کہ اگر امام حسنؓ کا ظاہر و باطن ایک نہ ہوتا اور دل و جان سے امیر معاویہؓ کے ساتھ نہ ہوتے تو اس معاہدہ میں باقاعدہ شرائط نہ ہوتیں۔ کیونکہ جبری اطاعت میں شرطیں نہیں ہوا کرتیں۔ امام حسنؓ نے امیر معاویہؓ سے شرط لی تھی:-

صالحه على ان يسلم اليه ولاية امر المسلمين على ان يعمل فيهم بكتاب الله و سنة رسول الله وسيرة خلفاء الصالحين[2]

ترجمہ۔ امام حسنؓ نے امیر معاویہؓ سے مصالحت کرتے ہوئے اس شرط کے ساتھ مسلمانوں کی ولایت اُن کے سپرد کی تھی وہ کتاب و سنت کے مطابق حکومت کریں اور خلفائے صالحین راشدین کی سیرت پر چلیں۔

کتبہ: خالد محمود عفا اللہ عنہ ۱۹ راپریل ۱۹۶۲ء

[1] بحار الانوار جلد ۱۰ ص۱۶۴ [2] بحار الانوار جلد ۱۰ ص۱۶۴ ایران۔

سوال: ہفت روزہ "دعوت" کی ۵ راکتوبر کی اشاعت میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے ماہوار رسالہ "النور" مجریہ جمادی الثانی ۱۳۵۲ھ سے حضرت مولانا حبیب احمد صاحب کیرانوی کا ایک مضمون رسالہ "تحریف قرآن کی حقیقت" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شیعہ موجودہ قرآن کو نہیں مانتے۔ میرے ایک شیعہ دوست کہتے ہیں کہ یہ الزام غلط ہے۔ ہمارا اسی موجودہ قرآن پر پوری طرح ایمان ہے۔ موجودہ قرآن حرف بحرف کلام خداوندی ہے اس کی ذرا وضاحت فرمائیں؟ سائل ناصر علی کراچی۔

جواب: شیعہ حضرات جب یہ کہتے ہیں کہ موجودہ قرآن حرف بحرف کلام خداوندی ہے تو اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کے سارے حروف کلام خداوندی کے حروف ہیں۔ الف بار وتار وغیرہ میں سے کوئی حرف نہیں جو کلام خداوندی میں نہ آچکا ہو اور یہ ایک الفاظ کا کھیل ہے جس سے عوام مغالطے میں آجاتے ہیں اور جب یہ حضرات کہتے ہیں کہ یہ قرآن لفظ بلفظ کلام الٰہی ہے تو اس سے بھی یہی مراد ہوتی ہے کہ اس کے تمام الفاظ کلام الٰہی کے الفاظ ہیں۔ ان حالات میں اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ان دوستوں کا ایمان موجودہ قرآن پر واقعی ہے یا نہیں۔ تو یوں پوچھیں کہ موجودہ قرآن میں:۔

۱۔ الفاظ کی باہمی ترتیب اور ہر آیت کے مختلف فقروں کی باہمی تالیف و ترتیب کیا ہو بہو وہی ہے جیسے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا اور اصحابؓ کو لکھوایا تھا؟

۲۔ آیاتِ قرآنی کی باہمی ترتیب اور موجودہ سورتوں کی ترتیب و تالیف آنحضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کردہ اور منظور شدہ ہے یا نہیں؟ آپ کا اسے نمازوں میں پڑھنا کیا اسی ترتیب سے تھا؟

۳۔ موجودہ قرآن حرف بحرف کلام خداوندی ہونے کے باوجود پورا اور مکمل ہے یا اس سے بعض آیات کی امت کے ہاتھوں کوئی کمی بھی ہو گئی ہوئی ہے؟

ان تینوں سوالوں کی روشنی میں آپ کو پتہ چل جائے گا کہ شیعہ کا موجودہ قرآن پر ایمان ہے یا نہیں؛ اس میں وہ آپ کو اس بات میں الجھائیں گے کہ خود اہل سنت کے نزدیک بھی تو یہ موجودہ ترتیب موافق تنزیل نہیں۔ آپ اس کے بارے میں کہیں کہ اگرچہ یہ ترتیب نزولی نہیں، لیکن ترتیب رسولی ضرور ہے۔ اہلسنت اس موجودہ قرآن کو اگر ترتیبِ نزولی کے موافق نہیں مانتے تو یہ بھی نہیں مانتے۔ کہ موجودہ ترتیب امت کے اپنے ہاتھوں کی ایجاد ہے۔ وہ یقین رکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی قرآن پاک کو ان وقائع اور حالات، کی ترتیب سے نہیں لکھایا۔ جو ان ہنگامی مواقع کا نتیجہ تھے۔ بلکہ اسے باذنِ الٰہی ایک ایسی جامع ترتیب سے لکھایا، سنایا اور یاد کرایا ہے جو لوحِ محفوظ کی ترتیب کے بالکل مطابق ہے اس ترتیب میں امت کی اپنی رائے کا کوئی دخل نہیں۔ یہ ہو بہو وہی قرآن ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے

سامنے پیش کیا تھا۔ شیعہ دوست بھی اس موجودہ قرآن کو موافق تنزیل نہیں مانتے۔ لیکن وہ اس کی موجودہ ترتیب کو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ترتیب تسلیم نہیں کرتے۔ بلکہ ان کا نظریہ یہ ہے کہ قرآن پاک اپنی موجودہ شکل میں صحابہؓ کی تالیف ہے اور یہ محض ایک صحیفہ عثمانی ہے۔ جس کے حروف اور الفاظ تو وہی ہیں جو قرآن پاک کے تھے۔ لیکن ان کی ترتیب و تالیف قطعاً پیغمبر کی مرضی کے خلاف ہے۔ اس مرحلے پر شیعہ اور اہل سنت اصولی طور پر مختلف ہو جاتے ہیں۔ شیعہ حضرات کے ابتدائی مدارس میں "عقائد الشیعہ" ایک مشہور رسالہ رائج ہے جس کے مصنف اُن کے ادیبِ اعظم مولانا ظفر حسن صاحب قبلہ ہیں۔ اسے شمیم بک ڈپو کراچی نے شائع کیا۔ اور رئیس پرنٹنگ پریس سے یہ چھپا ہے۔ اس کے ص۲۱ پر عقیدہ ہفتم کتب آسمانی ایک سرخی ہے۔ اس کے ماتحت ۲ پر یہ شیعہ ترجمان قرآن پاک کے متعلق اپنا عقیدہ یوں بیان کرتے ہیں:۔

"قرآن کے متعلق ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ جو کچھ ہمارے سامنے موجود ہے یہ حرف بحرف خدا کا کلام ہے لیکن یہ موافق تنزیل نہیں۔ اس میں مکی و مدنی سورے ملے جلے ہیں۔ حالانکہ اوّل مکی ہونے چاہیئے تھے۔ پھر مدنی سورہ اقرأ جو سب سے پہلی سورۃ تھی آخری پارہ میں ہے اور آیہ الیوم اکملت لکم دینکم یہ آخری آیت تھی وہ سورۂ مائدہ میں ہے اس سے معلوم ہوا کہ آیات کی ترتیب میں بھی فرق ہے۔ بعض سورتوں سے آیات کی کمی بھی کردی گئی ہے"

پھر اسی عقائد الشیعہ ص۳۲ کے ۵ پر یوں لکھا ہے:۔

"ہمارا عقیدہ ہے کہ جو قرآن موافق تنزیل حضرت علی علیہ السلام نے جمع کیا تھا وہ نسلاً بعد نسل ہمارے ائمہ کے پاس محفوظ رہا اور اب وہ ہمارے بارہویں امام علیہ السلام کے پاس ہے"

اُمید ہے کہ ان حقائق کی روشنی میں آپ پر یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ موجودہ قرآن پر ایمان رکھنے کے بارے میں شیعہ اور اہلسنت میں بنیادی اختلافات ہیں۔ وقت کے موجودہ تقاضوں اور حالات کی موجودہ افتاد کے پیشِ نظر ان اختلافات کو نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ لیکن جو امور ایمان پر اثر انداز ہوتے ہیں اور پھر بہت سے معاملاتِ شرعیہ جو مبنی برایمان ہیں (جیسے نکاح وغیرہ) وہ ان کی روشنی میں ہی طے ہوتے ہیں۔ تو ایسے واقعات کو دبا جانا اور ان میں ابہام سے کام لینا اسلامی حق امانت کے یقیناً خلاف ہیں اور خدا اس پر گواہ ہے کہ ہم نے نہایت نیک نیتی اور عامۃ الحق اسلام کی ہمدردی کے لیے آپ کے سوال کے جواب میں اس قدر تفصیل کی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سوال ۲ : سُنا ہے علمائے یہود نے مجرموں پر احکام تورات جاری کرنے میں امیر و غریب، اشراف اور عوام میں کچھ فرق کر رکھا تھا۔ کوئی بڑا آدمی جو مال دار ہو یا اشراف میں سے ہو وہ اگر زنا وغیرہ کرے تو اس پر وہ تورات کی حد جاری نہیں کرتے تھے اور اگر کوئی عوام اور غریبوں میں سے اسی جرم کا مرتکب ہوتا تو اس پر حکم شرعی جاری کر دیا جاتا۔ یہود کے پاس اس اختلاف عمل کی کیا توجیہ تھی؟ سائل۔ محمد اسلم از جہلم

الجواب : یہ تو صحیح ہے کہ فقہائے یہود ان قانونی سزاؤں کے نافذ کرنے میں اشراف اور عوام، امیر اور غریب، بڑے اور چھوٹے لوگوں میں فرق کرتے تھے۔ حالانکہ حکم تورات ان تمام مجرموں کے لیے عام تھا۔ وہ بندگان زر و مصلحت حکم شرعی کے اس عموم کو چھپاتے تھے اور اجرائے حدود کے فتوے میں یہ مصلحتی فرق روا رکھتے تھے۔ ان کے پاس اس اختلافِ عمل کی توجیہ میں کوئی دلیل منقول نہ تھی۔ بلکہ یہ ان کا اپنا اجتہاد تھا۔ امیر آدمی یا بڑے آدمیوں کے لیے جرم کے مواقع عوام اور ہر وقت محنت کرنے والے لوگوں کی نسبت بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ ان کی دولت و ثروت کے پیش نظر ان کے گھروں میں غیر محرم مردوں اور عورتوں کا آزادانہ اختلاط، وقت کی فارغ البالی جرم کو چھپانے پر قدرت، ناچ گانے کے مشاغل اور عریاں سوسائٹی یہ وہ امور ہیں کہ ان حالات میں فسق و فجور سے بچنا نسبتاً زیادہ مشکل ہے۔ علمائے یہود کا خیال ہوگا کہ جب بُرائی کے مواقع اور فحش کاری کی کشش اتنی عام ہے تو پھر ان مجرموں پر حکم تورات کا جاری کرنا بہت ظلم ہے۔ عوام اور غریب محنتی انسانوں کے اوقات اکثر معروف اور ان کے لیے عیش و عشرت کے اسباب اکثر محدود ہوتے ہیں۔ اس لیے اگر وہ بدکاری کریں تو ان کے پاس وجہ معذرت کوئی نہیں ایسے اجتہادات نے علمائے یہود کی اکثر آنکھوں کو اندھا اور باطن کو سیاہ کر رکھا تھا۔ الحمدللہ! کہ حضرت اسلام نے اس خانہ ساز اجتہاد کے تابوت میں آخری میخ لگا دی جس سے سوسائٹی میں بدکاری کے مواقع زیادہ ہوں اسے محض اس بناء پر لائق سزا نہ سمجھنا کہ ان حالات میں سیاہ کاریوں سے بچنا بہت مشکل ہے۔ یہ تصور یہود کی ایجاد ہے اور اسی نے شریعتِ تورات کو پارہ پارہ کیا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سوال : آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حقیقت میں بشر نہیں نُور تھے۔ یہ عقیدہ اکابر اہلسنّت، فقہاء، محدثین، میں سے کس نے لکھا ہے؟ یا یہ شیعہ کا عقیدہ ہے جو انہوں نے اس حدیث کی مخالفت میں وضع کیا کہ حضورؐ نے فرمایا ہیں، ابو بکرؓ اور عمرؓ ایک ہی مٹی سے پیدا کئے گئے۔ شیعہ نور و بشر کے مسئلہ میں اہلسنّت کے اس قدر سخت مخالف کیوں ہیں۔ اس کا کچھ پس منظر بیان فرماویں؟

جواب : حضورؐ اپنی ذات میں بشر نہیں نُور تھے یہ شیعہ عقیدہ ہے۔ ان کی کتابوں میں لکھا ہے کہ حضورؐ اور حضرت علیؓ ابتداء میں ایک نُور تھے۔ پھر اس کے دو ظہور ہوئے۔ سو آپؐ اور علیؓ ایک ہی نور سے پیدا کئے گئے

اور حضرت علیؓ کے بشر ہونے کی بھی کتابوں میں تصریح موجود ہے۔ رجال کشی ص۲۱۴ پر صاف لکھا ہے۔ کان علی بشر سو یہ تو کوئی اختلافی مسئلہ نہ تھا۔

اہل سنّت بزرگوں میں سے اگر کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نُور لکھا ہے تو اس سے ان کے ہاں آپؐ کی بشریت کی نفی ہرگز مقصود نہیں۔ نہ وہ آپ کی نوعِ انسانی کے کہیں منکر ہوئے۔ حضورؐ کے ایسا نور ہونے کا عقیدہ جس سے بشریت کی نفی ہو۔ یہ صرف شیعہ عقیدہ ہے۔ اہل سنّت کے ہاں آپ کی بشریت اور نورانیت میں تنافی نہیں۔ قرآن کریم کا مطالعہ کرنے سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ مشرکین بشریت اور رسالت میں تنافی کے قائل تھے۔ کھُلے بندوں کہتے کہ بشر کیسے رسول ہو سکتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ رسالت کسی بشر پر اُترے۔ یہ مدعیان رسالت تو کھاتے پیتے ہیں، یہ انسان ہیں۔ یہ کیسے نبی اور رسول ہو سکتے ہیں۔ ان کی اس قسم کی باتیں قرآن کریم میں متعدد بار منقول ہیں۔

انکارِ بشریت میں شیعہ کی شدّت

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کھُل کر فرماتی ہیں:۔

كان بشرًا من البشر يفلي ثوبه ويحلب شاته ويخدم نفسه ـ رواه الترمذي[1]

ترجمہ۔ آپ انسانوں میں سے انسان تھے۔ اپنے کپڑے کی دیکھ بھال خود کرتے اپنی بکری کا دودھ خود دوہتے اور اپنے کام خود کرتے تھے۔

ملا علی قاری جیسے محدثین نے اس حدیث کو تسلیم کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:۔

كان بشرًا من البشر تمهيد لما بعده من الخير لانها لما رأت من اعتقاد الكفار ان النبي لا يليق بمنصبه ان يفعل ما يفعل غيره من عامة الناس[2]

ترجمہ۔ ام المومنینؓ کا یہ کہنا آپ انسانوں میں سے ایک انسان تھے یہ اس بات کی تمہید میں فرمایا تھا جو آپ نے بعد میں کہی (کہ آپ گھر کے سارے کام کر لیتے تھے) آپ نے دیکھا کہ کفار یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ نبی کی شان کے لائق نہیں کہ وہ کام بھی کرے جو عام دوسرے لوگ کرتے ہیں (تو آپ نے کہا کہ حضورؐ گھر کے عام کام بھی کر لیتے تھے اور انسانوں میں سے انسان تھے) آپ نے اس حدیث کی تضعیف نہیں کی۔ اہل سنّت کے ہاں بشریت انبیاء کبھی کوئی اختلافی مسئلہ نہیں رہا۔ یہ شیعہ ذاکرین ہیں جنہوں نے حضرت عائشہؓ کی مخالفت میں یہ وسوسہ پیدا کر رکھا ہے کہ حضورؐ کو

---

[1] مشکوٰۃ ص۵۲۰ [2] دیکھئے جمع الوسائل فی شرح الشمائل ص۱۴۹ مطبوع مصر

بشر کہنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین ہے۔ استغفر اللہ العظیم

جواباً عرض ہے کہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی بشریت روایت کرتی ہیں۔ کہ آپ نے فرمایا:۔

انکم تختصمون الی وانما انا بشر ولعل بعضکم ان یکون الحن بحجتہ من بعض ... الحدیث[1]

ترجمہ۔ تم اپنے جھگڑے میرے پاس لے کر آتے ہو اور میں بھی انسان ہوں اور ہو سکتا ہے کہ تم میں سے کوئی اپنی حجت میں دوسرے سے زیادہ چرب زبان ہو۔

پھر کیا ملا محمد یعقوب الکلینی نے حضرت ام سلمہؓ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں وما ھو الا کسائر الرجال[2] کے الفاظ نقل نہیں کئے۔ پھر یہ الفاظ بھی دیکھئے۔ ان رسول اللہ بشر[3] شیعہ ائمہ کے ہاں یہ مسلم ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوپ لگتی تھی اور تکلیف دیتی تو آپؐ اپنے چہرہ پہ ہاتھ کا سایہ کر لیتے اور علامہ کلینی کتاب الحج باب الظلال للمحرم میں نقل کرتے ہیں:۔

ربما ستر وجھہ بیدہ۔ آپ اپنے چہرہ کو اپنے ہاتھ سے ڈھانپ لیتے تھے۔[4]

یہ جو کہا جاتا ہے کہ آپ کا سایہ نہ تھا۔ بدن مبارک اتنا لطیف تھا کہ روشنی اس میں سے گزر جاتی تھی۔ شیعہ کے ہاں یہ لائق قبول نہیں۔ ملا محمد باقر مجلسی لکھتا ہے:۔

ما قیل ان جسدہ الشریف کان لطیفاً فلم یکن یمنع نفوذ الشعاع فھو بعید جداً لانہ لو کان جسدہ الشریف کذلک لم تکن ثیابہ کذلک ولو کان کذلک لکان لا یمنع نفوذ شعاع البصر[5]

ترجمہ۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ آپ کا جسد شریف اس قدر لطیف تھا کہ شعاعیں اس کے اندر سے گزر جاتی تھیں یہ بات بعید از فہم ہے۔ کیونکہ اگر اس طرح ہو تو آپ کے کپڑے تو اس طرح کے نہ تھے (کہ آپ کا سایہ نہ پڑے) اور اگر یہ بھی اس طرح ہوں آپ کا بدن (دیکھنے والی) نظر کے پار ہونے کو تو نہ روکتا تھا۔

پھر شیعہ یہ بھی کہتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دفعہ بچھونے کاٹا۔ تو آپؐ نے اس کے خلاف دعا کی۔ علامہ کلینی لکھتے ہیں:۔

فلسعتہ عقرب فقال لعنک اللہ[6]۔ "آپؐ کو بچھونے کاٹا۔ آپؐ نے فرمایا تجھ پر خدا کی پھٹکار ہو"

---

[1] جامع ترمذی جلد ا صفحہ ۱۶۰ دہلی صفحہ ۲۱۶ لکھنؤ [2] کافی کلینی جلد ۵ صفحہ ۵۲۵ [3] ایضاً جلد ۴ صفحہ ۳۵ [4] مرآۃ العقول جلد ا صفحہ ۲۵۶ [5] الکافی جلد ۴ صفحہ ۳۶۳ جلد ۶ صفحہ ۳۲۷ [6] ایضاً جلد ۴ صفحہ ۳۵۰

کیا عنصری بدن ... بغیر بچھو کسی کو کاٹ سکتا ہے؟ شیعہ یہاں تو آپ کے بدن عنصری کا اقرار کرتے انسانی حوائج آپ کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ علامہ طبرسی کتاب الاحتجاج میں لکھتا ہے:۔

انما انا بشر مثلکم یعنی اکل الطعام ..... فی البشریۃ مثلکم[1]

ترجمہ۔ سوائے اس کے نہیں کہ میں بھی بشر ہوں جیسے تم یعنی میں بھی کھانا کھاتا ہوں اور بشری ضرورتوں میں تمہاری طرح ہوں۔

پھر یہ لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی حکمت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پہ سہو کی کیفیت وارد کر دے اور ان کے ہاں اس عقیدے میں کوئی عیب نہیں۔ پھر معلوم نہیں کہ یہ لوگ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بغض و عناد میں بشریت النبی کا کیوں انکار کرتے ہیں اور عوام میں نور بشر کے جھگڑے پھیلا کر خود اہلسنت کی صفوں میں انتشار پیدا کر رہے ہیں۔ ان کے علامہ مامقانی لکھتے ہیں:۔

اما مثل تجویز السھو علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ..... فلا یوجب فسقاً[2]

ترجمہ: اور یہ جو مسئلہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہ سہو کا وارد ہونا جائز مانا جائے (جیسا کہ علامہ طبرسی کی رائے ہے) تو اس عقیدے سے فسق لازم نہیں آتا۔

سو یاد رہے انکار بشریت شیعوں کی ایک کوشش ہے جو اہل سنت کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کے لیے انہوں نے تجویز کر رکھی ہے۔ ورنہ اہل سنت میں بریلوی اکابر بشریت کے ہرگز منکر نہیں تھے۔ مولانا احمد رضا خاں لکھتے ہیں:۔

اجماع اہل السنۃ ہے کہ بشر میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کے سوا کوئی معصوم نہیں۔[3]

پھر آپ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

قرآن عظیم ناطق ہے کہ آپ نور روشن ہیں اور بشر ہونا اس کے منافی نہیں۔ جیسا کہ وہم کیا گیا ہے۔[4]

نوٹ: یہ وہم کرنے والے کون ہیں۔ وہی نام نہاد شیعہ ذاکر جو آپ کے لیے لفظ نور کی اشاعت محض اس ذہن سے کرتے ہیں کہ جس طرح بن پڑے بشریت اور رسالت میں تنافی پیدا کی جائے۔ اللہ تعالیٰ فسادِ نیت سے محفوظ فرمائے۔

بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس رات معراج پہ گئے حضرت ابوبکر صدیقؓ اس رات ہمہ تن نماز میں رہے۔ آپ کو اس وقت علم نہ تھا کہ حضورؐ کہاں ہیں۔ لیکن آپ کے دل میں یہ داعیہ موجزن تھا کہ آج رات نماز میں ہی گزاریں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب حضورؐ وہاں (ملاء اعلیٰ میں)

---

[1] کتاب الاحتجاج للطبرسی صفحہ ۲۹ [2] رجال مامقانی جلد ا صفحہ ۲۰۸ [3] دوام العیش صفحہ ۲۷ [4] نفی الفئی صفحہ ۲

اللہ کے حضور حاضر ہوں تو آپ (حضرت ابوبکرؓ) یہاں زمین پر اللہ کے حضور حاضر ہیں۔ ابن عربی لکھتے ہیں:۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ ایک ہی مٹی کے خمیر سے پیدا کئے گئے تھے پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معراج کو سبقت لے گئے اور حضرت ابوبکرؓ نماز پڑھتے رہے۔ ان دونوں کا کلام (اس رات) خدا سے کلام تھا۔"[1]

سو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خلقت مٹی سے تھی اور آپ نور کی صفات میں جلوہ گر ہوئے تھے۔ آپ کی ذات سے بشریت کی نفی یہ اہل سنت کا عقیدہ نہیں ہے۔

خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کے عہد خلافت میں حضرت علی مرتضیٰؓ اور حسنینؓ کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ یہاں ایک شیعہ صاحب کہتے ہیں کہ ان حضرات کے ساتھ نہایت بدسلوکی کی جاتی تھی اور ان کی ذات کو ہمیشہ گرانے کی کوشش کی جاتی تھی اور یہ حضرات بھی ان خلفاء ثلاثہ سے نالاں رہتے تھے۔ اس میں کہاں تک حقیقت ہے؟ سائل غلام علی از میاں چنوں ضلع ملتان

جواب: حضرت علی مرتضیٰؓ اور حضرات حسنینؓ خلفائے ثلاثہ کے باسعادت عہد میں نہایت عزت و احترام کے ساتھ دیکھے جاتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت داری کے باعث ہر شخص ان سے محبت کرتا تھا۔ آپ کے اس شیعہ دوست کا یہ خیال غلط ہے کہ ان حضرات سے اچھا سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ شیعہ مذہب کے عقائد کی معتبر کتاب "حق الیقین" میں خلفائے ثلاثہ کے متعلق صراحت سے لکھا ہے:۔

"در ایام امامت خود ظاہراً در اعزاز و اکرام آں حضرت و حضرات حسنین علیہم السلام نہایت مبالغہ مے نمودند"[2]

ترجمہ۔ خلفائے ثلاثہ اپنے عہد خلافت میں علی مرتضیٰؓ، حضرت امام حسنؓ اور امام حسینؓ کے ظاہری اعزاز و اکرام میں بہت ہی زیادہ مبالغہ فرماتے تھے۔

حضرت عمر فاروقؓ کی تو یہ شان تھی کہ ان شہزادوں کو دیکھ کر فرط محبت میں بعض اوقات منبر سے بھی نیچے اُتر آتے تھے پس ان حضرات کے ان خلفائے کرام سے نالاں رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا حضرت ابوبکر صدیقؓ تو باغ فدک کی آمدنی سے ان حضرات کی ضروریات پوری فرماتے تھے اور یہ حضرات اُسے ہمیشہ قبول فرماتے اگر وہ روایات صحیح ہوتیں جن میں ان حضرات کے ناراض ہونے کا بیان ملتا ہے تو

[1] فتوحات مکیہ جلد اول باب دوم صفحہ ۳۰۸ لاہور سٹیم پریس [2] حق الیقین صفحہ ۱۷۷ لکھنو۔

یہ مقدس بزرگ باغ فدک کی آمدنی ہرگز قبول نہ فرماتے اور ناراض ہو کر کنارہ کش رہتے۔ یہ صحیح ہے کہ ان حضرات کا راشن باغ فدک کی آمدنی سے ہی آتا تھا۔ علامہ علی نقی شارح نہج البلاغۃ لکھتے ہیں:۔

"ابوبکرؓ غلہ و سود آں را گرفتہ بقدر کفایت باہل بیت علیہم السلام مے داد و خلفائے بعد او ہم برآں اسلوب رفتار نمودند"[1]

ترجمہ۔ حضرت ابوبکرؓ باغ فدک کا غلہ آمدنی حضرات اہل بیت کو اس قدر بھجواتے کہ انہیں کافی ہو جاتا اور بعد کے خلفاء بھی اسی طریق پر عمل پیرا رہے۔

شارح نہج البلاغۃ کا یہ بیان اہل بیت کی ناراضگی کے وسوسے کو بالکل تار تار کر رہا ہے۔ یہ گمان نہ کیا جائے کہ پھر حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا نے باغ فدک کے مالکانہ حقوق کے لیے دربار خلافت میں اپنا قاصد کیوں بھیجا۔ کیا انہیں اس حدیث پیغمبر کا علم نہ تھا کہ پیغمبروں کی وراثت مال میں نہیں چلتی اور ان کا سب مالی ترکہ بیت المال کا حق ہوتا ہے؟ اس لیے بعض اوقات تعلیم امت کے لیے اور اس لیے کہ سب عوام و خواص کو اس مسئلے کا پتہ چل جائے۔ ایسے عنوانات خود تیار کر لیے جاتے ہیں۔ واقعات کے ضمن میں مسائل کا کھلنا دیرپا نقوش چھوڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظریات کی نسبت واقعات زیادہ پختگی سے محفوظ رہتے ہیں۔ حضرت سیدہ زہراؓ کے مطالبہ فدک سے پہلے پیغمبروں کی وراثت، کا مال میں نہ چلنا محض ایک نظریے اور ایک مسئلے کے درجے میں تھا۔ حضرت سیدہؓ کے اس مطالبہ سے وہ نظریہ ایک واقعہ کی شکل اختیار کر کے اپنے نقوش نہایت گہرے اختیار کر گیا۔ مراد اس سے تادیب امت اور تعلیم امت ہی تھی نہ کہ یہ معاملہ واقعی حضرت فاطمہؓ سے پیش آ رہا تھا۔ اس میں اگر کہیں یہ وسوسہ پیدا ہو کہ حضرت سیدہؓ کے مقام اور احترام کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ جیسا کہ قاضی شوستری کی رائے ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کیا اس اصول کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا کہ بعض اوقات دوسروں کی تادیب کے لیے خود اپنوں سے بھی مخصوص انداز میں ایسا عمل اختیار کرنا پڑتا ہے جو بظاہر دل میں کھٹکنے لگے۔ لیکن حقیقت حال پر اطلاع پانے کے بعد اس میں کوئی غبار باقی نہیں رہتا۔ ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں:۔

"در سیاسیات ملوک و ادب ایشاں بسیار واقع می شود کہ یکے از مقرباں را مورد عتاب مے گردانند کہ دیگراں متنبہ شوند حق تعالیٰ در قرآن مجید بسیار جا نسبت بجناب نبویؐ عتاب آمیز سخن فرمودہ است برائے تادیب امت"[2]

ترجمہ۔ بادشاہوں کی سیاست اور ادب میں بہت دفعہ ایسے واقعات بھی آتے ہیں کہ وہ

[1] شرح نہج البلاغت جلد ۵ صفحہ ۹۶ [2] حیات القلوب جلد ا صفحہ ۳۶۳ ایران

اپنے خاص الخاص لوگوں میں سے کسی کو موردِ عتاب بنا لیتے ہیں اور مراد یہ ہوتی ہے کہ دوسروں کو پتہ چل جائے نہ یہ کہ ان مجرموں کی زجروتوبیخ مراد ہو) خود اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن مجید میں بہت جگہوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی عتاب آمیز انداز میں کلام فرمایا ہے اور مراد وہاں بھی تادیبِ امت ہی ہے (نہ کہ حضورؐ کو معتوب کیا جارہا ہے)۔

یاد رکھیئے کہ اگر حضرت علی المرتضیٰؓ حضرت صدیق اکبرؓ سے دلی طور پر ناراض ہوتے یا انہیں ان کی شان میں شبہ ہوتا تو وہ حضرت صدیق اکبرؓ کے پیچھے ان کے عہدِ خلافت میں نماز نہ پڑھتے اور حضرت صدیق اکبرؓ کو اپنا امام نہ سمجھتے اور نہ ہی کسی صورت میں فاغِ فدک کی آمدنی قبول فرماتے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ۔ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: یہاں پنجاب کے ایک مشہور گدی نشین مقرر نے کہا ہے کہ عورتوں کو غیر محرم ہونے کے باوجود پیروں سے پردہ واجب نہیں۔ جب عورتیں علاج کرانے کی غرض سے ڈاکٹروں سے پردہ ضروری نہیں سمجھتیں تو پیر اور مرشد بھی روحانی ڈاکٹر ہوتا ہے اس سے پردہ کیوں؟ اس کی تفصیل فرمایئے؟

سائل۔ محمد صدیق کھوکھر سنت نگر لاہور

الجواب: غیر محرم پیر سے پردہ ضروری ہے۔ ایسے پیر صاحب کا نوجوان لڑکیوں اور غیر محرم عورتوں میں بیٹھ کر بزرگی کے چٹخارے لینا اور نا جائز انداز میں انہیں اپنے تبرکات سے نوازنا خلافِ شرع اور خلافِ حیائے اسلام ہے۔ ایسے پیروں سے بیعت توڑ لینا واجب ہے۔ اس لیے کہ جو پیر اور بزرگ خدا کے فرمانبردار اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلانے میں وسیلہ نہیں بن سکتا۔ اس سے بیعت کا جوہری مفہوم ہی ضائع ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹروں نے بدن کا علاج کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے بدنی آثار اور علاماتِ مرض اُن کے سامنے آتے ہیں۔ روحانی مشائخ انسانی روح کا تزکیہ فرماتے ہیں۔ اس لیے انہیں روح سے ہی وابستگی ہونی چاہیئے۔ انہیں مریدین کے جسمِ انسانی سے کوئی تعلق بالذات نہیں۔ مولوی احمد رضا خاں صاحب لکھتے ہیں:-

"پیر سے پردہ واجب ہے جب کہ محرم نہ ہو۔"[1]

پھر ان پیروں کے متعلق جو بے حجابانہ اور بے باکانہ عورتوں میں بیٹھتے ہیں۔ بلکہ ان سے حلقہ کراتے ہیں اور انہیں توجہ دیتے ہیں مولوی احمد رضا خاں صاحب لکھتے ہیں:-

"یہ صورت محض خلافِ شرع و خلافِ حیا ہے ایسے پیر سے بیعت نہ چاہیئے۔"[2]

کتبہ۔ خالد محمود عفا اللہ عنہ ۹ر نومبر ۱۹۶۲ء

---

[1] احکامِ شریعت جلد ۲ ص ۱۰۹ مطبوعہ بریلی [2] ایضاً۔

سوال: "دعوت" کی ۲ر نومبر کی اشاعت میں آپ نے لکھا ہے کہ حضرت علی المرتضیٰؓ حضرت صدیق اکبرؓ کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے۔ ایک شیعہ صاحب یہ کہتے ہیں کہ یہ اہل سنت کا اپنا مسئلہ ہے۔ شیعہ کی کتابوں میں کہیں نہیں کہ حضرت ابوبکرؓ حضرت علیؓ کے بھی امام تھے۔ آپ تفصیل فرمائیں کہ شیعہ کتابیں اس مسئلہ میں کیا کہتی ہیں؟

سائل۔ شوکت علی چوک سخی اعتبار سیالکوٹ

جواب: حضرت علی مرتضیٰؓ حضرت ابوبکرؓ کے پیچھے ہی نمازیں پڑھتے تھے اور حضرت ابوبکرؓ کا حضرت علی مرتضیٰؓ کا امام ہونا شیعہ کتابوں سے بھی ثابت ہے۔ یہ کوئی اختلافی مسئلہ نہیں۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت ابوبکرؓ کی اقتدا میں نماز پڑھی ہے اور اپنے سامنے حضرت ابوبکرؓ کو اپنی مسجد شریف میں امام مقرر فرمایا۔ تو یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ حضرت علی مرتضیٰؓ جیسا شخص متبع سنت اور جاں نثارِ ادائے مصطفیٰ اس سے گریز پائی اختیار کرے۔ حضرت علیؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اقتداء میں ہی نماز پڑھتے تھے۔ احتجاج طبرسی میں ہے:-

ثم قام و تہیا للصلوٰۃ و حضر المسجد و صلی خلف ابی بکر۔[1]

ترجمہ۔ پھر حضرت علیؓ اُٹھے، نماز کی تیاری کی مسجد میں آئے اور حضرت ابوبکرؓ کے پیچھے نماز پڑھی۔

اہلسنت کے ہاں اس وسوسے کی کوئی گنجائش نہیں کہ شیر خدا ڈرتے ہوئے اور تقیہ کے ماتحت اُن کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے۔ اسی کی تائید میں شیخ عباس قمی اپنی کتاب کے حاشیہ پہ لکھتے ہیں:-

"بلکہ علی بن عیسیٰ اردبیلی کی کتاب کشف الغمہ میں تو حضرت علیؓ کا حضرت عمر فاروقؓ کے خطبہ جمعہ میں سامعین میں بیٹھنا بصراحت تمام موجود و منقول ہے اور حق یہی ہے کہ حضرت علیؓ سیدنا ابوبکرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ دونوں بزرگوں کو اپنا امام سمجھتے تھے۔"[2]

واللہ اعلم بالصواب۔ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی جنہوں نے حضرت یوسفؑ کو خود ہی کنویں میں گرا دیا اور خود ہی کسی دوسرے خون سے ایک قمیض خون آلود کی اور پھر اجتماعی طور پر ماتم کرتے اور روتے نکلے وہ جنتی ہوں گے یا نہ۔ اس مسئلے میں شیعہ کا کیا موقف ہے؟

سائل۔ عبدالحامد از حسن ابدال

جواب: شیعہ مذہب کی مستند کتاب حیات القلوب میں سچنہ سند سے منقول ہے کہ حضرت امام باقر نے ارشاد فرمایا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے یہ لڑکے یقیناً سعادت مند تھے۔ فرماتے ہیں:-

"از دنیا بیرون نہ رفتند مگر سعادت مندان۔"[3]

ترجمہ۔ حضرت یوسفؑ کے بھائی سعادتمند ہو کر ہی فوت ہوئے اور وہ اپنی تمام غلطیوں سے تائب تھے۔

---

[1] احتجاج طبرسی ص ۶۰ مطبوعہ نجف اشرف [2] منتہی الآمال ص ۱۱۳ [3] حیات القلوب جلد ۱ ص ۱۹۲ ایران

یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ شیعہ مذہب تاریخی پس منظر میں دینِ یہود سے ماخوذ ہے۔ یہود کے ہاں حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ کے بارہ بیٹے عمائد اسرائیل ہیں۔ اثنا عشری شیعوں کے ہاں بارہ امام ہی مامور من اللہ ہیں۔ اب یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ شیعہ ان بھائیوں کے بارے میں جنہوں نے خود حضرت یوسفؑ کو کنوئیں میں پھینکا تھا کسی پہلو سے بُرا کہہ سکیں۔ بارہ کے ماننے والے اُن بارہ سے کیسے مستغنی رہ سکتے ہیں۔

رہا یہ عذر کہ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو موت کے کنوئیں میں اُتارنے کا جو جرم کیا اسے اللہ تعالیٰ نے ان کے ماتمی جلوس نکالنے کے سبب معاف کر دیا۔ یہ لائق پذیرائی نہیں۔ قرآن کریم میں جہاں اس جلوس عزاداری کا ذکر ہے۔ وہاں یہ بھی ذکر ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اسے ہرگز پسند نہ کیا تھا۔ وہ اس ہیئت سے ہی سمجھ گئے کہ خود کوئی کارروائی کر کے آئے ہیں اور اب اپنے جرم کو چھپانے کے لیے انہوں نے یہ ادا اختیار کی ہے۔ اہلسنت کے ہاں برادرانِ یوسف کے اس اجتماعی ماتم میں کوئی پہلو لائق ستائش اور محل سعادت نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: یہاں ایک مولوی صاحب ہیں جو مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ "انہیں قرآن پاک کے سچا ہونے میں شک تھا۔ وہ فرماتے تھے کہ خدا تعالیٰ سے کذب کا صدور ممکن ہے" معاذ اللہ اگر خدائی کلام بھی سچا نہ ہو تو اور کون معیار صدق ہوگا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ تمام علماء دیوبند کا عقیدہ یہی ہے؟

سائل۔ عبدالکریم از دینہ ضلع جہلم

جواب: یہ سب پراپیگنڈہ غلط ہے۔ تمام علمائے دیوبند اللہ رب العزت کو ہر طرح سے عیب اور کمزوری سے منزہ جانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف ان معائب اور قبائح کی نسبت بھی نہیں ہو سکتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر نیکی اور بدی کا پیدا کرنے والا اللہ رب العزت ہی ہے۔ علمائے اہلسنت ایرانیوں کی طرح شر کی تخلیق کے لیے کوئی اور خالق تجویز نہیں کرتے۔ علمائے دیوبند کا عقیدہ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر خیر و شر کا خالق ہے۔ اور اسی کو بعض تفرقہ باز لوگ اور مولوی نما واعظ امکان کذب کے عنوان سے پیش کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جہالت کی ظلمات سے محفوظ فرمائیں۔ دیوبند کے مشہور محدث شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں:-

"خدا تعالیٰ کا خالقِ کذب ہونا تو ضرور لیکن قولاً و عملاً کاذب ہونا محال ہے"[1]

اب جو لوگ یہ پراپیگنڈہ کرتے پھرتے ہیں کہ علمائے دیوبند کے نزدیک خدا تعالیٰ کا کاذب ہونا ممکن ہے۔ کس قدر آخرت سے بے فکر اور جہالت کے نشہ میں چُور ہیں۔

[1] الاسلام ص۳۳ مطبوعہ دیوبند

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ فرماتے ہیں:-

"حق تعالیٰ پر جھوٹ لگانا بہت ہی بڑا گناہ ہے"[1]

ہاں اللہ تعالیٰ صدق و حقیقت کا صدور اپنے پُورے اختیار سے فرماتے ہیں اور حقیقت میں اس کے قادر علی الاطلاق اور پوری طرح مختار ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اسے اس کے خلاف پر بھی قدرت ہو۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ ایسا نہ کرے اور اس کا فیصلہ بھی یہی ہو کہ ایسا وہ ہرگز نہ کرے گا اور بالفعل ایسا وہ کرتا بھی نہیں۔ تاہم اس کے برعکس اسے پوری طرح قدرت حاصل ہے اور اسے سلب کرنا اس کی خدائی شان کے مناسب نہیں۔ اسی بیانِ قدرت کو حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی نے بیان فرمایا اور ان لوگوں نے جو انگریزوں کی خاطر تحریکِ آزادی میں حضرت گنگوہیؒ کے موافق نہ تھے۔ انہوں نے یہ پراپیگنڈہ شروع کر دیا جس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ مراد آباد کے ایک مولوی صاحب مولوی علی احمد نے حضرت گنگوہی سے خود اس باب میں استفسار کیا تھا۔ حضرت کا جواب فتاویٰ رشیدیہ جلد ۱ ص۹ پر اب بھی موجود ہے:-

"ذات پاک حق تعالیٰ جل جلالہ کی پاک و منزہ ہے اس سے کہ متصف بصفت کذب کیا جائے معاذ اللہ تعالیٰ اس کے کلام میں ہرگز ہرگز شائبہ کذب کا نہیں۔ قال اللہ تعالیٰ ومن اصدق من اللہ قیلا۔ جو شخص حق تعالیٰ کی نسبت یہ عقیدہ رکھے یا زبان سے کہے کہ وہ کذب بولتا ہے وہ قطعاً کافر ہے ملعون اور مخالف قرآن اور حدیث کا اور اجماع امت کا ہے۔ وہ ہرگز مومن نہیں۔ تعالیٰ اللہ عما یقول الظالمون علواً کبیراً۔ البتہ یہ عقیدہ اہل ایمان کا سب کا ہے کہ خدائے تعالیٰ نے مثل فرعون و ہامان و ابی لہب کو قرآن میں جہنمی ہونے کا ارشاد فرمایا ہے وہ حکم قطعی ہے اس کے خلاف ہرگز ہرگز نہ کرے گا مگر وہ تعالیٰ قادر ہے اس بات پر کہ ان کو جنت دیوے عاجز نہیں ہو گیا قادر ہے اگرچہ ایسا اپنے اختیار سے نہ کرے گا۔ قال اللہ تعالیٰ ولو شئنا لاٰتینا کل نفس ھداھا ولکن حق القول منی لاملئن جھنم من الجنۃ والناس اجمعین۔ اس آیت سے واضح ہے کہ اگر خدا تعالیٰ چاہتا سب کو مومن کر دیتا۔ مگر جو فرما چکا ہے اس کے خلاف نہ کرے گا اور یہ سب اختیار سے ہے اضطرار سے نہیں وہ فاعل مختار فعال لما یرید ہے۔ یہ عقیدہ تمام علماء[1] امت کا ہے چنانچہ بیضاوی میں تحت تفسیر قولہ

[1] حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ مدارج النبوۃ میں فرماتے ہیں: "اختلاف در آنست کہ آیا جائز ست عقلاً یا نہ معتزلہ کہ برآنند جائز نیست زیرا کہ آن موجب بتہید و تنفیر است و نزد اصحاب ما کہ گروہ اہلسنت والجماعت ایں ہم جائز است کہ حق تعالیٰ یکے را از چاہ ضلالت برآوردہ ہدایت رسانیدہ بمرتبہ نبوت رسانند ولیکن دلیل سمعی بر آنست کہ ایں جائز بوقوع نیامدہ الخ ——
فمن شاء تفصیل ہذہ المسئلۃ فلیرجع الی الجہد المقل وہو تالیف لطیف لمولانا محمود الحسن الدیوبندی رحمۃ اللہ علیہ۔

تعالیٰ ان تغفر لکھا ہے کہ عدمِ غفرانِ شرک کا مقتضی وعید کا ہے ورنہ کوئی امتناع ذاتی نہیں اور
یہ ہے عبارت اس کی "عدمِ غفران الشرک مقتضی الوعید فلا امتناع فیہ لذاتہ" واللہ اعلم بالصواب۔
کتبہ، الاحقر رشید احمد گنگوہی عفی عنہ

سوال: ہفت روزہ "دعوت" کی ۱۲ / نومبر کی اشاعت میں لکھا گیا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام حضرت ابوبکرؓ کے پیچھے نمازیں پڑھتے رہے اور حضرت عمرؓ کے بھی مقتدی رہے۔ میرے ایک شیعہ دوست نے کہا ہے کہ یہ سب کچھ تقیہ کی وجہ سے تھا۔ حضرت علی علیہ السلام نے محض جان بچانے کے لیے ان بزرگوں کی امامت کو تسلیم کیا تھا۔ اس پر میں نے کہا کہ حضرت علیؓ جیسے شیرِ خدا سے یہ امید نہیں کہ وہ ڈر کر غلط کو صحیح تسلیم کر لیں۔ اس پر اس نے کہا کہ قرآن پاک خود تقیہ کی تعلیم دیتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان (جسے مجبور کیا جائے وہ اپنے دل میں ایمان کو قائم رکھ کر زبان سے کفر کا کلمہ بھی جان بچانے کے لیے کہہ سکتا ہے) اسی طرح الا ان تتقوا منھم تقاۃ۔ میں بھی ڈر کی وجہ سے اظہار خلاف الحق کی اجازت ہے۔ اس کی وضاحت فرمائیں؟ سائل۔ اسد اللہ از جہانیاں

جواب: سب سے پہلے تو آپ یہ سمجھ لیں کہ عدمِ اظہار الحق (کسی موقع پر کسی مصلحت کی وجہ سے حق ظاہر نہ کرنا اور خاموش رہنا) اور اظہارِ خلافِ الحق (حق کے خلاف کسی امرِ باطل کا مرتکب ہونا) ان دونوں میں بنیادی فرق ہے۔ اگر کسی وقت کسی مصلحت کی رو سے انسان کو اجازت ہو کہ وہ حق ظاہر نہ کرے اور چپکا ہو رہے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسے اس امرِ باطل اور غلط طریق کار پر عمل پیرا ہونے کی بھی اجازت ہے۔ وہ خاموش تو رہ سکتا ہے لیکن اسے اس غلطی پر مہر تصدیق لگانے کی ہرگز اجازت نہیں۔ آپ کے شیعہ دوست نے جو آیات قرآنیہ پیش کی ہیں ان کا اگر وہ مطلب بھی لے لیا جائے جو وہ بیان کرتے ہیں تو زیادہ سے زیادہ اس سے ایسے مجبوری کے مواقع پر "عدمِ اظہار الحق" کی اجازت ہے "اظہار خلاف الحق" کی اجازت کسی صورت میں نہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی امامت معاذ اللہ ثم معاذ اللہ اگر امامت باطلہ تھی تو پھر حضرت علی المرتضیٰؓ کا ان کے پیچھے نمازیں پڑھنا، ان کے ہاتھ میں ہاتھ دینا اور ان کی بیعت کرنا یہ صرف عدمِ اظہار الحق نہیں، شیعہ عقیدے کے مطابق اظہار خلاف الحق بھی جائز ہے جس کی ان آیاتِ قرآنیہ میں قطعاً کوئی اجازت نہیں۔ آپ کے اس شیعہ دوست کا دعوے تو اظہار خلاف الحق کا ہے۔ جیسا کہ اس کے خیال کے مطابق حضرت علیؓ نے کیا ——— اور دلیل وہ پیش کر رہا ہے عدمِ اظہار الحق کی۔ پس دعوے اور دلیل میں مطابقت نہیں۔ شیعہ علم کلام اور وزن استدلال یہی ہے۔

ثانیاً: یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ بحث اکراہ ایسے ذمہ دار اشخاص کے متعلق نہیں جن پر کہ اظہار حق کا مدار ہو اور جن کے قول و فعل سے دوسروں کو حق و باطل اور حلال و حرام کا پتہ چلتا ہو۔ مثلاً اگر انبیاء کرام خدا تعالیٰ کی رضا کے ترجمان ہیں۔ ان نفوسِ قدسیہ کے قول و فعل یہاں تک کہ ان کی خاموشی سے بھی کسی امر کے اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ یا ناپسندیدہ ہونے کی سند ملتی ہے۔ اب اگر یہ حضرات کسی مصلحت کا شکار ہو جائیں اور جان بچانے کے لیے باطل کی ہاں میں ہاں ملائیں یا کم از کم اظہار حق سے باز رہیں تو آخر حق ظاہر کس طرح ہو گا؛ اور کب ہو گا؟ پس بحث اکراہ اور مجبوری کی اس حالت کو ان غیر ذمہ دار اشخاص سے متعلق سمجھا جائے گا۔ جن کا کتمان حق اور جن کی خاموشی حق کے ظاہر ہونے اور باطل سے ممتاز ہونے پر اثر انداز نہ ہوتی ہو۔

اگر یہ سوال پیدا ہو کہ وہ آیات جن میں کتمان حق کی بہ مصلحت اجازت ہے۔ عام ہیں اور ان کی تخصیص ونقیہ ان لوگوں سے جن پر تبلیغ حق کا مدار نہیں۔ یہ کس دلیل نفی پر مبنی ہے تو اس کے لیے اس قرآنی آیت کو پیش نظر رکھیئے:-

الذین یبلغون رسالات اللہ ویخشونہ ولا یخشون احداً الا اللہ (پ۲۲ سورہ احزاب)

ترجمہ: جو لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں اور اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

اس آیت شریفہ نے بتلا دیا کہ جن پاک ہستیوں پر تبلیغ حق کا مدار ہے وہ اللہ رب العزت کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ پس ان کے کسی مصلحت کے شکار ہونے اور اظہار خلاف الحق پر آمادہ ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ورنہ حق ہی مشتبہ ہو کر رہ جائے گا۔ اصول کا قاعدہ ہے کہ جب علت معلوم ہو تو باقی میں حکم ظنی نہ ہو گا۔ تبلیغ جاری رہے مجروح ہونے نہ پائے یہ علت ہے۔ پس جو بزرگ بھی انبیاء کے منہاج پر ہوں اور ان کی نیابت میں اپنے اپنے وقت میں تبلیغ حق اور اظہارِ حلال و حرام کا مدار اور مرکز ہوں۔ ان کے لیے کتمان حق کا جواز اور خلاف الحق کا ارتکاب کسی صورت میں جائز نہیں رہتا۔

"الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان" کے عموم میں اگر خواہ مخواہ انبیاء کرام اور ائمہ عظام کو بھی داخل کریں تو یہ بھی پیش نظر رہے کہ جہاں عموم الفاظ کا اعتبار کیا جاتا ہے وہاں یہ شرط ہے کہ قرائن و دلائل سے معلوم ہو جائے کہ متکلم کی مراد بھی یہی عموم تھا اور اگر قرائن خود بتلائیں کہ متکلم کی اپنی مراد اتنا عموم نہیں تو اس عموم سے ہر جگہ استدلال نہیں کیا جائے گا۔ جیسا کہ حدیث "لیس من البر الصیام فی السفر" (سفر میں روزہ رکھنا یہ کوئی نیکی نہیں) میں اگرچہ الفاظ کا عموم ہے۔ مگر دوسرے دلائل سے یہ ثابت ہے کہ یہ حکم ہر روزہ دار کے لیے عام نہیں۔ بلکہ صرف انہی روزہ داروں کے لیے ہے جن کی حالت پریشان ہو جائے اسی

طرح ان آیات کو جن سے کتمان حق بضرورت و مصلحت کی اجازت مفہوم ہوتی ہے۔ اگر عموم پر بھی محمول کیا جائے تو پھر بھی "الذین یبلغون رسالات اللہ و یخشونہ ولا یخشون احدا الا اللہ" یہ نص اس کی مخصص ہوگی اور علت معلوم ہونے پر ائمہ بھی (خصوصاً امامت کے اس تصور کے ساتھ جو شیعہ امامیہ میں پایا جاتا ہے) اس تخصیص میں انبیاء کے ساتھ ملحق ہوں گے۔ پس ان کے لیے تقیہ کا جواز کسی صورت میں باقی نہیں رہتا۔

ثالثاً : یہ امر واقع بھی پیش نظر رہے کہ اگر ایسی مصلحتیں حضرت علیؓ کو خلفائے ثلاثہ کی قیادت اور امامت قبول کرنے کے لیے سند جواز بخش سکتی تھیں تو پھر حضرت امام حسینؓ نے میدان کربلا میں تقیہ کیوں نہ کرلیا آخر حضرت علی المرتضیٰؓ حضرت امام حسینؓ سے تو زیادہ بہادر، قرآن دان اور مدبر تھے۔ یہ یقین کیجئے کہ انہوں نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو حق سمجھ کر ہی قبول کیا تھا اور انہیں اپنا حقیقی امام سمجھ کر ہی ان کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے۔ جیسا کہ احتجاج طبرسی ص۶۰ مطبوعہ نجف اشرف میں تصریحاً موجود ہے۔ واللہ اعلم۔

کتبہ۔ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال : اگر کوئی انسان ایک سے زیادہ جگہوں پر بیک وقت حاضر اور موجود ہو تو کیا یہ بات اس کے کمالات میں شمار ہوگی یا نہ ؟

سائل۔ مختار قادری ناظم مجلس غوثیہ لاہور۔

جواب : حقیقی کمالات اسلام کا حصہ ہیں۔ جو چیز اسلام کے باہر بھی موجود ہو وہ حقیقی کمالات میں ہرگز شمار نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ چیز حقیقۃً کمال ہوتی تو رب العزت اسے غیر مسلموں کو ذرہ بھر عنایت نہ فرماتے۔ اس لیے کہ حقیقی دولت صرف اسلام میں ہی ہے۔ اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے بعد یہ دیکھیں کہ بیک وقت کئی جگہوں پہ حاضر ہو سکنا، آیا یہ بات کافروں میں بھی پائی گئی ہے یا نہ۔ اگر پائی گئی ہے تو پھر یہ امر اسلامی کمالات میں ہرگز معدود اور شمار نہیں ہو سکتا۔ جناب مولوی احمد رضا خاں صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ کرشن چندر مہاراج بھی سینکڑوں جگہوں پہ بیک وقت[1] حاضر ناظر تھے۔ پس تعجب ہے کہ ایک ایسی بات جو مسلمانوں سے بھی خاص نہ ہو بلکہ کفار و مشرکین میں بھی موجود ہو سکتی ہو وہ انبیائے کرام اور اولیائے عظام کے لیے مدار کمالات کیسے بنے گی۔ فیا للعجب۔ آپ تو مصر کے ایک گدھے کے بارے میں علم غیب کا عقیدہ رکھتے تھے۔[2]

یاد رکھیئے خوبی اور کمالات کا وہ تصور ہرگز صحیح نہیں جو محض جذبات پر مبنی ہو۔ حقیقی کمال اور شان وہ ہے جس کا کمال اور شان ہونا خود کتاب و سنت میں مذکور و موجود ہو۔ "دعوت" کی ۲۳ نومبر کی اشاعت میں

[1] ملفوظات احمد رضا خاں حصہ اول ص۱۱۴ [2] ملفوظات حصہ چہارم ص۱

کرشن چندر مہاراج کے بیک وقت کئی جگہوں پہ حاضر و ناظر ہونے کا مسئلہ باب الاستفسارات میں منقول ہے اس کا حوالہ ملفوظات حصہ اول ص۱۱۴ میں اس طرح موجود ہے :-

"کرشن کنہیا کافر تھا اور ایک وقت میں کئی سو جگہ موجود ہو گیا۔۔۔۔ شیخ بذات خود ہر جگہ موجود تھے۔ اسرار باطن فہم ظاہر سے وراء ہیں۔"

سوال : اسلام کاروبار کے متعلق حلال اور حرام، اور جائز و ناجائز کی پوری تفصیل کرتا ہے۔ مطلع کریں کہ کیا سناروں کا کام کرنا یا صرافوں کا یہ شرعاً جائز ہے یا ناجائز اور مکروہ ہے۔ اس میں شیعہ مذہب کیا ہے۔ ایک شیعہ نے کہا ہے کہ یہ سب کاروبار مکروہ ہیں ان سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ تو جو شیعہ یہ کام کرتے ہیں کیا وہ سب حرام خور یا مکروہ خور ہیں ؟

سائل۔ عبدالکریم عابد راجہ بازار سیالکوٹ

جواب : اہل سنت کے ہاں سناروں کا کام کرنا اور صرافوں کا کاروبار بشرطیکہ اس میں خارج سے کسی ناجائز کام کو دخل نہ ہو بالکل جائز ہے۔ سنار اور صراف اپنے اپنے فن اور پیشہ کے لحاظ سے ہرگز قابل ملامت نہیں لیکن یہ مسلک صرف اہل سنت والجماعت کا ہے۔ شیعہ کے نزدیک یہ عام پیشے اور کاروبار مکروہ ہیں جن سے پرہیز بہتر ہے۔ آپ کے دوست نے جو کہا ہے وہ شیعہ عقیدے کے لحاظ سے بالکل بجا ہے۔ اُسے ہرگز ملامت نہ کریں۔ یہاں ہر کسی کو اپنے عقیدے کے مطابق بات کرنے کا حق ہے تنگ نظری صحیح نہیں شیعہ حضرات کے نجف اشرف کے مشہور مجتہد حجۃ الاسلام والمسلمین آقا اخوند ملا محمد کاظم خراسانی نے اپنی فقہ کی کتاب ذخیرۃ العباد میں احکام تجارت کی بحث میں اقسام مکاسب بیان فرمائے ہیں۔ پھر جو کسب مکروہ ہیں جن سے بچنا اور پرہیز کرنا بہتر ہے۔ ان کی یہ فہرست پیش کی ہے :-

۱۔ صرافی کرنا۔ ۲۔ کفن بیچنا۔ ۳۔ غلہ بیچنا۔ ۴۔ اُجرت لے کر حجامت کرنا۔ ۵۔ غلام بیچنا۔ ۶۔ قصائی کا کام کرنا۔ ۷۔ اُجرت لے کر دائی کا کام کرنا۔ ۸۔ سنار کا کام کرنا۔ ۹۔ نر حیوان کو اجرت کی شرط پر مادہ پر ڈلوانا۔ ۱۰۔ ان لوگوں کا پیشہ جو لوگوں کے مال میں حرام سے پرہیز نہیں کرتے۔ ۱۱۔ تعلیم قرآن کی اُجرت لینا۔ ۱۲۔ دریا میں تجارت کرنا (مچھلیوں کا کاروبار وغیرہ)۔ ۱۳۔ جانوروں کے خصیے نکالنے میں اجرت لینا مکروہ ہے۔ ۱۴۔ ظالموں سے لین دین کرنا اور ان لوگوں سے لین دین کرنا جو پست[۱۵] طبیعت کے ہیں اور ایسے لوگوں سے معاملہ کرنا جن کے بدن[۱۶] میں خورہ اور پیسی اور اسی قسم کے عیب ہوں۔ ۱۷۔ اور خانہ بدوشوں اور اہلِ ذمہ مثلاً یہود و نصاریٰ سے معاملہ[۱۸] کرنا۔[1]

[1] فتاوے مجتہد اعظم نجف اشرف مندرجہ ذخیرۃ العباد ص۲۱۸

سوال: جو لوگ کفار و مشرکین کی اولاد ہیں یا جو لوگ پہلے خود کفر و شرک سے آلودہ تھے، قبولِ اسلام کے بعد کیا ان میں محض اس لیے کہ وہ کفار و مشرکین کی اولاد ہیں، کوئی کمی اور نقص باقی رہ جاتا ہے۔ سنا ہے کہ وہ آلِ طیب اور ذریّتِ طاہرہ نہیں کہلا سکتے۔ یہ طیب اور طاہر ہونا محض انہی مومنین کے لیے ہے جو اصلابِ طاہرہ سے ہی منتقل ہوتے چلے آئے ہیں؟ سائل حکیم ذوالقرنین از لاہور ..

جواب: قبولِ اسلام کے بعد کوئی کمزوری اور آلودگی باقی نہیں رہ جاتی۔ اسلام قبول کرنے والے کا کفار و مشرکین کی نسل میں سے ہونا کوئی عیب نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے بڑے بدبخت ابوجہل کو بھی مخاطب کرکے ارشاد فرمایا تھا:۔

يا ابا جهل انما رفع عنك العذاب لعلمه بانه سيخرج من صلبك ذرية طيبة۔[1]

ترجمہ۔ اے ابوجہل اللہ تعالیٰ نے تجھ سے عذابِ عامہ اس لیے اٹھایا ہوا ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ تیرے صلب سے ایک ذریتہ طیبہ پیدا ہوگی۔

یہاں ذرّیتِ طیبہ کے الفاظ پوری صراحت سے موجود ہیں، پس جب کہ ابوجہل جیسے ازلی بدبخت کی اولاد میں سے بھی حضرت عکرمہؓ پیدا ہو سکتے ہیں اور اس کی صلب سے بھی طاہر و طیب ذرّیت نکل سکتی ہے تو آباؤ اجداد کا کفر اُن کی مومن اولاد میں کسی قسم کی کمزوری یا نقص کا سبب بن سکتے ہیں۔ آباؤ اجداد تو درکنار انسان نے خود جو اعمال بحالتِ کفر کئے ہوں۔ اگر اسلام لانے کے بعد اس کے اعمال نیک ہوں تو اس پر اس کے اعمالِ جاہلیت سے قطعاً کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ حضرت امام جعفر صادقؒ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا:۔

من احسن فی الاسلام لم يوخذ بما عمل فی الجاهلية۔[2]

ترجمہ۔ جو اسلام قبول کرکے اچھے اعمال کرے تو اسے اعمالِ جاہلیت پر کسی قسم کا کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔

بعض صحابہؓ کی تنقیص محض اس لیے کرنا کہ پہلے وہ خود کفر میں تھے یا اُن کے آباؤ اجداد کفر و شرک سے آلودہ تھے۔ یہ اسلام کی روشن تعلیمات آنحضرت ختمی مرتبتؐ کے ارشادات اور حضرت امام جعفر صادقؒ کی روایات سے بے خبری پر مبنی ہے۔ کتبہ خالد محمود عفا اللہ عنہ ۷، دسمبر ۱۹۶۲ء

سوال: دعوت کی ۲۳، نومبر کی اشاعت میں کرشن چندر مہاراج کے بیک وقت کئی جگہوں پر حاضر و ناظر ہونے کا مسئلہ باب الاستفسارات میں منقول ہے۔ اس کا حوالہ مطلوب ہے؟ سائل

جواب: دراصل یہ مسئلہ میر عبدالواحد بلگرامی کی کتاب "سبع سنابل" کے ص ۱۸۱ سے منقول ہے۔ اصل کتاب

---

[1] احتجاج طبرسی ص ۱۸۱ [2] اصول کافی مع شرح الصافی جلد ۴ ص ۳۶۰

فارسی میں ہے۔ اس میں مخدوم شیخ ابوالفتح جونپوری کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے بیک وقت دس جگہوں کی دعوت منظور فرمالی۔ اس پر حاضرین نے پوچھا کہ آپ نے ہر دس جگہ پر پیشی کی نماز کے بعد جانے کی دعوت منظور فرمالی ہے۔ یہ کیسے ہوگا۔ اس پر حضرت مخدوم نے فرمایا کہ کرشن چندر جو کافر تھا وہ سینکڑوں جگہوں پر بیک وقت حاضر ہو سکتا تھا۔ اگر ابوالفتح نے ایسا کیا تو کون سی تعجب کی بات ہے۔ اصل عبارت یہ ہے:۔

"کشن کہ کافر بود چند صد جا حاضر می شود اگر ابوالفتح دہ جا حاضر شود چہ عجب"

اس سے معلوم ہوا کہ بیک وقت کئی جگہوں پر حاضر و ناظر ہونا یہ امرِ حقیقی کمالات میں سے ہرگز نہیں۔ اگر یہ کوئی حقیقی کمال ہوتا تو رب العزت یہ مقام بعض کافروں کو ہرگز عطا نہ فرماتے۔ جناب مولوی احمد رضا خاں صاحب اس کتاب کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ بارگاہِ رسالت میں پیش اور سرکار کو مقبول ہو چکی ہے۔ (دیکھیے احکامِ شریعت جلد دوم ص ۱۱۸) ہاں اس ذمہ داری میں خان صاحب بریلوی منفرد ہیں کہ کرشن چندر کا کئی جگہوں پر حاضر و ناظر ہونا دربارِ آنحضرت میں مقبول ہو چکا ہے۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ یہ دعوے نہ حضرت مخدوم ابوالفتح کا ہے نہ میر عبدالواحد بلگرامی کا بلکہ اس بات کی تمام تر ذمہ داری جناب خان صاحب پر عائد ہوتی ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ انسانی کمال کو سمجھا نہیں گیا۔ جو بات کافروں میں بھی ہو سکے (جیسے کہ کرشن بیک وقت کئی جگہوں پر حاضر و ناظر ہوا) اسے کبھی کمالاتِ نبوت میں ذکر نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں اگر کوئی بھی پہلو تے کمال ہوتا تو یہ شان کبھی کسی کافر کو نہ ملتی۔ اب جو لوگ انبیاء کے حاضر و ناظر ہونے میں ان کی بڑی شان سمجھتے ہیں انہیں سوچنا چاہیئے کہ اس میں کون سا کمال پیا ہے۔ شیطان کی واردات بیک وقت مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں ہوتی ہے۔ اب اگر مولانا احمد رضا خاں بیک وقت مشرق و مغرب پر واز نہ کر سکیں تو کیا یہ کہا جا سکے گا کہ وہ شیطان کے مرتبہ تک بھی نہیں جا سکے۔ ہرگز نہیں۔ کجا شیطان لعین اور کجا اعلیٰ حضرت۔

اسی طرح مولانا احمد رضا خاں نے یہ بات بھی کھل کر کہی ہے کہ مصر کا ایک گدھا غیب کی باتیں بتاتا تھا اور پھر کہا ہے کہ:۔

"وہ صفت جو غیر انسان کے لیے ہو سکتی ہے انسان کے لیے کمال نہیں اور وہ جو غیر مسلم کے لیے ہو سکتی ہے مسلم کے لیے کمال نہیں۔"[2]

پھر یہ بھی فرمایا:۔

"کشف مسلم تو مسلم کبھی غیر مسلم کو بھی ہوتا ہے۔ صاحبِ کشف ہونے سے ولی ہو جانا ضرور نہیں۔"[3]

مفتی احمد یار گجراتی بھی لکھتے ہیں:۔

---

[1] احکام شریعت جلد ۲ ص ۱۱۸ [2] ملفوظات حصہ اول ص ۱۱۴ [3] ایضاً ص ۱۱

"حاضر و ناظر ہونا بعض بندوں کی صفت ہے"[1]

معلوم نہیں بعض لوگ علم غیب اور حاضر و ناظر ہونے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کس پہلو سے ٹھہراتے ہیں، جب وہ ان امور کو عام دوسرے بندوں میں بھی مانتے ہیں اور علم غیب گدھے میں بھی مانتے ہیں اور کرشن کنہیا کو صدہا جگہ حاضر و ناظر مانتے ہیں۔ تو پھر وہ ان امور کو کمالاتِ نبوت میں کیوں ذکر کرتے ہیں۔ کیا یہ خود نبوت کی شان میں بے ادبی نہیں؟

سوال: آج کل حدیث کا انکار کرنے والے کئی طریقوں سے کام لے رہے ہیں۔ ایک صاحب کہتے ہیں کہ بھائی امام ابو حنیفہؒ نے تو صرف سترہ یا اٹھارہ حدیثوں کو صحیح کہا ہے اور باقی میں اس نے کہا ہے کہ ملاوٹ ہو گئی ہے۔ کیا واقعی امام ابو حنیفہؒ نے سترہ یا اٹھارہ حدیثوں کو صحیح کہا ہے؟

سائل: محمد اسحاق مرزا از باغ گل بیگم مزنگ لاہور

(سائل نے اس کے ساتھ عبد الرحیم کی کتاب Muhammadan Jurispurdence کے ص۳۱ و ص۳۲ کو بھی علیحدہ ٹائپ کرا کر اپنے سوال کے ساتھ لف کیا ہے جس میں واقعی امام ابو حنیفہؒ کے متعلق ایسا ہی کہا گیا ہے۔ ادارہ)

جواب: یہ بات بالکل غلط ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ نے صرف سترہ یا اٹھارہ حدیثوں کو صحیح کہا ہے اس کے لیے کوئی معتبر نقل ہم تک نہیں پہنچی۔ آپ نے جو حوالہ ساتھ لف کیا ہے وہ اس کے لیے کافی نہیں عبد الرحیم صاحب کو اپنے اس دعوے پر کوئی مستند تاریخی شہادت پیش کرنی چاہیئے تھی۔ جو ان کے بیان میں یکسر مفقود ہے۔ امام ابو حنیفہؒ ایک فقیہ اور مجتہد تھے۔ جنہوں نے دوسرے محدثین کی طرز پہ حدیث کی تدوین نہیں کی۔ یہ دوسرے محدثین کتاب العلم، کتاب المناقب، کتاب التفسیر وغیرہ سارے ابواب مرتب کرتے ہیں۔ لیکن ایک فقیہ مجتہد کو زیادہ تر واسطہ احادیث احکام سے ہوتا ہے۔ جن سے مسائل کے استنباط اور استخراج میں دلیل مل سکے۔ سنن ابی داؤد وغیرہ کتب سنن ایسے فقہی ذہن کی ترتیب پر ہی مدون ہوئی ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ نہ صرف ایک بلند پایہ محدث تھے۔ بلکہ ائمہ جرح و تعدیل کے ساتھ بھی ان کا تذکرہ آتا ہے۔ آپ نے حدیث کی کوئی باقاعدہ کتاب ترتیب نہیں دی۔ لیکن فقہی مسائل کے استخراج اور استنباط میں انہوں نے جن جن حدیثوں سے استنباط کیا ہے اگر ایسے تمام شواہد حضرت امام کے تلامذہ کی کتابوں سے جمع کیے جائیں تو ان کی تعداد خود سینکڑوں اور ہزاروں تک جا پہنچتی ہے۔ مؤطا امام محمد، کتاب الآثار، کتاب الحجج،

---

[1] نور العرفان ص۲۴۵ بحاشیہ کنز الایمان

جامع کبیر اور سیر کبیر کے فقہی ذخیروں میں امام ابو حنیفہؒ کی اپنی روایت سے سینکڑوں حدیثیں موجود ہیں۔ جن پر امام صاحبؒ نے کامل اعتماد کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ امام صاحب نے حدیث کی جانچ پڑتال میں بڑی تشدید کی ہے اور بڑی کڑی نظر سے ہر روایت کو پرکھا ہے (کما نص علیہ علی القاری فی سند الانام) لیکن یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ان کا اعتماد صرف سترہ یا اٹھارہ حدیثوں پر ہی تھا۔ یہ امام صاحب کی اپنی مرویات کے ہی خلاف ہے جو اُن کے شاگردوں کی کتابوں میں مدّون صورتوں میں موجود ہیں۔

امام حصنفکی نے اپنی روایت سے حضرت امام کی کچھ مرویات جمع کی ہیں جو مسند امام اعظمؒ کے نام سے معروف ہیں۔ علامہ ملا علی قاری نے اس کی ایک شرح بھی سند الانام کے نام سے لکھی ہے جو شائع ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ علامہ خوارزمی نے بھی امام کی مسانید کو دو ضخیم جلدوں میں جمع کیا ہے جو حیدر آباد دکن سے شائع ہو چکی ہے۔ ان کتابوں کا وجود اور حضرت امام کے تلامذہ کی اپنی تصنیفات میں حضرت امام کی مرویات کی عظیم تعداد اس بات کی کافی شہادت ہے کہ منکرین حدیث کا یہ دعوے کہ حضرت امام کا دعوے صرف سترہ یا اٹھارہ حدیثوں پہ ہی تھا، بالکل غلط ہے۔ یحیٰی بن سعید القطان اور وکیع بن جراح جیسے بلند پایہ محدثین جس امام سے فن حدیث میں تلمذ رکھتے ہوں کیا وہ امام صرف سترہ یا اٹھارہ حدیثوں کا نمائندہ ہوگا؟

امام صاحب کے مذہب میں تو ضعیف حدیث بھی قیاس پر مقدم ہے تو جو بزرگ قیاس کے مقابلے میں ضعیف حدیث پر بھی اعتماد کر لیتے ہیں وہ صرف سترہ یا اٹھارہ حدیثوں پر اعتماد کرنے والے کیسے ہو سکتے ہیں؟ سترہ یا اٹھارہ حدیثوں کا مسئلہ کچھ اور تھا۔ جسے ان منکرینِ حدیث نے اپنا مطلب نکالنے کے لیے کسی اور صورت میں پیش کر دیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ امام اعظمؒ تابعی تھے۔ انہوں نے حضرت انسؓ وغیرہ صحابہ کرامؓ کے دیدار سے خود اپنی نگاہیں منور کی تھیں۔ مؤرخین میں یہ بات چلی کہ حضرت امامؒ نے صحابہ کرامؓ کی زیارت ہی کی یا ان سے براہ راست روایات بھی لیں۔ وہاں بحث کا رُخ اس طرف ہو گیا کہ حضرت امام ابو حنیفہ کو اس طرح کل سترہ یا اٹھارہ روایات پہنچیں وہ قصہ بگڑ کر یہ صورت اختیار کر گیا اور یہ بات خود اپنی جگہ محتاج ثبوت ہے، ورنہ سترہ یا اٹھارہ روایات کا قصہ کسی مستند کتاب، اور معتبر طریق روایات سے پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتا۔ آپ اس کے لیے دار العلوم دیوبند کے محدث حضرت مولانا اصغر حسین صاحب کا رسالہ رحمۃ الرضوان، مولانا شبلی نعمانی کی کتاب سیرت النعمان اور مولانا سرفراز خاں صاحب صفدر کی کتاب مقام ابو حنیفہؒ مطالعہ فرمائیں۔ احقر کا تصنیف کردہ شجرہ علمی میسر آجائے تو اسے ہی دیکھ لیں۔ آپ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچیں گے۔ کہ منکرین حدیث کے لیے اس میں اپنی تائید کی کوئی گنجائش نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ۔ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: اکثر شیعہ اعتراض کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چار صاحبزادیاں ہوتیں تو خطبوں میں صرف حضرت فاطمۃ الزہراؓ کا نام نہ لیا جاتا۔ بلکہ تین بیٹیوں کا نام بھی لیا جاتا۔ کیا کہیں ان باقی بنات النبی کا نام بھی لیا جاتا ہے؟

سائل۔ نور محمد از میانوالی

جواب: بیشک ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں چار تھیں۔ حضرت امام جعفر صادقؒ کا ارشاد سند معتبر سے شیعہ کتابوں میں موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں چار تھیں۔ لیکن ہمارا اہلسنت والجماعۃ کا یہ نظریہ بھی صحیح ہے کہ ان سب میں افضل حضرت فاطمۃ الزہراؓ ہی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سب سے چھوٹی بیٹی تھیں۔ پس فطرتاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ محبت انہی سے تھی۔ حضورؐ کی نسل بھی انہی سے جاری رہی۔ باقی دوسری بیٹیوں کی اولاد تو ہوئی جیسے حضرت رقیہؓ کے بطن سے زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے بطن سے علیؓ نامی صاحبزادے پیدا ہوئے۔ لیکن وہ بچپن ہی میں فوت ہو گئے۔ فتح مکہ کے دن علی بن ابی العاصؓ کو آپؐ نے اپنے کندھوں پہ اٹھایا ہوا تھا۔ تاہم ان کی نسل آگے نہ چلی۔ حضورؐ نے جنت کی عورتوں کا سردار بھی اپنی بیٹیوں میں سے حضرت فاطمہؓ کو ہی فرمایا۔ یہ وہ فضیلت ہے جس کی وجہ سے اہل سنت اپنے خطبوں میں زیادہ ان کا نام لیتے ہیں۔ یہ انتخاب اس حیثیت میں نہیں کہ آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی ہیں۔ بلکہ اس لیے ہے کہ آپ جنت کی عورتوں کی سردار ہیں۔ پس اس سے یہ نتیجہ نکالنا قطعاً صحیح نہیں کہ حضورؐ کی بیٹی ایک ہی تھی۔ علاوہ ازیں کئی حضرات اپنے خطبوں میں ان دوسری بیٹیوں کا نام بھی لیتے ہیں کیوں کہ الفاظ خطبات کچھ توقیفی نہیں اور ایسے خطبے چھپے ہوئے بھی موجود ہیں۔ تاہم آپ اپنے اس شیعہ دوست سے یہ کہیں کہ بیٹیوں کی بات تو چھوڑیئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹوں کے متعلق تو کسی کو کلام نہیں۔ پھر ان کا نام کسی خطبہ جمعہ میں کیوں نہیں لیا جاتا؟ معلوم ہوا کہ خطبوں میں نہ ہونا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد نہ ہونے کی کوئی دلیل نہیں۔

یاد رکھیئے کہ شیعہ بارہ اماموں میں سے کسی امام کا یہ قول ہرگز نہیں دکھا سکتے کہ حضورؐ کی صاحبزادی صرف ایک ہی تھی۔ اس کے برعکس ہم نے حضرت امام جعفر صادقؒ کا قول سند معتبر سے پیش کر دیا ہے۔ کہ حضورؐ کی بیٹیاں چار تھیں۔

کیا ان لوگوں کو حضرت سیدہ کی وہ وصیت یاد نہیں جو آپ نے حضرت علیؓ کو کی تھی کہ میرے بعد میری بہن امامہؓ سے نکاح کرنا۔ ملا محمد بن یعقوب کلینی روایت کرتا ہے:-

اوصت فاطمہ الی علی ان یتزوج ابنۃ اختہا من بعدھا۔[1]

---

[1] الکافی جلد ۵ ص ۵۵۵، ص ۳۷۶، بحار الانوار جلد ۱۰ ص ۶۰ طبع قدیم

حضرت امامہؓ سے روایت کرتے ہوئے کلینی ان کا تعارف اس طرح کراتا ہے:-

عن امامۃ وامہا زینب بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم[1]

ترجمہ۔ امامہؓ سے روایت ہے اور آپ کی والدہ زینبؓ تھیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی تھیں۔

حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا ذکر بھی عام ملتا ہے:-

ماتت رقیۃ ابنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔[2]

شیعہ ذاکروں کی یہ صرف ضد ہے کہ حضورؐ کی صرف ایک بیٹی تھی۔ ملا کلینی کہتا ہے:-

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابا بنات۔[3] "آپؐ کئی بیٹیوں کے باپ تھے"

اور یہ بات بھی غلط ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہؓ کے سوا کسی اور بیٹی کی کبھی کوئی تعریف نہ فرمائی۔ آپؐ نے اپنی صاحبزادی سیدہ حضرت زینبؓ کے بارے میں فرمایا۔ خیر بناتی اصیبت فی۔[4] یہ خیر البنات ہے میری بہترین بیٹی ہے جس نے میری راہ میں بڑے دکھ اٹھائے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے سوا کوئی اور بھی معصوم ہو سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ ملائکہ اور نابالغ بچے بھی معصوم ہیں:-

لقولہ تعالیٰ: لا یعصون اللہ ما امرھم۔ (پ ۲۸ التحریم آیت ۶)

وقال علیہ السلام: رفع القلم عن ثلث وعدّ فیہم الصّبی حتی یبلغ۔

لیکن تینوں کی عصمت مختلف قسم کی ہے۔ حقیقی اور کامل عصمت انبیاء ہی کی ہے کہ باوجود مادہ معصیت اور اسباب معصیت موجود ہونے کے پھر ان سے معصیت کا صدور نہیں ہوتا اور باوجود قدرت علی المعصیت کے رب العزت نے انبیاء کرام کو قبائح اور معاصی سے طبعاً متنفر کیا ہوتا ہے۔ طاعات کی طرف ان کی محض رغبت عقلی نہیں رغبت طبعی بھی ہوتی ہے اور اسی طرح معاصی سے ان کا تنفر محض عقلاً نہیں بلکہ طبعاً بھی ہوتا ہے۔ یا ہیں ہمہ ان کی قدرت علی المعصیت سے انکار کی ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں۔ کوئی صاحب اسے امکان معصیت کا عنوان نہ دینے لگیں، یہ ہمارا مقصد نہیں اور فرشتوں کی عصمت اس بنا پر ہے کہ ان میں معصیت کا مادہ اور خواہش ہی نہیں ہے۔ ہاں بچوں کو با ایں ہمہ معصوم کہتے ہیں کہ قلت عقل کی وجہ سے اُن سے کوئی باز پرس نہیں کی جاتی۔ یہ نہیں کہ ان سے کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ ہاں اس پہ کوئی گناہ ان کو نہیں ہوتا۔ ان تینوں کے سوا کوئی معصوم نہیں۔ عصمت ائمہ دوازدہ بارہ

---

[1] الکافی جلد ۲ ص ۳۷ [2] الکافی جلد ۳ ص ۲۴۱ ص ۱۵۲ [3] الکافی جلد ۶ ص ۵ [4] مجمع الزوائد جلد ۹ ص ۲۱۳

اماموں کے معصوم ہونے کا اعتقاد خود ان کے اصحاب و تلامذہ اور مریدین و معتقدین میں بھی بیشتر موجود نہ تھا کما صرح بہ المجلسی فی حق الیقین. واللہ اعلم بالصواب. کتبہ. خالد محمود عفا اللہ عنہ ۱۴ دسمبر ۱۹۷۶ء

سوال: خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کو صدیق کا لقب کب سے ملا تھا اور کہاں سے ملا تھا. ایک شیعہ صاحب کہتے ہیں کہ صدیق اصل میں حضرت علی المرتضیٰؓ کا لقب تھا. مگر افسوس یہ آہستہ آہستہ حضرت ابوبکرؓ کو دے دیا گیا. اس الزام کی تفصیل مطلوب ہے؟

سعید ظفر چوک سنجی اعتبار شاہ سیالکوٹ

جواب: سیدنا حضرت ابوبکرؓ نے صدیقؓ کا لقب نہ خود اپنے لیے وضع کیا ہے کہ لوگوں کو کہتے پھریں کہ میں صدیق اکبر ہوں اور نہ ہی یہ اعزاز انہیں امت نے بخشا. بلکہ خود لسانِ شریعت نے انہیں صدیق کے لفظ سے نوازا تھا اور یہ اتنا بڑا اعزاز اور اکرام ہے کہ اس کی نظیر ملنی مشکل ہے. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی معیت میں احد پہاڑ پر تھے کہ پہاڑ پر لرزہ طاری ہوا. اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

اسکن احد فلیس علیك الا نبی وصدیق وشہیدان۔[1]

ترجمہ. اے پہاڑ تو سکون کر تجھ پر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہید ہیں۔

اس میں صراحت کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ کے لیے صدیق کا لقب خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔

پھر ملا کلینی کے استاد شیخ علی بن ابراہیم قمی لکھتے ہیں. کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ غار میں تھے تو حضورؐ نے فرمایا کہ "میں جعفر اور دوسرے مہاجرین حبشہ کی کشتی کو سمندر میں ٹھہرے ہوئے دیکھ رہا ہوں. اس پر حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ مجھے بھی دکھائیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آنکھوں پر اپنا دستِ مبارک مل دیا. پھر حضرت ابوبکرؓ نے بھی وہ سارا نقشہ دیکھا. اس سے آگے روایت کے الفاظ یہ ہیں:

فقال لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انت الصدیق۔[2]

ترجمہ. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو کہا کہ آپ ہی صدیق ہیں.

پھر حضرت امام باقرؒ بھی فرماتے ہیں:-

"ہاں وہ صدیق ہیں، صدیق ہیں، صدیق ہیں. جو انہیں صدیق نہ کہے اللہ تعالیٰ اس کی کوئی بات دنیا اور آخرت میں سچی نہ کرے۔[3]"

[1] بخاری جلد ۱ ص ۵۲۳ [2] تفسیر قمی ص ۱۵۷ مطبوعہ ایران [3] کشف الغمہ ص ۲۲۰ ایران

اس دعا کے عربی الفاظ یہ ہیں:-

من لم یقل لہ الصدیق فلا صدق اللہ قولہ فی الدنیا والآخرۃ.

ترجمہ. جو شخص انہیں (حضرت ابوبکرؓ کو) صدیق نہ کہے، خدا اس کی کسی بات کو دنیا اور آخرت میں سچا نہ کرے۔

سیدنا حضرت علی المرتضیٰؓ کے متعلق جس روایت میں صدیق اکبرؓ کا لفظ منقول ہے اور شیعہ اسے استدلال میں پیش کرتے ہیں وہ صحیح نہیں. سنن ابن ماجہ میں وہ روایت اس طرح مروی ہے:-

حدثنا محمد بن اسمٰعیل الرازی حدثنا عبید اللہ بن موسیٰ انبأنا العلاء بن صالح عن المنہال عن عباد بن عبد اللہ قال قال علیؓ انا عبد اللہ و اخو رسولہ وانا الصدیق الاکبر الخ ص ۱۲

"یعنی حضرت علیؓ خود فرماتے ہیں کہ میں خدا کا بندہ ہوں، حضورؐ کا بھائی ہوں اور میں ہی سب سے بڑا صدیق ہوں" (معاذ اللہ)

یہ حدیث درایۃً اور روایۃً کسی طرح صحیح نہیں۔

درایۃً تو اس طرح کہ حضرت علی المرتضیٰؓ کے اخلاقِ فاضلہ ممتاز تھے، طبیعت میں تواضع تھی، حلم اور نرمی بے مثال تھی. یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے منہ سے خود اپنی تعریف کرتے پھریں اور پھر یہاں تک کہہ دیں کہ میں ہی سب سے بڑا صدیق ہوں. داناؤں کا قول ہے:

ستائش خود بخود کردن نزیبد مردِ دانا را

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے لیے جو لفظ صدیق وارد ہے وہ حضرت ابوبکرؓ کی اپنی زبان سے نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اور حضرت امام محمد باقر کے ارشاد سے ثابت ہے. وہ خود اپنے آپ کو صدیق نہیں کہہ رہے۔

روایۃً یہ قول اس طرح صحیح نہیں کہ اس کے راوی عبید اللہ بن موسیٰ خود شیعہ تھے۔[1]

پس ایک شیعہ کی روایت سے اہل سنت کے خلاف کوئی حجت قائم نہیں ہو سکتی. اہلِ سنت کی کتابوں میں اگر یہ منقول ہے تو شیعہ راویوں سے منقول ہے. پس ذمہ داری اصل پر ہے نقل پر نہیں. پھر اس کے راوی منہال بن عمرو پر بھی وہم کی جرح موجود ہے. عباد بن عبد اللہ الکوفی بھی ضعیف ہے۔[2]

امام بخاری نے اپنی تاریخ کبیر کی دوسری جلد میں بھی اس روایت کی تضعیف کی ہے. پیر جھنڈا (سندھ)

[1] کشف الاستار ص ۷ تقریب ص ۲۱۷ [2] دیکھئے کشف الاستار ص ۵ تقریب ص ۱۴۲

کے کتب خانہ میں کتاب الضعفاء للعقیلی کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے۔ اس میں سلیمان بن عبداللہؒ کے ترجمے میں اس روایت پر امام بخاریؒ کی جرح کی پوری توثیق ہے۔ حاصل اینکہ یہ قول حضرت علی المرتضیٰؓ سے درایۃً اور روایۃً ہرگز ثابت نہیں۔ حضرت علیؓ کی شان اس سے بلند ہے کہ خود اپنے منہ سے اور اس انداز سے اپنی تعریف کرتے پھریں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ کتبہ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خالد بن ولیدؓ پر مالک بن نویرہ کو قتل کرنے اور اُس کی بیوی سے دورانِ عدت نکاح کرنے کے الزام میں خالد بن ولیدؓ پر کوئی حد جاری نہیں کی اس کی وجہ کیا تھی؟

سائل: عبدالغفار بابہ ڈیرہ اسماعیل خاں

جواب: آپ کا پیش کردہ الزام جن تاریخی روایات پر مبنی ہے۔ اگر ان روایات کے ضعیف ہونے کو نہ بھی پیشِ نظر رکھا جائے تو زیادہ سے زیادہ اخبارِ احاد ہوں گی اور حضرت صدیق اکبرؓ کا خدا اور اس کے رسول کا محبوب ہونا اور ان کے مقامِ رضا پر فائز ہونا یہ امر اخبارِ متواترہ سے منقول ہے۔ پس جب خبرِ واحد اور خبرِ متواتر میں تعارض ہوگا تو ترجیح خبرِ متواتر کو ہوگی۔ اس لیے ایسے تمام الزامات، جو حضرت صدیق اکبرؓ کے مرکزی تقدس کے خلاف ہوں گے از خود غلط اور افتراء ہوں گے۔

ثانیاً اس الزام کے دو حصے ہیں۔ اوّل مالک بن نویرہ کا قتل۔ دوم دورانِ عدت میں نکاح۔ جہاں تک پہلے حصہ کا تعلق ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریفہ کی خبر سُنکر مالک بن نویرہ نے جسے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وادیٔ بطاح میں اخذِ صدقات کے لیے مامور کیا ہوا تھا۔ وصول شدہ صدقات سب واپس کر دیئے تھے اور یہ بات مشہور تھی کہ مالک بن نویرہ نے وفات کی خبر سُن کر خوشی منانے، حنابندی کرنے، دف بجانے اور اسی طرح فرحت و مسرت کے سب دوسرے آداب اختیار کیے ہیں۔ پھر جب حضرت خالد بن ولیدؓ، طلیحہ بن خویلد اسدی مدعیٔ نبوت کی مہم سے فارغ ہو کر بطاح میں پہنچے اور مالک بن نویرہ حضرت خالدؓ کے سامنے پیش ہوئے تو اتفاق سے مالک بن نویرہ کا اندازِ گفتگو ایسا تھا، جس سے ارتداد کی بُو آرہی تھی۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بات کو نقل کرتے ہوئے مالک بن نویرہ نے کہا:-

قال رجلکم او صاحبکم کذا۔ "تمہارے ساتھی اور تمہارے آدمی نے یوں کہا ہے"

اس پر غیرتِ اسلام حضرت خالد بن ولیدؓ بہت برہم اور مشتعل ہوئے اور مالک کے قتل کا حکم دے دیا۔ پھر اگر یہ قتل بے جا بھی ہوا اور حضرت خالد بن ولیدؓ کا مالک بن نویرہ کے مرتد ہونے کا یقین واقعۃً

غلط بھی ہو تو سوال یہ ہے کہ آیا اس صورت میں حضرت خالد بن ولیدؓ پر قصاص لازم آتا ہے کہ خلیفۂ وقت پر قصاص نہ دلوانے کا الزام قائم کیا جا سکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ادرؤا الحدود بالشبہات واضح ہے کہ شبہات پیدا ہونے سے حدیں ساقط ہو جاتی ہیں اور ہر عدالت میں شک کا فائدہ ملزم ہی کو ملتا ہے یہ اصول فطرتِ شریعت اور قانون کے بالکل مطابق ہے۔ چنانچہ حضرت خالد بن ولیدؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے عہدِ مبارک میں بھی ایک دفعہ ایسی غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے اور ایک پوری کی پوری آبادی کو تہہ تیغ کر دیا تھا۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سخت ناراض ہوئے تھے اور یہ بھی فرمایا تھا:

اللّٰھم انی ابرأ الیك مما صنع خالد۔ ترجمہ۔ اے اللہ! میں خالد کے عمل سے تیری طرف بری ہوتا ہوں۔

لیکن اس لیے کہ خالد بن ولیدؓ شبہ کا شکار تھے اور شبہ سے حدود ساقط ہو جاتی ہیں۔ حضورؐ نے حضرت خالد بن ولیدؓ پر کوئی حد جاری نہ فرمائی تھی۔ تو یہ عمل عین سنتِ خیر الانام کی پیروی ہے نہ یہ کہ اس پر حضرت صدیق اکبرؓ کے خلاف کوئی الزام عائد ہو سکے۔ حضرت خالدؓ حکومت کی طرف سے ایک ڈیوٹی پر مقرر تھے۔ اور اس سلسلے میں ان کی غلط فہمی کی کارروائی کی ذمہ داری بھی حکومت پر ہی عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ اس ذمہ داری سے حضرت صدیق اکبرؓ پوری طرح عہدہ برآ ہوئے اور بیت المال سے مالک بن نویرہ کے خون کی دیت ادا فرما دی۔ اس صورت میں الزام حضرت صدیق اکبرؓ پر وارد نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

امرِ دوم: یہ کہ اس کی عورت سے حضرت خالد بن ولیدؓ نے اسی وقت نکاح کر لیا۔ یہ کسی معتبر کتاب میں قابلِ اعتبار سند سے منقول نہیں۔ اور اگر کہیں یہ واقعہ مذکور ہے تو وہاں اس بات کی بھی تصریح ہے کہ وہ عورت اس وقت مالک بن نویرہ کی قائم نکاح بیوی نہ تھی مطلقہ عورت تھی۔ جس کی عدتِ طلاق پوری ہو چکی تھی۔ پس اس صورت میں عقدِ نکاح پر کوئی شرعی اعتراض لازم نہیں آتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ۔ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلانِ نبوت سے پہلے حضرت ابوبکرؓ کے عقائد کیا تھے۔ کیا وہ حالتِ کفر میں تھے یا آپ ایک خاموش زندگی بسر کرتے تھے۔ اس باب میں اہلسنّت کا عقیدہ کیا ہے؟

سائل۔ عبدالکریم عابد سیالکوٹ

جواب: اہل سنت علمِ کلام کے مقتدر امام شیخ ابوالحسن اشعریؒ ارشاد فرماتے ہیں:-

لم یزل ابوبکرؓ بعین الرضا منہ۔

ترجمہ۔ حضرت ابوبکرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا سے ہمیشہ مالا مال رہے۔

پس جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اعلانِ نبوت سے پہلے ہر طرح کے کفر و شرک سے پاک تھے اسی طرح ان کے رضا یافتہ حضرت صدیق اکبرؓ بھی ہر طرح کے کفر سے بالکل پاک تھے۔ ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رضا بالکفر لازم آتی ہے۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔

علامہ قسطلانی شارح بخاری شیخ ابوالحسن اشعریؒ کے مذکور الصدر ارشاد کے متعلق لکھتے ہیں:۔

فاختلف الناس فی مراده بهذا الکلام والصواب ان یقال ان الصدیق لم یثبت عنه حالت الکفر بالله کما ثبت عن غیره ممن آمن وهو الذی سمعناه من اشیاخنا ومن یقتدیٰ به وهو الصواب انشاء الله تعالیٰ۔[1]

ترجمہ۔ شیخ اشعری کے اس ارشاد کی مراد میں اہل علم کا اختلاف ہے، لیکن اس کا صحیح مفہوم یہی ہے کہ حضرت صدیقؓ سے حالتِ کفر ایک لمحہ کے لیے بھی ثابت نہیں جیسا کہ اور بزرگوں سے ثابت ہے۔ یہی فیصلہ ہم نے اپنے مشائخ اور اپنے ائمہ سے سُنا ہے اور یہی صحیح ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

تاہم اتنی بات مجمع علیہ حقیقت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلانِ نبوت پر حضرت صدیق اکبرؓ کا ایک لمحے کا توقف بھی ثابت نہیں۔

وفی الحدیث ان ابابکر اول المسلمین من الرجال الاحرار کما فی حاشیۃ البخاری ص ۵۱۶ ج ۱

واللہ اعلم بالصواب۔ کتبہ: خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: ایک شیعہ صاحب کہتے ہیں کہ جب حضرت علی مرتضیٰؓ پیدا ہوئے تھے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے منہ میں سب سے پہلے اپنا لعاب دہن ڈالا۔ اس فضیلت کی بنا پر وہ حضرت ابوبکرؓ سے آگے ہیں۔ پھر حضورؐ نے یہ بھی اعلان فرمایا۔ ان علیاً منی وانا منہ (علیؓ مجھ سے ہیں اور میں علیؓ سے ہوں)۔ کیا یہ روایات صحیح ہیں اور کیا ان سے حضرت علیؓ کی افضلیت ثابت نہیں ہوتی؟ از ظفر اقبال صدر تنظیم اہلسنت سیالکوٹ

جواب: یہ روایات اپنی سند کے اعتبار سے صحیح ہوں یا نہ ہوں، لیکن یہ امر یقینی ہے کہ یہ امور کوئی اہم بنائے افضلیت نہیں۔ قرآن عظیم اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو افضلیت کے معیار بیان فرمائے وہ آپ کو دعوتِ صدیق اکبرؓ میں ملیں گے۔ یہاں آپ یہ یاد رکھیں کہ لعاب دہنِ نبوی کا یہ فیض اگر حضرت علی المرتضیٰؓ کے لیے ثابت ہے تو یہی نعمت حضرت صدیق اکبرؓ کے نواسے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے لیے بھی ثابت ہے۔ صحیح بخاری میں ہے:۔

---

[1] ارشاد الساری جلد ص

فکان اول شیٔ دخل جوفه ریق رسول الله صلی الله علیه وسلم ثم حنّکه بتمرة ثم دعا له وبرّک علیه وکان اول مولود ولد فی الاسلام۔[1]

ترجمہ۔ سب سے پہلے جو چیز عبداللہ بن زبیرؓ کے پیٹ میں پہنچی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا لعاب دہن تھا۔ پھر حضورؐ نے انہیں کھجور کا لعاب چکھایا اور پھر انہیں برکت کی دعا دی۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ ہجرت کے بعد سب سے پہلے مولودِ اسلام ہیں۔

ہاں حضرت عبداللہ بن خبابؓ کے متعلق بھی یہ منقول ہے[2] کہ وہ اسلام کے سب سے پہلے مولود ہیں۔

اور حضرت علی المرتضیٰؓ کے متعلق جو یہ ارشاد ہے کہ "ان علیاً منی وانا من علی" اس حدیث سے بصورتِ ثبوت صرف شانِ علی المرتضیٰؓ کا اظہار ہوتا ہے نہ یہ کہ یہ دلیلِ افضلیت ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی ارشاد حضرت سیدنا عباسؓ کے متعلق بھی مروی ہے۔ سنن نسائی میں کتاب القود والدیات باب القود من اللطمہ میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:۔

العباس منی وانا منه۔[3] "بیشک عباسؓ مجھ سے ہے اور میں اس میں سے ہوں"

واللہ اعلم بالصواب۔ کتبہ: خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: آپ نے ڈیرہ اسماعیل خاں میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی افضلیت پر تقریر فرمائی تھی۔ ایک عزیز کہنے لگے کہ صحابہ کرامؓ میں افضلیت کی بحث نہ چھیڑی جائے۔ سب کی اپنی جگہ شان اور فضیلت بیان کر دینا ہی کافی ہے۔ آپ کے دلائل تو یقیناً صحیح اور عقل سلیم کے بالکل مطابق تھے۔ لیکن بعض صحابہؓ کی افضلیت بیان کرنے سے بعض دوسروں کی تنقیص ہونے کا خطرہ ہے۔ اس خیال سے افضلیت کی بحث زیادہ مناسب معلوم نہیں ہوتی۔ اپنے ارشاد سے مطلع فرمائیں؟ سائل: سفیر الدین از ڈیرہ اسماعیل خاں

جواب: یہ گمان کہ تفضیل اور افضلیت سے دوسروں کی تنقیص ہو جاتی ہے صحیح نہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ تلك الرسل فضّلنا بعضهم علیٰ بعض۔ (کہ ہم نے رسولوں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی) پس جب کہ انبیائے کرام کے بھی اپنے اپنے مدارج ہیں۔ تو صحابہ کرامؓ بھی جن کی زندگیاں منہاجِ نبوت پر تھیں۔ ان کے اپنے اپنے مدارج کیوں نہ ہوں گے اور جس طرح بعض پیغمبروں کی افضلیت سے بعض دوسرے پیغمبروں کی تنقیص لازم نہیں (یاد رہے کہ کسی ایک پیغمبر کی ادنیٰ تنقیص بھی یقینی طور پر کفر ہے۔ کیونکہ یہ خدائی انتخاب پر گرفت ہے۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) پس صحابہ کرامؓ کی افضلیت سے بعض دوسرے صحابہؓ کی تنقیص

---

[1] صحیح بخاری جلد ۱ ص ۵۵۵ [2] سنن نسائی جلد ۲ ص ۲۱۱

ہرگز لازم نہیں آتی۔

یا در کھیئے کہ سب صحابہؓ ہم اہلسنت کے سروں کے تاج اور سب ہی آسمانِ ہدایت کے روشن ستارے ہیں۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ کا سب سے افضل ہونا یہ سب اہل سنّت کا بنیادی عقیدہ ہے۔ اور تمام ائمہ اعلام اور علمائے کلام کا اس پر اجماع ہے۔

امام حدیث امام ابو داؤد سجستانی نے اس تفضیل پر باقاعدہ باب باندھا ہے[1]

پس اس کا بیان بھی لازم ہے۔ جو شخص حضرت صدیق اکبرؓ کی علی الاطلاق افضلیت کا قائل نہیں ہے وہ اہلِ بدعت میں شمار ہوتا ہے اور اہلسنت کے دائرہ سے خارج ہے هذا ما ظهر لى والله اعلم بالصواب۔

کتبہ۔ خالد محمود عفا اللہ عنہ ۲۱، ۲۸ دسمبر ۱۹۶۲ء

سوال: "دعوت" کے صدیق اکبرؓ نمبر میں صلا پر لکھا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ پر کسی اور بزرگ کو فضیلت دینے والے کا کوئی عمل آسمان کی طرف نہیں اُٹھتا یعنی درجہ قبولیت حاصل نہیں کرتا۔ کیونکہ پاک کلمے اور صحیح اعمال ہی اُوپر اٹھتے ہیں۔ جواب طلب امر یہ ہے کہ ایسا کہاں لکھا ہے کسی معتبر کتاب کا حوالہ دیں؟

سائل۔ ارشاد احمد از سرائے عالمگیر نزد جہلم

جواب: احقر نہ مجتہد ہے، نہ مدعیٔ اجتہاد۔ اور نہ "دعوت" اچھرہ سے شائع ہوتا ہے۔ "دعوت" کا مسلک سلف صالحین کے عقائد و نظریات کی تائید و تبلیغ ہے۔ مسلمانوں کے موجودہ انحطاط کا باعث تحقیقات کی کمی نہیں محض تعلیمات کی کمی ہے۔ ورنہ تحقیقات کا کون سا ایسا باب ہے جس میں ہمارے اسلاف و اکابر ہر پیاسے کو سیراب نہ کر گئے ہوں۔ اور پھر عقائد جیسے نازک معاملہ میں نئے نئے اجتہادات کی اختراعیں..... یہ وہ راہیں ہیں جن سے اسلامی فکر و عمل کی شاہراہیں ہمیشہ گدلی ہوتی رہی ہیں۔ آپ نے جس مسئلہ کا ذکر کیا ہے اس میں بھی حسب دستور ہم سلف کے تابع ہیں۔ حدیث کی مشہور و مستند کتاب سنن ابی داؤد جلد دوم میں کتاب السنۃ میں ایک مستقل باب ہے جس کا نام "باب فی التفضیل" ہے۔ اس میں ہے:۔

من زعم ان عليًّا رضى الله عنه كان احق بالولاية منهما فقد خطّا ابابكرؓ و عمرؓ والمهاجرين والانصار وما اراه يرتفع له مع هذا عمل الى السماء[2]

ترجمہ۔ جو شخص یہ گمان کرے کہ حضرت علی المرتضیٰؓ خلافت کے پہلے دو بزرگوں سے زیادہ حقدار تھے تو ان کا کوئی عمل اس غلط عقیدے کے ساتھ آسمان کی طرف اٹھتا نظر نہیں آتا۔

---

[1] دیکھئے سنن ابی داؤد جلد ۲ صفحہ ۶۳۶ [2] سنن ابی داؤد جلد ۲ صفحہ ۶۳۶

اور پاک کلمے اور صحیح اعمال ہی اُوپر اٹھائے جاتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے:۔

واليه يصعد الكلم الطيب والعمل الصالح يرفعه. والله اعلم بالصواب۔ (پ۲۲ فاطر ع۲)

کتبہ۔ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: "دعوت" کے صدیق اکبرؓ نمبر میں حضرت ابوبکرؓ کے فضائل بہت درج ہیں لیکن یہ کہیں نہیں ملا کہ ان کی پیدائش خانہ کعبہ اور قبلہ شریف میں ہوئی ہو؟

کسے را میسر نہ شد ایں سعادت ۞ بکعبہ ولادت، بہ مسجد شہادت

السائل۔ مسرت جعفری چوک سخی اعتبار سیالکوٹ

جواب: جس وقت حضرت صدیق اکبرؓ کی ولادت ہوئی۔ اس وقت خانہ کعبہ بتوں کا مرکز تھا۔ اللہ کے گھر کو مشرکین مکہ نے ہر طرح کے کفر و شرک سے آلودہ کر رکھا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبرؓ اپنے جوہر فطرت اور اپنی طبعی لطافت میں ہر طرح کے کفر و شرک سے پاک اور جملہ قبائح و معائب سے طبعاً بیزار تھے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان کی پیدائش اس جگہ پر ہو جہاں ذات وحدہٗ لاشریک کے مقابلہ میں سینکڑوں بُت کفر و شرک کی داد پا رہے ہوں اور جہاں حج کے مقدس دنوں میں بھی شیطان ننگا ناچتا ہو۔ رب العزت کو منظور نہ ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریف اور حضرت صدیق اکبرؓ کا ولود مسعود اس جگہ ہو۔ اگر اسے صدیق اکبرؓ کے حق میں ایک کمی سمجھا جائے تو پھر ذات رسالت اور حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے متعلق بھی کیا یہی کہا جائے گا۔

ثانیاً کعبہ شریف ان دنوں قبلہ بھی کب تھا کہ حضرت صدیق اکبرؓ کی ولادت قبلہ شریف میں نہ ہونا ایک کمزوری سمجھ لی جائے۔ اس وقت قبلہ خانہ کعبہ نہیں، بلکہ بیت المقدس تھا۔

ثالثاً بچے کی پیدائش کے متعلق والدہ کے لیے جو شرعی حکم جنابت ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ ایسے وقت والدہ زچگی کے ارادے سے ایسی پاک جگہ اور مقدس مقام پر نہ آئے۔ اس لیے صدیق اکبرؓ کی والدہ اگر اس وقت کعبہ میں نہ آئیں تو یہ کوئی وجہِ ملامت نہیں۔ ہاں حضرت حکیم بن حزامؓ صحابی اگر کعبہ میں پیدا ہوئے تو یہ ایک اتفاقی امر تھا۔

کتبہ۔ خالد محمود عفا اللہ عنہ ۴، ۱۱ جنوری ۱۹۶۳ء

سوال: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیر معراج کے متعلق صحیح عقیدہ کیا ہے؟ حضور انورؐ کو یہ سیر جسمانی طور پر کرائی گئی یا یہ ایک روحانی سیر تھی۔ اگر یہ ایک جسمانی سیر تھی تو پھر بعض روایات میں واقعہ معراج مذکور ہونے

کے بعد یہ الفاظ کیوں کہے. ثم استیقظت کہ "پھر میں جاگ پڑا" اس سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے کا سارا واقعہ ایک خواب کا واقعہ تھا. پھر یہ معراج جسمانی طور پر کیسے صحیح ہوا؟ سائل. عبدالرزاق از سعدی پارک لاہور

جواب: جمہور اہل اسلام کا یہی عقیدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سیر جسد عنصری کے ساتھ بحالتِ بیداری کرائی گئی اور معراج شریف کا واقعہ جسمانی طور پر ہی عمل میں آیا اور یہی ہمارا اہلسنت کا عقیدہ ہے۔

(۱) ——— حافظ ابن قیم فرماتے ہیں:۔

ثم اسری برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بجسدہ علی الصحیح۔[۱]

ترجمہ. صحیح یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سیر معراج آپ کے جسدِ اطہر سمیت کرائی گئی۔

(۲) ——— حضرت امام شاہ ولی اللہ صاحبؒ محدث دہلوی فرماتے ہیں:۔

اسری بہ صلی اللہ علیہ وسلم الی المسجد الاقصیٰ ثم الی سدرۃ المنتہیٰ والی ما شاء اللہ وکل ذٰلک بجسدہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فی الیقظۃ۔[۲]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد اقصیٰ تک پھر وہاں سے سدرۃ المنتہیٰ تک اور پھر وہاں سے اس مقام تک جہاں بھی خدا کو منظور تھا حضورؐ کو معراج کی سیر کرائی گئی اور یہ سب کچھ جسدِ اطہر کے ساتھ عالم بیداری میں واقع ہوا۔

(۳) ——— دارالعلوم دیوبند کے محدثِ جلیل شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحؒ لکھتے ہیں:۔

ان الاسراء والمعراج وقعا فی لیلۃ واحدۃ فی الیقظۃ بجسد النبی صلی اللہ علیہ وسلم وروحہ بعد المبعث والی ھٰذا ذھب الجمھور من العلماء المحدثین والفقہاء والمتکلمین وتواردت علیہ ظواھر الاخبار الصحیحۃ ولا ینبغی العدول عن ذٰلک اذ لیس فی العقل ما یحیلہ حتیٰ یحتاج الیٰ تاویل قلت ولاسیما فی ھٰذا العصر الذی شاھد الناس فیہ من التجارب الروحیۃ والاعمال الکھربائیۃ ماترک الاوھام حائرۃ۔[۳]

ترجمہ. حافظ عسقلانی لکھتے ہیں کہ اسراء اور معراج دونوں ایک ہی رات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ اطہر اور روحِ انور کے مجموعہ کے ساتھ عالم بیداری میں واقع ہوئے اور یہ واقعہ بعثتِ شریفہ کے بعد عمل میں آیا. جمہور علماء محدثین فقہا اور متکلمین کا یہی فیصلہ ہے. صحیح احادیث کے ظاہر فیصلے بھی یہی ہیں جن سے روگردانی کرنا صحیح نہیں. عقل اسے محال قرار نہیں دیتی کہ اس کی کوئی تاویل کرنی پڑے. میرے خیال میں اس زمانے میں تو خاص کر

---

[۱] زاد المعاد جلد ۱ صفحہ ۳۰۰. [۲] حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ صفحہ ۱۹۰ مصر [۳] فتح الملہم جلد ۱ صفحہ ۳۱۶

اس کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں. کیونکہ روحی تجربات اور برقی اعمال نے انسانی فکر و گمان کو نہایت حیرت میں ڈال رکھا ہے۔

(۴) ——— نواب صدیق حسن خاں صاحب تفسیر فتح البیان میں لکھتے ہیں:۔

"جس امر کی کثرت سے احادیثِ صحیحہ دلالت کرتی ہیں وہ یہ ہے جس کی طرف سلف و خلف کے اکثر اکابر گئے ہیں کہ اسراء آپ کے جسد شریف اور روح کے ساتھ عالم بیداری میں تھا"[۱]

ثُمَّ اسْتَیْقَظْتُ کی روایات کا جواب

پہلا جواب. معراج شریف کا واقعہ اتنا طویل البیان ہے اور اس کی جزئیات اس قدر طویل ہیں کہ اس کے تذکرے میں بعض امور کا آگے پیچھے ہو جانا کوئی تعجب خیز بات نہیں. یہاں جس جاگنے کا بیان ہے یہ وہ جاگنا ہے جو پہلے مسجد حرام میں واقع ہوا تھا. جب کہ حضرت جبریل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لینے آئے تھے. اس وقت حضورؐ بیدار ہوئے اور پھر یہ واقعہ معراج عمل میں آیا. کسی راوی نے اس جاگنے کا یہ جزو آخر میں بیان کر دیا جس سے یہ وہم ہونے لگا کہ شاید یہ واقعہ خواب کا ہو. آئیے دیکھیں کہ اس حدیث کی روایات میں کوئی ایسا راوی تو نہیں جو تقدم تاخر کا مرتکب ہوتا ہو. صحیح بخاری کتاب التوحید میں "فاستیقظ" کی روایت کہ "حضورؐ پھر جاگ پڑے شریک بن عبداللہؓ کی روایت سے مروی ہے"[۲] اور شریک بن عبداللہؓ تقدم و تاخر کے مرتکب ہوا ہے. صحیح مسلم کے متن میں واقعہ معراج میں ہی امام مسلم کی یہ تصریح موجود ہے:۔

قدم فیہ شیئاً واخر وزاد ونقص۔[۳]

ترجمہ. شریک نے مضمون کو آگے پیچھے کر دیا ہے اور کمی بیشی کا مرتکب ہوا ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ نے معراج کی روایات میں راویوں کے ذکر و حذف، اختصار و اجمال اور تفسیر و تشریح کے ایک عمومی صورت میں واقع ہونے کی تصریح فرمائی ہے۔[۴]

حافظ ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں اس روایت کا جواب شریک بن عبداللہؓ پر جرح کی صورت میں ہی پیش کیا ہے (دیکھئے زاد المعاد جلد ۱ صفحہ ۳۰۲) علاوہ ازیں حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے بھی فتح الباری جزو ۲ صفحہ ۱۷۷ دہلی میں اسے ایک جواب کی صورت میں جگہ دی ہے. حافظ ابن کثیرؒ کہتے ہیں کہ شریک بن عبداللہؓ کی روایت میں جو ثم استیقظتُ کے الفاظ وارد ہیں وہ شریک کی اغلاط میں شمار ہیں۔[۵]

---

[۱] فتح البیان جلد ۳ صفحہ ۲۸ [۲] دیکھئے جلد ۲ صفحہ ۱۱۲۰ سطر ۳ طبع دہلی [۳] صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۲۲۴ مع الفتح [۴] دیکھئے البدایہ والنہایہ جلد ۳ صفحہ ۱۱۱ مصر [۵] البدایہ والنہایہ جلد ۳ صفحہ ۱۱۴

دوسرا جواب۔ اگر اس جاگنے کو آخری احوال پر محمول کیا جائے تو اس سے وہ جاگنا مراد ہو گا جو سیر معراج سے واپسی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پھر سو جانے کے بعد حسبِ معمول ظہور پر آیا علامہ قرطبی لکھتے ہیں:۔

یحتمل ان یکون استیقاظاً من نومة نامها بعد الاسراء لان اسراءه لم یکن طول لیلة۔[1]

ترجمہ۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں وہ جاگنا مراد ہو جو آپ معراج سے واپسی پر سونے کے بعد پھر جاگے کیونکہ سیرِ معراج ساری رات تو ہوتی نہ رہی تھی۔

تیسرا جواب۔ عربی محاورہ میں ایک حالت سے دوسری میں آنے کو بھی تیقظ یعنی جاگنے سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب طائف میں گئے اور لوگوں نے آپ کی تکذیب کی تو حضورؐ نہایت غمگین حالت میں واپس ہوئے۔ اس غم کا آپ پر بہت اثر تھا۔ ابو اسید جب اپنے لڑکے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گھٹی دلانے کے لیے لایا، تو اس نے اپنے لڑکے کو حضورؐ کی ران پر بٹھا دیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باتوں میں مشغول ہو گئے۔ ابو اُسید نے اس دوران میں لڑکا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ران سے اُٹھا لیا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پہلی گفتگو کی حالت سے اس دوسری حالت کی طرف متوجہ ہوئے تو کہا کہ لڑکا کہاں ہے۔ حدیث میں آتا ہے:۔

ثم استیقظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلم یجد الصبی فسأل عنه فقالوا رفع فسماه المنذر۔[1]

ترجمہ۔ پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس حالت سے اس طرف متوجہ ہوئے (یعنی تیقظ میں آئے) تو آپ نے اس لڑکے کو اپنے پاس نہ پایا۔ پس آپ نے لوگوں سے اس کی بابت پوچھا۔ لوگوں نے کہا کہ اسے اٹھا لیا گیا تھا۔ پھر حضورؐ نے اس کا نام منذر رکھا۔

اس کے جاگنے کے متعلق حافظ قرطبیؒ لکھتے ہیں:۔

ویحتمل ان یکون المعنی افقت مما کنت فیه مما خامر باطنه من مشاهدة الملاء الاعلیٰ لقوله تعالیٰ لقد رای من ایات ربه الکبریٰ فلم یرجع الی حالة البشریة الا وهو فی المسجد الحرام۔

ترجمہ۔ اس کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مجھے اس حالت سے افاقہ ہوا جس میں کہ میں پہلے تھا آپ ملاء الاعلیٰ کے مشاہدہ میں اپنی باطنی توجہ پوری طرح لگا چکے تھے اور اپنے پروردگار کی آیاتِ کبریٰ مشاہدہ فرما چکے تھے پس جب آپ پھر بشری کی طرف لوٹے تو آپ مسجد حرام میں ہی تھے۔

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۳ صفحہ ۱۴۷

حافظ ابن کثیر کی رائے یہ ہے کہ شریک بن عبداللہؓ کی روایت کو اس معنی پر محمول کرنا اسے غلط قرار دینے کی نسبت زیادہ اچھا ہے ــــــ حاصل اینکہ فاستیقظت اور فاستیقظ کی روایت یا اصلاً صحیح نہیں اور یا ذومعنی ہے جو اپنے معنوں پر محمول نہیں معنی خفی پر مشتمل ہے اور اس کے مقابلہ میں اصح روایات اور اکثر روایات یہی کہہ رہی ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا، پھر میں مکہ آ گیا۔ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی لکھتے ہیں:۔

بعض احادیث میں صاف لفظ ہیں۔ صبحت بمکة یا اتیت بمکة (پھر صبح کے وقت میں مکہ پہنچ گیا) اگر معراج محض کوئی روحانی کیفیت تھی تو آپ مکہ سے غائب ہی کہاں ہوئے تھے۔[1]

واللہ اعلم بالصواب۔ کتبہ۔ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال ۲: قرآن پاک نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کو لفظ "رؤیا" سے بھی بیان کیا۔ فی قولہ تعالیٰ و ماجعلنا رؤیاك التی ارینك الا فتنة للناس اور رؤیا خواب کو کہتے ہیں۔ پس معراج ایک واقعۂ خواب ہوا یہ نہیں کہ آپؐ نے خود چشم مبارک سے یہ مشاہدات دیکھے تھے؟ عبدالحفیظ از کوہاٹ

جواب: بے شک رؤیا کا لفظ خواب کے معنی میں بھی آتا ہے اور اکثر ایسا ہی ہے۔ لیکن یہ لفظ کبھی کبھی مطلق رویت کے معنی میں بھی آتا ہے اور علامہ قسطلانیؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔ یہاں اس آیت سے مراد اگر یہ واقعہ معراج ہی ہے تو لفظ رؤیا حقیقی طور پر آنکھوں سے دیکھنے کے معنی میں وارد سمجھیے نہ کہ خواب کے معنی میں۔ ترجمان القرآن حضرت ابن عباسؓ اس آیت کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں:۔

عن ابن عباس وماجعلنا الرؤیا التی ارینك الا فتنة للناس قال هی رؤیا عین اریها رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلة اسریٰ به۔[2]

ترجمہ۔ حضرت ابن عباسؓ اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ اس سے مراد آنکھوں کا دیکھنا ہے جو حضورؐ کو معراج کی رات دکھایا گیا۔

کتبہ۔ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال ۳: "دعوت" کی کسی سابقہ اشاعت میں نظر سے گزرا تھا کہ معراج شریف کے جسمانی ہونے پر تمام صحابہؓ کا اجماع ہے۔ ایک مرزائی کہتے ہیں کہ یہ بالکل غلط ہے۔ اکثر صحابہؓ معراج کو روحانی مانتے تھے۔ یہ معراج جسمانی کا عقیدہ بہت بعد کی پیداوار ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جسمانی طور پر اُوپر اٹھائے جانے کے خیال کی تائید کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ اس اجماع کا حوالہ مطلوب ہے؟ منصور علی از کیمل پور

---

[1] فوائد تفسیریہ صفحہ ۳۶۵ [2] بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۸

جواب : مرزا غلام احمد قادیانی خود لکھتے ہیں :۔

"اس بارہ میں کہ وہ جسم سمیت شبِ معراج میں آسمانوں کی طرف اٹھائے گئے تقریباً تمام صحابہ کا یہی اعتقاد ہے"[1]

مرزا صاحب نے اس کتاب کے ص۱۴۸ کی آٹھویں سطر میں اس کے لیے اجماعِ صحابہؓ کا لفظ بھی بیان کیا ہے[2]۔ امید ہے کہ اب آپ کے مرزائی دوست کا کوئی شبہ باقی نہیں رہا ہوگا۔ باقی رہا نہ ماننا تو یہ دلوں کی مہر کا ایک ظاہری نشان ہے۔ حق تعالیٰ اتباعِ حق کی توفیق عطا فرمائیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ۔ خالد محمود عفا اللہ عنہ ۱۸ جنوری ۱۹۶۳ء

سوال : آپ کے "دعوت" کا مطالعہ جاری ہے۔ اس میں بعض جگہ حضرت علیؓ کے ساتھ علیہ السلام لکھا ہوتا ہے کیا یہ جائز ہے یا ناجائز۔ اگر جائز ہے تو پھر حضرت صدیق اکبرؓ کے نام پر کیوں ایسا نہیں لکھا جاتا۔ حالانکہ حضرت صدیق اکبرؓ تو حضرت علیؓ کے بھی امام تھے اور حضرت علیؓ حضرت ابوبکرؓ کے پیچھے ہی نماز پڑھتے تھے اور حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت بھی کی ہوئی تھی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ حضرت علیؓ کے ساتھ تو آپ علیہ السلام لکھیں اور ان کے اپنے امام اور پیشوا پر صرف رضی اللہ عنہ لکھیں؟ عبدالعزیز جماعت دہم جامپور

جواب : انبیاء کرام علیہم السلام کے سوا کسی کے لیے بھی اس طرح بالاستقلال صلوٰۃ و سلام لکھنا اہلسنّت و الجماعت کے نزدیک جائز نہیں۔ آپ نے "دعوت" کے جن پرچوں میں حضرت علیؓ کے نام کے ساتھ علیہ السلام آپ کے لیے لکھا دیکھا ہے وہ کاتب کی غلطی ہے ادارے کی نہیں۔ کاتب لوگ عام طور پر صاحبِ علم نہیں ہوتے اور جہاں کسی بزرگ یا شخصیت کا نام آجائے وہیں اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ تعظیمی الفاظ لکھ دیتے ہیں اور ایسا زیادہ تر اس رواجِ عام کی بنا پر ہے جو عملاً پہلے سے رائج ہے مسئلہ وہی ہے جو ہم نے لکھ دیا ہے۔ اور اگر علیہ السلام، اور السلام علیہ میں فرق نہ بھی کیا جائے اور اس لیے کہ ہم روزمرہ ایک دوسرے کو السلام علیکم کہتے ہیں۔ اور تمام بزرگانِ دین کے نام کے ساتھ علیہ السلام لکھنے کو جائز قرار دیا جائے تو بھی اس میں اہل بدعت کے شعار پر عمل لازم آتا ہے۔ اس لیے ایسے تمام آداب سے بچنا لازم ہے۔ سیدنا حضرت ملا علی قاری علیہ الرحمۃ شرح فقہ اکبر کے ملحقات میں فرماتے ہیں :۔

ان قول علی علیہ السلام من شعار اھل البدعۃ فلا یستحسن فی مقام المرام۔[3]

"حضرت علیؓ کے نام کے ساتھ علیہ السلام لکھنا اہل بدعت کا شعار ہے پس یہ مقامِ مقصود پر بھی مناسب نہیں۔"

[illegible] ۱۳۲۰ھ [illegible] ص۲۰۴ مطبع کانپور

اور اگر کسی جگہ اس کا شعار اہل بدعت ہونا ثابت اور واقع نہ ہو تو بنابریں قول کہ السلام علیہ اور علیہ السلام میں کوئی فرق نہیں۔ اسے حضرت صدیق اکبرؓ کے نام کے ساتھ لکھنا بھی جائز ہوگا۔ پھر قوموں کے شعار زمانہ کے اختلاف سے بدلتے رہتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اہل کتاب اپنی عبادت گاہوں میں جوتے سمیت نہ جاتے تھے۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ رب العزت نے کوہ طور پر جب اپنی مثالی تجلی کا نزول اجلال فرمایا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا تھا۔ فاخلع نعلیك انك بالواد المقدس طوی۔ کہ اپنے جوتے اتار دیں، آپ ایک پاکیزہ وادی میں تشریف رکھتے ہیں۔ آنحضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مسئلے کا ذکر کرکے اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ مشابہت پکڑنے سے منع فرماتے ہوئے اپنی امت کو جوتوں سمیت عبادت کے لیے آنے کا حکم دیا تھا (بشرطیکہ جوتے ناپاک نہ ہوں) لیکن آج جب کہ اہل کتاب اپنے اس شعار کو چھوڑ چکے ہیں اور اب وہ اپنے گرجوں اور کلیسوں میں بوٹوں سمیت جاتے ہیں تو اب اس تشبہ سے گریز اور ان کے شعار سے دوری ضروری ہے اور وہ صرف اسی صورت میں رہ سکتی ہے کہ ہم اپنی عبادت گاہوں میں جوتوں سمیت نہ جائیں۔ اس سے معلوم ہوا مختلف قوموں کے شعار مختلف زمانوں میں اور مختلف علاقوں میں مختلف ہوتے ہیں۔ حضرت مولانا علامۃ الشیخ خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوریؒ نے بذل المجہود شرح ابی داؤد میں اسی نظریہ کی تائید فرمائی ہے۔ جب خوارج سیدنا حضرت علی المرتضیٰؓ کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے انہیں "سود اللہ وجھہ" کے نام سے ذکر کرتے تھے۔ تو اہلسنّت خوارج کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کا نام "کرم اللہ وجہہ" کے ساتھ لیتے تھے۔ آج کل ہمارے بلاد میں خوارج تقریباً ناپید ہیں۔ اس لیے اب حضرت علی المرتضیٰؓ کے نام کے ساتھ کرم اللہ وجہہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اب ان کے نام کے ساتھ بھی وہی قرآنی اعزاز کافی ہے جو رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کے الفاظ میں تمام صحابہؓ کے لیے وارد ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ اور دوسرے کئی علماء نے کرم اللہ وجہہ کہنے کی بجائے رضی اللہ عنہم کہنے کی تائید فرمائی ہے۔ حاصل ایں کہ اگر کسی طبقے یا علاقے میں ان بزرگانِ کرام کے ساتھ علیہ السلام لکھنا اہل بدعت کا شعار ہو، پھر تو اس سے پرہیز لازم ہے اور اگر یہ کسی ایک گروہ کا شعار نہ رہا ہو تو پھر اسے مذکورۃ الصدر اصول کی روشنی میں دوسرے بزرگوں کے نام کے ساتھ لکھنا بھی ممنوع نہ سمجھنا چاہیے۔ کاتب حضرات کی یہ کارکردگی صرف ہفت روزہ "دعوت" کے صفحات پر ہی نہیں کتب احادیث کی نقل و کتابت میں بھی یہ لوگ ایک رواجِ عام کے تاثر میں ان بزرگوں کے ناموں کے ساتھ علیہ السلام لکھ جاتے ہیں۔

واللہ اعلم بالصواب

کتبہ۔ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال : ہمارے عقیدے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمانوں پر زندہ موجود ہیں اور علمائے دیوبند کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ ہمارے پیغمبر حضور سرکارِ مدینہؐ اپنے روضۂ منورہ میں اپنے اصلی جسم عنصری کے ساتھ زندہ اور موجود ہیں۔ ہمارے ملنے والے بعض مرزائی لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین ہے کہ وہ تو زمین پر ہوں اور حضرت عیسیٰؑ آسمان پر اتنی بلندی میں ہوں۔ مرزائیوں کی دیکھا دیکھی اب بعض عیسائی بھی اس سوال کو بار بار پیش کر رہے ہیں۔ از راہِ کرم "دعوت" کی کسی قریبی اشاعت میں اس کا مفصل جواب دیں؟

سائل۔ احقر حافظ اسحاق احمد از ڈیرہ اسماعیل خاں

جواب : قادیانیوں کا یہ ایک مغالطہ ہے کہ روضۂ اطہر زمین پر ہے تو اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کمی نظر آتی ہے۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمان کسی طرح اس اسلامی عقیدے سے دستبردار ہو جائیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر بجسدہ الاصلی زندہ نہیں اور قربِ قیامت پر دوبارہ تشریف نہ لائیں گے۔ مرزائیوں کا یہ مغالطہ اتنا سطحی ہے کہ بادنیٰ توجہ اس کی حقیقت کھل جاتی ہے۔ بفرضِ محال یہ تسلیم کر لیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام وہاں تشریف فرما نہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہاں ملاء الاعلیٰ میں یا آسمانوں میں فرشتے بھی موجود اور استقرار پذیر ہیں یا نہ؟ اگر ملائکہ کرام وہاں موجود ہیں تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ملائکہ کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مرتبے میں زیادہ ہیں یا کم؟ اگر قول اول اختیار کریں تو یہ اسلام کی اس اجمالی تعلیم کے خلاف ہے کہ رب العزت کی ساری مخلوق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے برابر کوئی نہیں۔ چہ جائیکہ افضل ہو۔ اور قول ثانی اختیار کریں کہ ان فرشتوں کا درجہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کم ہے تو پھر مرزائیوں کا یہ مفروضہ غلط ہوا کہ جن مقدس ہستیوں کا استقرار آسمان میں ہو ان کا درجہ اس ذاتِ اقدس سے زیادہ ہے جس کا روضۂ اطہر اس زمین پر موجود ہو۔ نہایت حیرت کا مقام ہے کہ محض اس لیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان میں زندہ موجود ہیں۔ خاتم الانبیاءؐ پر بھی ان کی فضیلت کا دعویٰ کر دیا جائے۔

ہمارے عقیدے میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر کی جگہ آسمانوں کی دنیا تو درکنار خود عرشِ معلیٰ سے بھی افضل ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بھی انتہائے سعادت یہی ہے کہ قربِ قیامت پر نزول فرمائے اور پھر موت کا ذائقہ چکھنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر میں دفن ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

یموت فیدفن معی فی قبری[1]

ترجمہ۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام میرے ساتھ میرے روضہ میں دفن کئے جائیں گے۔

---

[1] مشکوٰۃ جلد صفحہ ۴۸

پس مقامِ غور ہے کہ [illegible]وپر آسمانوں میں ہونا ہی وجہ افضلیت تھا تو پھر اللہ تعالیٰ انہیں اس مقام سے یہاں نیچے کیوں لائیں گے۔ ان کا آخر کار روضۂ اطہر میں دفن ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اوپر اور نیچے ہونا کوئی معیارِ فضیلت نہیں۔ اگر ایسا ہو تو مندرجہ ذیل صورتوں کا کیا جواب ہوگا۔

(۱) ترازو کا جو پلڑا اوپر ہو اسے ترجیح ہوتی ہے یا اسے جو نیچے ہو۔

(۲) خانہ کعبہ جو نیچے ہے اسے فضیلت ہے یا کوہِ ہمالیہ کی چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ کو جو اس خطۂ ارضی کا بلند ترین مقام ہے۔

(۳) جو افراد ہوائی جہاز سے سفر کرتے ہیں وہ مرتبے میں ان مسافروں سے افضل ہیں جو ریل میں یا اونٹوں پر سفر کرتے ہوں اور پھر ہوائی جہاز کی یہ سیٹیں مساجد شریفہ سے افضل ہیں یا نہ؟

(۴) جو موتی دریاؤں کی انتہائی گہرائی میں ہیں ان کا درجہ زیادہ ہے یا وہ بلبلے افضل ہیں جو دریا کی اوپر کی سطح میں پائے جاتے ہیں۔

(۵) جو پرندے چڑیا، کبوتر، بلبل وغیرہ فضا کی نیچی سطح پر اُڑتے ہیں وہ زیادہ اچھے سمجھے جاتے ہیں یا وہ گدھ اور نخچیر جو فضا کی انتہائی بلندیوں میں پرواز کرتے ہیں؟

(۶) جن مکانوں میں سجی ہوئی بیٹھکیں اور خوب صورت مہمان خانے نچلی منزل میں ہوتے ہیں اور بیت الخلاء اوپر کی چھت پر ان میں سے کون سی جگہ افضل اور اعلیٰ ہے۔

ایسی اور بھی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں اور حاصل سب کا یہی ہے کہ محض اوپر اور نیچے ہونا کوئی معیارِ فضیلت نہیں۔ محض ایسے مغالطوں سے اسلام کی اصولی تعلیمات پر ہرگز پردے نہیں ڈالے جا سکتے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ۔ خالد محمود عفا اللہ عنہ ۲۵ جنوری ۱۹۶۳ء

سوال : حضرت بی بی فاطمہؓ اپنے خاوند سیدنا حضرت علیؓ سے ہمیشہ خوش رہیں یا کبھی ناراض بھی ہوئیں۔ اگر کسی معاملے میں ناراض ہوئیں تو بتلایا جائے کہ ان امور میں حق حضرت فاطمہؓ کے ساتھ تھا یا حق پر حضرت علی المرتضیٰؓ ہوتے تھے؟ میں نے بعض لوگوں کو یہ سنا ہے کہ حضرت فاطمہؓ تو حضرت علیؓ کے ساتھ شادی کرنے پر بھی خوش نہ تھیں، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سمجھانے پر راضی ہو گئیں، یہ صحیح ہے یا غلط؟ نیز اس مسئلے کی بھی وضاحت کر دی جائے کہ حضرت فاطمہؓ کبھی حضرت علیؓ سے ناراض ہوئی ہوں۔ تو اس حدیث کا کیا جواب ہوگا کہ جس نے فاطمہؓ کو ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا اور جس نے مجھے ناراض کیا اس نے خدا کو ناراض کیا؟

سائل۔ محمد امین از سنت نگر لاہور

جواب: حضرت سیدہ فاطمۃ الزہراؓ اور حضرت علی المرتضیٰؓ ان دونوں بزرگوں کے متعلق ہمارا عقیدہ ہے کہ اسلام کی یہ ہر دو شخصیتیں اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول اور ان کی زندگیاں خدا اور اس کے رسول کی رضا جوئی میں معمول تھیں. ان میں اگر کبھی باہمی اختلافات بھی ہوئے ہوں اور خاوند بیوی جو پوری زندگی کے ساتھی ہوتے ہیں تو ان میں بتقاضائے بشریت کچھ غلط فہمیاں اور اختلافات پیدا ہو جائیں تو ہمیں پھر بھی یہی چاہیئے کہ ان معاملات میں دخل نہ دیں. ان بزرگوں اور صحابہؓ کے باہمی مشاجرات کو کچھ وقتی حالات اور کچھ وقتی غلط فہمیوں پر محمول کریں اور مجموعی طور پر یہی طریقہ رکھیں کہ ان سب حضرات کی نیات خیر کی تھیں اور ان کی مجموعی زندگی رب العزت کے ہاں نہایت اعلیٰ درجہ کی مقبول تھی. ان کے باہمی اختلافات میں زیادہ دخل دینا ایمان کو کمزور کرتا ہے ان سے بچنا چاہیئے.

ثانیاً یہ صحیح ہے کہ حضرت فاطمہؓ نے حضرت علی المرتضیٰؓ کے خلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کئی دفعہ شکایت کی اور کئی موقعوں پر ناراضگی کا اظہار کیا. چنانچہ ملا باقر مجلسی نے جلاء العیون (مطبوعہ ایران) کے صفحہ ١٩٢، ١٤١، ١٦٤ اور ٢٢٦ وغیرہا پر ایسے کئی واقعات نقل کیے ہیں. لیکن ان مواقع کا اگر تجزیہ کیا جائے تو حق حضرت علی المرتضیٰؓ کی طرف نظر آتا ہے. الحق مع علیؓ اور ان معاملات میں حضرت سیدہؓ محض غلط فہمی کی وجہ سے شکایت کر رہی ہوتی ہیں. لیکن اس سے حضرت سیدہؓ کی شان میں کوئی فرق نہیں آتا. اللہ تعالیٰ کے ہاں معاملہ نیتوں پر مبنی ہے اور حضرت سیدہؓ کی ان اختلافات میں بھی نیت مبنی بر خیر تھی.

ثالثاً حدیث میں جو آتا ہے "من اغضب فاطمۃ فقد اغضبنی" حضرت علی المرتضیٰؓ اس حدیث کی وعید میں عملاً نہیں آتے. اوّلاً اس لیے کہ اس میں محض حضرت فاطمہؓ کی ناراضگی محل نکیر نہیں، اغضاب محل نکیر ہے جس میں ارادہ اور نیت شامل ہیں. یعنی اگر کوئی شخص ارادے اور نیت سے حضرت سیدہؓ کو ناراض کرے تو وہ بے شک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ختمی مرتبت کو ناراض کرنے کا موجب ہے. لیکن جس کے ارادے اور اقدام میں اغضاب (یعنی ناراض کرنا) داخل نہیں، بلکہ حضرت سیدہؓ کو کوئی غلط فہمی ہو جائے تو پھر وہ فرد حدیث مذکور کی وعید میں عملاً داخل نہ ہوگا. اس تفصیل سے آپ اچھی طرح سمجھ لیں کہ حضرت علی المرتضیٰؓ پر ان اختلافات کی وجہ سے کوئی حرف نہیں آتا اور نہ ہی اس سے حضرت سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کی شان میں کوئی کمی واقع ہوتی ہے اگر کبھی ایسے چند واقعات پیش بھی آئے تو بتقاضائے بشریت تھے. ان مشاجرات کی تفصیل میں جانا ہمارے لیے مناسب نہیں. علاوہ ازیں حضرت سیدہؓ کی بعد کی رضامندی پہلے سب اختلاف کو دھو دیتی ہے.

رابعاً حضرت فاطمۃ الزہراؓ کا حضرت علیؓ کے ساتھ شادی کرنے کو تشویش اور ناراضگی کے ساتھ دیکھنا یہ محض وقتی طور پر ہوا تھا. شیعہ روایات نے اس مقام پر حضرت علیؓ کے حلیہ مبارک اور مالی پوزیشن پر بھی بحث

کی ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ایسی تمام روایات صحیح نہ ہوں گی. حضرت فاطمہؓ اور حضرت علی المرتضیٰؓ کا مقام اس سے بہت بلند ہے کہ ہم ان امور کی نسبت اسلام کے ان صفِ اوّل کے بزرگوں کی طرف کریں. حضرت سیدہؓ کو جو وقتی طور پر تشویش ہوئی وہ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سمجھانے سے دور ہو گئی تھی. واللہ اعلم بالصواب.

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: بعض فرنگی تہذیب کے لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ حضرت مولانا مدنیؒ ہندوؤں کے ساتھ اتحاد کرتے رہے اور انگریزوں کی مخالفت کرتے رہے. حالانکہ انگریز اہل کتاب ہیں اور ہندو نہیں. اس لیے جنگ ہندو سے چاہیئے تھی نہ کہ انگریز سے. اس کے علاوہ مولانا دوسروں کو تو جہاد کے لیے برانگیختہ کرتے تھے لیکن خود اس میدان میں نہیں آتے تھے؟

سائل بشیر محمد غزنوی از سرگودھا

جواب: ہندوستان کے عہدِ غلامی میں مسئلہ یہ نہیں تھا کہ ہندوؤں یا انگریزوں میں سے کون اہل کتاب ہے. اصل مسئلہ استخلاصِ وطن تھا کہ ملک کو غیر ملکی غاصبوں سے کس طرح آزاد کرایا جائے جو اس ملک کی دولت سمیٹ کر اپنے ملکوں میں لے جا رہے ہیں اور یہاں کے رہنے والوں کو محض بھکاری بنانے پر تُلے ہوئے ہیں. ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں ہندو ہمارے شریک وطن تھے اور انگریز اہل کتاب میں شمار ہوتے ہوئے بھی ایک غیر ملکی حکمران تھے. جو ہم پر دھوکے اور فریب کے شاطرانہ انداز میں مسلط ہو گئے تھے. مسلم لیگ جو ہندو دشمنی کی سب سے بڑی منادی تھی. یہ نعرہ تو اس کا بھی نہیں تھا کہ ہندو کی بجائے انگریز ہمارے لیے بہتر ہے انگریز تو بہرحال اس قابل تھا کہ اس ملک سے ان کی حکومت ختم کر دی جائے اور اس تحریک کے لیے جھنڈا خواہ کانگرس کا ہو خواہ مسلم لیگ کا، منزلِ مقصود یہی تھا کہ انگریز کو یہاں سے نکال دیا جائے. آپ کے جن دوستوں نے یہ بات اٹھائی ہے کہ وہ حقیقت میں مسلم لیگی بھی نہیں. اغلب ہے کہ دم بریدہ سگانِ برطانیہ کے حلقوں کے ہوں اور ان علماء سے بغض رکھتے ہوں جو آزادی کے علمبردار تھے.

حضرت مولانا کی سیاسی رائے تو اختلاف ہو سکتا ہے. لیکن ان کی علمی اور دینی رائے پر پورے سوادِ اعظم بلکہ مسلمانانِ عالم کو کامل اور مکمل اعتماد تھا —— یہ دوسری بات تاریخ کا ایک مذاق ہے کہ حضرت مدنیؒ دوسروں کو تو جہاد پر آمادہ کرتے تھے لیکن خود کبھی اس میں نہ آئے بھلا جس مجاہد کی زندگی سالہا سال قید و بند کی صعوبتوں میں گزری اور جس عظیم شخصیت کے لیل و نہار بڑی سے بڑی قربانی کی ایک تاریخ رکھتے ہوں. اُس کے متعلق ایسی ہرزہ سرائی اگر واقعات کا منہ چڑانا نہیں تو اور کیا ہے شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں. مولانا مدنیؒ کے ایمان اور خلوص میں کسی مخالف سے مخالف کو بھی شک نہیں ہو سکتا.

خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال : غوث الثقلین کے کیا معنی ہیں ؟

کیا خدا کے سوا کسی اور کو بھی غوث الثقلین کہہ سکتے ہیں ؟

"دعوت" کے شمارہ ۶۰ میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح کو غوث الثقلین کیوں لکھا ہے ؟

کیا یہ شرک میں داخل نہیں ؟

محمد منیر اقبال دیوبندی متعلم الیف ایس سی گورنمنٹ کالج چکوال

جواب : غوث الثقلین کے معنی دونوں جہاں کے فریادرس کے ہیں۔ دونوں جہانوں کی تعیین میں پھر تفصیل ہے کہ یہاں ثقلین سے مراد کیا ہے۔ پیش نظر رہے کہ ثقلین سے مراد کبھی کتاب و سنت ہوتے ہیں اور کبھی قرآن اور عترت رسول پر یہ لفظ اطلاق ہوتا ہے۔ عالم تکلیفات میں اس سے مراد انسانوں اور جنوں کی دُنیا ہے اور کبھی اس سے مراد یہ عالم دُنیا اور عالم آخرت لیے جاتے ہیں۔ غوث الثقلین میں عموماً انسانوں اور جنوں کا جہان مراد ہے اور اس کے معنی ہیں انسانوں اور جنوں کے فریادرس۔ یہ فریادرسی کبھی اسباب کے ماتحت ہوتی ہے جیسا کہ اس دُنیا میں خدا تعالیٰ کی دی ہوئی قوتوں کے سہارے ہم ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ اور کبھی یہ فریادرسی اسباب سے بالا مافوق الاسباب طریق سے عمل میں آتی ہے۔ اس دوسرے معنی کے اعتبار سے تمام نفع و نقصان کا مالک، حاجت روا، مشکل کشا اور فریادرس صرف خدائے رب العزت ہی ہے اور اس کے سوا کسی اور کے لیے غوث الثقلین کا اطلاق جائز نہیں اور پہلے معنی کے لحاظ سے یعنی اسباب کے ماتحت کسی کے کام آنا، سو یہ تو ظاہر ہے کہ جو بزرگان کرام اور اشخاص کریمہ اس دُنیا سے انتقال فرما گئے یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اس دُنیا کے مادی اسباب کے ذریعہ سے کسی کی فریادرسی کریں۔ وہ روحانی اسباب کے ذریعہ اپنے کسی مخلص کی فریادرسی کر سکتے ہیں یا نہ ؟ سو اس کا سمجھنا اس پر موقوف ہے کہ عالم برزخ میں ان کی ارواح مقدسہ محض ملائکہ کی طرح ہیں کہ ان کے اپنے ارادے کا اس میں کوئی خلل نہ ہو۔ یا ان کے روحانی تصرفات باقی ہیں۔ ان روحانی تصرفات سے مراد اگر یہ ہے کہ وہ خود مستقل بالارادہ ہیں۔ اگرچہ اس کے لیے جو قوتیں ہیں وہ واسطہ فی الثبوت کے انداز میں خدا ہی کی دی ہوئی ہیں لیکن اب ان سے تصرف کرنے میں وہ پوری طرح مختار اور مستقل ہیں اور ہر ضرورت کے ہر جزو میں وہ خدا کے محتاج نہیں تو ان ارواح قدسیہ کا ایسا روحانی تصرف بھی ہرگز ممکن نہیں اور اس کے شرک ہونے میں کوئی شک نہیں۔ ہاں اگر اس روحانی تصرف سے مراد فاضلہ روحانی اور ان ارواح طیبہ کا روحانی سلسلۂ دُعا و استغفار اور رب العزت کے حضور میں تقرب کے طور پر ہو تو ایسا فیضان روحانی بے شک قائم ہے۔ اہل حق کے ہاں غوث الثقلین کے معنی یہی ہیں کہ انسانوں اور جنوں دونوں کے لیے آپ اللہ رب العزت کے تقرب کا موجب ہیں اور بذریعہ دُعا اور استغفار ان کی روحانی کامیابی

کا سبب بننے والے ہیں اور اسے بطریق تا[illegible] فریادرسی بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ تاویل صرف شرک سے بچانے کے لیے ہے۔ ورنہ ایسے الفاظ موہمہ سے احتراز لازم ہے۔ عوام اس قدر تفصیل اور تاویل میں تو جا نہیں سکتے۔ البتہ ان کے غلط عقیدہ پر چل جانے کا مظنہ قوی ہو جاتا ہے۔ دعوت کے کسی سابقہ شمارے میں اگر کہیں غوث الثقلین کے الفاظ آئے ہیں تو وہ صرف عرف مشہور کی بناء پر ہیں۔ جس میں اس کے ظاہری معنی مراد نہیں۔ اور اگر وہ معنی مراد لیے جائیں جو ہم نے عرض کیے تو پھر اس میں کچھ حرج نہیں۔ سید العلماء محدث شہیر حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب رح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نعت کہتے ہوئے ایک مقام پر لکھتے ہیں ؛

ع مستغیث است الغیاث اے سرورِ عالی مقام

چونکہ آپ کا انتساب دیوبندی مکتب فکر سے اس لیے آپ کے لیے یہ بات کافی ہوگی۔ واللہ اعلم

سائل موصوف کا اس سلسلہ میں پھر ایک استفسار موصول ہوا تھا جس کا جواب ۱۹ اپریل ۱۹۶۳ء کے شمارے میں شائع ہو گیا تھا مضمون کی مناسبت سے اسے بھی یہاں ہی درج کیا جا رہا ہے۔

سوال : آپ نے شمارہ ۲۲ میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح کے لیے لفظ غوث کا استعمال پیش کیا ہے مگر افسوس کہ آپ نے مجھے خاموش کرنے کا ڈھنگ استعمال کیا کہ "آپ کا انتساب دیوبندی مکتب فکر سے ہے اس لیے آپ کے لیے علامہ انور شاہ کشمیری کا لفظ کافی ہے"؛ میں مانتا ہوں کہ آپ نے یہ لفظ مخلوق کے لیے استعمال کیا ہوگا۔ لیکن یہ بتلائیں کہ کیا علامہ انور شاہ کشمیری رح ہمارے لیے حجت ہیں۔ خصوصاً توحید جیسے اہم مسئلے میں ہم ان کی بات کیسے مان لیں۔ آپ نے اس لفظ کے جو معنی کیے ہیں اس میں آپ اپنے مخصوص انداز میں شرک سے بچ نکلے ہیں۔ لیکن آپ جواب دیں کہ آپ نے اس کے معنی عرف عام کے کیوں نہیں کیے۔ کمال ہے کہ لفظ عرف عام میں رائج ہو اور معنی خاص کریں ؟ سائل محمد منیر اقبال دیوبندی گورنمنٹ کالج چکوال

جواب : تعجب ہے کہ آپ نے اپنے نام کے ساتھ تو افتخاراً دیوبندی لکھا ہے اور آپ کو اکابر مسلک اور بزرگان دیوبند پر اتنا اعتماد بھی نہیں کہ انہوں نے توحید کو قرآن و حدیث کے مطابق بالکل صحیح سمجھا ہو۔ اگر یہ علماء امت جو اپنے اپنے مقام پر علم و فضل کے امام اور تقویٰ و عمل کے پیکر تھے۔ توحید جیسے مسئلے کو بھی اس کے اصول و فروع کے ساتھ صحیح نہیں سمجھ سکے تو پھر آپ کا ان کے ساتھ کفر و اسلام اور شرک و توحید کا سا اختلاف ہوگا اور ظاہر ہے کہ اتنے بنیادی اختلاف کے ساتھ عقیدت مندی اور اخلاص قطعاً قائم نہیں رہ سکتا۔ الّا یہ کہ آپ حضرات کا دیوبندی کہلانا محض ایک عنوان اور صرف ایک ظاہر ہو۔

سیدنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح کے لیے لفظ غوث کا استعمال حضرت مولانا اشرف علی صاحب رح

تھانوی کے مواعظ میں عام ملتا ہے۔ اگر آپ کو ان اکابرِ دیوبند پر اعتماد نہیں تو کم از کم اوپر کے فقہاء احناف کے بارے میں تو آپ ابھی تک اتنے بدگمان نہیں ہوں گے۔ حضرت امام ملا علی قاری علیہ رحمۃ الباری جو فقہاء حنفیہ میں نہایت ممتاز بزرگ گزرے ہیں اپنی کتاب نزہۃ الخاطر الفاتر مطبوعہ مصر کے صفہ پر سید حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے متعلق رقمطراز ہیں :-

القطب الربانی والغوث الاعظم الصمدانی سلطان الاولیاء والعارفین۔

کیا حدیث و فقہ اور علم کلام کے یہ بلند پایہ امام اسلام کے توحید جیسے بنیادی اور نازک مسئلے میں بھی ابھی تک خام ہیں؟ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ اگر ان ائمہ اعلام اور فقہائے کرام پر اعتماد اُٹھ جائے تو باقی ہمارے پلے میں رہتا ہی کیا ہے۔ حضرت شیخ احمد رفاعی کی کتاب "البنیان المشید" کا اردو ترجمہ جو حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی نگرانی میں حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ تھانوی نے کیا تھا۔ اس میں کئی مقام پر لفظ غوث کا یہ استعمال عام موجود ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال ۲: "دعوت" کے صدیق اکبرؓ نمبر کے صفہ کالم ۱ میں آپ نے مندرجہ ذیل روایت لکھی ہے :

المؤمن من لا یخدع و لا یخدع۔

"کامل مومن وہ ہے جو نہ دھوکا دے اور نہ دھوکا کھائے"

یہاں چند دوست اس اُلجھن میں پھنس گئے ہیں کہ کیا حضرت امام حسینؓ (جنہیں کوفیوں نے دھوکا دیا) حضرت علیؓ (جنہیں کوفیوں نے دھوکا دیا) حضرت طلحہؓ و زبیرؓ (جنہیں دھوکا دے کر جنگ جمل میں حضرت علیؓ سے لڑا دیا گیا) کیا یہ سب کامل مومن نہ تھے۔ (معاذ اللہ)؟ اقبال نیر گورنمنٹ کالج چکوال

جواب : حضرت حسینؓ، حضرت علی المرتضیٰؓ، حضرت طلحہؓ و زبیرؓ یہ سب حضرات کامل الایمان اور علم و عمل کے نیر تاباں تھے۔ لیکن ان میں بھی افضل و مفضول کا سلسلہ اسی طرح ہے جس طرح انبیاء کرام میں سلسلہ تفضیل و افضلیت تھا۔ اگر خاتم الانبیاء کو سب انبیاء کرامؑ سے علماً عملاً اور رتبۃً افضل کہنا باقی انبیاء و مرسلین کے علم و عمل اور مرتبے کی توہین نہیں تو حضرت صدیق اکبرؓ کو علماً عملاً اور رتبۃً باقی سب صحابہؓ و اہلبیت سے افضل قرار دینا اس میں بھی ان بزرگانِ کرام اور امہات المومنین کی کوئی توہین مضمر نہیں۔ یہ بزرگانِ کرام سب کے سب کامل الایمان والعمل تھے۔ مگر یہ کاملیت بھی ایک کلی مشکک ہے جس کے کئی مدارج ہیں۔ ان میں جو شان اکملیت خود حضور ختمی مرتبت کو حاصل تھی وہ حضرت صدیق اکبرؓ کے لیے حاصل نہیں اور جو شرفِ اکملیت سیدنا

حضرت صدیق اکبرؓ کو حاصل تھا۔ اگر اس میں وہ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت فاطمہؓ اور حضرت عائشہؓ سب سے ممتاز نظر آتے ہیں تو یہ کوئی وجہ الجھن نہیں۔ ہر کسی کا کامل الایمان ہونا اور ہر بزرگ کی بزرگی اپنے اپنے درجہ میں ثابت ہے۔ جو اس میں شک یا تردد کرے اور کسی ایک بزرگ کی توہین کا مرتکب ہو، اہلسنت کے دائرہ حقہ میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ؎

اسلامِ ما اطاعتِ خلفائے راشدین ؛ ایمانِ ما محبتِ آلِ محمد است

واللہ اعلم بالصواب۔ کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال : رمضان شریف میں جو شخص تراویح پڑھ چکا ہو۔ اب اس کے لیے نمازِ تہجد کا حکم کیا ہے۔ کیا تہجد تراویح سے علیحدہ کوئی اور نماز ہے۔ صحابہ کرامؓ کا اس مہینے عمل کیا تھا۔ کیا کسی صحابیؓ سے تراویح کے باوجود علیحدہ تہجد ثابت ہے۔ نیز بتایئے کہ اگر کوئی شخص رمضان میں تہجد پڑھے تو اسے کتنی رکعت پڑھنی چاہیئے؟

سائل، ارشاد احمد از سرائے عالمگیر

جواب : تراویح اور تہجد دو علیحدہ علیحدہ اور مستقل نمازیں ہیں۔ تہجد سارا سال پڑھی جاتی ہے اور تراویح صرف رمضان شریف میں ہی۔

ثانیاً تہجد کی نماز ابتدائے اسلام میں بحکم باری تعالیٰ شروع ہوئی اور تراویح کی نماز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مشروع فرمائی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :-

شهر كتب الله عليكم صيامه وسننت لكم قيامه۔[1]

ترجمہ۔ یہ ایسا مہینہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس کے روزے تم پر فرض فرمائے اور میں نے اس کا قیام (یعنی تراویح) تمہارے لیے مشروع بنایا۔

ثالثاً۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک دفعہ رمضان کا چاند نظر نہ آنے پر یوں فیصلہ کیا گیا

ان لا يصوموا وان لا يقوموا۔ "کہ نہ روزہ رکھا جائے اور نہ تراویح پڑھی جائیں"

اگر تراویح تہجد کی نماز کے علاوہ کوئی علیحدہ نماز نہ ہوتی تو حضورؐ رمضان کا چاند نظر نہ آنے پر اس نماز کے نہ پڑھنے کا حکم ہرگز صادر نہ فرماتے۔ (رواہ الدارقطنی)

رابعاً۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہؓ سے تہجد کی نماز تراویح کے علاوہ بھی ثابت ہے۔ سنن نسائی میں ہے :-

---

[1] ابن ماجہ ص ۶۵

عن قیس بن طلق قال زارنا ابی طلق بن علی فی یوم من رمضان فامسی بنا وقام بنا تلك اللیلة و اوتر بنا ثم انحدر الی مسجد فصلی باصحابه حتی بقی الوتر ثم قدم رجلاً فقال اوتر بهم فانی سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه واٰله وسلم یقول لا وتران فی لیلة[1]

حضرت طلق بن علی رضؓ صحابی رسول سے یہاں تین نمازیں ثابت ہیں :۔

پہلے قیام رمضان، پھر وتر اور وتر کے بعد پھر ایک اور نماز ـــــــ ظاہر ہے کہ یہ تیسری نماز تہجد کی نماز تھی، معلوم ہوا کہ رمضان میں تراویح کے علاوہ تہجد کی علیحدہ نماز بھی صحابہؓ سے ثابت ہے۔

خامسًا۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں :۔

یکرہ صلوٰۃ النوافل فی جماعة بعد التراویح فی احد الروایتین عند الامام وروی عن انس بن مالك انه کرهه بل ینام نومة خفیفة ثم یقوم یأتی بما شاء من النوافل والتهجد ثم یرجع الی منامه[2]

حضرت شیخ جیلانیؒ کے اس فیصلے سے معلوم ہوا کہ تراویح کے بعد نماز تہجد مستقل طور پر ایک علیحدہ نماز ہے اور ان دونوں نمازوں کو ایک ہی نماز نہ سمجھا جائے۔

سادسًا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ تراویح اور تہجد دو علیحدہ علیحدہ نمازیں ہیں اور قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ نے بھی الرای النجیح میں اسی فیصلے کی تائید فرمائی ہے۔

تہجد کی رکعات

تہجد کی رکعات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے علاوہ وتر کے عمومًا آٹھ رکعت ثابت ہیں۔ حضورؐ کی رمضان شریف کی تہجد میں اور اس مہینے کے علاوہ دوسرے اوقات کی تہجد میں کوئی بنیادی فرق نہ تھا۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ رمضان اور غیر رمضان میں (عام طور پر) گیارہ رکعت ہیں (مع وتر کے) پڑھتے تھے۔ حضرت امام بخاری نے اس حدیث کو کتاب التہجد میں روایت کیا ہے۔[3]

واللہ اعلم بالصواب　　　　کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

---

[1] سنن نسائی جلد ۱ ص ۱۸۹ [2] غنیۃ الطالبین ص ۴۹۷ [3] دیکھئے صحیح بخاری جلد ۱ ص ۱۵۴ کتاب التہجد

سوال : ایک شیعہ دوست کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز رمضان اور غیر رمضان میں برابر ہوتی تھی، اس لیے تراویح کی نماز ایک اضافہ اور بدعت ہے۔ حضرت عمرؓ خود فرماتے ہیں کہ تراویح بدعت ہے اس کی وضاحت فرمایئے؟　　　　سائل۔ اعجاز احمد دیانند روڈ لاہور

جواب : آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو نماز رمضان اور غیر رمضان میں برابر ہوتی تھی وہ صرف تہجد کی نماز تھی تراویح کی نماز اس کے علاوہ ہے اور رمضان کے نظام عبادت میں اس اضافے کا اقرار شیعہ کی مستند کتاب استبصار جلد ۱ ص ۴۶۲ میں بھی واضح طور پر موجود ہے۔ حضرت امام جعفر صادقؓ سے پوچھا گیا :۔

ایزید الرجل فی الصلوٰۃ فی شهر رمضان.

ترجمہ۔ کیا یہ جائز ہے کہ کوئی شخص رمضان میں اپنی نماز میں اضافہ کرے۔

اس پر حضرت امام جعفر صادق نے فرمایا :۔

نعم ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم قد زاد فی رمضان فی الصلوٰۃ.

ترجمہ۔ ہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی رمضان کی نماز دوسرے مہینوں کی نماز سے بڑھائی تھی۔

ظاہر ہے کہ یہ بڑھانا تراویح کی صورت میں ہی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ تہجد کی نماز رمضان اور غیر رمضان میں برابر تھی۔ حضرت امام جعفر صادقؓ نے ان شیعہ حضرات کی پُر زور تردید فرمائی ہے جو اپنے آپ کو حضرت امام کا ساتھی کہہ کر اس اضافی نماز کا انکار کرتے تھے۔ حضرت امام خود فرماتے ہیں :۔

ان اصحابنا هٰؤلاء ابوان یزید وافی صلوٰتهم فی شهر رمضان وقد زاد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه واٰله وسلم فی صلوٰته فی رمضان[1]

باقی حضرت عمرؓ نے جو "نعمت البدعة هٰذه" فرمایا، سو معلوم ہو کہ آپ کا یہ ارشاد محض الزامی طور پر تھا۔ بعض حلقوں سے یہ آواز اٹھی کہ یہ (تراویح کی متعدد جماعات کی بجائے جماعت تراویح کا یکجا ہونا اور سب تراویح پڑھنے والوں کا ایک ہی امام پر جمع ہونا) اتنا عرصہ ترک ہونے کے بعد اب ایک نئی بات ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا "نئی ہے تو نئی سہی"، ظاہر ہے کہ یہ صورت جواب محض ایک الزامی صورت ہی ہو سکتی ہے۔ امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کا یہ پورا ارشاد امام محمد بن نصر مروزی کی کتاب قیام اللیل میں اسی طرح موجود ہے :۔

ان کانت هٰذه لبدعة فنعمت البدعة هذه. اوکما قال.

ترجمہ۔ اگر یہ نئی بات ہے تو ایک اچھی نئی بات سہی۔

آج کل جب کہ تراویح ایک امام کے پیچھے نہیں بلکہ متعدد اماموں کے پیچھے مختلف جگہوں پر پڑھی جا

---

[1] استبصار جلد ۱ ص ۴۶۲

رہا ہے تو اس بحث کا کوئی موقعہ ہی نہیں رہ جاتا۔ الزامی صورت قرار دینے کا یہ جواب منجملہ ان جوابوں کے ایک ہے، جو اس باب میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: ہم تو اب تک یہی سنتے آئے ہیں کہ حضرت صدیق اکبرؓ اور علی المرتضیٰؓ کے متعلق یہ اختلاف رہا ہے کہ دونوں میں سے کون بزرگ خلافت کے زیادہ مستحق تھے۔ لیکن ہمارے بعض شیعہ کرم فرما یہ کہتے ہیں کہ اصل اختلاف ان دونوں کے خاکی اور نوری ہونے میں ہے۔ حضرت ابو بکرؓ بشر تھے اور حضرت علیؓ بشر نہیں، بلکہ نور تھے اس کے متعلق ان باتوں کے جواب سے آگاہ فرمائیں:۔

۱۔ حضرت علی المرتضیٰؓ کے لیے بشر کا لفظ شیعہ کی کسی کتاب میں ملتا ہے یا نہیں؟

۲۔ جب مولائے علیؓ آیت تطہیر کی وجہ سے افراد طیبہ میں شمار ہیں تو پھر بشر کیسے ہو سکتے ہیں۔ طاہر و طیب تو صرف نور ہی ہوتا ہے؟

۳۔ حضور سرکار مدینہؐ کے بدن طیب کے ساتھ اشتراک حضرت علیؓ کا زیادہ تھا یا حضرت ابو بکر صدیقؓ کا؟

سائل: صوفی کریم بخش از جام پور (ضلع ڈیرہ غازیخان)

جواب: حضرت علی مرتضیٰؓ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ، یہ دونوں بزرگ اپنی اپنی جگہ بشر بھی تھے اور نور بھی۔ ذات میں دونوں بشر تھے اور صفات میں دونوں نور ——— شیعہ حضرات کی معتبر کتاب کتاب الشافی میں حضرت علی المرتضیٰؓ کے لیے صریح طور پر بشر کا لفظ موجود ہے۔ فرماتے ہیں:۔

ان شجاعته وان كانت على ما ذكرت وافضل فلا تبلغ الى ان يغلب جميع الخلق ويحارب سائر الناس وهو مع شجاعته بشر والبشر يقوى ويضعف ويخاف و يامن والتقية جائزة على البشر[1]

ترجمہ: حضرت علیؓ کی شجاعت اگرچہ ایسی ہی تھی جیسی کہ مذکور ہے اور اس میں بے شک آپ کی فضیلت تھی۔ لیکن اس حد تک نہ پہنچتی تھی کہ آپ ساری مخلوق پر غالب آسکیں اور تمام لوگوں سے جنگ کر سکیں۔ کیونکہ آپ اپنی اس شجاعت کے باوجود بشر تھے اور بشر کبھی قوی ہوتا ہے کبھی ضعیف، کبھی ڈر میں ہوتا ہے اور کبھی امن میں۔ اور تقیہ بشر کے لیے جائز ہے۔

۲۔ افراد طیبہ میں شمار ہونے سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ وہ بشر نہ تھے نور تھے۔ جہاں تک اُن کے نور ہدایت

[1] کتاب الشافی صفحہ ۴ ایران

اور نورِ صفات ہونے کا تعلق ہے۔ ہمارا اہلسنت کا ایمان ہے۔ لیکن اس سے بشریت کی نفی کا استدلال علمی طور پر بہت ہی کمزور ہے۔ شیعہ حضرات کی معتبر کتاب احتجاج طبرسی میں ہے کہ حضور ختمی مرتبتؐ نے ابوجہل سے کہا تھا۔

انما رفع عنك العذاب لعلمه بانه سيخرج من صلبك ذرية طيبة۔[1]

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے تجھ سے عذاب اٹھایا ہوا ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ تیرے صلب سے ایک ذریت طیبہ پیدا ہو گی۔

ظاہر ہے کہ ابوجہل کی اولاد ذریت طیبہ میں سے تو ہے لیکن یہ نہیں کہ وہ اب بشر نہیں رہے نور ہو گئے، طیب و طاہر ہونا اور بات ہے اور بشریت کی نفی اس کو ہرگز لازم نہیں۔

۳۔ حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسلی اشتراک حضرت علی المرتضیٰؓ کو حاصل تھا۔ لیکن جوہری اشتراک پر حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ فائز تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ارشاد فرماتے ہیں:۔

خلقت انا و ابوبكرؓ و عمرؓ من تربة واحدة وفيها ندفن۔[2]

ترجمہ: میں، ابو بکرؓ اور عمرؓ ایک ہی (پاک) مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں اور ایک ہی مٹی میں ہم دفن ہوں گے۔

واللہ اعلم بالصواب۔ کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: سنی ہفت روزہ "دعوت" لاہور کے مدیر اعلیٰ لکھتے ہیں:۔

"کہنے کو تو اہلسنت والجماعت ہیں لیکن اس کے علی الرغم جماعت و مرکزیت کے تصور سے یہ نا آشنا ہیں۔ بس یہ ایک بھیڑ ہے، ایک انبوہ کثیر ہے جو سواد اعظم کے نام سے ملک میں موجود ہے۔ نہ اس کا کوئی مرکز ہے، نہ اس کی کوئی تبلیغی جماعت بس ہر سو ایک انتشار ہی انتشار ہے اور لامرکزیت اور انفرادیت"

۱۱ جنوری ۱۹۶۳ء

اب سوال یہ ہے کہ کیا ایسی انتشار زدہ بھیڑ کو فرقہ ناجیہ یا فرمودہ نبوی الا دھی الجماعۃ کا مصداق قرار دیا جا سکتا ہے؟

سائل: ابو العطا جالندھری از الفرقان ربوہ

اس سوال کا جواب ایک اور سوال سمجھنے پر موقوف ہے "الفرقان" کے مدیر اعلیٰ ہمارے اس سوال کا جواب تحریر فرمائیں اور اس کے ضمن میں اپنے اس سوال کا جواب خود مطالعہ فرمالیں؟

بابت فروری صفحہ ۱ ۱۹۶۳ء

[1] احتجاج طبرسی صفحہ ۱۸ نجف اشرف [2] خطیب بغدادی فی کتاب المتفق والمفترق دیکھئے فتاوی افریقہ صفحہ ۸۴ کتاب ہذا صفحہ ۳۹

سوال : مرزا غلام احمد صاحب کے آنے سے پہلے جو اہل سنت والجماعت اپنی جماعتی تنظیم اور مرکزیت سے ناآشنا تھے اور سواد اعظم کے نام سے تمام ممالک اسلامیہ میں ایک انبوہِ کثیر کسی مستقل مذہبی مرکز کے بغیر موجود تھا وہ اہلسنت فرقہ ناجیہ تھے یا نہ ؟ اگر اس وقت کے وہ مسلمان فرقہ ناجیہ میں سے نہ تھے تو جو بھی اس وقت فرقہ ناجیہ تھا اس کی نشاندہی کی جاوے۔ کیونکہ آنحضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت جب تک موجود رہے ان میں ایک فرقہ ناجیہ فرقے کا موجود ہونا بھی لازمی ہے اور اگر وہی مرکزیت سے ناآشنا اور انتشار زدہ اہل سنت جن میں غالباً غلام احمد مرزا کے والد مرزا غلام مرتضیٰ بھی شامل تھے۔ اس وقت فرقہ ناجیہ تھا۔ تو مطلع کیا جائے کہ اس فرقے کو الا وھی الجماعۃ کا مصداق کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔ نیز اس کی بھی تفصیل کی جائے کہ جماعت سے مراد یہی ہے۔ کہ ایک رجسٹر میں نام درج ہوں اور سب کا چندہ ایک جگہ جمع ہوتا ہو۔ خواہ مذہبی اور سیاسی امور میں ان کے امام اور صدر بھی علیحدہ علیحدہ ہوں جو آپس میں مختلف المسلک بھی ہوں یا جماعت سے مراد وہ افراد بھی ہو سکتے ہیں جو ایک خدا، ایک قبلہ، ایک قرآن اور ایک پیغمبر کی مرکزیت میں ایمان رکھتے ہوں اور صرف ان کی عملی زندگی میں انتشار ہو۔ اور ان کے پاس کوئی ایک رجسٹر نہ ہو۔

اس سوال کے جواب میں ہی آپ کو اپنے سوال کا جواب مل جائے گا۔

ثانیاً جس انتشار لامرکزیت سے متاثر ہو کر تنظیم اہل سنت کا مرکزی پلیٹ فارم عمل میں آیا اور دعوت کا زیر بحث شذرہ اسی مذہبی اور تبلیغی مرکز کے استحکام کے لیے ایک اپیل ہو تو اس مرکز کے موجود اور ثابت ہونے کی یہ شہادت مدیر "الفرقان" نے کیا اسی شذرہ میں نہیں دے دی۔ اس میں دیکھیے:۔

"اس مذہبی و تبلیغی مرکز کو اس قدر مضبوط و مستحکم کر دیں کہ وہ مذہب حق سے وابستہ اپنے تمام افراد کو اپنے ساتھ رکھ کر تبلیغی خدمت سر انجام دے سکے۔" دعوت ۴/۱۱ جنوری ۱۹۶۳ء

ابوالعطاء جالندھری اس پر ایسے دم بخود ہوئے کہ کاٹو تو بدن میں خون نہیں —— مرزا غلام احمد کے پیرو اس کی وفات کے بعد چھ سال تک بھی اکٹھے نہ رہ سکے اور ان کا اختلاف خود اسی مسئلہ میں ہو گیا کہ دونوں کے حضرت صاحب کا اصل دعویٰ کیا تھا۔ مسائل کا اختلاف تو دور کی بات ہے۔ یہ مرزا غلام احمد کے اصل دعوے ہی مختلف ہو گئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین مسلسل اور بلافصل تیس سال تک منہاج نبوت سے برسر خلافت رہے اور آدھی دنیا ان کے زیر نگین تھی اور یہ لوگ اپنے امام کے اصل دعوے کو ہی پا نہ سکے۔ اس سے زیادہ ان کی ناکامی اور کیا ہو گی۔

مفتی اعظم مصر استاذ العلماء شیخ حسنین محمد مخلوف کا علمی و تحقیقی فتویٰ

حضرت عیسیٰؑ کا رفع آسمانی اور کفریات مرزا غلام احمد قادیانی

ہفت روزہ "دعوت" کے باب الاستفسارات میں کافی عرصہ سے ایسے سوالات موصول ہو رہے تھے کہ سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع جسمانی اور حیات آسمانی کے متعلق علمائے مصر کا عقیدہ کیا ہے۔ کیا وہ واقعی اسلام کے اس اجماعی عقیدے کے قائل ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور ثانی علامات قیامت میں سے ایک علامت ہے اور یہ کہ وہ آسمان پر بجسد عنصری زندہ اور موجود ہیں یا علمائے مصر اس باب میں باقی جمیع علماء عرب اور پاک و ہند کے خلاف ہیں۔ ان سوالات کا اصل محرک مصر کے ایک آزاد خیال پروفیسر شلتوت کا ایک مضمون تھا جو آج سے پچیس تیس سال پہلے شائع ہوا تھا اور جسے قادیانی حضرات اپنی ہمنوائی میں ہر سال شائع کرتے رہتے ہیں۔ قادیانیوں کا اس اشاعت سے مقصد عوام کو یہ اثر دینا ہے کہ ان ابواب میں اکابر علمائے مصر ان کے ساتھ ہیں۔ اس مغالطے اور تلبیس کا پردہ چاک کرنے کے لیے حکومت مصر کے سابق مفتی اعظم استاذ العلماء حضرت شیخ حسنین محمد مخلوف کا ایک فتوےٰ ان کی بلند پایہ کتاب صفوۃ البیان لمعانی القرآن طبع ۱۳۷۰ھ سے نقل کیا جاتا ہے۔ یہ تمام استفسارات کا مشترک جواب ہے۔ جو اس سلسلہ میں دفتر "دعوت" میں موصول ہوتے رہے ہیں۔ رہا پروفیسر شلتوت کا معاملہ تو آزاد خیال اور خود پسند ادیب کہاں نہیں ملتے۔ اگر مصر کے ایک غیر ذمہ دار اور غیر معتمد علیہ پروفیسر نے سلف کی شاہراہ سے ہٹ کر کتاب و سنت میں الحاد کی راہ اختیار کی ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جمہور علمائے مصر اور ارباب فتوےٰ و قضاء بھی معاذ اللہ اسلام کے اجماعی فیصلوں سے برگشتہ ہو گئے ہیں جس طرح پاکستان میں مسٹر پرویز اور ڈاکٹر غلام جیلانی برق کو باوجودیکہ ہر دو حضرات اسلامی عنوانات کو ہی اپنا موضوع سخن بنا رہے ہیں اور ان کے قلم کی جولانگاہ یہ اسلامی موضوعات ہی ہیں۔ تاہم انہیں یہاں پاکستان کے اونچے درجے کے علماء اور محققین کا اعتماد حاصل نہیں اور علمی ابواب میں ان لوگوں کی رائے نہ صرف غلط ہے بلکہ کفر کی سرحدوں سے ملتی ہے۔ اس طرح مصر کے آزاد خیال پروفیسر شلتوت بھی وہاں کے علمی دینی اور تحقیقی حلقوں میں کسی اعتماد کے لائق نہیں رہے ہیں۔ انہوں نے جب وہ تحریر لکھی تھی جسے کہ یہ قادیانی حضرات آئے دن اس طرح شائع کرتے رہتے ہیں، گویا کہ یہ فتوےٰ آج چھپ کر آیا ہے۔ تو وہاں کے اکابر علماء نے اسی وقت اس کی تردید فرما دی تھی اور مختلف رسائل و جرائد نے اس پر پرزور رد عمل فرمایا تھا۔ بہرحال مصر کے

کے معتمد عالم اور حکومتِ مصر کے سابق مفتیٔ اعظم کا یہ تحقیقی فیصلہ قارئین "دعوت" کے پیش خدمت ہے۔ ترجمہ مولانا منظور احمد صاحب (چنیوٹ) نے کیا ہے۔ (ادارہ)

واعلم ان عیسیٰ علیہ السلام لم یقتل ولم یصلب کما قال تعالیٰ وما قتلوہ وما صلبوہ ولکن شبّہ لھم وقال وما قتلوہ یقیناً. فاعتقاد النّصاریٰ القتل والصّلب کفر لاریب فیہ وقد اخبر اللّٰہ تعالیٰ انہٗ رفع الیہ عیسیٰ کما قال ورافعک الیّ وقال بل رفعہ اللّٰہ الیہ فیجب الایمان بہ والجمھور علیٰ انہ رفع حیّاً من غیر موت ولاغفوۃ بجسدہ وروحہ الی السماء والخصوصیۃ لہ علیہ السلام ھی فی رفعہ بجسدہ وبقاءہ فیہا الی الامد المقدر لہ.

واما التّوفی المذکور فی ھٰذہ الاٰیۃ وفی قولہ تعالیٰ فلما توفیتنی فالمراد منہ ماذکرنا علی الرّوایۃ الصحیحۃ عن ابن عباسؓ والصّحیح من الاقوال کما قالہ القرطبیّ وھو اختیار الانباری وغیرہ.

وان من اھل الکتاب الا لیؤمننّ بہ قبل موتہ ای ما احدٌ من اھل الکتاب الموجودین عند نزول عیسیٰ علیہ السلام اخر الزّمان الا لیؤمننّ بانّہ عبداللّٰہ ورسولہ وکلمتہ قبل ان یموت عیسیٰ علیہ السلام فتکون الادیان کلّھا دیناً واحداً وھو دین الاسلام الحنیف دین ابراھیم علیہ السلام ونزول عیسیٰ علیہ السّلام ثابتٌ فی الصّحیحین وھو من اشراط السّاعۃ.[1]

ترجمہ "اور جاننا چاہیئے کہ عیسیٰ علیہ السلام نہ تو قتل ہوئے ہیں اور نہ ہی سُولی دیئے گئے ہیں۔ جیسا کہ ارشادِ تعالیٰ ہے۔ وما قتلوہ وما صلبوہ ولکن شبّہ لھم وما قتلوہ یقیناً۔ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل بھی نہیں کیا اور سولی بھی نہیں دیا لیکن ان کے لیے ایک شخص کو عیسیٰ علیہ السلام کے ہمشکل بنا دیا گیا اور یہ امر یقینی ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا۔ لہٰذا عیسائیوں کا قتل اور صلیب کا عقیدہ رکھنا بلاشبہ کفر ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں خبر دی ہے کہ عیسیٰ کو اُس نے اپنی طرف اُٹھا لیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا ورافعک الیّ۔ میں تجھے اپنی طرف اُٹھا لوں گا۔

اور فرمایا۔ بل رفعہ اللّٰہ الیہ۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف اُٹھا لیا ہے۔ لہٰذا

---

[1] صفوۃ البیان لمعانی القرآن ص۱۰۹ و ص۱۱۱

اس پر (جسمانی رفع پر) ایمان لانا واجب ہے اور جمہور علمارِ اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو موت یا نیند طاری کیے بغیر زندہ آسمان پر اٹھا لیا گیا ہے اور جسم سمیت آسمان پر اُٹھایا جانا اور وہاں ایک مدتِ مقررہ تک مقیم رہنا آپ ہی کی خصوصیت ہے اور لفظ توفّی جو اس آیت اور آیت فلما توفیتنی میں مذکور ہے۔ اس سے مراد وہی ہے جو ہم نے ابن عباسؓ کی صحیح روایت کی بنا پر تحریر کر دیا ہے اور مفسرین کے اقوال میں سے صحیح قول وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ امام قرطبیؒ کے علاوہ دیگر علمارِ کرام نے بھی تصریح کی ہے۔"

وان من اھل الکتاب الّا لیؤمننّ بہ قبل موتہ کی تفسیر میں مفتیٔ اعظم فرماتے ہیں:

"آخری زمانہ میں عیسیٰ علیہ السلام کے نازل ہونے کے وقت جو اہلِ کتاب بھی موجود ہوں گے وہ عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے اس بات پر ایمان لائیں گے کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور اس کے کلمہ ہیں اور تمام مذاہب کی جگہ ایک ہی مذہب رہ جائے گا اور وہ ابراہیمی دین اسلام ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کا (آسمان سے) نازل ہونا صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ثابت ہے اور یہ نزولِ سماوی قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔"

والمراد علی القراءتین انہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اخر انبیاء اللّٰہ ورسلہ فلا نبی ولا رسول بعدہ الی قیام الساعۃ فمن زعم النبوۃ بعدہٗ فھو کذّاب افّاکٌ وکافر بکتاب اللّٰہ وسنّۃ رسولہ ولذا افتینا بکفر طائفۃ القادیانیۃ اتباع المفتون غلام احمد القادیانی الزّاعم ھو واتباعہ انہ نبی یوحیٰ الیہ وانہ لا یجوز مناکحتھم ولا دفنھم فی مقابر المسلمین.[1]

لفضیلۃ الاستاذ الشیخ الحسنین مخلوف مفتی الدیار المصریۃ السابق وعضو جماعت کبار العلماء طبع اولیٰ سنہ ۱۳۷۰ھ

ترجمہ "زیرِ آیت خاتم النبیین تحریر فرماتے ہیں اور لفظ خاتمؐ کی مراد زیر و زبر والی دونوں قرأتوں کی بنا پر یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام نبیوں اور رسولوں کے آخر میں آنے والے ہیں۔ آپ کے بعد قیامت تک کوئی نبی اور کوئی رسول نہیں بنایا جائے گا۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے بعد جو شخص بھی نبوت کا دعوےٰ کرے وہ پرلے درجہ کا جھوٹا، بہت بڑا بہتان

---

[1] صفوۃ البیان لمعانی القرآن ص۱۸۱

باندھنے والا اور اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کا منکر ہے۔

اسی لیے ہم علماء حق نے مرزا غلام احمد قادیانی کی متبع تمام جماعت کے کافر ہونے کا فتوےٰ دیا ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کی تمام جماعت کا یہ دعوےٰ ہے کہ وہ نبی ہے اور اس کی طرف وحی کی جاتی ہے کفر ہے ہم یہ بھی فتوےٰ دیتے ہیں کہ نہ ان کے ساتھ رشتہ کیا جائے اور نہ ان کو مسلمانوں کے قبرستانوں میں دفن کیا جائے۔"

سوال : ۱۔ کیا یہ جائز ہے کہ نماز کی اذان اپنے گھر میں کہی جائے اور اس کی نماز پھر مسجد میں جاکر پڑھی جائے ؟

۲۔ شیعہ کی مروجہ اذان کسی امام سے ثابت ہے یا کسی شیعہ کتاب نے اسے تحریر کیا ہے۔ ان کی اذان کا یہ جملہ اشہد انّ علیاً ولیّ اللہ کسی جگہ ثابت ہے؟ اسے شیعہ کتاب کے حوالہ سے بیان کیا جائے ؟

۳۔ اہل سنت صبح کی اذان میں الصلوٰۃ خیرٌ من النّوم کہتے ہیں۔ اہل سنّت کے نزدیک اس کا ثبوت کیا ہے؟ اور اس کا کیا درجہ ہے۔ امید ہے جواب جلدی دیں گے ؟

سائل۔ منظور احمد شاہ کہروڑی محلہ فرید آباد ملتان

جواب : اذان اور نماز ایک ہی جگہ ہونی چاہیئے۔ اگر نماز مسجد میں جاکر پڑھ سکتا ہے تو پھر اس کی اذان کے گھر میں ہونے کے کیا معنی ؟ مؤذن جب کہتا ہے۔ حیّ علی الصلوٰۃ "نماز کی طرف آؤ"، تو اگر اس مقام اذان میں نماز ہوتی ہی نہیں تو وہاں سے حیّ علی الصلوٰۃ کی پکار کا کیا مطلب ؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے یہی ثابت ہے کہ اذان اور نماز مقام واحد ہی میں ہوتی تھیں۔ اس اصل کے خلاف جو بھی دعوےٰ ہے، وہ محتاج ثبوت ہے۔ شیعہ مذہب میں بھی یہ کہیں ثابت نہیں کہ اذان گھر میں اور نماز مسجد میں ادا ہو جو شخص اس کا مدعی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ بارہ اماموں میں سے کسی امام کا فیصلہ پیش کرے من ادعی فعلیه البیان۔

۲۔ شیعہ کی مروجہ اذان کا جملہ اشہد انّ علیاً ولیّ اللہ ان کے کسی امام سے منقول نہیں حضرت امام حسینؓ کے قیام کربلا کے وقت جو اذانیں کربلا میں دی گئیں، ان میں بھی یہ جملہ کہیں نہیں ملتا۔ حضرت امام زین العابدین، امام باقر اور امام جعفر صادق رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی اس کا کوئی ثبوت شیعہ کتب میں نہیں ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب سیرِ معراج پر تشریف لے گئے تو بیت المقدس میں جو تمام انبیاء کرام کی امامت فرمائی اور اسی طرح جب آسمانوں پر تشریف فرما ہوئے اور ملائکہ کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت میں نماز پڑھی تو ان اوقات کی اذانوں میں بھی اشہد ان علیاً ولیّ اللہ کا کوئی جملہ نہیں ملتا۔

ملا باقر مجلسی نے حیات القلوب جلد ۲ صفحہ ۲۷۶ مطبوعہ ایران میں واقعہ معراج کے ذیل میں اس اذان کے پورے جملے نقل کئے ہیں اور یہ اذان وہی ہے جو مسلک اہل سنت والجماعت کے موافق ہوتی ہے۔ ولایتِ علی کا یہ زائد جملہ ان میں کہیں نہیں ملتا۔

ملا کاظم خراسانی ذخیرۃ العباد میں لکھتے ہیں کہ اسے اذان کا جزو سمجھنا حرام ہے۔ شیعہ حضرات کے اصول اربعہ میں سے من لا یحضرہ الفقیہ ایک مشہور کتاب ہے اس میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؓ نے ابوبکر حضرمی اور کلیب اسدی کے سامنے اذان کے پورے جملے بیان فرمائے۔ ان میں اشہد ان علیاً ولی اللہ کا نہیں ہے۔ یہ ان بزرگوں پر بہتان اور افتراء ہے کہ ان کی اذان میں اس فقرے کے شامل ہونے کا دعوٰی کیا جائے۔ ابن بابویہ قمی اذان کو اس فقرے کے بغیر نقل کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں :۔

قال مصنف هٰذا الكتاب هٰذا هو الاذان الصحيح لا يزاد فيه ولا ينقص منه والمفوضة لعنهم الله قد وضعوا اخبارًا وزادوا في الاذان محمد وآل محمد خير البرية مرتين ومنهم من روى بدل ذلك اشهد ان عليًا امير المؤمنين حقًا ولا شك في ان عليًا ولي الله وانه امير المؤمنين حقًا وان محمدًا وآله خير البرية ولكن ليس ذلك في اصل الاذان۔[1]

ترجمہ۔ میرا (ابن بابویہ قمی کا) فیصلہ ہے کہ یہی اذان صحیح ہے اس میں نہ کوئی اور جملہ داخل کیا جائے اور نہ اس سے کچھ کم کیا جائے۔ مفوضہ لوگوں نے خدا ان پر لعنت کرے کچھ روایات گھڑلی ہیں اور اذان میں اضافہ کر دیا ہے جیسے محمد وآل محمد خیر البریہ اور انہی ملعونوں کی بعض من گھڑت روایات میں ہے کہ اشہد ان محمداً رسول اللہ کے بعد دو دفعہ اشہد ان علیاً ولی اللہ کہا جائے اور بعض نے اس کی بجائے اشہد ان علیاً امیر المؤمنین حقاً کی روایت بنائی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت علیؓ ولی اللہ ہیں اور امیر المؤمنین برحق ہیں اور یہ کہ محمد وآل محمد خیر البریہ ہیں۔ لیکن یہ جملے اذان کا جزو ہرگز نہیں ہیں"

۳۔ اہل سنت صبح کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من النّوم کے الفاظ کہتے ہیں۔ یہ الفاظ بے شک سے ثابت ہیں۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں :۔

من السنّة اذا قال المؤذن في اذان الفجر حي على الصلوٰة حي على الفلاح قال

---

[1] من لا یحضرہ الفقیہ جلد ۱ صفحہ ۱۸۸ ایران

الصلوٰۃ خیر من النّوم۔

ترجمہ۔ مؤذن صبح کی اذان میں جب حی علی الفلاح کہہ لے تو اس کے بعد الصلوٰۃ خیر من النّوم کہنا سنّت ہے؛

اس حدیث کو ابن خزیمہ، دارقطنی اور بیہقی نے روایت کیا ہے اور اسناد اس کا بالکل صحیح ہے۔

امام نسائیؒ اپنی سنن میں الاذان فی السفر کے باب میں حضرت ابی محذورہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا:۔

"جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حنین سے واپس لوٹے تو میں اہلِ مکہ میں سے دسواں تھا جو حضورؐ کے ساتھ نکلا تھا۔ ہم حضورؐ اور ان کے ساتھیوں کی طلب میں تھے کہ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کو اذان کہتے ہوئے سنا۔ ہم ٹھہر گئے اور ہم نے بھی اذان کہنی شروع کردی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں نے ان لوگوں میں سے کسی اچھے آواز والے کی آواز سُنی ہے۔ حضورؐ نے ہمیں بلا بھیجا اور ہم میں سے ایک ایک نے اذان کہی تو حضورؐ نے فرمایا، ادھر آؤ۔ اور مجھے اپنے سامنے بٹھایا۔ میری پیشانی پر اپنے دستِ مبارک سے مسح فرمایا۔ میرے لیے تین بار دعا فرمائی اور کہا جا خانہ کعبہ کے پاس اذان کہہ۔ میں نے کہا یا رسول اللہ! میں کس طرح اذان دوں۔ تو حضورؐ نے مجھے اس طرح اذان سکھائی جس طرح کہ تم آجکل اذان کہہ رہے ہو۔ آپؐ نے مجھے یہ اذان سکھائی:۔

اللہ اکبر اللہ اکبر .... حی علی الفلاح حی علی الفلاح۔ الصلوٰۃ خیر من النوم الصلوٰۃ خیر من النوم فی الاولیٰ من الصبح قال علمنی الاقامۃ مرتین۔[1]

اس حدیث میں صبح کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم کی واضح تصریح ارشادِ نبوت سے ثابت ہے

سنن ابی داؤد میں ہے کہ حضورؐ نے حضرت ابو محذورہؓ کو اذان سکھاتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

فان کان لصلوٰۃ الصبح قلت الصّلوٰۃ خیر من النوم الصلوٰۃ خیر من النوم۔[2]

ترجمہ۔ جب اذان صبح کی اذان کے لیے ہو تو الصلوٰۃ خیر من النوم بھی دو دفعہ کہا کرو۔"

امام ابن خزیمہؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔[3] (آثار السنن جلد ۱ صـ۵۴)

محدثِ جلیل علامہ انور شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:۔

"الصلوٰۃ خیر من النوم فی اذان الفجر ھو ثابت مرفوعاً۔"[4]

---

[1] سنن نسائی جلد ۱ صـ۷۴ [2] سنن ابی داؤد جلد ۱ صـ۷۲ [3] آثار السنن جلد ۱ صـ۵۴ [4] العرف الشذی جلد صـ۱۱۰

"کہ صبح کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم کہنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوری سند کے ساتھ ثابت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: آج کل جو وصیت نامے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں ان کی حقیقت کیا ہے۔ کیا واقعی مدینہ منورہ میں کسی شخص شیخ احمد کو ایسا خواب آیا ہے اور کیا اس کی اشاعت ہر شخص پہ لازم ہے جیسا کہ اس کی مرسلہ نقول میں یہ پابندی عائد ہوتی ہے؟ سائل محمد شریف خیدار ۲۲۳ نواں کوٹ لاہور

جواب: دینِ اسلام اعتقاداً اور عملاً ہر اعتبار سے آنحضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ہو چکا ہے حضورؐ کی شریعت عقائد و معاملات اور اعمال و اخلاق کے ہر باب میں کامل اور مکمل ہے۔ ترغیب و ترہیب امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے قرآن عزیز، ارشاداتِ نبوت اور آثارِ صحابہؓ کیا کم ہیں کہ اب ان اُمور کے لیے خوابوں کی تلقین ضروری قرار پائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی یہاں کی دنیوی حیات میں درسِ ہدایت کا ہر باب پھیلا چکے اور درسِ عبرت کے ہر طریق سے قربِ قیامت اور امورِ آخرت کے بارے میں ڈرا چکے ہیں۔ ان تعلیماتِ قدسیہ میں کون سی کمی رہ گئی تھی۔ جو اس کے لیے اب حضورؐ کو خوابوں کے ذریعہ اس نئی مہم کو چلانا پڑے (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ)

ایسے خواب نامے دبے الفاظ میں یہ تاثر پیدا کر رہے ہیں کہ تعلیماتِ نبوت کی تکمیل قرآن و سنّت کے ذریعہ نہ ہو سکی تھی جس کے لیے اب یہ دروازہ کھولنا پڑا ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر اسلام کے خلاف اور کیا سازش ہوگی؟ شیخ احمد کا خواب کیا اولیاء کبار کے کشوف و الہامات بھی شریعتِ اسلامیہ کا جزو نہیں بن سکتے۔ شریعت وہی ہے جو حضورؐ پر مکمل ہو چکی۔ حضورؐ کے بعد ہر پیش آمدہ ضرورت کا حل قرآن و سنّت کی نصوص سے استنباط اور استخراج کے ذریعہ سے حاصل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ائمہ مجتہدین اس طریق سے شریعتِ محمدیہ کی شانِ جامعیت کی پوری عملی تصدیق کرتے ہیں۔

ان نقول مرسلہ میں جو پابندی عائد کی ہوتی ہے کہ اس کی اتنی نقلیں کرا کر اطراف میں شائع کی جائیں ایسی پابندی اور تعیین بھی صرف شریعت کا حق تھا۔ کسی کام کے لیے تاریخ یا عدد اپنی طرف سے معین کر لینا جب کہ یہ تعیین بھی محض انتظامی نہ ہو۔ بلکہ اسے شرعی رنگ میں رنگا گیا ہو یقینی طور پر ایک زیادتی ہے جو جائز نہیں کمزور عقیدے کے مسلمان ان نقول مرسلہ کی اشاعت میں جو اہتمام کرتے ہیں اگر وہی اہتمام قرآن و سنّت کے عبرت آموز اسباق کی نشر و اشاعت میں کیا جائے تو اس سے ان تمام شبہات و وساوس کی جڑ کٹ جائے

گی. جو اس سلسلہ میں پیدا ہو رہے ہیں. واللہ اعلم بالصواب

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: اگر کوئی آدمی نماز پڑھتا ہو اور حضورؐ کا خیال آجائے تو نماز ٹوٹ جاتی ہے یا نہ؟ اس مسئلے میں علماء دیوبند کا کیا عقیدہ ہے؟
سائل. حبیب الرحمٰن پانی پتی مدرسہ اشرف العلوم چنیوٹ

جواب: نماز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال مبارک آنے سے نماز ہرگز نہیں ٹوٹتی اور ہماری آجکل نمازیں اس درجہ کی ہی کب ہیں کہ ہمہ تن اللہ رب العزت کی طرف توجہ رہے اور اپنی ہمت کا اس ذاتِ برتر میں پوری طرح انجذاب ہو چکا ہو. اگر کوئی عارف باللہ اس روحانی درجے کے ہوں کہ ان کی تمام تر ہمت رب العزت کے حضور میں جذب ہو چکی ہو تو اس مقام عبادت پر کسی نہایت لائق تعظیم مخلوق کی طرف توجہ باندھ دینا (خواہ وہ مخلوق برتر ملائکہ کرام میں سے ہو یا انبیاء عظام میں سے) ہرگز جائز نہ ہو گا. کیونکہ مقام عبادت میں تعظیمی توجہ باندھنا خود عبادت ہے. ظاہر ہے کہ نماز میں انتہائی تعظیمی توجہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے. اس کے ساتھ کسی اور چیز کا خیال اگر ایسی تعظیم نہ لائے تو یہ اگرچہ موجب شرک نہیں لیکن قابلِ مذمت ضرور ہے لیکن اگر وہ خیال انتہائی تعظیم بھی ساتھ لا رہا ہو اور پوری طرح توجہ بھی اس کی طرف بندھ جائے تو یہ عبادت لغیر اللہ کا موجب ہو گا. جو پہلی بات سے بھی زیادہ مضر ہے. اگر کسی بزرگ و برتر مخلوق کا محض خیال ہی آئے تو اس میں کوئی حرج نہیں. لیکن اگر محض خیال نہ رہے. بلکہ پوری توجہ کا انجذاب ہو جائے تو بصورت تحقق تعظیم اس کا عبادت کے ساتھ اشتباہ ہو گا اور بصورت عدم تحقق تعظیم جیسے کہ معمولی چیزوں کا خیال ہو عبادت میں شریک کرنے کا سبب نہ بنے گا. لیکن یہ بھی لائق مذمت اور موجب کراہت ضرور ہے. تاہم اس کا ضرر اخف ہو گا. یہ تو ان اولیاء کرام اور بزرگوں کی بات ہے جو صاحبِ مقامات ہوں اور جنہیں صرفِ ہمت کی نسبتیں حاصل ہوں.

عوام الناس کے لیے ان باتوں میں الجھنا بالکل نامناسب ہے. بلکہ بعض اوقات ایمان ضائع جانے کا بھی اندیشہ ہو جاتا ہے. علمائے دیوبند کا اس باب میں مسلک یہ ہے جسے کہ ہم فتاوے دارالعلوم دیوبند جلد ۸ ص۲۳۲ سے بصورت سوال و جواب نقل کر رہے ہیں اور حق یہی ہے کہ مسئلہ اپنی حدود تک بیان ہو. اولیاء اللہ اور عارفین کرام کی باتیں کچھ اور ہی رنگ کی ہوتی ہیں، جنہیں ظاہری لفظوں سے دیکھنے کی بجائے کچھ معنوی حقیقت کے ساتھ سمجھا جاتا ہے. بزرگوں پر اعتراض کرنے کے بجائے ان کے کلام کا محمل تلاش کرنا چاہیئے. بہرحال مسئلہ سوال و جواب کی صورت میں حسبِ ذیل ہے. واللہ اعلم بالصواب.

سوال: عید الفطر کی نماز پڑھ کر امام صاحب خطبہ پڑھتے ہیں. کیا اس خطبہ کے بعد دعا مانگنی جائز ہے. براہِ کرم اس کا مفصل جواب تحریر فرمائیں. علمائے دیوبند کا مسلک کیا ہے؟

سائل. نور محمد مالک پراچہ ہوٹل، بیرون کھاد فیکٹری خانیوال روڈ ملتان

جواب: اس موضوع پر دارالعلوم دیوبند ہی کے دو فتوے ہدیۂ قارئین کیے جاتے ہیں. پہلا فتوے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی کا ہے جو فتاوے دارالعلوم جلد ۸ ص۲۳۷ پر موجود ہے اور دوسرا مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دامت برکاتہم کا ہے جو اسی فتاوے کے ص۲۳۸ پر موجود ہے. واللہ اعلم بالصواب

جواب حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب نقشبندی قدس سرہ العزیز.

الجواب: ہمارے حضراتِ اکابر مثل حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور دیگر حضرات، اساتذہ مثل حضرت مولانا محمد یعقوب، صاحب صدر مدرس سابق مدرسہ ہذا اور حضرت مولانا محمود الحسن صاحب صدر مدرس مدرسہ ہذا وغیرہم کا یہی معمول رہا ہے کہ بعد عیدین کے بھی مثل تمام نمازوں کے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے تھے اور احادیث سے بھی مطلقاً نمازوں کے بعد دعا مانگنا ثابت ہے اس میں عیدین کی نماز بھی داخل ہے. لہذا راجح ہمارے نزدیک یہی ہے کہ دعا بعد نماز عیدین بھی مستحب ہے اور مولانا عبدالحی صاحبؒ کا فتوے بندہ نے بھی دیکھا تھا کہ محض اس وجہ سے کہ عیدین کی نماز کے بعد دعا کا ذکر نہیں ہے. دعا کا نہ ہونا معلوم نہیں ہوتا اور دیگر احادیث سے سب نمازوں کے بعد دعا ہونا ثابت ہے. پس اس کو بھی اس پر محمول کیا جائے گا. کیونکہ جب کلیۃً استحباب، دعا کا بعد صلوات کے ثابت ہو گیا تو اب یہ ضرور نہیں کہ ہر ہر نماز کے بعد کی تصریح وارد ہو. کما ھو ظاھر. اور بہشتی گوہر میں بھی غالباً مولانا عبدالحی صاحبؒ کے فتویٰ کے اتباع سے ایسا لکھا گیا ہے. بندہ کے نزدیک وہ مسلم نہیں ہے. فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

کتبہ، عزیز الرحمٰن عفی عنہ

جواب حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دامت برکاتہم

الجواب: احادیث قولیہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے باسانید صحیحہ ہر نماز کے بعد جس میں نمازِ عید بھی داخل ہے، دعا مانگنے کی فضیلت اور ثواب منقول ہے. اگرچہ احادیث فعلیہ میں عمل کی تصریح نہیں. مگر نفی بھی منقول نہیں. اس لیے احادیثِ قولیہ پر عمل کرنا اور ہر نماز کے بعد اور عیدین کے بعد دعا مانگنا جائز و مستحب ہو گا اور بعض حدیث قولیہ یہ ہیں:-

روی عن براء بن عازب قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من قال دبر کل صلوٰۃ استغفر اللہ واتوب علیہ غفر لہ وان کان فر من الزحف رواہ الطبرانی فی

الصغیر والاوسط ومن معاذؓ فی حدیث طویل مرفوعًا اوصیك یامعاذ لاتدعن دبر کل صلوٰۃ ان تقول اللّٰھم اعنی علیٰ ذکرك وشکرك وحسن عبادتك رواہ ابوداؤد، النسائی واللفظ لہ وابن خزیمہ وابن حبان فی صحیحھما والحاکم وقال صحیح علیٰ شرط الشیخین[1]۔ کتبۂ احقر محمد شفیع غفرلہٗ

سوال: کسی حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد موجود ہے کہ امام مہدی کے ظہور کے وقت، ایک ہی رمضان میں سورج گرہن اور چاند گرہن لگیں گے۔ چاند گرہن رمضان کی ۱۳ تاریخ کو اور سورج گرہن ۲۸ رمضان کو ہو گا۔ اصل حقیقت کیا ہے؟ نیز مطلع فرمائیں کہ کیا یہ دونوں گرہن اپنی مذکورہ تاریخوں میں مرزا غلام احمد کے دعویٰ نبوت کے دور میں لگے ہیں؟ سائل۔ سید ناصر علی از لاہور

جواب: حدیث کی کتاب میں یہ پیشگوئی آنحضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الفاظ سے منقول نہیں اور نہ اسے حدیث نبوی کہا جا سکتا ہے۔ مرزائی مبلغین جب اسے حدیث نبویؐ کہہ کر پیش کرتے ہیں تو یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک صریح بہتان اور افترا ہے۔ سنن دارقطنی میں یہ پیش گوئی ایک بزرگ محمد بن علیؒ سے منقول ہے جو صحابی بھی نہیں چہ جائیکہ اس روایت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہا جائے بلکہ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ محمد بن علیؒ نے ایسا واقعی فرمایا ہو۔ کیونکہ اس قول کو محمد بن علی سے نقل کرنے والے بھی تقریبًا ایسے ہی ہیں جو ضعیف اور پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں۔ سنن دارقطنی میں محمد بن علی نامی کسی بزرگ کا یہ قول اس طرح منقول ہے:۔

عن عمرو بن شمر عن جابر عن محمد بن علی قال ان لمھدینا اٰیتین لم تکونا منذ خلق السمٰوات والارض تنکسف القمر لاوّل لیلۃ من رمضان وتنکسف الشمس فی النصف منہ لم تکونا منذ خلق السمٰوات والارض[2]۔

ترجمہ۔ شمر کا بیٹا جابر جعفی سے نقل کرتا ہے کہ محمد بن علی (نامی کسی شخص) نے کہا کہ ہمارے مہدی کے دو نشان ہوں گے اور وہ دونوں (اپنی اپنی جگہ پہ مستقل طور پر) ایسے ہیں کہ زمین و آسمان جب سے پیدا ہوئے کبھی ان کا ظہور نہیں ہوا۔ اوّل یہ کہ چاند کو گرہن رمضان کی پہلی رات ہو گا اور دوسرا یہ کہ سورج گرہن اسی رمضان شریف کے نصف میں واقع ہو گا۔ اور جب سے خدا تعالیٰ نے زمین و آسمان پیدا کئے ایسے گہنوں کا ظہور کبھی نہیں ہوا۔"

---

[1] ترغیب للمنذری ص۲۷۸ جلد۱ [2] سنن دارقطنی جلد۱ ص۱۸۸

شمر کا بیٹا عمرو جو محمد بن علی کے مذکورہ بالا قول کو نقل کر رہا ہے اس قابل نہیں کہ اس کی نقل پہ اعتماد کیا جائے۔ یہ شخص کذاب اور تقیہ باز تھا۔ اس پہ رافضی اور شاتم صحابہؓ ہونے کی جرح میزان الاعتدال ذہبی میں موجود ہے۔ اس کا استاد جابر جعفی جو مذکورہ پیشگوئی کا راوی ہے ضعیف ہے۔ اس کے متعلق سیدنا امام ابو حنیفہ رحؒ فرماتے ہیں کہ میں نے آج تک اس جیسا جھوٹا راوی کسی کو نہیں دیکھا۔ پس جب محمد بن علی سے نقل کرنے والوں کا بھی یہ حال ہے تو ہم اسے پورے اعتماد کے ساتھ حضرت محمد بن علی کا قول بھی نہیں کہہ سکتے چہ جائیکہ اسے کسی صحابی کا قول یا ارشادِ رسول خاتم کہا جا سکے۔

باقی یہ سوال کہ اگر یہ قول ایسا ہی کمزور اور مقطوع تھا تو پھر اسے امام دارقطنی نے درج کیوں کیا ہو اس کا جواب یہ ہے کہ احادیث کی کتابوں میں ارشاداتِ نبوی کے علاوہ صحابہ اور تابعین کے آثار بھی منقول ہوتے ہیں۔ بعض مقامات پہ ائمہ و فقہاء کے اپنے اقوال بھی مندرج ہوتے ہیں۔ حدیث کی کتاب میں درج ہونا اس بات کو ہرگز لازم نہیں کہ یہ قول خود لسانِ شریعت سے منقول ہو۔ ایسا گمان محض جہالت اور نادانی پہ مبنی ہے۔ اہل علم کے ہاں اس سوال کی کوئی قیمت نہیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحؒ اپنے اصول حدیث کے رسالہ عجالہ نافعہ کے ص۷ پر تصریح فرماتے ہیں کہ سنن دارقطنی حدیث کی تیسرے طبقے کی کتابوں میں سے ہے۔ جن کے جمع کرنے والوں نے روایات کی صحت کا التزام نہیں کیا، بلکہ ہر طرح کی روایات ان میں جمع کر رکھی ہیں۔

مرزا صاحب نے اس ضعیف اور بے بنیاد قول کو جو کذاب قسم کے راویوں کے واسطے صرف محمد بن علی تک پہنچتا ہے۔ اگر حدیثِ رسول سمجھ لیا ہے تو ہمارے لیے بالکل قابلِ التفات نہیں۔ مرزا صاحب فن حدیث میں بہت کمزور تھے۔ انہیں یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ "صحیح" ایک خاص معیار کی کتب ہوتی ہیں۔ جیسے صحیح بخاری اور صحیح مسلم وغیرہ اور یہ کہ حدیث کی ہر کتاب صحیح نہیں کہلاتی اور وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر تھے کہ سنن دارقطنی محدثین کے ہاں ہر قسم کی رطب و یابس روایات پر مشتمل ہے۔ مرزا صاحب کی نادانی دیکھیے کہ وہ دارقطنی کو بھی صحیح کا نام دے رہے ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

صحیح دارقطنی میں ایک حدیث ہے[1]...... الخ۔ یہ سنن دارقطنی ہونا چاہیئے تھا۔

یہ حدیث اگر قابلِ اعتبار نہیں تھی تو دارقطنی نے اپنی صحیح میں کیوں اس کو درج کیا[2]۔

حدیث کے ابتدائی درجہ کے طلبہ کو بھی معلوم ہے کہ حضرت امام بخاری کا اسم گرامی محمد تھا اسماعیل نہ تھا۔ اسماعیل ان کے باپ کا نام تھا۔ مگر مرزا صاحب ازالہ اوہام میں امام بخاری کا نام اسماعیل بتاتے ہیں۔

---

[1] حقیقۃ الوحی ص۱۹۴ - [2] تحفہ گولڑویہ ص۲۸

حالانکہ اس وقت اور ان علاقوں میں اس طرح کے مرکب ناموں کا منہاج ہی نہ تھا (دیکھئے ازالۂ اوہام جلد ۱ ص۱۱۱، ص۱۳۸ جلد دوم ص۲۵۹، ص۲۴۵) شہادت القرآن میں مرزا صاحب ایک حدیث صحیح بخاری کے حوالے سے نقل کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ صحیح بخاری میں بالکل نہیں ہے۔

اور پھر یہ نہیں کہ صحیح بخاری کا لفظ اتفاقاً قلم سے نکل گیا ہو۔ بلکہ اسے اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہہ کر اس نقل کی اور توثیق کرتے ہیں۔ پھر ازالۂ اوہام ص۲۱۰ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کرتے ہوئے یہ الفاظ بطور حدیث کے پیش کرتے ہیں:۔ بل ھو امامکم منکم۔ لفظ بل عجیب اضافہ ہے۔

حالانکہ یہ الفاظ اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث میں نہیں ملتے، نہ ان کے لیے کوئی سند صحیح ہے اور نہ کوئی ضعیف۔ یہ محض ایک افترار اور بہتان ہے۔ الحاصل مرزا غلام احمد فن حدیث میں عام طلبہ کے بھی ہمسر نہیں تھے۔ پس اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ہم ان کے اعتماد پر مذکورۃ الصدر پیشگوئی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث تسلیم کرلیں۔ (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ)

۲۔ مذکورہ گرہن مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوے کی تصدیق کے لیے قطعاً ثابت نہیں ہوئے یہ محض پراپیگنڈہ ہے۔ مرزائیوں کے اپنے دعویٰ کے مطابق گرہنوں کا وقوع ۱۳۱۲ھ میں پیش آیا۔ حالانکہ اس وقت تک مرزا صاحب نے رسالت کا دعوے ہی نہ کیا تھا۔ تعجب ہے کہ مرزا صاحب نے ان گرہنوں کو اپنے دعویٰ نبوت اور رسالت کی تصدیق کے لیے کیسے پیش کر دیا۔ مرزا صاحب لکھتے ہیں:۔

"اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رمضان کے مہینہ میں کبھی یہ دو گرہن جمع نہیں ہوئے بلکہ یہ مطلب ہے کہ کسی مدعیٔ نبوت یا رسالت کے وقت میں کبھی یہ دونوں گرہن جمع نہیں ہوئے۔ جیسا کہ حدیث کے ظاہر الفاظ اس پر دلالت کر رہے ہیں۔ اگر کسی کا یہ دعوے ہے کہ کسی مدعیٔ نبوت یا رسالت کے وقت میں یہ دونوں گرہن رمضان میں کسی زمانہ میں جمع ہوئے ہیں تو اس کا فرض ہے کہ اس کا ثبوت دے۔"[1]

اگر یہ کہا جائے کہ گرہن مہدیت کی علامت ہیں نبوت اور رسالت کی نہیں تو یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ مرزا صاحب کے نزدیک مہدیت کا دعوے رسالت کے دعوے کو بھی شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حقیقۃ الوحی کی مذکورہ عبارت میں اسے اپنے دعوے نبوت و رسالت کے لیے آسمانی نشان بتلا رہے ہیں۔ چونکہ مرزا صاحب کا یہ دعوے رسالت بہت بعد کا ہے اور یہ وقوع گرہن اس سے بہت پہلے کا ہے۔ بنا بریں ہم یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ مرزا صاحب کے دعوے نبوت کے دور میں ایسے گرہن کبھی نہیں لگے۔ یہ قادیانی حضرات

[1] حقیقۃ الوحی ص۱۹۶

کا محض پراپیگنڈہ ہے۔ اسی طرح ان لوگوں کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ ۱۳۱۲ھ کے اس مذکورہ گرہن سے پہلے اس طرح کے گرہن کبھی نہیں لگے۔ کیونکہ اس سے ایک سال قبل ۱۳۱۱ھ میں بھی چاند اور سورج کا گرہن امریکہ میں لگا تھا۔ اور وہاں بھی اس وقت ایک جھوٹا مدعیٔ نبوت مسٹر ڈوئی موجود تھا پس ایسے گرہن جو خرقِ عادت بھی نہیں کسی دعوے کی تصدیق کے ضامن ہرگز نہیں ہو سکتے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: ایک دوست کہتے ہیں کہ علماء کا یہ عقیدہ ہے کہ خدائی فیصلہ اٹل ہوتا ہے۔ حالانکہ احادیث اس عقیدے کے خلاف ہیں۔ مثلاً واقعہ معراج ہی کو لیجئے۔ حضورؐ کو پچاس نمازیں عطا ہوئیں پھر پانچ کیونکر رہ گئیں؟

۲۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معراج کی رات مداخلت کی کیا ضرورت تھی۔ معاملہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضورؐ کی امامت کا تھا؟ العبد۔ رشید احمد ارشد قریشی چکڑوی از جہلم

جواب: بے شک اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور اس کے وعدے پختہ اور اٹل ہیں۔ خدائی فیصلے تبدیل نہیں ہوتے اور کوئی طاقت انہیں بدل نہیں سکتی۔ اس اسلامی عقیدے کی بنا یہ قرآنی آیت ہے:۔

الّذین اٰمنوا و کانوا یتقون۔ لھم البشریٰ فی الحیٰوۃ الدنیا و فی الاٰخرۃ لا تبدیل لکلمات اللہ ذٰلک ھو الفوز العظیم۔ (پ ۱۱۔ یونس)

ترجمہ۔ جو لوگ ایمان لائے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہے، ان کے لیے خوشخبری ہے، حیات دنیا میں اور آخرت میں۔ بدلتی نہیں اللہ کی باتیں۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت ہے کہ اعمال اور نتائج اعمال سے متعلق سنتِ اللہ تبدیل نہیں ہوتی اور خدائی فیصلے بدلا نہیں کرتے۔

احادیث میں اگر بعض ایسے امور ملتے ہیں کہ فلاں فلاں موقعہ پر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ بدل گیا۔ تو در اصل وہاں خدائی فیصلے کی تبدیلی مراد نہیں۔ بلکہ اس امر کا اظہار مقصود ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہ حکم جتنی مدت کے لیے دیا تھا اور خدائی فیصلے میں وہ حکم جتنے وقت کے لیے تھا اب وہ مدت ختم ہو گئی ہے۔ اب اگلے دور کے لیے جو خدائی فیصلہ ہے وہ اور ہے۔ علماء اصول کی اصطلاح میں اسے نسخ کہتے ہیں:۔

ھو النص الدال علیٰ انتھاء امد الحکم[1]

ترجمہ۔ ناسخ اس نص کو کہتے ہیں جو کسی حکم کی مدت کے ختم ہونے کا پتہ دے۔

[1] مسلم الثبوت جلد ۲ ص۳۳ مصر

حصول المامول میں نسخ کی جو شرطیں بیان کی گئی ہیں ان میں سے چوتھی شرط یہ ہے :۔

ان یکون المنسوخ مقیدا بالوقت[1]

ترجمہ۔ امرِ منسوخ کسی ایک محدود مدت کے لیے ہی ہوتا ہے۔

پس جہاں کہیں خدائی احکام کے بدلنے کا بیان ہوتا ہے اس کا مفہوم انتہائے حکم کا بیان ہے کہ وہ حکم خدا کے علم میں ایک خاص زمانے تک کے لیے تھا اس زمانہ کی انتہا پر وہ حکم ختم ہو گیا اب اسے منسوخ کہیں گے۔ خواہ اسے کسی نئے حکم سے بدلا جائے یا بغیر بدل کے اس کے ختم ہونے کا اعلان کر دیا جائے۔

تفسیر رحمانی میں واذا بدلنا اٰیۃ مکان اٰیۃ (پ ۱۴، نحل) کے تحت لکھتے ہیں:۔

معراج کی رات پچاس نمازوں کی فرضیت جتنے مختصر وقت کے لیے تھی۔ اس کے گزر جانے پر پانچ نمازوں کا حکم باقی رہ گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بار بار جانا اور آنا اسباب کے درجے میں تھا۔ خدائی فیصلے میں یہ بات اپنی جگہ اٹل تھی کہ آخری حکم پانچ کا ہی باقی رہے گا اور اب اس میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔ یعنی اس حکم کے لیے جو وقت مقرر ہے اس دور کی انتہا کبھی نہ ہوگی یہاں تک کہ قیامت آجائے۔ چنانچہ اس امر کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ لایبدل القول لدیّ۔ کہ میرا فیصلہ ہرگز بدلا نہیں جائے گا۔"

۲۔ معراج کی رات حضرت موسےٰ علیہ السلام کی مداخلت اور مشاورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اخوتِ نبوت کا حق ادا کرنے کے لیے ایک ہمدردی کا اظہار تھا۔

ثانیاً۔ شرائع کی جامعیت اور احکام جہاد و ہجرت وغیرہ کو متضمن ہونے کے اعتبار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی ایک خاص مناسبت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت سے تھی اور یہ وہ عظیم مناسبت ہے جو اس امتِ مسلمہ کو امم گذشتہ میں سے صرف حضرت موسےٰ علیہ السلام کی امت سے ہی حاصل تھی۔ بنابریں اس امتِ گذشتہ کے تجربات اس امت کے لیے نشان تھے۔ اندریں حالات معراج کی رات پچھلے انبیاء میں سے صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مشاورت و نصیحت ہی مناسب تھی۔

ثالثاً۔ اور عالمِ ارواح میں اور عہدِ میثاق میں تمام انبیاء کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت اور امانت کا اقرار کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب سے یہ عہد لیا تھا۔ ولتؤمنن بہ ولتنصرنہ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی عہدِ نصرت کی تکمیل میں معراج کی رات اپنا یہ فریضہ بر سبیل مشاورت اور نصیحت ادا فرمایا تھا۔

---

[1] حصول المامول ص۵۷

سوال: ہفت روزہ "دعوت" کے گذشتہ شمارہ میں اس سوال کا جواب موصول ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اٹل ہوتا ہے تو پھر اس کے بعض احکام منسوخ کیوں ہو جاتے ہیں۔ اس جواب سے میری کافی تسلی ہو گئی ہے۔ مگر ایک دوسرا خدشہ ذہن میں وارد ہو گیا ہے۔ اس کا بھی ازالہ فرمائیں۔ وہ خدشہ یہ ہے کہ جو حکم منسوخ ہوتا ہے اس کا ناسخ ضرور اس سے بہتر ہوتا ہے یا کم از کم اس کی مثل ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔ ما ننسخ من اٰیۃ او ننسھا نأت بخیر منھا او مثلھا۔ مگر معراج کی رات جب پچاس نمازیں منسوخ ہو کر پانچ رہ گئیں تو یہ پانچ ان پچاس سے کسی طرح افضل نہیں اور نہ ہی ان کی مثل ہیں۔ بلکہ یہاں اعلیٰ ادنیٰ کے ساتھ منسوخ ہو رہا ہے۔ پھر نسخ قبل العمل کہ منسوخ پر ابھی عمل نہ ہوا ہو اور ناسخ آجائے۔ یہ بات وضاحت طلب ہے اس کی تفصیل فرمائیں؟

سائل۔ رشید احمد ارشد قریشی ججروی از جہلم

جواب: رب العزت اپنے جس حکم کو منسوخ فرماتے ہیں اس کا ناسخ پہلے حکم سے یقیناً بہتر ہوتا ہے اور اس کے برابر ہونے میں تو کلام ہی نہیں۔ لیکن ہر حکم کمیات اور مقدار کے اعتبار سے ہی ناپا تولا یا گنا نہیں جاتا بلکہ اس کی کیفیات، لوازمات اور کئی دوسرے اعتبارات کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ پانچ نمازیں گنتی اور تعداد میں تو پچاس نمازوں سے بہتر اور زیادہ نہیں۔ لیکن اس لحاظ سے کہ پانچ نمازوں کے فرض ہونے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے اتنے امکانات نہیں، جتنے کہ پچاس نمازوں کے فرض ہونے کی صورت میں ہیں پانچ یقیناً پچاس نمازوں سے زیادہ بہتر اور افضل ہیں۔ پانچ نمازوں کی فرضیت کی صورت میں رزقِ حلال طلب کرنے کے مواقع اتنے زیادہ ہیں کہ پچاس نمازوں کی صورت میں اتنے نہیں۔ اس اعتبار سے بھی پانچ پچاس سے بہتر اور افضل ہیں اور جب کہ ان پانچ پر ثواب اتنا ہی مرتب ہوتا ہو، جتنا کہ پچاس پر تو ان پانچ کی ہر ایک اکائی پچاس کی ہر ایک اکائی سے یقیناً افضل اور بہتر ہوگی۔ رب العزت نے پہلے پچاس نمازیں فرض فرمائیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح تسلیم کر لیا اور احکامِ باری تعالیٰ اسی صورت میں لا رہے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مشورے سے اس میں ترمیم و تسہیل کے لیے پھر عرضداشت پیش کی اس سے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال اطاعت کمال تسلیم اور کمالِ ادب بحضور باری تعالیٰ کا پتہ چلتا ہے وہاں نماز عبادت اور اطاعتِ رب العزت کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرغوبِ طبعی ہونے کی بھی شہادت ملتی ہے کہ کثرتِ عبادت پر حضور طبعاً اس طرح مسرور اور مطمئن ہیں جیسے کسی کو نہایت لطیف اور لذیذ مٹھائی کھانے کو مل جاوے جس کے واپس کرنے اور لوٹانے کا تصور بھی دل میں نہیں گزرتا۔ ہاں حضرت موسےٰ علیہ السلام کے عرض کرنے پر پھر تقلیل و تخفیف کی گذارش اس امر کا پتہ دیتی ہے کہ مشورہ لینے اور قبول کرنے کے اعلیٰ اخلاق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادات شریفہ میں طبعی طور پر سموئے ہوئے تھے۔

اور پھر ان سب کام کرنے بھی حضورؐ کی اپنی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ رحمۃ للعالمین کا دامنِ رحمت خود اُمت کی بہتری اور آسائش کے لیے ہی پھیل رہا تھا۔ پہلے پچاس نمازوں کے فرض ہونے اور بالآخر پانچ رہ جانے میں ان جیسی اور ہزاروں حکمتیں موجود ہونگی۔ تاہم اس یقین سے چارہ نہیں کہ اگر اولاً ہی پانچ کی فرضیت ہوتی تو یہ حقائق و معارف اس صورت میں ہرگز ظاہر نہ ہوتے۔ باقی رہا نسخ قبل العمل تو یہ اس واقعہ معراج میں ہی مذکور نہیں اس کے علاوہ بھی یہ حقیقت اپنی جگہ ثابت ہے۔ رب العزت نے حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ جیسا کہ آیت قرآنی یا ابت افعل ما تؤمر سے مستفاد ہے۔ پھر بغیر اس کے کہ اس پر عمل کا تحقق ہو۔ رب العزت اسے مینڈھا ذبح کرنے کے دوسرے حکم سے بدل دیتے ہیں۔ وفدیناہ بذبح عظیم اس میں خواہ ہزاروں حکمتیں ہوں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کہ نسخ قبل العمل کی صورت یہاں بھی پیش آئی۔ اب یہاں مینڈھے کی قربانی کرنا بیٹے کی قربانی کرنے کے ثواب سے کسی صورت میں بھی کم نہیں۔ ٹھیک ہے کہ مینڈھے کا درجہ حضرت اسماعیلؑ کے برابر ہرگز نہیں، چہ جائیکہ افضل اور برتر ہو۔ لیکن سوال مینڈھے اور سیدنا حضرت اسماعیلؑ کی ذات اور شخصیات کا نہیں۔ بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فعل قربانی کا ہے اور ہم یقین رکھتے ہیں کہ خلیل باری حضرت ابراہیمؑ کو اس صورت پیش آمدہ میں مینڈھے کی قربانی کا جو ثواب ملا وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کے ثواب سے کسی صورت میں کم نہیں اور اس فدیہ اور نسخ حکم سے اعلیٰ کا ادنیٰ کے ساتھ منسوخ ہونا کسی طرح لازم نہیں آرہا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: خالد محمود عفا اللہ

سوال: حضرت عثمانؓ پنجتن میں داخل ہیں یا نہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ پنجتن سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، علی المرتضیٰؓ، حضرت فاطمۃ الزہراؓ اور حضرات حسنینؓ ہیں۔ اور اکثر لوگ اپنے محاورات میں پنجتن سے مراد وہ پانچ بزرگ لیتے ہیں جنہوں نے منہاجِ نبوت کے مطابق تیس سال مسلمانوں کی عملی قیادت کی۔ یعنی حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت امام حسن رضی اللہ عنہم اجمعین۔ اب امر جواب طلب یہ ہے کہ عرفِ عام میں پنجتن سے کون کون سے بزرگ مراد لیے جاتے ہیں۔ اس کی کچھ تفصیل فرمائیں؟

سائل۔ سعید ظفر چوک سخی اعتبار شاہ سیالکوٹ

جواب: سیدنا حضرت عثمانؓ یقیناً پنجتن میں داخل ہیں اور پنجتن سے مراد حقیقت میں وہی نفوسِ قدسیہ ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق کے مطابق ملتِ اسلامیہ کی عملی قیادت فرمائی۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پہلے پانچ بزرگوں کے لیے پنجتن کا اطلاق موجود نہیں۔ حدیث کساء کی روشنی میں اپنے بعض

حضرات نے ان مقدس بزرگوں کے لیے پنجتن کا لفظ استعمال کیا ہے۔ پس ہر دو مفہوم اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔

اوّلاً: ایک چادر کے نیچے آکر حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے مشرف ہونے والے چارتن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ساتھ شمار کرلیں تو پنجتن۔

ثانیاً: آنحضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہاج کے مطابق امت کی عملی قیادت کرنے اور بارِ نبوت اٹھانے والے پانچ نفوسِ قدسیہ۔

ہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خود مرکزِ رشد و ہدایت اور منبعِ نور و عرفاں ہیں اور باقی سب اسی ایک شمعِ فروزاں سے مستنیر و مستفید، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے ساتھ برابر کا شریک کرنا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ پروانوں کا شمع کے ساتھ برابر کا شمار کیسا اور اصل کے ساتھ عکوس مرایا کی برابری کی کیا نسبت؟ زیادہ مناسب یہی تھا کہ پہلے عرف کے مطابق پنجتن کی بجائے چارتن کی اصطلاح وجود میں آتی تاکہ مرکز اور اطراف اصل اور ظل شمع اور پروانے کا امتیاز قائم رہتا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ دوسری اصطلاح میں پنجتن کا اطلاق جن بزرگوں پر آتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غایت عظمت اور مرکزی رفعت کی وجہ سے حضورؐ کو ان کے ساتھ شریک نہیں کیا گیا تاکہ کسی قسم کی برابری کا ابہام پیدا نہ ہو۔ ہاں پنجتن کے ساتھ پاک کی ترکیب کسی صورت میں درست نظر نہیں آتی۔ اس لیے کہ پہلی اصطلاح کے مطابق بھی صرف یہی پانچ بزرگ پاک نہیں بلکہ ان کے علاوہ حضرت حسینؓ کی ہمشیرہ بی بی زینبؓ، بی بی ام کلثومؓ، حضرت امام زین العابدینؒ، امام باقرؒ اور حضرت امام جعفر صادقؒ وغیرہم یہ سب بزرگانِ کرام بھی نہایت پاک اور مقدس ہستیاں ہیں۔ پس پہلے پانچ کو پاک کہنے میں کسی قسم کا کوئی حصر نہ رہا۔ اسی طرح دوسرے پانچ بزرگوں کے ساتھ پاک اور مقدس ہونے میں حضرت ابن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، اور حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ بھی یقیناً شامل ہیں۔ پس پنجتن کی اصطلاحات تو اپنے اپنے امتیازات کے ساتھ بے شک قائم ہیں۔ لیکن اس لفظ کے ساتھ پاک کی زیادتی مناسب نہیں۔ باقی یہ امر کہ حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت امام حسنؓ کے لیے پنجتن کی یہ اصطلاح صرف تنظیم اہلسنت کی ایجاد ہے عرف عام ہرگز نہیں۔ سو اس کے جواب میں اور عرف عام کے اثبات میں ہم ایک غیر جانب دار شہادت پیش کرتے ہیں۔ رائے بہادر کنہیا لال کی مشہور قدیمی کتاب "یادگار ہندی" اپنی اہمیت، شہرت اور عظمت میں ایک نہایت ممتاز مقام رکھتی ہے۔ یہ کتاب نوادر زمانہ میں سے ہے اور کسی کسی لائبریری میں میسر آتی ہے۔ احقر نے یہ کتاب انجمن اصلاح المسلمین پنڈی بھٹیاں کی لائبریری میں دیکھی تھی۔ اس کے صفحہ ۸۱ پر انہی پانچ بزرگوں کا تذکرہ ہے اور آخر میں یہ لکھا ہے۔ ؎

بایں پنجتن شد خلافت تمام — کہ از نام شاں یافت اسلام نام

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان پانچ نفوس قدسیہ پر پنجتن کا اطلاق اس وقت بھی عرف عام کے درجہ میں موجود تھا۔ اس کے متعلق پورے اشعار درج ذیل ہیں۔ رائے بہادر کنہیالال لکھتے ہیں:-

شد آں مطلع نورِ صدق و یقیں
چو خورشیدِ تاباں بزیرِ زمیں

ابوبکرؓ شد بعد ازاں جانشیں
باجماعِ اصحاب اہلِ یقیں

زدورش چو دو سال و شش ماہ رفت
ازیں دہر آں صاحبِ جاہ رفت

دگر بارہ شد جانشیں عمرؓ
بخورد از نہالِ خلافت ثمر

بدورانِ آں حاکمِ نیک نام
باصحابِ دیں فتح شد روم و شام

چودہ سال از دورِ حکمش گزشت
بہ تختِ عرب شاہ عثمانؓ نشست

بدورانِ آں اہلِ عز و وقار
عجم سربسر گذشت فرماں گذار

باسلامِ دیں مملکت شد وسیع
ز درگاہِ حق یافت قدر رفیع

بحکمش شد ایراں و توراں مطیع
بہ تیغش سراپا خراساں مطیع

چو شد دوازدہ سال از دورِ او
ز دنیا برفت آں امیرِ نکو

بعالم علیؓ گشت فرماں روا
باجماعِ اصحاب اہلِ صفا

چو بگذشت از عہدِ او چار سال
شد از دہر دوں حیدرِ باکمال

حسنؓ بعد ازاں مسند آرائے گشت
رواں حکمِ او گشت در کوہ و دشت

بایں پنجتن شد خلافت تمام
کہ از نامِ شاں یافت اسلام نام

واللہ اعلم بالصواب

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال ۲: حضرت عثمانؓ جنگ بدر، جنگ احد اور بیعتِ رضوان وغیرہا جیسے اہم موقعوں پر غائب کیوں رہے۔ اتنی عظیم شخصیت کا ایسے مواقع پر غائب رہنا کچھ شکوک و شبہات پیدا کرتا ہے۔ اس کی تفصیل فرماویں؟

سائل۔ ارشاد احمد از سرائے عالمگیر

جواب: سیدنا حضرت عثمانؓ کا جنگ احد کی افراتفری میں منتشر ہونا کسی معتبر طریق سے ثابت نہیں محض ایک اعتراض ہے جو مخالفین کے حوالے سے ہی ہماری کتابوں میں نقل ہے تحقیقی وزن تو اس کا نہیں ہے باقی رہا الزامی جواب تو ہمارے بزرگوں نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ اس کی تفصیل فرمائی ہے یعنی اگر آپ

جنگِ احد کے موقع پر عوامی افراتفری میں منتشر ہو بھی گئے تو اس سے کوئی الزام قائم نہیں ہوتا۔ رب العزت نے اس اضطراری کیفیت کے جملہ نتائج کو قرآن پاک میں معاف فرما دیا ہوا ہے۔ سیدنا حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا الزامی جواب اور جنگِ بدر اور صلح حدیبیہ میں شامل نہ ہو سکنے کے تحقیقی جواب بڑی تفصیل سے پیش فرمائے ہیں۔ حضرت عثمان بن موہبؒ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مکہ میں سوال کیا:-

انی سائلك عن شیء افتحدثنی قال انشدك بحرمت هذا البيت اتعلم ان عثمان بن عفانؓ فر يوم احد قال نعم قال فتعلمه تغيب عن بدر فلم يشهدها قال نعم، قال فتعلم انه تخلف عن بيعت الرضوان فلم يشهدها، قال نعم قال فكبر قال ابن عمرؓ تعال لاخبرك ولابين لك عما سألتني عنه اما فراره يوم احدٍ فاشهد ان الله عفا عنه واما تغيبه عن بدرٍ فانه كانت تحته بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم وكانت مريضةً فقال له النبي صلى الله عليه وسلم ان لك اجر رجل ممن شهد بدرا وسهمه واما تغيبه من بيعت الرضوان فانه لو كان احد اعز ببطن مكة من عثمان بن عفانؓ لبعثه مكانه فبعث عثمان وكانت بيعت الرضوان بعد ما ذهب عثمان الى مكة فقال النبي صلى الله عليه وسلم بيده اليمنى هذا يد عثمانؓ فضرب بها على يده فقال هذه لعثمانؓ اذهب بهذا الان معك۔[1]

ترجمہ: میں آپ سے ایک سوال پوچھتا ہوں کیا آپ مجھے بتائیں گے۔ میں آپ کو اسی مقدس مقام کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا آپ جانتے ہیں کہ عثمانؓ جنگِ احد کے دن میدان سے چلے گئے تھے۔ آپ نے کہا۔ ہاں۔ اس نے پوچھا کیا آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ عثمانؓ جنگِ بدر میں غائب تھے اور حاضر نہ ہوئے۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں۔ اس نے پوچھا کیا آپ جانتے ہیں بیعت الرضوان سے پیچھے رہے اور شامل نہ ہوئے۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں۔ اس نے طنزاً اللہ اکبر کہا۔ اس پر حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا۔ آئیں تجھے بتاؤں اور جو تو نے پوچھا ہے اسے بیان کروں۔ آپ کا جنگِ احد سے چلے جانا جو ہے اس کے بارے میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا ہے اور آپ کا جنگِ بدر سے غائب ہونا اس لیے

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۵۸۲

تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی جو آپ کے نکاح میں تھیں بیمار تھیں۔ پس حضورؐ نے حضرت عثمانؓ کو فرمایا تھا کہ جنگِ بدر میں شامل ہونے کا تجھے ثواب بھی ملے گا اور مالِ غنیمت میں سے دوسروں کے برابر حصہ بھی ملے گا اور آپ کا بیعت الرضوان سے پیچھے رہنا اس لیے تھا کہ حضورؐ نے حضرت عثمانؓ کو کفار مکہ کے ساتھ مسلمانوں کی طرف سے گفتگو کرنے کے لیے بھیجا ہوا تھا۔ مکہ والوں کے لیے حضرت عثمانؓ سے بڑھ کر اگر کوئی معزز ہوتا تو حضورؐ اسے بھیجتے۔ اور بیعت الرضوان حضرت عثمانؓ کے مکہ جانے کے بعد ہوئی تھی۔ پس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک ہاتھ کو حضرت عثمانؓ کا ہاتھ قرار دے کر دوسرے ہاتھ کے ساتھ بیعت فرمائی اور کہا کہ یہ عثمانؓ کا ہاتھ ہے یعنی عثمانؓ کی جانب سے میں خود بیعت کر رہا ہوں"

اس کے بعد حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ جواب اپنے ساتھ لے جا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جو جنگِ اُحد کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرما دیا تھا۔ اس کا مآخذ سورۂ آل عمران کی یہ آیت مبارکہ ہے:۔

ان الذین تولوا منکم یوم التقی الجمعٰن انما استزلھم الشیطٰن ببعض ما کسبوا ولقد عفا اللہ عنھم ان اللہ غفور حلیم۔

ترجمہ: جو لوگ تم میں سے اس دن بھاگ گئے جس دن دونوں جماعتوں کی ٹکر ہوئی یعنی جنگِ اُحد کے دن تو سوائے اس کے اور کوئی وجہ نہیں کہ شیطان نے انہیں پھسلا دیا تھا۔ بہ وجہ ان کے بعض کاموں کے اور البتہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا ہے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ بخشنے والے اور حلم والے ہیں"

جنگِ احد میں چونکہ مسلمانوں کو ایک مغالطہ لگ گیا تھا جس کی وجہ سے وہ شریکِ جنگ نہ رہے اور پھر بھاگنا پڑا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف دیا کیونکہ یہ ان کی ایک اجتہادی غلطی تھی۔ انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ فتح ہو چکی ہے اور اپنے مورچوں کو چھوڑ دیا تھا۔ حالانکہ دشمن پہاڑ کے پیچھے سے حملہ کرنے کا ارادہ کر رہے تھے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضورؐ نے باوجودیکہ پہلے ہدایت بھی فرمائی تھی کہ خواہ ہم کامیاب بھی ہو جائیں مورچے نہ چھوڑنا مگر فتح کی خوشی کی وجہ سے وہ اپنے آپے میں نہ رہے۔ ببعض ما کسبوا سے یہی مراد ہے۔ وہ صحابہ صرف اسی وجہ سے پھسلے تھے، بزدلی یا ڈر کی وجہ سے نہیں۔ ورنہ انّما کا کلمہ حصر چہ معنی دارد؟ پس جب کہ اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا تو اب اعتراض کرنے کی کون شقی القلب جرأت کر سکتا ہے۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے آیہ مذکورۃ الصدر کو ہی سابقہ حدیث کا ترجمۃ الباب قرار دیا ہے۔

جنگِ بدر میں جس طرح بنتِ رسول کی نگرانی کے پیشِ نظر حضرت عثمانؓ شامل نہ ہو سکے تھے۔ اسی طرح حضورؐ کے اہل و عیال کی نگہداشت کی وجہ سے حضرت علیؓ بھی غزوۂ تبوک میں شامل نہ ہو سکے تھے اور حضرت عثمانؓ نے ہی اس غزوہ کی تیاری کروائی تھی۔ مگر چونکہ ان دونوں بزرگوں کے یہ کام خدا کے رسول کی رضا اور حکم کے ماتحت تھے۔ اس لیے ان پر اعتراض بھاری غلطی ہو گی۔ ہاں حضرت عثمانؓ بموجب نصِ نبوی بدری ہونے کی فضیلت، باعتبار شمولیت اور باعتبار غنیمت ضرور رکھتے ہیں۔ اور اگر حضرت علیؓ کے لیے غزوۂ تبوک میں شامل ہونے والوں کی فضیلت خصوصی طور پر مذکور نہیں تو اس سے آپ کی شان میں کوئی فرق نہیں آتا۔ آپ تو جانے کے لیے تیار تھے مگر حضورؐ نے ہی آپ کو اس منزلت میں رکھ کر جو حضرت ہارونؑ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھی۔ اپنے اہل و عیال کی دیکھ بھال کے لیے متعین فرمایا تھا۔ باقی بیعت الرضوان میں حضرت عثمانؓ کو وہ فضیلت حاصل ہوئی تھی، جو کسی دوسرے صحابی کو حاصل نہ ہو سکی اور اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے، کیا جا سکتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: یزید نے حضرت امام حسینؓ کے ساتھ جو سلوک کیا اس کی ذمہ داری حضرت امیر معاویہؓ پر بھی عائد ہوتی ہے یا نہ؟ اگر یزید کی بجائے اس وقت حضرت امیر معاویہؓ برسرِ حکومت ہوتے تو کیا ان کا عمل بھی ایسا نہ ہوتا؟ اگر نہیں تو پھر انہوں نے حضرت علی المرتضیٰؓ کے ساتھ جنگیں کیوں کیں۔ حضرت علیؓ کی امیر معاویہؓ کے بارے میں کیا رائے تھی؟

سائل: محمد رفیق اکبر بازار کھاریاں

جواب: یزید نے حضرت امام حسینؓ کے ساتھ جو سلوک کیا۔ اس کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے۔ حضرت امیر معاویہؓ اس عمل سے بالکل پاک اور بری ہیں۔ اگر ان پر یہ ذمہ داری اس لیے ڈالی جائے کہ انہوں نے یزید کو اربابِ حل و عقد کے شورائی فیصلے سے اپنا ولی عہد بنایا تھا۔ تو یہ بار سیدنا حضرت امیر معاویہؓ پر اس لیے نہیں آتا کہ انہوں نے ولی عہد بنانے کے ساتھ ہی حضرت حسینؓ کے متعلق بھی واشگاف الفاظ میں حکم فرما دیا تھا۔ شیخ ابن بابویہ قمی سند معتبر سے حضرت زین العابدینؒ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہؓ نے یزید سے کہا:۔

امام حسینؓ پس میدانی نسبت و قرابت او باآں حضرت رسالت واو پارہ تن آں حضرتؐ است واز گوشت و خون آں حضرتؐ پروردہ است و من میدانم کہ البتہ اہلِ عراق او را بسوئے خود خواہند برد و یاری او نخواہند کرد و او را تنہا خواہند گذاشت اگر باو ظفر یابی حق حرمت او را بشناس و منزلت و قرابت او باپیغمبر بیاد آور و او را بجرد ہائے او مؤاخذہ مکن و روابطی کہ من با او دریں مدت محکم کردہ ام قطع مکن زنہار کہ با او مکرد

آسیبی برسانی"[1]

ترجمہ: لیکن حسینؓ کے متعلق تو تُو جانتا ہی ہے کہ اسے حضرت رسالتؐ کے ساتھ کتنی قرابت اور نسبت حاصل ہے وہ حضورؐ کے لختِ جگر ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گوشت اور خون ہی کے پروردہ ہیں مجھے پتہ ہے کہ اہلِ عراق انہیں اپنے ہاں بُلائیں گے اور پھر ان کی مدد نہیں کریں گے بلکہ انہیں تنہا چھوڑ دیں گے۔ اگر تجھے ان پر کامیابی حاصل ہو تو ان کے احترام کا پُورا حق ادا کرنا۔ ان کے درجے اور ان کی پیغمبر کے ساتھ قرابت کو یاد رکھنا اور ان کے کسی بھی عمل پر ان سے مؤاخذہ نہ کرنا اور وہ تعلقات جو میں نے اب تک ان کے ساتھ مضبوط کئے ہیں انہیں ہرگز نہ توڑنا۔ دیکھنا کہیں ایسا نہ ہو کہ انہیں کوئی دھوکا اور تکلیف تمہاری طرف سے پہنچے"۔

اتنے واضح ارشادات اور اتنی کھلی ہدایات کے بعد اب جو کچھ بھی یزید کا عمل ہو۔ اس کی ذمہ داری سیدنا حضرت امیر معاویہؓ پر ہرگز عائد نہیں ہوتی۔ یزید نے ان ہدایات کی خلاف ورزی کی۔ ابن زیاد حضرت حسینؓ سے بدسلوکی کا موجب ہوا۔ یہ اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ اصولی طور پر ان احکام کا وجود حضرت امیر معاویہؓ کے دامنِ اقدس پر کوئی دھبہ آنے نہیں دیتا اور ہم اہلسنّت والجماعت کے نزدیک علم غیب خاصہ باری تعالیٰ ہے۔ اگر حضرت امیر معاویہؓ کو یہ پتہ نہ چل سکا کہ یزید ان احکام کی کہاں تک پابندی کرے گا۔ تو یہ حضرت امیر معاویہؓ کا قصور نہیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:۔

"علم غیب اصلاً نزد اہلسنّت بلکہ جمیع طوائف مسلمین غیر از شیعہ شرط امامت نیست"[2]

"علم غیب خاصہ خداست پیغمبراں ہم نظر بحال ظاہر آرایاں باطن خراب نفاق پیشہ فریفتہ مے شوند۔ تا وقتیکہ وحی الٰہی و وقائع اللّٰہی کشف حال شاں بکند"

پھر آگے لکھتے ہیں:۔

"امام را علم غیب ضرور نیست کہ در حسن ظن خطا نکند و ہر کس را بحسب آنچہ از و صادر شدنی است بداند"[3]

(حاصل ترجمہ) علم غیب کا لازم ہونا صرف شیعوں کا عقیدہ ہے۔ حق یہ ہے کہ علم غیب خاصہ خدا ہے پیغمبر بھی ظاہر حال پر حکم کرتے ہوئے بعض اوقات باطن خراب اور نفاق پیشہ لوگوں کا اعتبار کر لیتے ہیں۔ اور جب تک وحی الٰہی اور واقعات حالات کا انکشاف نہ کر دیں پیغمبروں کا ظاہر بھی حالات

---

[1] جلاء العیون ص ۳۸۸ طبع ایران، طبع دوم ص ۲۴۸ طبع اوّل ایران [2] تحفہ ص ۳۰۵ لکھنؤ [3] ایضاً ص ۳۰۷

پر ہی مبنی ہوتا ہے۔ امام کے لیے ضروری نہیں کہ وہ اپنے حسنِ ظن میں خطا کر ہی نہ سکے اور جو کچھ آگے ہوتا ہے وہ اسے پُوری طرح جانتا ہو"۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی تفصیل سے یہ اَمر از خود واضح ہے کہ یزید نے حضرت امام حسینؓ کے ساتھ جو سلوک بھی کیا حضرت امیر معاویہؓ پر اس کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

۲۔ یزید کی بجائے اس وقت اگر خود حضرت امیر معاویہؓ برسرِ حکومت ہوتے تو واقعاتِ کربلا کا نقشہ اس طرح ہرگز نہ ہوتا۔ اوّلاً اس لیے کہ حضرت حسینؓ کے متعلق حضرت امیر معاویہؓ کے خیالات اور ارادے جو محولہ بالا ارشادات سے ثابت ہوتے ہیں ہر ممکن بدسلوکی سے مانع ہوتے۔

ثانیاً حضرت امیر معاویہؓ کے یہ جذبات عقیدہ کے درجہ تک پختہ تھے کہ آلِ رسول اور حضرات اہلبیت کے ساتھ تعلقات اور روابط مضبوط سے مضبوط تر کرنے چاہئیں۔ جیسا کہ جلاء العیون کی مذکورہ بالا عبارت سے از خود واضح ہوتا ہے۔

ثالثاً اگر اس وقت یزید کی بجائے خود امیر معاویہؓ کی حکومت ہوتی تو حضرت امام حسینؓ بھی ہرگز مخالفت میں نہ آتے۔ بلکہ وہ حضرت امیر معاویہؓ کا مقام، مرتبہ اور پالیسی پہچانتے تھے۔ اگر ان کے نزدیک حضرت امیر معاویہؓ کی شخصیت لائق احترام نہ ہوتی تو وہ ان کی ہرگز بیعت نہ فرماتے اور انہیں ہرگز اپنا راہنما تسلیم نہ کرتے۔ رجال کشی میں صاف طور پر منقول ہے کہ حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہما ان دونوں بزرگوں نے حضرت امیر معاویہؓ کی بیعت فرمائی تھی۔ ملّا باقر مجلسی نے پُوری وضاحت کے ساتھ اس بیعت کو تسلیم کیا ہے[1] پس یہ تو تصور میں بھی نہیں آسکتا کہ حضرت امام حسینؓ جس ہستی کو بیعت کرنے کے لائق سمجھتے ہیں وہ ان کی مخالفت پر اُتر آتے۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔

۳۔ باقی رہا یہ امر کہ حضرت امیر معاویہؓ نے حضرت علی المرتضیٰؓ کے ساتھ جنگیں کیوں کیں۔ سو یہ ہے ہی سرے سے غلط۔ حضرت امیر معاویہؓ نے حضرت علی المرتضیٰؓ کے خلاف کبھی لشکر کشی نہیں کی۔ بلکہ اس کے برعکس سیدنا حضرت علی المرتضیٰؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کے ساتھ جنگیں کیں۔ حضرت امیر معاویہؓ تو صرف دفاع کر رہے تھے کہ جب تک حضرت علی المرتضیٰؓ قاتلین امام مظلوم سیدنا حضرت عثمانؓ کو گرفتار نہ کرلیں۔ وہ ان کے احکام متعلقہ عزل و نصب عمال ماننے کے لیے تیار نہیں۔ اور یہ محض اجتہادی امور تھے اور جب سیدنا حضرت امام حسنؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کے ساتھ ان تمام واقعات اور جنگوں کے پس منظر کے باوجود صلح کرلی تو اس صلح کے بعد اب پچھلے اختلافات کو اچھالنا کوئی علمی شان نہیں اور نہ یہ دیانت کا مقتضا ہے۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۱۰ ص ۱۲۴ مطبوعہ ایران

۴۔ سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حضرت امیر معاویہؓ کے متعلق کیا رائے تھی۔ اس کے لیے حضرت علی المرتضیٰؓ کا مندرجہ ذیل ارشاد کافی و وافی ہے۔ فرماتے ہیں :۔

"بخدا سوگند کہ معاویہؓ از برائے من بہتر ازیں جماعت۔ اینہا دعوے می کنند کہ شیعہ منند و ارادہ قتل من کردند و مال مرا غارت کردند۔ بخدا سوگند اگر از معاویہؓ عہدے بگیرم و خون خود را حفظ کنم و ایمن گردم در اہل و عیال خود بہتر است برائے من از آنکہ اینہا مرا بکشند[1]

ترجمہ۔ خدا کی قسم معاویہؓ میرے لیے ان لوگوں سے بہتر ہے جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ میرے شیعہ ہیں۔ اگر میں معاویہؓ کے ساتھ صلح کر لوں اور اپنی اور اپنے اہل و عیال کی حفاظت کر لوں یہ میرے لیے اس سے بہتر ہے کہ میرے اپنے ہونے کا دعوے کرنے والے مجھے مار ڈالیں۔"

نہج البلاغۃ میں حضرت علی المرتضیٰؓ کا یہ خطبہ نہایت واضح ہے کہ آپ امیر معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں سے ایمان میں زیادہ نہیں اور نہ یہ لوگ حضرت علی المرتضیٰؓ سے ایمان میں آگے ہیں۔ مومن بہ امور میں سب برابر ہیں۔ سب کا خدا ایک، پیغمبر ایک، قبلہ ایک، کتاب اور دعوت الی الاسلام ایک —— یہ جو کچھ اختلافات ہوئے صرف انتظامی امور میں ہوئے کہ قاتلین امام مظلوم سیدنا حضرت عثمان سے کس طرح نبٹا جائے اور خدا گواہ ہے کہ ہم اس خون سے بالکل بری ہیں۔ او کما قال رضی اللہ عنہ۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال ۷ : بی بی شہربانو ایک فرضی شخصیت ہے یا اس کا کوئی حقیقی وجود تھا؟ علامہ زمخشری کس مسلک اور مذہب کے بزرگ تھے۔ ان سے پہلے کیا کسی محدث یا مؤرخ نے بی بی شہربانو کا ذکر کیا ہے؟

سائل، عبدالسلام مفتی دواخانہ مین بازار ڈیرہ اسمٰعیل خاں

جواب : اہل تشیع کے نزدیک بی بی شہربانو حقیقی شخصیت ہیں۔ ان کا تذکرہ ملا محمد بن یعقوب الکلینی نے اصول کافی میں نہایت وضاحت سے کیا ہے۔[2] کلینی اپنے طبقے کے ایک عظیم محدث شمار ہوتے ہیں۔ شیعہ کے قدماء میں سے ہیں۔ امام حسن عسکری کے دو واسطوں سے شاگرد ہیں۔ آپ کی وفات ۳۲۸ھ میں ہوئی۔ علامہ زمخشری معتزلی تھے فروع میں حنفی تھے۔ عربی کے مشہور ادیب اور مفسر ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

---

[1] جلاء العیون صفحہ ۲۹۰ مطبوعہ ایران [2] اصول کافی جلد ۲ حصہ ۲ صفحہ ۲۰۴ مطبوعہ لکھنؤ۔

معراج میں پچاس نمازوں کو پانچ کرانے کا اعزاز

ہو سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں وہ ارمان ابھی باقی ہو کہ میں نے رب العزت کی دولت دیدار سے فیضیاب ہونے کی تمنا کی تھی جو مالک حقیقی کی شان بے نیازی سے تشنہ تکمیل رہی۔ اب جب حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ دیکھتے ہیں کہ رب العزت اپنے محبوب خاتم کو خود اپنے حریم ناز میں بلا رہے ہیں اور جو مرتبہ وہاں طلب پر بھی نہ ملا اس سے یہاں بلا طلب نوازا جا رہا ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام حضور ختم مرتبتؐ کے راستے میں کھڑے ہو گئے۔ کہ اگر اپنی آنکھیں اس حسن حقیقی اور جمال مطلق کے دیدار کا شرف نہیں پا سکیں تو جو آنکھیں اس نور سے منور ہو کر آ رہی ہیں ان آنکھوں کے دیدار سے ہی اپنی آنکھوں کو تسکین دے لوں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس حسن مطلق کا مطالعہ حضور ختم رسالت کی مبارک آنکھوں کے صفحات میں فرمایا۔ هذا ما يظهر من كلام السيوطي والله اعلم بحقيقة الحال

نوٹ : نسخ قبل العمل پر بحث پہلے ہو چکی ہے دیکھیے صفحہ ۱۱۸

محترم المقام علامہ صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

مندرجہ ذیل سوال کا جواب بذریعہ "دعوت" عنایت فرما کر ممنون فرما دیں :

سوال : گذشتہ سال ربیع الاول کے موقع پر عید گاہ تلہ گنگ کے اجتماع عام میں سیرت کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا تھا کہ جب قیصر روم کے دربار میں حضورؐ کے ظہور کی خبر پہنچی تو اس نے سوال کیا تھا کہ کیا اس کے پہلے ساتھیوں میں سے کوئی اسے چھوڑ بھی گئے ہیں یا وہ بدستور آپ کے ساتھ ہیں اور روز بروز بڑھ رہے ہیں۔ اس پر ابو سفیان جو اس وقت تک مسلمان نہ تھے انہوں نے کہا نہیں۔ اس پر قیصر نے اسے اسلام کی صداقت کا نشان سمجھا۔ آپ کے بیان سے تلہ گنگ میں یہ بات چل نکلی ہے کہ مولانا مودودی صاحب کو ان کے پہلے ساتھی تقریباً سب کے سب چھوڑ گئے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ ان کے پہلے ساتھی جو مخلص بھی تھے اور علماء بھی۔ یہ سب کے سب انہیں کیوں چھوڑ گئے ہیں۔ جب ہم نے ان لوگوں کے سامنے حضرت مولانا منظور احمد نعمانی، مولانا امین احسن اصلاحی، غازی عبدالجبار، مولانا عبدالغفار حسن، سعید ملک وغیرہ کے نام لیے۔ انہوں نے کہا کہ علامہ صاحب جو روایت بیان کر گئے ہیں وہ ہے ہی سرے سے غلط، کسی تاریخ میں یہ سوال موجود نہیں۔ برائے نوازش تصحیح فرما کر مشکور فرمائیں؟

رفیق غلام ربانی چوک غلہ منڈی تلہ گنگ

جواب : یہ صحیح ہے کہ کسی پروگرام کے ابتدائی کارکن اس کے درست رفتار یا غلط رفتار ہونے کی کافی شہادت ہوتے ہیں، مخالفین اسلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو ناکام کرنے کے لیے صحابہ کرامؓ کے خلاف اور ان بزرگوں کے صراط مستقیم سے پھر جانے کا پراپیگنڈہ بھی محض اسی لیے کیا تھا کہ اس

طرح بالواسطہ حضورؐ کی رسالت کو غلط اور ناکام ثابت کیا جائے۔ کسی تحریک کے ابتدائی کارکن جب سب کے سب اسے چھوڑ رہے ہوں تو یہ داخلی امور کی ایک منہ بولتی شہادت ہے کہ دال میں ضرور کالا ہے۔ ہرقل شاہِ روم کی شاہانہ بصیرت اور غیر معمولی مردم شناسی اسی نفسیاتی اصول کی ترجمان تھی۔ جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس نے ابوسفیان سے ایسے سوالات کئے تھے۔ تلہ گنگ کے بعض لوگوں کا اس تاریخی واقعہ سے انکار اگر فرقہ وارانہ اور تعصب نہیں تو ناواقفیت اور جہالت ضرور ہے۔

امام بخاری نے جلد ۱ ص۴ اس سوال و جواب کو اس طرح روایت کیا:۔

قال ایزیدون ام ینقصون قلت بل یزیدون قال فهل یرتد احد منهم سخطة لدینه بعد ان یدخل فیه قلت لا۔[1]

ترجمہ۔ ہرقل نے پوچھا کہ کیا اس مدعی نبوت کے ساتھی بڑھ رہے ہیں یا گھٹ بھی رہے ہیں۔ میں نے کہا وہ تو بڑھ رہے ہیں۔ پھر اس نے کہا کہ کوئی شخص آپ کے پروگرام میں داخل ہونے کے بعد اس تحریک سے ناراض ہو کر علیحدہ بھی ہوا ہے۔ میں نے کہا نہیں۔"

پھر ہرقل نے اسے تحریکِ اسلام کی صداقت کا ایک نفسانی معیار قرار دیتے ہوئے کہا:۔

وكذلك الايمان حين تخالط بشاشته القلوب۔ (بخاری)

ترجمہ۔ ایمان کی بات اس طرح ہے جب اس کی بشاشت دلوں میں آملے۔

واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم واحکم فی کل باب۔ کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: حضرت امام حسنؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کی بیعت کی تھی۔ ایک شیعہ کہتے ہیں کہ اس کا ثبوت اہلسنت کی کتابوں میں تو مل جاتا ہے لیکن شیعہ کی کتابوں میں اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ شیعہ علماء کا بیان ہے کہ حضرت امام حسن علیہ السلام کی امیر معاویہؓ سے صلح تو ثابت ہے لیکن بیعت کی کوئی تصریح موجود نہیں۔ اس کا ثبوت کسی شیعہ کتاب سے پیش کریں تو مسئلہ بالکل واضح ہو جائے گا؟ سائل۔ اظہار سلطین زیدی واہ راولپنڈی

جواب: شیعہ کی نہایت معتبر کتاب رجال کشی ص۸۹ میں موجود ہے کہ حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ دونوں بزرگوں نے حضرت امیر معاویہؓ کے ہاتھ مبارک پر بیعت کی تھی یہاں لفظ بیعت صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ ملا باقر مجلسی بحار الانوار جلد ۱۰ ص۱۲۴ میں رقم طراز ہیں۔ فقام فبایع۔ "امام حسنؓ نے کھڑے ہو کر امیر معاویہؓ کی بیعت کی" امید ہے کہ اب آپ کے شیعہ احباب اس بیعت کے حقیقتِ واقعہ ہونے کا کسی طرح انکار نہ کر سکیں گے۔

واللہ اعلم بالصواب۔ کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: کیا امام حسنؓ کی اولاد آگے چلی ہے۔ ایک صاحب کہتے ہیں کہ ان کی اولاد آگے نہیں چلی اور نہ ان کی نسل سے کوئی موجود ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ حضرت امام حسنؓ نے امیر معاویہؓ سے جو صلح کر لی تھی یہ اسی کا صلہ اور ثمرہ تھا۔ یہ کہاں تک درست ہے؟ سائل۔ ماسٹر فضل داد شوز مرچنٹ چوک پنجہ حسن ابدال

جواب: علمائے تاریخ و سیر کا حضرت امام حسنؓ کی اولاد میں بہت اختلاف ہے۔ لیکن یہ اختلاف صرف تعداد میں ہے۔ نفس اولاد اور پھر کثرتِ اولاد میں کوئی اختلاف نہیں۔ واقدی اور کلبی انکے پندرہ لڑکے اور آٹھ لڑکیاں بتلاتے ہیں۔ ابن جوزی سولہ لڑکے اور چار لڑکیاں کہتے ہیں۔ ابن شہر آشوب پندرہ لڑکے اور چھ لڑکیاں ذکر کرتے ہیں۔ لیکن شیخ مفید جن کی تحقیقات پر علمائے امامیہ کو کافی اعتماد ہے دس لڑکے اور سات لڑکیاں شمار کرتے ہیں۔ شیخ عباس قمی نے اس آخری قول کو ہی اپنا مختار قرار دیا ہے۔

امام حسنؓ کی اولاد میں سے صرف چار لڑکے صاحبِ اولاد ہوئے۔ ۱۔ حسین اثرم، ۲۔ عمر ۳۔ زید ۴۔ حسن مثنیٰ۔ لیکن حسین اثرم اور عمر سے کوئی نرینہ اولاد نہ چلی۔ پس امام حسنؓ کی نسل کا بقا صرف زید اور حسن مثنیٰ سے ہوا۔ امامیہ کی معتبر کتاب منتہی الآمال فی تواریخ النبی والآل میں ہے:۔

"و فرزندگان امام حسن علیہ السلام از زید و حسن مثنیٰ بجائے ماند لاجرم سادات حسنی بجملہ بتوسط زید و حسن با امام حسن علیہ السلام پیوستہ مے شوند"[1]

حضرت امام حسنؓ کے بیٹے حسن مثنیٰ کے چھ لڑکے ہوئے۔ عبداللہ محض، ابراہیم، حسن، داؤد، جعفر اور محمد۔ ان میں سے سوائے محمد کے باقی سب کی اولاد چلی۔ عباس قمی کہتے ہیں:۔

" اما پسران حسن مثنیٰ، بجز محمد تمامی اولاد آوردند۔"[2]

امام حسنؓ کے پوتے عبداللہ محض کے پھر چھ لڑکے تھے۔ محمد (ملقب بہ نفس زکیہ) ابراہیم، ابوالحسن موسیٰ، یحییٰ (صاحب دیلم) ابو محمد سلیمان، ابوعبداللہ ادریس، ان میں سے تیسرے بیٹے ابوالحسن موسیٰ کو موسیٰ الجون بھی کہا جاتا ہے۔ ان موسیٰ الجون کے ایک بیٹے کا نام بھی موسیٰ تھا جسے موسیٰ ثانی کہا جاتا ہے۔ ان کی کنیت ابوعمرو بھی اور یہ راوی حدیث بھی ہیں۔ ان ابوعمر موسیٰ ثانی کے پوتے کا نام محمد اور اس محمد کے پوتے کا نام عبداللہ تھا جو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے دادا تھے۔ شیعہ کا یہ کہنا کہ حضرت امام حسنؓ کی اولاد آگے نہیں چلی ایک بالکل بے سروپا بات ہے۔ جس کی ارباب سیر و تاریخ کے نزدیک کوئی حقیقت نہیں۔ امام عفیف الدین عبداللہ بن اسعد یافعی یمنی روض الریاحین کے تتمہ میں حضرت شیخ سید عبدالقادر جیلانیؒ کا شجرہ نسب یہ بیان کرتے ہیں:۔

[1] منتہی الآمال جلد ۱ ص۱۷۷ مطبوعہ ایران [2] ایضاً ص۱۸۲

السید محی الدین ابو محمد عبد القادر (ابن) السید ابی صالح موسیٰ (ابن) السید عبد اللہ (ابن) السید یحیی الزاہد (ابن) السید محمد (ابن) السید داؤد (ابن) السید موسیٰ الثانی (ابن) السید عبد اللہ (ابن) السید موسیٰ الجون (ابن) السید عبد اللہ المحض (ابن) السید الامام الحسن المثنیٰ (ابن) السید الامام الہمام الحسن السبط (ابن) الامام الہمام امیر المؤمنین سیدنا علی بن طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

حضرت مولانا عبد الرحمٰن جامیؒ نفحات الانس من حضرات القدس میں فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ سید عبد القادر جیلانیؒ ثابت النسب سید ہیں اور فرماتے ہیں :۔

فانہ علوی حسنی من جانب الاب نقلہ علی القاری علیہ رحمۃ ربہ الباری۔

واللہ اعلم بالصواب۔ کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

: یہاں ایک شیعہ مقرر نے دورانِ تقریر میں کہا ہے کہ صلح حدیبیہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مصلحتاً صلح کی تھی۔ اسی طرح حضرت علیؓ نے مصلحتاً حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ ثابت ہوا کہ ایسے مواقع پر تقیہ جائز ہے؟

محمد دین از گوجرہ ضلع لائل پور

جواب : آپ نے جس شیعہ تقریر کا حوالہ دیا ہے وہ علم پر مبنی نہیں۔ بلکہ اس کا منشاء جہل اور تعصب کا نہایت کریہہ امتزاج ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحب مذہب شیعہ کے اصولوں سے بھی واقف نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشرکین کے ساتھ صلح کرنا برابر کی سطح پر تھا جس طرح کہ ایک آزاد خود مختار ریاست دوسری خود مختار مملکت سے معاہدہ کرتی ہے۔ اس میں ایک دوسرے کی ماتحتی یا سربراہی کا نام نہ تھا۔ اہل مکہ اور اہل مدینہ سب اپنی اپنی جگہ آزاد خود مختار تھے۔ جو اپنے اپنے صوابدید کے مطابق اپنا اپنا موقف اختیار کئے ہوئے تھے ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں تقیے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تقیہ کے لیے ڈر شرط ہے اور پیغمبر اس سے پاک ہوتے ہیں۔ چہ جائیکہ ہم اُسے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کر سکیں۔ قرآن عزیز ارشاد فرماتا ہے :۔

الذین یبلغون رسالات اللہ ویخشونہ ولا یخشون احداً الا اللہ۔ (پ۲۲ احزاب)

ترجمہ۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی رسالت آگے پہنچاتے ہیں اور وہ صرف اسی سے ڈرتے ہیں اور اللہ رب العزت کے سوا کسی کا ڈر ان کے قلب پر وارد نہیں ہوتا۔

اس نص قرآنی کے ہوتے ہوئے الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان کو ان افراد عامہ سے متعلق ماننا پڑے گا جو مقتدا اور پیشوا کی حیثیت نہیں رکھتے۔ جن بزرگوں کا عمل دوسروں کے لیے حجت اور سند ہو۔ ان کے ظاہر اور باطن کے مختلف ہونے سے دین وملت کا سارا شیرازہ منتشر ہو جاتا ہے۔ پس تقیہ کی اگر کوئی

حقیقت ہے تو وہ پیغمبروں اور پیشواؤں سے متعلق نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں حق ظاہر ہی نہیں ہو سکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صلح حدیبیہ کو ڈر اور تقیہ پر محمول کرنا مقام رسالت پر ایک شرمناک حملہ ہے۔ اعاذنا اللہ منہا۔

شیعہ مسلک کے نہایت مقتدر فقیہ اور محدث محمد بن حسن طوسی تہذیب الاحکام باب صفۃ الوضوء پہ لکھتے ہیں :۔

لا تقیۃ فیہ اذا کان الخوف لا یبلغ الفزع علی النفس والمال[1]۔

ترجمہ۔ جب تک اس درجے کا ڈر نہ ہو کہ جان اور مال معرض خطر میں ہوں اسوقت تک تقیہ جائز نہیں؛

اب آپ ہی غور کریں کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا کسی قسم کا ڈر تھا؟ اگر آپ ہر لحاظ سے مجبور محض ہی تھے تو پھر بیعتِ رضوان آخر کس کے لیے لی جا رہی تھی؟ ممکن ہے تقیہ باز افراد اس بیعتِ رضوان کو بھی جس کی قرآن پاک نہایت شاندار انداز میں مدح فرماتا ہے اور رب العزت اسے اپنی بیعت قرار دیتے ہیں تقیہ پر محمول کریں۔ لیکن اربابِ خبر پورے یقین سے کہتے ہیں کہ بیعتِ رضوان ایک حقیقت تھی وہاں ڈر اور تقیہ ہرگز نہ تھا۔ ملا محمد بن یعقوب الکلینی نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے موقع پر مشرکین مکہ کے جواب میں فرمایا تھا :۔

فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا حاجۃ لنا فیہم وعلیٰ ان نعبد اللہ فیکم علانیۃ غیر سر[2]۔

ترجمہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہمیں اب ان کی ضرورت نہیں اور ہم اب تم میں علی الاعلان خدا کی عبادت کریں گے چھپ کر نہیں۔

ان حقائق کے ہوتے ہوئے صلح حدیبیہ کو تقیہ قرار دینا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیبیہ کی پوزیشن کو ماتحت اور مغلوب قرار دینا یہ جسارت کسی جاہل یا معاند کے سوا اور کسی سے متصور نہیں۔

اسی طرح حضرت علی المرتضیٰؓ کے متعلق بھی ہم کبھی تصور نہیں کر سکتے۔ وہ اسد اللہ الغالب، شیرِ خدا، فاتح خیبر اور قاتلِ مرحب ہو کر محض ڈر کی وجہ سے اور تقیہ کی چادر زیب تن کر کے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی بیعت کریں۔ یہ صحیح ہے کہ حضرت علی المرتضیٰؓ نے حضرت صدیق اکبرؓ کی بیعت کی اور ائمہ معصومین سے یہ حقیقت واضح طور پر مذہب شیعہ کی اپنی کتابوں میں منقول ہے۔ لیکن حضرت علی المرتضیٰؓ کی ذات والا صفات پر یہ ایک نہایت ناپاک اور رکیک حملہ ہے کہ معاذ اللہ انہوں نے حضرت ابو بکرؓ کی بیعت ڈرتے ہوئے کی تھی۔ واللہ اعلم۔

---

[1] تہذیب جلد ۱ صـ۲۳ [2] فروع کافی جلد ۳ صـ۱۵۱ کتاب الروضہ۔

حضرت اسامہ بن زیدؓ کے لشکر میں تاخیر

سوال۔ حضورؐ نے اپنے آخری دنوں میں حضرت اسامہ بن زید کی قیادت میں ایک لشکر شام کی طرف روانہ کیا تھا کیا یہ صحیح ہے کہ اس میں حضرت ابوبکر بھی تھے اگر ایسا ہو تو معلوم ہوتا ہے کہ حضور انہیں مدینہ سے باہر بھیجنا چاہتے تھے تاکہ آپ کی وفات کے وقت وہ پاس موجود نہ ہوں اور خلافت پر قبضہ نہ کرسکیں ؟ پھر اگر حضرت ابوبکر اس لشکر میں ہوں تو انہیں چھوڑ کر اسامہ کو اس لشکر کا سردار کیوں بنایا سو جو ایک لشکر کی قیادت نہ کر سکے وہ پوری امت کی قیادت کیسے کر سکے گا ؟

جواب۔ آنحضرتؐ نے اپنی وفات سے کچھ دن پہلے مقام اُبنیٰ کی طرف جانے کے لیے ایک لشکر تیار فرمایا تھا۔ اُبنیٰ شام کے علاقے میں ہے اور جنگ موتہ یہیں لڑی گئی تھی جسمیں حضرت زید بن حارثہ۔ جعفر طیار اور عبداللہ بن رواحہ باری باری شہید ہوئے تھے اور حضرت خالد بن ولید کے ہاتھوں وہاں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی تھی۔

جن لوگوں نے حضرت زید، جعفر اور عبداللہ بن رواحہ کو شہید کیا تھا حضور ان سے قصاص لینا چاہتے تھے آپ نے ۲۶ صفر بروز پیر حضرت زید کے بیٹے اسامہ کو لشکر کا امیر مقرر فرمایا اور کہا کہ اپنے باپ کے مقتل اُبنیٰ کی طرف جاؤ اور صبح ان پر حملہ کر دینا ظاہر ہے کہ اسمیں اسامہ کا جذبہ کس قدر مخلصانہ ہو سکتا تھا یہی ان کی وجہ انتخاب تھی۔

بدھ کے دن آپ نے اس لشکر کے لیے جھنڈا تیار فرمایا حضرت اسامہ نے جھنڈا حضرت بریدہ اسلمی کو دیا اور مسلمان جرف کے مقام پر شام جانے کے لیے جمع ہونے لگے اتوار کے دن حضورؐ کی بیماری تیز ہوگئی حضرت اسامہ خبر گیری کے لیے جرف سے آپ کی خدمت میں آئے اور حضورؐ کی پیشانی پر بوسہ دیا اس وقت حضورؐ پر غشی طاری تھی پھر آپ سوموار کے دن حاضر ہوئے اب حضور کو کچھ افاقہ تھا آپ نے حضرت اسامہ کو دعا دی اور وہ پھر اپنے لشکر میں جرف کے مقام پر آگئے اور لوگوں کو شام کی طرف روانگی کا حکم دیا۔

اس سے دو باتوں کا پتہ چلا (۱) سوموار کے دن جب حضورؐ کو افاقہ ہوا تھا اور حضرت اسامہ آپ کی خدمت میں آئے تھے آپ نے اسامہ کو یہ نہیں کہا کہ پچھلے سوموار کو میں نے تمہیں روانگی کا حکم دیا تھا تم نے اتنے دن تاخیر کیوں کی ؟ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک حضرت اسامہ کا آپ کی بیماری کے تیز ہونے کے باعث روانگی میں تاخیر کرنا کسی طرح موجب ملامت نہ تھا ورنہ آپ اس پر مزید زجر فرماتے اور کہتے ابھی مدینہ سے نکل جاؤ تاکہ ابوبکر یہاں نہ رہ سکیں (معاذ اللہ)

(۲) حضرت اسامہ کی نیت حضورؐ کی حکم عدولی نہ تھی صورت حال ہی ایسی تھی کہ وہ جا نہ سکتے تھے یہ اسی طرح ہے جس طرح صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت علی نے تحریر معاہدہ سے رسول اللہ کا لفظ کاٹنے سے انکار کر دیا تھا اور یہ حضورؐ کی حکم عدولی نہ تھی غایت احترام تھا۔

جب حضرت اسامہ حضور سے واپس لوٹے اور لشکر کو اُبنیٰ جانے کا حکم دیا تو ایک شخص جسے آپ کی والدہ ام ایمن نے بھیجا تھا آیا اور اطلاع دی کہ حضورؐ پر اس وقت نزع کی حالت طاری ہے تو آپ (اور آپ کے ساتھ حضرت عمر اور حضرت ابوعبیدہ بھی تھے) پھر مدینہ آئے اور اسی دن حضورؐ کی وفات ہوگئی سب مسلمان جو جرف میں شام جانے کے لیے جمع تھے مدینہ واپس آئے اور حضرت بریدہ نے وہ جھنڈا حضورؐ کے حجرہ مبارکہ کے دروازے پر نصب کر دیا۔

(۱) اس سے پتہ چلا کہ حضرت ابوبکر وہاں نہ تھے نہ لشکر اسامہ میں ان کا نام تھا وہ تو حضورؐ کے ایام علالت میں مدینہ میں نماز پڑھا رہے تھے اور حضورؐ نے ہی انہیں نماز پڑھانے کے لیے مقرر فرمایا تھا یہ وسوسہ محض ایک شیطانی حرکت ہے کہ حضورؐ ان دنوں حضرت ابوبکر کو مدینہ سے باہر بھیجنا چاہتے تھے اور اسی لیے معاذ اللہ حضرت اسامہ کا لشکر تیار کیا تھا۔

(۲) حضرت عمر اور حضرت ابوعبیدہ کا حضرت اسامہ کے ساتھ حضورؐ کی خدمت میں آنا حضرت اسامہ کی اجازت سے تھا کیونکہ وہ امیر لشکر تھے حضرت عمر نے حضرت اسامہ سے تخلف نہ کیا تھا اور حضورؐ کی وفات کے بعد جب حضرت ابوبکر نے اس لشکر اسامہ کو روانہ فرمایا تو حضرت اسامہ سے اجازت مانگی کہ وہ حضرت عمر کو ان کے پاس چھوڑ جائیں تاکہ وہ مہمات خلافت میں ان کے مشورہ اور تدبیر سے فائدہ اٹھا سکیں۔ حضرت اسامہ نے حضرت عمر کو ٹھہرنے کی اجازت دے دی اور حضرت ابوبکر نے لشکر اسامہ کو روانہ فرمایا ابن سعد (۲۳۰ھ) لکھتے ہیں۔

فبعثه ابوبكر و استاذن لعمر ان يتركه عنده فاذن اسامة لعمر [1]

ابن جریر طبری نے بھی لشکر اسامہ میں حضرت عمر کا نام ذکر کیا ہے حضرت ابوبکر کا نہیں [2]

(نوٹ) معلوم رہے کہ حضورؐ نے لشکر اسامہ کی تیاری تو فرمائی اسے روانگی کا حکم بھی دیا لیکن عملاً یہ لشکر عہد صدیقی میں روانہ ہوا۔ اور حضورؐ کا یہ ارادہ بعہد صدیقی پورا ہوا حضورؐ کے عہد میں جب یہ لشکر روانہ ہی نہیں ہوا تو کسی کے

---

[1] طبقات ابن سعد جلد ۴ صہ ۶۷ [2] دیکھئے طبری جلد ۲ صہ ۴۶۲۔

اس سے تخلف (پیچھے رہنے) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا حضرت عمر اگر پیچھے رہے تو اپنی خواہش سے نہیں حکم خلافت سے اور خلیفہ وقت نے بھی اپنا حکم نہیں چلایا حضرت اُسامہ سے اِذن لیا اس باضابطہ اجازت کو کسی طرح پہلوتہی نہیں کہا جاسکتا ہاں جو اس سے بلا اذن امیر بھاگے اس پر بیشک یہ الفاظ منطبق ہوسکتے ہیں لعن اللہ من تخلف عن جیش اُسامۃ - اسے خواہ مخواہ حضرت عمر پر منطبق کرنا ایک بغض باطنی اور صحابہ دشمنی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اور حضرت اسامہ کو بھی اس لیے امیر نہ بنایا تھا کہ ان کا تجربہ اور مقام حضرت عمرؓ سے زیادہ تھا بلکہ اس لیے کہ وہاں حضرت اسامہ کے والد کا بدلہ لینا پیش نظر تھا اس کے ساتھ یہ ظاہر کرنا بھی پیش نظر تھا کہ حضورؐ کا مسلمانوں پر ضبط و کنٹرول اتنا مضبوط ہے کہ جب چاہیں کسی چھوٹے کو بڑوں سے بھی آگے کرسکتے ہیں -

سوال ۲ . کیا یہ درست ہے کہ حضور جب عبداللہ بن ابی منافق کی نماز جنازہ پڑھانے لگے تو حضرت عمر نے نہایت سخت انداز میں کہا تھا اتصلی علیہ وھو منافق کیا اس سے حضورؐ کو اذیت نہ ہوتی اور جو حضور کو اذیت دے اس کے بارے میں قرآن کیا کہتا ہے ؟ یہ کہنا کہ کیا آپ ایک منافق کی نماز جنازہ پڑھا رہے ہیں ؟ کیا یہ مناسب تھا -

جواب . حضرت عمرؓ نے حضورؐ کی خدمت میں جو عرض کی اسکا سبب جوشِ ایمانی تھا مخالفت رسول ہرگز نہ تھا ورنہ حضورؐ نے جب ان کی بات نہ سنی اور نماز جنازہ پڑھائی تو حضرت عمر آپ کی اقتدار نہ کرتے اپنی بات پر اڑے رہتے معلوم ہوا جو کچھ کہا وہ ایک عرض تھی آپ سے مناقشہ نہ تھا صحیح بخاری میں ہے جب وہ یہ کہہ رہے تھے کہ آپ منافق کی نماز جنازہ پڑھا رہے ہیں تو حضور مسکرا رہے تھے اور آپ کے چہرہ پر تبسم تھا - اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ حضور حضرت عمر کے ایمانی جوش پر مسکرا رہے تھے ناراض نہ ہو رہے تھے پھر حضرت عمر کے لیے یہ فضیلت کوئی کم ہے کہ اس واقعہ کے بعد خود اللہ رب العزت نے حضرت عمر کی تائید فرما دی اور حکم دے دیا کہ آئندہ کے بعد کسی منافق کی نماز جنازہ نہ پڑھی جائے اور حضورؐ نے ہی اسکا اعلان فرمایا قرآن کریم میں حکم آیا -

ولا تصل علی احد منھم مات ولا تقم علی قبرہ ۔ پ التوبہ ع ۱۱

اس سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ جسطرح حضرت عمر کافروں کے خلاف تھے منافقوں کے بھی خلاف تھے اور آیت جاھد الکفار والمنافقین پر پوری قوت ایمانی سے عمل پیرا تھے -

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ حضرات خود بظاہر مسلمان تھے دل سے مومن نہ تھے ان کے لیے یہ لمحہ فکریہ ہے . حضرت عمرؓ کا منافقوں کے خلاف یہ بغض و عناد اور یہ تمنا اور خواہش کہ یہ لوگ اس لائق نہیں کہ ان پر حضورؐ نماز جنازہ پڑھیں حضرت عمرؓ کے دل کے اندر کی خبر دیتا ہے آپ کے قلب مومن کے ایمان کی شعاعیں کس تیزی سے باہر آرہی تھیں کہ آپ بول پڑے آپ منافق کی نماز جنازہ کیوں پڑھا رہے ہیں ؟ اور اللہ رب العزت کو بھی بالآخر ان کی تائید کرنا منظور تھا -

یہ صرف پیغمبر کی شان ہے کہ وہ حکم ربانی سے بولتا ہے جذبات پیدا بھی ہوں تو وہ ان کا اظہار نہیں کرتا . اسے ان پر بے مثال قابو ہوتا ہے وحی الٰہی آتی ہے تو اس کے عمل کا نٹ بدلتا ہے

واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم واحکم فی کل باب

سوال آنحضرتؐ نے غزوہ تبوک پر حضرت علی کو اپنا جانشین بنایا انہیں ہارون امت فرمایا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو ہی آپ کا جانشین ہونا چاہیئے تھا حضرت ہارون بھی اگر موسیٰ علیہ السلام کے بعد زندہ رہتے تو کیا ان کے ہوتے ہوئے حضرت یوشع بن نون خلیفہ ہوسکتے تھے ؟

جواب اگر ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ کے بعد زندہ رہتے تو وہ خود ایک نبی کی حیثیت میں ہوتے حضرت موسیٰ کے خلیفہ نہ ہوتے حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے عہد میں خود ایک نبی تھے حضرت داؤد کے خلیفہ کے طور پر معروف نہ تھے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی شہرت خود ایک نبی کی تھی حضرت زکریا کے خلیفہ کے طور پر نہ تھی حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ کے خلیفہ ان کی زندگی میں تو ہوسکتے تھے اور ہوئے بھی لیکن ان کی وفات کے بعد ان کی خلافت کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی وہ تو پیغمبر تھے .

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف سفروں میں مختلف صحابہ کو اپنا قائم مقام بنایا تو کیا ان میں سے ہر ایک کو حضورؐ کا خلیفہ بلافصل ہونا چاہیئے ؟ بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست. تو پھر یہ تقاضا کیوں کہ حضرت علی کو حضورؐ کی وفات کے بعد خلیفہ بلافصل ہونا چاہیئے تھا

غزوہ بنی قینقاع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بشر بن منذر کو مدینہ میں اپنا قائم مقام بنایا غزوہ مریسیع میں حضرت زید بن حارثہ کو اور غزوہ بنی غطفان میں جسے غزوہ انمار بھی کہتے ہیں حضرت عثمان غنیؓ کو مدینہ میں اپنا جانشین چھوڑا پھر غزوہ ذات الرقاع میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان کو اپنا خلیفہ بنایا - (حضرت عثمان اس اعتبار سے ممتاز ہیں کہ آپ نے دو مرتبہ حضورؐ کی یہ جانشینی پائی اور اس جہت سے بھی آپ ذوالنورین ٹھہرے

علامہ حافظ ابن تیمیہؒ نے اسطرح کے کچھ اور اسفار بھی ذکر کیے ہیں جن میں آپ وقتی طور پر کسی نہ کسی صحابی کو قائم مقام کرتے رہے ہیں [1]
غزوہ تبوک کے بعد حضورؐ حجۃ الوداع کے لیے گئے تو مدینہ منورہ میں آپ کے جانشین حضرت ابو دجانہ الساعدیؓ (ہ) ہوئے حضرت علی ان دنوں یمن گئے ہوئے تھے وہ وہاں سے مکہ آئے تھے پھر حضرت سباع بن عرفطہ غفاری کے بارے میں روایات ملتی ہیں کہ غزوہ تبوک کے بعد وہ بھی حضورؐ کے وقتی طور پر جانشین ہوتے تھے۔

سوال حضورؐ نے ۹ ہجری کے حج پر حضرت ابوبکرؓ کو امیر حج بنا کر بھیجا تھا پھر آپ نے حضرت علی کو آپ کے پیچھے بھیجا مطلع کریں کہ آپ نے حضرت علی کو بھیج کر حضرت ابوبکر کی امارت کو ختم کیا تھا یا اس کی وجہ کچھ اور تھی؟

جواب۔ آنحضرتؐ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو روانہ کر چکے تھے کہ سورۃ برآت نازل ہوئی اور وہ معاہدہ جو اہل مکہ سے حدیبیہ کے مقام پہ ہوا تھا اللہ تعالیٰ نے اسے ختم کرنے کا حکم دے دیا حضورؐ کی تشریف آوری سے پہلے عرب کسی قومی اور جماعتی زندگی سے آشنا نہ تھے حضورؐ مسلمانوں کو قومی اور جماعتی آداب سکھا چکے تھے لیکن مسلمان نہ ہونے والے ابھی کوئی قومی تصور نہ رکھتے تھے ان کے ہاں جو کچھ ہوتا وہ نسل اور قبائل کے امتیاز سے ہوتا تھا صلح حدیبیہ کے موقع پر حضورؐ خود موجود تھے اس وقت کے رواج کے مطابق اس معاہدہ کو ختم کرنے کے لیے حضورؐ کی تشریف آوری ضروری تھی یا یہ کہ حضورؐ کا کوئی قریبی رشتہ دار آپ کی نمائندگی کرے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ ۹ ہجری کے حج پر حضورؐ کی جماعتی نمائندگی کر رہے تھے اور حضرت علی مرتضیٰ معاہدہ حدیبیہ کے خاتمہ کے لیے حضورؐ کی ذاتی نمائندگی پہ مامور ٹھہرے تھے اور یہ عرب کے اس وقت کے آداب کے مطابق تھا جسطرح صلح حدیبیہ کی تحریر بھی اس وقت کے آداب کے مطابق مشترکہ الفاظ میں لکھی گئی تھی بایں ہمہ حج کے باب میں حضرت علیؓ حضرت ابوبکرؓ کے ماتحت تھے حضورؐ نے انہیں امیر حج بنا کر نہ بھیجا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ ابھی مکہ نہ پہنچے تھے عرج کے مقام پہ تھے کہ حضرت علیؓ انہیں آملے حضرت ابوبکرؓ نے انہیں آتے ہی پوچھا امیر او مامور آپ بطور امیر بھیجے گئے ہیں یا میرے ماتحت آپ کو یہ ذمہ داری ادا کرنی ہے؟ آپ نے کہا میں ماتحت رہوں گا [2] اور پھر دونوں حضرات اکٹھے حج کو چلے اور حضرت ابوبکرؓ نے ہی امارتِ حج کے فرائض سرانجام دیئے حضرت علیؓ نے مجمع عام میں سورہ برآت کی آیات پڑھ کر سنائیں آپ کی آواز کچھ دبی سی تھی حضرت ابوہریرہ آپ کی مدد کرتے اور اسے آگے پہنچاتے تھے

---

[1] دیکھئے منہاج السنہ جلد ۳ صہ ۱۶ جلد ۴ صہ ۸۷ [2] [3] مسند حمیدی جلد ۱ صہ ۲۷ مسند امام احمد جلد ۱ صہ ۷۹ المستدرک جلد ۳ صہ ۵۲۔ البدایہ والنہایہ جلد ۵ صہ ۳۷ سیرت ابن ہشام جلد ۲ صہ ۵۴۶۔

حضرت علیؓ نے سورہ برات کی آیات پڑھیں اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس سورہ میں ثانی اثنین والی آیت ہے اور حضرت ابوبکر کے مناسب نہ تھا کہ خود اپنی مدح سنائیں حضورؐ نے یہ کام حضرت علی سے لیا حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:۔

لانہا تضمنت مدح ابی بکر فاراد ان یسمعوہا من غیر ابی بکر [1]

(ترجمہ) یہ سورہ مدح ابی بکر پر متضمن تھی سو آپ کا ارادہ ہوا کہ لوگ اسے حضرت ابوبکر سے نہیں کسی اور کی زبان سے سنیں

سوال بعض شیعہ علماء سے سنا ہے کہ حضورؐ کے انتقال پر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر فیصلہ خلافت کے لیے سقیفہ بنی ساعدہ چلے گئے تھے اور حضرت علی نے ان کی عدم موجودگی میں ہی حضورؐ کو دفن کر دیا تھا اور یہ حضرات جنازہ نبوی میں شامل نہ ہو سکے تھے۔

جواب۔ شیعہ علماء اس کے لیے جو راوی پیش کرتے ہیں وہ عروہ بن زبیر ہیں انؒ کی پیدائش اس وقت ہوئی جب حضرت عثمان کا دور خلافت شروع ہو چکا تھا [2] سو یہ صاحب انتقال نبویؐ اور جنازہ نبوی میں ہرگز موجود نہ تھے ان کی اس وقت کی روایت کا کیسے اعتبار کیا جا سکتا ہے خصوصاً ان مسائل میں جو عقائد کی سرحدوں کو چھوتے ہوں حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت سنداً منقطع ہے اور دیگر معروف روایات کے بھی خلاف ہے جن میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کا جنازہ نبویؐ میں موجود ہونا بلکہ سب مہاجرین و انصار کا جنازہ پڑھنا صراحت سے مذکور ہے [3] سو اس کا حکم شاذ ہوا پھر یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ حضورؐ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حجرہ میں دفن ہوں اور حضرت ابوبکر کو پتہ تک نہ ہو اور یہ سب کام بلا خلیفہ ہی سرانجام پا رہے ہوں کچھ سوچئے اتنا بڑا اور اہم کام کیا کسی نظام کے بغیر ہی عمل میں آگیا؟

سوال۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ۷ ہجری میں خیبر تشریف لے گئے تھے اور صفر کا پورا مہینہ وہیں رہے تھے آپ نے ان دنوں کے لیے حضرت علی کو مدینہ میں اپنا نائب بنایا تھا تو کیا اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ آپ کے نزدیک آپ

---

[1] فتح الباری جلد ۸ صہ ۲۵۸ کتاب التفسیر [2] تذکرۃ الحفاظ للذہبی جلد ۱ صہ ۹۵ [3] دیکھئے شمائل ترمذی صہ ۲۹۔ السنن الکبریٰ جلد ۳ صہ ۳۹۵ جلد ۴ صہ ۳۰۔ سنن ابن ماجہ صہ ۱۱۸ البدایہ والنہایہ جلد ۵ صہ ۲۶۵ اسکی تائید شیعہ مرویات میں بھی ہے دیکھئے کتاب سلیم بن قیس صہ ۷ مطبوع نجف اشرف کتاب الاحتجاج للطبرسی صہ ۴۵ حیات القلوب جلد ۲ صہ ۸۶۶ لکھنؤ۔

کے نائب مولی امومنین ہی تھے ۔

جواب ۔ یہ ہرگز صحیح نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دنوں کے لیے سیدنا علی مرتضی کو مدینہ میں اپنا قائم مقام چھوڑا تھا مدینہ میں ان دنوں آپ کی نیابت حضرت سباع بن عرفطہ غفاری نے کی تھی [1] حضورؐ نے اپنے کنبہ اور برادری کے پیش نظر کسی کو قائم مقام نہیں بنایا تھا۔

سوال ۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر بیشک حضور کے بہت قریب تھے اور ہر وقت کے دوست تھے لیکن کیا وجہ ہے کہ حضورؐ نے کبھی کوئی فوجی خدمت ان کے سپرد نہ کی کیا آپ کو ان پر اعتماد نہ تھا؟ فاتح خیبر حضرت علی تھے تو یہ حضرات اس وقت کہاں چھپے بیٹھے تھے یہ سوال ایک شیعہ نے کھڑا کر رکھا ہے اسکا جواب مرحمت فرمائیں۔

جواب ۔ جنگ خیبر میں فوج کی ترتیب یہ تھی ۔

۱. مقدمہ الجیش اس پہ حضرت عکاشہ بن محصن الاسدی متعین تھے۔

۲ ۔ میمنہ (دائیں رجمنٹ) اس پر سیدنا حضرت عمرؓ مقرر تھے علم بھی آپ کے ہاتھ میں تھا

۳ ۔ فوج کے ایک حصے کا علم حضرت ابوبکرؓ کے پاس تھا ایک حصے کا حباب بن منذر کے پاس اور ایک پرچم حضرت سعد بن عبادہ اٹھائے ہوئے تھے [2]

سیرت حلبیہ میں ہے کہ حضورؐ نے اس دن جن حضرات کو پرچم دیئے ان میں حضرت ابوبکرؓ بھی تھے حضرت بریدہ اسلمی کہتے ہیں جب حضورؐ خیبر آئے تو آپ نے علم حضرت عمر کو بھی عنایت فرمایا [3]

سو یہ کہنا کہ یہ حضرات خیبر کے دن کہیں چھپے ہوئے تھے کسی شقی و لعین کا افترا ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

خیبر کے قلعہ حصن النطاۃ پہ حضورؐ خود سات دن مصروف جہاد رہے پھر حضرت محمد بن مسلمہ انصاری کو ہر روز ادھر بھیجتے رہے ان دنوں مسلمانوں کے مرکز اور فوجی مستقر پہ حضرت عثمان رضؓ محافظ ٹھہرائے گئے تھے یہ مرکز اہل خیبر اور بنو غطفان کے وسط میں تھا اسے رجیع کے نام سے موسوم کرتے ہیں رات کو یہیں سب حضرات حضورؐ کے پاس جمع ہوتے تھے اس جگہ کی نگرانی اور حراست فوجی نکتہ نظر سے بہت اہم تھی اور یہی محل اعتماد تھا بعض راتوں میں حضرت عمر بھی اس کا پہرہ دیتے رہے ہیں

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد۴ صہ۱۸۱ [2] [3] طبقات ابن سعد جلد۳ صہ ۱۹۵۔

قلعہ حصن القموص کے بیس لے محاصرے کے بعد آپ نے اس کا علم حضرت علی مرتضٰی کو دیا فتوح خیبر میں یہ آخری جنگ تھی جو حضرت علیؓ کی امارت میں حاصل ہوئی اس سے پہلے حضرت علی آشوب چشم کے باعث ابتدائی معرکوں میں حصہ نہ لے سکے تھے لیکن حضرت ابوبکر حضرت عمر اور حضرت عثمان حضورؐ کے ساتھ ان مہمات میں برابر شریک رہے تھے ہاں یہ صحیح ہے کہ قلعہ قموص حضرت علی کے ہاتھوں فتح ہوا اور چونکہ یہ خیبر کی آخری جنگ تھی اس لیے حضرت علی فاتح خیبر کے نام سے معروف ہوئے کافروں کا مشہور پہلوان مرحب یہیں قتل ہوا مرحب کے قاتل محمد بن مسلمہ انصاری تھے۔ [1] مرحب کے بھائی یاسر کو حضرت زبیرؓ نے قتل کیا تھا

بعض بے سروپا روایات میں ہے کہ قلعہ قموص کا ایک دروازہ جو اس قدر وزنی تھا کہ چالیس آدمی بمشکل اٹھا سکیں حضرت علی مرتضٰی نے بطور ڈھال اٹھایا تھا ایسا اگر ہوا ہو تو اصولاً اس کا انکار نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ اپنے مقربین اولیاء کرام کو کرامات سے نوازتے ہیں جو حقیقت میں فعل خداوندی ہوتا ہے علامہ قسطلانی مواہب اللدنیہ میں ان روایات کے متعلق لکھتے ہیں:۔

قال شیخنا وکلها واهیة ولذا انکره بعض العلماء [2]

سوال جسطرح حضرت علیؓ نے جحفہ کے قریب کنوئیں میں گھرے جنوں سے مقابلہ کیا، کیا کسی اور صحابی سے بھی اس طرح جنوں سے کوئی مقابلہ ثابت ہے؟۔

جواب ۔ حضرت علی کا جنوں سے قتال کرنا اور اپنی بہادری کے جوہر دکھانا یہ قصہ ساز ذاکروں کی ایجاد ہے اس سلسلہ میں ایک روایت بھی صحیح نہیں ملتی حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں :۔

وما یذکره کثیر من القصاص فی مقاتلة الجن فی بئر ذات العلم وهو بئر قریب من الجحفة فلا اصل له وهو من وضع الجهلة من الاخباریین فلا یغتر به [3]

(ترجمہ) اور یہ جو بہت سے قصہ گو ذات العلم کنوئیں کے (جو جحفہ کے قریب ہے) جنوں کے مقابلے کا ذکر کرتے ہیں اس کی تائید کوئی اصل نہیں ہے یہ جاہل اخباری لوگوں کی موضوع روایات ہیں ان پر دھوکہ نہ کھانا چاہیئے ۔

---

[1] تاریخ خلیفہ بن خیاط جلد۱ صہ ۴۵ ۔ [2] دیکھئے تاریخ الخمیس جلد۲ صہ۵۱ اسکی تائید المقاصد الحسنہ للسخاوی صہ۱۹۲ اور الاصابہ للحافظ ابن حجر جلد۲ صہ ۵۰۳ پر بھی ملتی ہے ۔ [3] البدایہ والنہایہ جلد۴ صہ ۲۳۴ ۔

(نوٹ) یہ سوال ایک مختلف پیرائے میں ایک دفعہ پھر سامنے آیا. اب کے اس کے جواب میں قدرے تفصیل ہے۔

سوال۔ حضرت علی کو جو فاتح خیبر کہتے ہیں اس سے کیا مراد ہے کیا خیبر کی تمام جنگیں حضرت علی نے سر کی تھیں اور حضور پاک خود ان مہمات میں شریک نہ تھے؟ حضرت ابوبکر حضرت عمر اور حضرت عثمان کیا ان معرکوں میں موجود نہ تھے۔

جواب۔ خیبر کسی ایک قلعے کا نام نہیں یہ کم وبیش گیارہ قلعے تھے جو یہودیوں نے بنا رکھے تھے ان میں سے ایک قلعہ حصن القموص تھا یہ حضرت علی رضؓ نے فتح کیا تھا یہ چونکہ آخری قلعہ تھا جس کے کھلنے پر یہود خیبر سے جنگ ختم ہو گئی تھی اس لیے آخری کردار ہونے کے موجب آپ کو فاتح خیبر کہتے ہیں یہ نہیں کہ ان مہمات خیبر میں اور صحابہ شریک نہ تھے خیبر مدینہ سے شام کی طرف تقریباً اسّی میل کے فاصلے پر ہے حصن ناعم، حصن سہوان، حصن البشق، حصن الوطیح، حصن سلالم، حصن ابی، حصن النطاۃ حصن الصعب حصن القموص اس کے مشہور قلعے تھے

ان فتوحات خیبر میں صحابہ کرام نے مختلف خدمات سرانجام دیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان فتوحات کے خاتمہ پر اموال خیبر کو اٹھارہ حصوں میں تقسیم کیا اور ایک حصہ سو حصوں پہ مشتمل ٹھہرایا ان اٹھارہ سو حصوں میں چار حصے اسپ سواروں کے تھے اور باقی چودہ ان کے سو افراد کو ملے ہر سو افراد پر ایک رأس عدد تھا اور کل چودہ راس تھے محمد بن حسن طوسی لکھتا ہے۔

فکان عمر بن الخطاب رأساً وعلی رأساً وطلحہ رأساً والزبیر رأساً وعاصم بن عدی رأساً وکان سہم النبی صلی اللہ علیہ وسلم مع عاصم بن عدی [1]

(ترجمہ) ایک رائس عدد حضرت عمر تھے ایک رائس علی ایک طلحہ ایک زبیر اور ایک عاصم بن عدی تھے حضورؐ کا حصہ جس راس میں آیا وہ راس حضرت عاصم بن عدی تھے۔

یہ سوال نہ کیا جائے کہ حضورؐ کا حصہ حضرت علی کے سہم میں کیوں نہ لایا گیا یہ امتیاز حضرت عاصم بن عدی کو کیوں ملا؟ بات دراصل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمیشہ سے یہ حکمت رہی ہے کہ اپنے ہر ہر صحابی کو کسی نہ کسی اختصاص سے نوازیں حضورؐ نے مہمات خیبر میں جب علم تقسیم کیے تھے تو ایک علم حضرت ابوبکر کے ہاتھ میں دیا۔ ایک سعد بن عبادہ کے ہاتھ میں کچھ حصے پہ حضرت حباب بن المنذر علم اٹھائے ہوئے تھے مرکز کے محافظ اور نگران حضرت عثمان تھے اور ان واقعات اور حقائق سے کوئی انکار نہیں کر سکتا.

[1] الامالی للطوسی جلد ا صد ۲۶۸۔

خلاصہ جواب یہ ہے کہ تقریباً سب صحابہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات اور تعینات کے تحت ان مہمات خیبر میں شریک رہے ہیں آخری قلعہ قموص حضرت علی نے فتح کیا مگر حضورؐ نے انہیں ایک راس عدد ہی رکھا جسطرح حضرت طلحہ اور زبیر دوسرے راس تھے واللہ اعلم بالصواب حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں بھی ان سہام و رؤس کی کچھ بحث کی ہے [1]

سوال۔ حضورؐ جب مدینہ تشریف لائے تو آپ نے صحابہ کے مابین ایک مواخات قائم کی تھی اور حضرت علی کو اپنے ساتھ رکھا تھا اخوت نبوت میں کیا کوئی اور صحابی بھی حضورؐ کے ساتھ اس امتیاز میں جمع ہوا۔

جواب۔ جب اس مواخاۃ کی بنا مہاجرین والنصار میں بھائی چارہ قائم کرنے پر تھی تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حضورؐ اور حضرت علی جو دونوں مہاجر تھے وہ ایک اخوت میں مرتبط ہوں اس اخوت کی اساس ایک ایک مہاجر اور ایک ایک انصاری پر تھی مدینہ منورہ میں یہ اخوت حضرت علی اور حضرت سہیل بن حنیف کے مابین قائم ہوئی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی یہ مواخات خارجہ بن زید کے ساتھ تھی حضرت عمر رضؓ کی عویم بن ساعدہ کے ساتھ تھی اور حضرت عثمان کی یہ مواخات عوف بن ثابت کے ساتھ قائم ہوئی تھی۔ یہ مواخات ہیں جو مدینہ میں قائم ہوئی تھی [2]

مدینہ منورہ میں حضورؐ اور حضرت علی کے مابین مواخات کا ذکر گو بعض مورخین نے کیا ہے لیکن ان میں سے ایک روایت بھی سند کے اعتبار سے درست نہیں حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں

ہاں مکہ مکرمہ میں حضورؐ اور حضرت علی کے مابین ایک مواخاۃ بیشک قائم ہوئی تھی اور حضرت علی اس جہت سے شفقت نبوی کا عزیز ترین مورد تھے لیکن مدینہ منورہ کی مواخات میں حضرت علی حضرت سہیل بن حنیف کے ساتھ تھے حضورؐ کے ساتھ نہ تھے رہی اخوت اسلامی تو وہ حضورؐ کی حضرت ابوبکر کے ساتھ تھی [3]

سوال۔ حضرت علی صحابہ میں سے کیا کبھی کسی کے نائب بھی رہے بعض علماء کہتے ہیں بنو ہاشم اپنی سیادت میں ہمیشہ اول رہے ہیں کبھی کسی کے نائب نہیں ہوئے کیا یہ صحیح ہے؟

جواب۔ حضرت جعفر طیار ہاشمی تھے حضرت علی کے سگے بھائی تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ موتہ میں اول امیر حضرت زید بن حارثہ کو رکھا تھا ان کے بعد حضرت جعفر طیار ان کے نائب ہوئے پھر ان کے نائب عبداللہ بن رواحہ

[1] دیکھئے البدایہ جلد ۴ صد ۲۰۲ [2] دیکھئے سیرت حلبیہ جلد ۲ صد ۲۲، البدایہ والنہایہ جلد ۳ صد ۲۲۷ جلد ۷ صد ۲۲۳ اور کتاب المحبر لابی جعفر البغدادی صد ۷۲۔ [3] دیکھئے صحیح بخاری جلد ا صد ۵۱۶ دھلی

ہوئے یہ حضرات باری باری امیر بنتے رہے اور تینوں اس جنگ میں شہید ہوئے کیا یہاں ہاشمی غیر ہاشمی کے ماتحت نہیں رہے۔ اسی طرح غزوہ احد میں مہاجرین کا پرچم حضرت مصعب بن عمیر کے ہاتھ میں تھا ان کی شہادت کے بعد یہ حضرت علی کے ہاتھ میں دیا گیا[1] حضرت علی کا اس اعزاز میں دوسرے نمبر پر آنا ان کی شان اور ان کے مقام میں کسی کمی کا موجب نہیں یہ ترتیب اتفاقی بھی ہو سکتی ہے لیکن یہ بات اپنی جگہ واضح ہے کہ حضرت علی اس کام میں دوسرے درجہ میں رکھے گئے تھے

سوال۔ حضورؐ کی ازواج مطہرات پر طعن و تشنیع کی ابتدا کب سے ہوئی اس کا تاریخی پس منظر کیا ہے؟

جواب۔ غزوہ بنی قریظہ ۵ھ میں پیش آیا تھا یہود بنی قریظہ نے خلاف معاہدہ جنگ احزاب میں مشرکین مکہ کا ساتھ دیا تھا اس غزوہ میں پرچم حضرت علی کے ہاتھ میں تھا آپ نے بنو قریظہ کے قلعہ پر یہ علم نصب کر دیا اس وقت یہود حضورؐ اور آپ کی ازواج پر سب و شتم کرنے لگے یہ ازواج مطہرات کے خلاف پہلی بدگوئی تھی جو اس قوم نے شروع کی حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں۔

وکان علی قد سمع قولاً سیئا لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وازواجہ رضی اللہ عنہن[2]

(ترجمہ) اور حضرت علیؓ نے انہیں رسول اللہؐ اور آپ کی ازواج مطہرات کے خلاف بدگوئی کرتے سنا۔

اس سے پتہ چلا کہ اس زمانے میں جو روافض امہات المومنین کی شان میں سب و شتم کرتے ہیں اصلاً وہ یہود بنی قریظہ کے نقش پا پر چلے ہیں اور اسی لیے کہا گیا ہے کہ رفض کی اصل یہود سے ہے۔

سوال۔ امیر معاویہ اور ان کے ساتھیوں پر باغی کا اطلاق شرعاً درست ہے یا نہیں؛ حضرت عمار بن یاسرؓ کو حضرت معاویہ کی جماعت نے شہید کیا تھا اور حضورؐ نے انہیں پہلے سے خبر دی تھی کہ انہیں ایک باغی جماعت قتل کرے گی تو اہل صفین کیا سب باغی نہ ہوئے؟

جواب۔ حضرت امیر معاویہؓ کی سیاسی زندگی پر مختلف دور گزرے ہیں آپ انہیں اور ان کے ساتھیوں کو کس دور میں باغی سمجھتے ہیں؟ پہلے اس دور کی تعین کریں جس کے سیاق میں آپ انہیں باغی کہنا چاہتے ہیں اور بتلائیں کہ کیا ان کو سفر آخرت اپنی اسی حالت میں پیش آیا یا وقت وفات آپ عالم اسلام کے متفق علیہ حکمران تھے؟ جواب دیتے ہوئے آپ کی سیاسی زندگی کے یہ دور ملحوظ رہیں۔

---

[1] دیکھئے البدایہ والنہایہ جلد ۴ صہ ۲۰ [2] ایضاً جلد ۴ صہ ۱۱۹۔

(۱) حضرت عمر کے مقرر کردہ والی در ارض شام بدور اسلام
(۲) حضرت عثمانؓ کے مقرر کردہ گورنر شام بعہد حضرت عثمان۔
(۳) حضرت عثمانؓ کے مقرر کردہ گورنر شام بعد از شہادت عثمان
(۴) خلیفہ راشد حضرت علیؓ کے خلاف میدان صفین میں۔ دفاعاً
(۵) حضرت علیؓ سے ۴۰ھ میں عدم قتال کے معاہدہ (مہادنت) کے بعد۔
(۶) حضرت حسن سے صلح کے بعد جب آپ بالاتفاق خلیفۃ المسلمین تھے

جو شخص ان ادوار ستہ پر غور سے نظر کرے گا وہ حق کو پا لے گا حضرت عمار بن یاسرؓ اگر ان کے آدمیوں کے ہاتھوں شہید ہوئے تو آپ کے ان ساتھیوں کو جنہوں نے حضرت عمار کو شہید کیا تھا زیادہ سے زیادہ ان ادوار ستہ میں سے چوتھے دور میں باغی کہا جا سکے گا۔ اور تقتلک الفئۃ الباغیۃ کا مطلب یہ سمجھا جائے گا کہ اس دور مقاتلہ میں جس میں جنگ صفین واقع ہوئی اہل شام بنا بر تاویل باغی تھے ان کے پاس عذر اپنی جگہ موجود تھا لیکن ایسا ہو بھی تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انہیں اس پانچویں اور چھٹے دور میں بھی باغی کہا جائے ۴۰ھ میں حضرت امیر معاویہ کی حضرت علی سے مصالحت ہو گئی تھی پھر آپ ہی سوچیں بغاوت کہاں رہی اور باغی کا حکم کیسے رہا اور پھر ۴۱ھ کو تو عام الجماعۃ کہا جاتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے پھر سے مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جمع کر دیا تھا اور اب حضرت امیر معاویہ تمام عالم اسلام کے ایک متفق علیہ حکمران اور خلیفۃ المسلمین تھے

آپ لوگ جو ان کا حکم (کہ انہیں باغی کہا جا سکتا ہے یا نہ؟) معلوم کرنا چاہتے ہیں وہ چوتھے دور کے اعتبار سے پوچھتے ہیں؟ یا پانچویں اور چھٹے دور کے اعتبار سے؟ چوتھے دور میں اگر ان پر حدیث تقتلک الفئۃ الباغیۃ کی رو سے فئۃ باغیۃ کا حکم ہو بھی تو ۴۰ھ کی مہادنت یا ۴۱ ہجری کی مصالحت کے بعد نہ بغاوت باقی رہی نہ ان پر باغی ہونے کا حکم باقی رہا یاد رکھیے حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے انما العبرۃ بالخواتیم کہ سبق پچھلے اور آخری دور سے لینا چاہیے نہ کہ اول یا وسطی دور سے؛ اور اس چوتھے دور میں بھی تو وہ اجتہاداً حضرت علی سے ہٹے ہوئے تھے مقابلاً نہیں۔ علامہ قرطبی لکھتے ہیں:-

انہم لم یخرجوا بذلک عن حد الولایۃ والنبوۃ فکذلک الامر فیما جری بین الصحابۃ (تفسیر قرطبی جلد ۱۶ صہ ۳۲۲)

(ترجمہ) برادران یوسف باہمی رقابت کے باوجود ولایت اور نبوت کی حدود میں رہے اسی طرح وہ

اختلافات ہیں جو صحابہ میں جاری ہوئے۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو حضرت علیؓ کبھی ان لوگوں کی جو صفین میں آپ کے بالمقابل قتل ہوتے نماز جنازہ نہ پڑھاتے حافظ ابن عساکر دمشقی (۵۷۱ھ) عقبہ بن علقمہ سے نقل کرتے ہیں آپ نے فرمایا۔

شهدت مع علی یوم صفین فاتی بخمسة عشر اسیراً من اصحاب معاویه فکان من مات منهم غسله وکفنه وصلی علیه [1]

(ترجمہ) میں جنگ صفین میں حضرت علی کے ساتھ تھا آپ کے پاس امیر معاویہ کی جماعت کے پندرہ قیدی لائے گئے ان میں سے جو بھی فوت ہوا آپ نے اسے غسل دلوایا کفن پہنایا اور اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔

اس عمل سے پتہ چلتا ہے کہ آپ اپنے ساتھ جنگ کرنے والوں کو کافر نہ سمجھتے تھے انہیں مومن سمجھتے اور ان کے ساتھ مومنین والا برتاؤ ہی کرتے اگر آپ کا مامور من اللہ ہونے کا دعویٰ ہوتا یا آپ اپنے لیے کسی آسمانی حق امامت کے مدعی ہوتے تو آپ قطعاً اپنے محاربین کو مومن نہ کہتے نہ ان کی نماز جنازہ پڑھتے سو حکیم محمد بن حسن طوسی (صاحب تجرید) کی یہ بات درست نہیں کہ آپ کے (حضرت علی کے) مخالف فاسق ہیں اور محارب کافر ذاکروں کی یہ بات بالکل بے سروپا ہے۔

محدث شہیر ابن ابی شیبہ (۲۳۵ھ) بھی روایت کرتے ہیں۔

ان علیا قال یوم الجمل اللهم لیس هذا اردت اللهم لیس هذا اردت [3]

(ترجمہ) حضرت علیؓ نے جنگ جمل کے دن فرمایا اے اللہ گواہ رہ میرا ارادہ جنگ کرنے کا نہ تھا اے اللہ تو گواہ رہ میں نے جنگ کا قصد نہ کیا تھا۔

پھر آپ نے اپنے صاحبزادے حضرت حسن کو مخاطب کرکے فرمایا۔

یا بنی انی لم ار ان الامر یبلغ هذا [4]

(ترجمہ) اے بیٹا مجھے اندازہ نہ تھا کہ معاملہ یہاں تک پہنچ جائے گا (جنگ کی صورت اختیار کرلے گا)

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۱۶ صہ ۳۲۲۔ [2] تلخیص تاریخ ابن عساکر جلد ۱ صہ ۷۴۔ [3] المصنف جلد ۱۵ صہ ۲۷۵

[4] البدایہ جلد ۷ صہ ۲۴۴ کنز العمال جلد ۶ صہ ۸۵۔

اور یہ احساس صرف حضرت علی کا ہی نہ تھا حضرت ام المومنین نے بھی یہی کہا ہے۔

انما ارید ان یحتجز بین الناس مکانی . . . ولم احسب ان یکون بین الناس قتال ولو علمت ذلك لم اقف ذلك الموقف ابداً . . . فلم یسمع الناس کلامی [1]

(ترجمہ) میرا ارادہ تو یہ تھا کہ میری حیثیت (کہ میں مومنین کی ماں ہوں) لوگوں کو باہمی اختلاف سے روک دے گی . . . اور مجھے یہ گمان نہ تھا کہ لوگ آپس میں لڑ پڑیں گے اگر مجھے اس کا پتہ ہوتا تو میں ہرگز یہاں نہ ہوتی (یہاں نہ پہنچتی) لوگوں نے میری بات نہ سنی نہ میری طرف التفات کی اور لڑائی ہو گئی۔

اور حضرت ام المومنین سے اس کے سوا گمان بھی کیا ہوسکتا ہے کہ وہ بطور ماں لوگوں کے مابین واقع ہونے والے اختلاف کو ختم کریں گی امام غزالیؒ (۵۰۵ھ) فرماتے ہیں۔

واظن بعائشة انها کانت تطلب تطفئة الفتنه ولکن خرج الامر من الضبط فاواخر الامور لا تبقی علی وفق طلب اوائلها [2]

(ترجمہ) حضرت عائشہ سے گمان یہی ہے کہ وہ اس فتنہ کی آگ کو بجھانے کے لیے نکلی تھیں لیکن معاملہ کنٹرول سے نکل گیا اور ان امور کا انجام اپنے ابتدائی حالات کے مطابق نہ رہا۔

اور جب جنگ چھڑ گئی تو حضرت ام المومنین پھر بھی لوگوں کو لڑنے سے روکتی رہیں محمد بن طلحہ کو کہا کہ ہابیل کی طرح اپنا ہاتھ روک لے بھائیوں سے قتال نہ کر [3]

اور حضرت علی بھی اس صورت حال پر اتنے پریشان تھے کہ اپنے بیٹے سے فرمایا۔

یاحسن لوددت انی مت قبل هذا بعشرین حجة [4]

(ترجمہ) اے حسن میں چاہتا ہوں کہ میں آج سے بیس سال پہلے فوت ہو چکا ہوتا۔

لو علمت ان الامر یکون هکذا ما خرجت [5]

سوال:۔ واقعہ جمل میں جو لوگ شہید ہوئے کیا وہ مسلمان رہے یا محاربہ علی کے باعث وہ کافر ہوگئے (۲) کیا انہیں

---

[1] المصنف لعبد الرزاق جلد ۵ صہ ۴۵۷۔ [2] الاقتصاد صہ ۹۹ [3] المصنف لابن ابی شیبہ جلد ۱۵ صہ ۲۸۲۔ [4] المصنف جلد ۱۵ صہ ۲۸۸ [5] المصنف جلد ۱۵ صہ ۲۹۳ کتاب الآثار امام ابو یوسف صہ ۲۰۸۔

مشرک کہا جاسکتا ہے کیا یہ صحیح ہے کہ مفسدین کی سازش کے باعث ان کا عمل ظاہری صورت میں بغاوت کی شکل اختیار کرگیا تھا۔

جواب :۔ یہ حضرات (حضرت طلحہ حضرت زبیر اور حضرت ام المومنین کے ساتھی) اصلاً باغی نہ تھے لیکن مفسدین کی سازش سے ظاہراً باغی کے انداز میں آگئے سو انہیں مسلمان کہنا اور انہیں اسلامی برادری میں رکھنا ضروری ہے انہیں کافر یا منافق کہنا کسی طرح صحیح نہیں ملا نصیر طوسی نے تجرید الاعتقاد میں محاربین علی کو کافر لکھا ہے لیکن حضرت علی مرتضیٰؓ نے اس کے برعکس ان حضرات کو اپنے بھائی فرمایا ہے :۔

سئل علی عن اهل الجمل قال قیل أمشرکون هم قال من الشرک فروا قیل أمنافقون هم

قال ان المنافقین لا یذکرون الله الا قلیلاً فما هم قال اخواننا بغوا علینا [1]

(ترجمہ) حضرت علیؓ سے اہل جمل کے بارے میں سوال کیا گیا۔ پوچھا گیا کیا وہ مشرک ہیں ؟ آپ نے فرمایا شرک سے وہ فرار کئے ہوئے تھے پھر پوچھا گیا کیا وہ منافق تھے؟ فرمایا منافق اللہ کو اتنا یاد نہیں کرتے جتنا یہ کرتے تھے پھر پوچھا گیا کہ پھر ان کا حکم کیا ہوگا؟ آپ نے فرمایا یہ ہمارے بھائی ہیں جنہوں نے (مفسدین کی سازش سے) ہم پر چڑھائی کر دی۔

شیعہ کی مستند کتاب قرب الاسناد میں بھی اسی طرح ہے ۔

ان علیا علیه السلام لم یکن ینسب احداً من اهل حربه الیٰ الشرک ولا الیٰ النفاق

ولکن یقول هم اخواننا بغوا علینا [2]

(ترجمہ) بیشک حضرت علی اپنے لڑنے والوں میں سے کسی کو شرک یا نفاق کا ملزم نہ ٹھہراتے تھے بس یہی کہتے یہ ہمارے بھائی ہیں جو ہم پر چڑھ دوڑے ۔

جب جنگ کی یہ صورت بن گئی تھی اسوقت بھی کچھ ایسے حضرات تھے جو اصلاح بین الناس کے لیے پکارتے رہے لوگوں کو لڑنے سے روکتے رہے حضورؐ کے جلیل القدر صحابہ حضرت ابوبکرہ ثقفیؓ اس دن اسی موقف پر تھے حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں :۔

المعروف من مذهب ابی بکرة الثقفی انه کان علیٰ رای عائشة فی طلب الاصلاح بین الناس

---

[1] المصنف جلد ۱۵ ص ۲۵۶ ، السنن الکبریٰ جلد ۸ ص ۱۷۳ [2] قرب الاسناد لعبداللہ بن جعفر الحمیری ص ۴۵ ایران ۔

(ترجمہ) حضرت ابوبکرہ کا مشہور موقف وہی رہا ہے جو حضرت عائشہ کا تھا کہ لوگوں میں مصالحت کرانے کے درپے رہیں [1]

سوال :۔ مطلع کریں کہ مروان بن حکم صحابی تھا یا تابعی اور کیا یہ صحیح ہے کہ حضرت طلحہؓ کو جنگ جمل میں اسی نے شہید کیا تھا

جواب :۔ مروان بن حکم جو امام زین العابدین کے استاذ حدیث تھے صحابی نہ تھے تابعی [2] تھے یہ صحیح نہیں ہے کہ انہوں نے حضرت طلحہ کو قتل کیا تھا یہ ان پر اتہام ہے علامہ عینیؒ (۸۵۵ ھ) حضرت طلحہ کے ذکر میں لکھتے ہیں۔

قتل یوم الجمل اتاه سهم لا یدری من رماه واتهم به مروان [3]

(ترجمہ) آپ واقعہ جمل میں قتل ہوئے آپ کو تیر لگا اور پتہ نہ چلا کہ کس نے چلایا ہے اور مروان اس قتل پر یونہی متہم کر دیا گیا ۔

حافظ ابن کثیر (۷۷۴ ھ) لکھتے ہیں کہ میرے نزدیک یہ روایت کہ حضرت طلحہ پر کسی دوسرے شخص نے تیر چلایا مروان بن حکم نے نہیں زیادہ صحیح ہے گو شہرت اس روایت کو دے دی گئی ہے کہ آپ کا قاتل مروان تھا [4]

سوال :۔ جو لوگ واقعہ جمل میں مارے گئے ان کے بارے میں کیا عقیدہ رکھنا چاہیئے (۱) کیا وہ باغی تھے؟ (۲) ان کے لیے دعائے مغفرت کرنی چاہیے یا بد دعا (۳) حضرت زبیر واقعہ جمل میں لڑتے ہوئے مارے گئے یا وہ کنارہ کش ہو چکے تھے اور انہیں بے خبری میں کسی نے مار ڈالا تھا (۴) حضرت زبیر کا قاتل جنت میں جائے گا یا جہنم میں (۵) حضرت طلحہ اور زبیر کی عزاداری میں رونا اور ان سے اظہار ہمدردی کرنا کیسا ہے ؟

جواب :۔ (۱) وہ لوگ باغی نہ تھے نہ وہ چڑھائی اور جنگ کے ارادہ سے بصرہ آئے تھے ان کی آمد کا مقصد اصلاح احوال تھا مفسدین نے اسے جنگ بنا دیا تو اس قصد دفاع میں کسی کو دوسرے کا باغی نہیں کہا جاسکتا (۲) ان کے لیے دعائے مغفرت جائز ہے اور حضرت علیؓ نے انکے لیے مغفرت کی دعا کی تھی محدث ابن ابی شیبہ روایت کرتے ہیں ۔

عن عبد الله بن محمد قال مر علی قتلیٰ من اهل بصره فقال اللهم اغفر لهم [5]

---

[1] فتح الباری جلد ۱۳ ص ۴۶ ۔ [2] جامع ترمذی جلد ۲ ص [3] عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری جلد ۱ ص ۲۶۵ [4] دیکھئے البدایہ [5] المصنف لابن ابی شیبہ جلد ۱۵ ص ۲۸۴

(ترجمہ) حضرت علی جمل کے مقتولوں کی لاشوں کے پاس سے گزرے اور آپ نے ان سب کے لیے
مغفرت کی دعا فرمائی۔

ہاں ان میں جو مفسدین اور قاتلین عثمان تھے ان کے خلاف آپ نے ضرور بددعا کی امام بخاری نے اپنی تاریخ میں محمد بن حنفیہ سے روایت کیا ہے آپ واقعہ جمل میں موجود تھے آپ نے اپنے والد حضرت علی سے اس موقعہ پر آپ کی یہ بددعا نقل کی ہے۔

اللھم اکبب قتلة عثمان لمناخرھم الغداة [1]

(ترجمہ) اے اللہ قاتلین عثمان کو قیامت کی صبح کو چہروں کے بل الٹا کر کے سزا دے۔

اللھم احلل بقتلة عثمان خزیاً [2]

(ترجمہ) اے اللہ حضرت عثمان کے قاتلوں پر ذلت اتار۔

(۳) حضرت زبیر جو حضور کے پھوپھی زاد بھائی اور صفیہ بنت عبد المطلب کے بیٹے تھے واقعہ جمل میں جنگ سے کنارہ کش تھے وادی سباع میں بیٹھے تھے کہ اچانک کسی مفسد نے انہیں شہید کر دیا (۴) جب یہ خبر حضرت علی کو ملی تو آپ نے اس قاتل کو جہنمی ہونے کی خبر دی اور آپ نے بتایا حضور نے فرمایا تھا کہ زبیر کے قاتل کو جہنم کی بشارت دے دو (۵) حضرت علی نے جب حضرت زبیر کو شہید ہوتے پایا تو آپ اور آپ کے ساتھ جو لوگ تھے سب ان کی عزاداری میں رو پڑے لیکن یہ رونا اختیاری طور پر نہ تھا ایک کیفیت تھی جو ان پر طاری ہو گئی تھی اور اسمیں باہمی تعلق اور اخلاص کی جھلک تھی۔

جلس علیؓ یبکی علیه ھو واصحابه [3]

(ترجمہ) حضرت علی حضرت زبیر کی لاش کے پاس بیٹھ گئے آپ خود بھی رو رہے تھے اور آپ کے
ساتھی بھی رو رہے تھے

امام باقر سے روایت ہے کہ آپ حضرت طلحہ کی میت پر بھی روئے۔

عن ابی جعفر قال جلس علی واصحابه یوم الجمل یبکون علی طلحة والزبیر [4]

---

[1] التاریخ الکبیر جلد ۴ صہ ۳۴۳۔ [2] المصنف لابن ابی شیبہ جلد ۱۵ صہ ۲۷۷۔
[3] طبقات ابن سعد جلد ۳ صہ ۷۹۔ [4] المصنف لابن ابی شیبۃ جلد ۱۵ صہ ۲۶۱۔

آپ نے حضرت طلحہ کے چہرے سے گرد و غبار کو دور کیا اور فرمایا میں طلحہ اور زبیر ان اہل جنت میں سے ہونگے جن کا جنت میں داخلہ باہمی رنجشوں کے دلوں سے نکل جانے پر ہوا ہوگا اور اس کی قرآن کریم میں خبر دی گئی ہے۔

ونزعنا ما فی صدورھم من غل اخواناً علی سرر متقابلین (پ۱۴ الحجر ع۴)

حضرت علی کا یہ حسن سلوک اور حسن ظن بتا رہا ہے کہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ حضرات باغی نہ تھے نہ لڑنے کے ارادہ سے بصرہ آئے تھے سب کے آنے کی وجہ اصلاح احوال تھی جسے مفسد قاتلین عثمانؓ نے دفعۃً حملہ کر کے جنگ میں بدل دیا حضرت طلحہ کے صاحبزادے محمد بن طلحہ بھی یوم الجمل میں شہید ہوئے تھے حضرت علیؓ نے ان کے بارے میں فرمایا:-

السجاد ورب الکعبة ھذا الذی قتله برّ لابیه [1]

(ترجمہ) رب کعبہ کی قسم یہ بڑے نفل گزار تھے جس چیز نے انہیں یہاں تک پہنچایا یہ اپنے باپ سے
نیکی کرنے کا جذبہ تھا۔

حضرت علی مرتضیٰ کو واقعہ جمل کے بعد جو جو لاشیں ملیں خواہ وہ کسی فریق کی ہوں آپ نے ان سب کی نماز جنازہ پڑھائی ابن کثیر لکھتے ہیں:-

صلی علی القتلی من الفریقین وخص قریشاً بصلوٰة من بینھم [2]

(ترجمہ) آپ نے دونوں طرف کے مقتولوں کی نماز جنازہ پڑھائی اور نماز جنازہ میں قریش کے مقتولوں
کو اولیت بخشی

نماز جنازہ کیا ہے! مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کرنا۔ سو جب حضرت علی دونوں فریق کے مقتولوں کے لیے دعائے مغفرت کر رہے ہیں تو اب کسی کو ان میں سے کسی پر اعتراض کرنے کا حق نہ رہا صاحب حق ان میں سے ہر کسی کو اپنا حق معاف کر چکے اب ان میں سے کسی کو کسی پر اعتراض کا حق نہیں رہتا۔

دونوں طرف معاملہ عفو و درگذر کا تھا۔ خالد بن واشمہ حضرت ام المومنین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اس نے حضرت طلحہ و زبیر کے شہید ہونے کی خبر دی ام المومنین نے کلمہ ترجیع پڑھا (انا للہ وانا الیہ راجعون) پھر اس نے زید بن صوحان کے قتل ہونے کی خبر دی آپ نے اس پر بھی کلمہ ترجیع پڑھا۔ زید بن صوحان حضرت

---

[1] نسب قریش لمصعب الزبیری صہ ۲۸۱۔ [2] البدایہ جلد ۷ صہ ۲۴۴۔

نی کی طرف سے عبقسی قبائل کے امیر تھے خالد بن واشمہ نے تعجب سے کہا یہ دو فریق ایک دوسرے کے مقابل تھے دونوں کے مقتول کیسے جنتی ہو سکتے ہیں ؟ ام المومنین نے کہا کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ کی رحمت بہت وسیع ہے

اولا تدری ان رحمۃ اللہ واسعۃ وھو علی کل شئی قدیر [1]

(ترجمہ) کیا تم نہیں جانتے اللہ کی رحمت بہت وسیع ہے اور وہ ہر بات پر قدرت رکھتا ہے ۔

سوال :- ام المومنین جب بصرہ آئی تھیں تو اس سفر میں کیا آپ کا کوئی محرم ساتھ تھا ؟

جواب :- آپ کے بھانجے حضرت عبداللہ بن زبیر آپ کے ساتھ تھے علاوہ ازیں آپ کی دو بہنوں حضرت اسماء اور ام کلثوم کے شوہر حضرت زبیر بن العوام اور حضرت طلحہ بن عبیداللہ اس سفر میں ہمراہ تھے اور آپ ایک ہودج میں جو لوہے کا بنا ہوا تھا پردہ نشین تھیں علامہ محمود آلوسی نے روح المعانی پ۲۲ (سورہ احزاب) میں اس پر مفصل بحث کی ہے وہاں دیکھ لیں ۔

سوال حضرت علی قاتلین عثمان سے قصاص لینے کا انکار کیوں کرتے تھے اگر انہیں یہ طاقت حاصل نہ تھی تو انہیں خلافت کرنے کا کیا حق تھا ؟ وہ حاکم ہی کیا جو مظلوم کو اس کا حق نہ دلا سکے حضرت ابوبکر رضؓ نے خلافت کے جو اصول بتائے کیا اس میں یہ نہ تھا کہ تم میں سے جو قوی ہے وہ میرے نزدیک کمزور ہے یہاں تک کہ میں اس سے حق وصول کر سکوں اور جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے ۔

جواب :- یہ صحیح نہیں کہ حضرت علی قاتلین عثمان کو سزا دینے کے حق میں نہ تھے نہ آپ نے ان سے قصاص لینے کا انکار کیا تھا ان کے متعدد بیانات پڑھنے اور مختلف حالات کا جائزہ لینے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں ملکی وحدت اور قیام عدالت دو الگ الگ مسئلے تھے آپ کے ہاں ملکی وحدت کا مسئلہ زیادہ اہم تھا مملکت اسلامی کے تمام صوبے جب تک آپ کے زیر خلافت نہ آجائیں آپ قیام عدالت اور مجرموں کو پکڑنے پر قوت صرف نہ کرنا چاہتے تھے ۔

یوں سمجھئے کہ آپ کے پیش نظر دو بغاوتیں تھیں ایک وہ جو عثمان کے خلاف ہوئی دوسری وہ جو ان کے خیال میں ان کے خلاف ہوئی آپ اہل شام کو باغی سمجھتے تھے امیر معاویہ کو کہتے رہے اما الخلافۃ

---

[1] دلائل النبوۃ جلد ۶ صہ ۴۱۷ السنن الکبری ص ۱۷۴/۸ المصنف لعبدالرزاق جلد ۱۱ صہ ۲۹۰ البدایہ صہ ۲۳۵۔

فلسنا نطلبھا لیکن حضرت علی کو یہی گمان رہا کہ یہ دل سے میری خلافت کے خلاف ہیں ۔ اس صورت حال میں حضرت علی رضؓ نے سمجھا کہ پہلی بغاوت (جو حضرت عثمان کے خلاف تھی) یہ تو اس وقت موجود نہیں گو اس کے مفسدین موجود ہیں لیکن دوسری بغاوت تو بالفعل سامنے ہے اب اگر مقدم ملکی وحدت اور امن عام ہے تو پہلے اسے فرو کرنا چاہیئے پھر پہلی بغاوت جو عملاً باقی نہیں اس کے مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے گا ملکی وحدت کے بغیر وہ اپنے اندر یہ طاقت نہ پاتے تھے کہ ان مجرموں کے خلاف عدالت قائم کریں ملکی وحدت اور قیام عدالت میں آپ کے ہاں ملکی وحدت مقدم تھی ۔

ثانیاً آپ کا فقہی موقف یہ تھا کہ خلیفہ گو امیر المومنین اور رئیس القوم ہے لیکن اس کے قتل ہونے پر اس کے وارث اس کے اولیاء ہوں گے نہ کہ قوم ۔ قرآن کریم نے من قتل مظلوماً فقد جعلنا لولیہ سلطاناً میں مَنْ کو عام رکھا ہے کہ جو بھی ظلماً مارا جائے (خواہ خلیفہ ہو یا رعایا کا کوئی فرد) اس کا ولی اس کے خون کا وارث ہو گا چاہے بدلہ لے چاہے معاف کر دے ۔ اس بنا پر حضرت علی چاہتے تھے کہ بجائے اس کے کہ آپ ان مجرموں سے قصاص لیں یہ حق حضرت عثمان رضؓ کے وارثوں کو دلایا جائے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تو معاف کرنے پر آجائیں اور میں ان پر سزا جاری کر دوں ۔

اب حضرت معاویہ کا یہ مطالبہ کہ پہلے ان سے قصاص لیا جائے اسمیں پھر دو پہلو ہیں (۱) یہ مطالبہ وحدت ولایت کے ساتھ ہے (مطالبہ کرنے والے اور حاکم عدالت ایک ہی ملک میں ہیں) یا وہ علیحدہ علیحدہ مملکتوں میں ہیں اسمیں حضرت علی کا موقف یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کو ایک مملکت میں ہونا چاہیئے اس لیے آپ نے شامیوں سے کہا :-

ادخلوا فی البیعۃ واطلبوا الحق تصلوا الیہ [1]

(ترجمہ) پہلے بیعت کریں اور پھر اپنے حق کا مطالبہ کریں آپ اپنا حق پالیں گے ۔

اسمیں چار باتیں ملتی ہیں (۱) آپ حضرت عثمان کو مظلوم جانتے تھے اور آپ مانتے تھے کہ انہیں ظلماً مارا گیا ہے اور آپ کے وارثوں کو قصاص کا حق پہنچتا ہے (۲) آپ امیر معاویہ کو وارثین عثمان کا نمائندہ تسلیم کرتے تھے (۳) آپ قصاص کیلئے فریقین کی وحدت ملکی کو ضروری سمجھتے تھے (۴) حضرت علی اور امیر معاویہ کا اختلاف

---

[1] شرح ترمذی لابن العربی المالکی جلد ۱۳ صہ ۲۲۹ تفسیر قرطبی جلد ۱۲ صہ ۳۱۸ ۔

خلافت میں نہیں قصاص عثمان میں تھا

حضرت امیر معاویہ کا موقف یہ تھا کہ مجرموں پر سزا جاری کرنے کے لیے وحدت ملکی ضروری نہیں اور اگر حضرت علی اسے ضروری سمجھتے ہیں تو وہ قاتلوں کو ان کے سپرد کر دیں فقد جعلنا لولیہ سلطاناً پر عمل ہو جائے گا ——— اور حضرت علی اپنے اندر یہ طاقت نہ پاتے تھے کہ مجرموں کو ان کی صحیح شناخت اور شہادت کے بغیر دوسری حدود ولایت میں بھیج دیں جو ابھی تک داخل قمرو خلافت نہیں ——— ہو سکتا ہے ان پر کوئی زیادتی ہو وہ قاتلین میں نہ ہوں۔

حضرت علی کا یہ کہنا کہ مجھ میں اس وقت طاقت نہیں کہ ان قاتلوں کو پکڑ سکوں یہ سزا جاری کرنے کے باب میں نہیں اگر آپ اتنے بے بس ہوتے تو خلافت کا دعوی نہ کرتے یہ بات مجرموں کو امیر معاویہ کے سپرد کرنے کے بارے میں ہے [1] کہ ابھی خلافت میں یہ قوت نہیں کہ ان مجرموں کو ان کی صحیح شناخت اور شہادت کے ساتھ اہل شام کے سپرد کیا جا سکے اسمیں خود میرے خلاف بغاوت اٹھ کھڑی ہونے کا اندیشہ ہے۔ [2]

حضرت علی کا یہ موقف ان کے نزدیک اتنا روشن تھا کہ وہ امیر معاویہ کو اہل میں سے سمجھتے تھے اور یہ قتال ان کے نزدیک حضرت عثمان کے خلاف چڑھائی کرنے والوں کے خلاف کاروائی کرنے سے مقدم تھا حافظ ابن حجر عسقلانی رح لکھتے ہیں

اذ حجة علي ومن معه ما شرع لهم من قتال اهل البغي حتى يرجعوا الى الحق [3]

(ترجمہ) حضرت علی اور ان کے ساتھیوں کا موقف یہ تھا کہ انہیں اہل بغی سے قتال کرنا ہے یہاں تک کہ وہ راستی پر آجائیں۔

اور حضرت امیر معاویہ سمجھتے تھے کہ حضرت علی اگر واقعی پہلے ملکی وحدت چاہتے ہیں اور پھر وہ قاتلین عثمان سے قصاص لیں گے تو اس کا جواز کیا ہے کہ وہ قاتلین اور مجرمین خود حضرت علی کے لشکر میں موجود ہوں

[1] انما المنازعة كانت بسبب تسليم قتلة عثمان رض الى عشيرته ليقتصوا منهم (اليواقيت جلد ۲ صـ ۱۵۹ الامر ۲۱)

[2] اذا المبادرة بالقبض عليهم مع كثرة عشائرهم واختلاطهم بالعسكر يؤدي الى اضطراب امر الامامة العامة ـ اليواقيت ۲ صـ ۷

[3] فتح الباری جلد ۱۳ صـ ۲۴۶ کتاب التمہید لابی الشکور السالمی صـ ۱۶۷ ـ

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں:-

حجة معاوية ومن معه ما وقع من قتل عثمان مظلوما و وجود قتلته باعيانهم في العسكر العراقي [1]

(ترجمہ) امیر معاویہ اور ان کے ساتھیوں کا عذر یہ تھا کہ حضرت عثمان تو مظلوم مارے گئے ہیں ان کے قاتل خود عراقی لشکر میں موجود ہیں۔

سوال :- حضرت عثمان کے خون ناحق کے خلاف قصاص طلب کرنے کا حق حضرت عثمانؓ کے بیٹوں کا تھا نہ کہ امیر معاویہؓ کا وہ کیسے اس قصاص کے مطالب بن گئے ؟

جواب سیدنا حضرت عثمان کے بیٹے ابان بن عثمان جن کے نکاح میں حضرت جعفر طیار (حضرت علی کے بھائی) کی پوتی ام کلثوم بنت عبداللہ بن جعفر تھی وہ بحیثیت ولی قصاص حضرت معاویہ کے ساتھ تھے حضرت معاویہ چونکہ بڑے تھے اس لیے حضرت عثمان کے عزیزوں نے انہی کو اپنا نمائندہ بنا رکھا تھا سلیم بن قیس الکوفی الہلالی العامری جو حضرت علی کے شاگردوں میں سے ہے لکھتا ہے:-

ان معاويه يطلب بدم عثمان ومعه ابان بن عثمان و ولد عثمان [2]

(ترجمہ) حضرت معاویہ حضرت عثمان کے قصاص کے لیے اٹھے اور حضرت عثمان کے بیٹے ابان اور حضرت عثمان کے دوسرے بیٹے ان کے ساتھ تھے۔

حضرت امیر معاویہ نے اس بات کو خود واضح کر رکھا تھا کہ یہ کام والیوں کی طرف سے میرے سپرد کیا ہوا ہے آپ نے ابو مسلم خولانی کو یہ جواب دیا تھا:-

انا ابن عمه وانا اطلب بدمه وامره اليّ [3]

(ترجمہ) میں حضرت عثمان کا چچا زاد بھائی ہوں میں ان کے قصاص کا طالب ہوں اور ان کا معاملہ (والیوں کی طرف سے) میرے ہی سپرد ہے

سوال جب یہ بات چل نکلی کہ حضرت عثمان کے قتل میں حضرت علی کا ہاتھ ہے تو آپ نے اپنی صفائی کیوں پیش نہ کی اگر آپ اپنے کو اس الزام سے بری کرتے تو یقیناً حضرت معاویہ ان کے خلاف نہ اٹھتے اتنے سنگین الزامات کے

[1] فتح الباری جلد ۱۳ صـ ۲۴۶ [2] کتاب سلیم بن قیس الشیعی صـ ۱۵۳ طبع نجف [3] البدایہ والنہایہ جلد ۸ صـ ۱۲۹ ـ

باوجود آپ (حضرت علی) ان پر خاموش کیوں رہے

جواب۔ یہ غلط ہے کہ آپ اس غلط الزام پر خاموش رہے آپ نے بارہا ان الزامات سے اپنے آپ کو معصوم تبلایا حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں میں نے حضرت علی کو کہتے ہوئے سنا :۔

واللہ ما قتلت عثمان ولا امرت بقتلہ ولکن غُلِبتُ [1]

(ترجمہ) بخدا میں نے حضرت عثمان کو قتل نہیں کیا نہ ان کے قتل کا کسی کو حکم دیا بات صرف یہ ہے کہ میرے پاس ان قاتلوں کو روکنے کی طاقت نہ تھی۔

مضمون ہذا حضرت علی سے اس تواتر کے ساتھ منقول ہے کہ اس پر علم الیقین کا دعوے کیا جاسکتا ہے۔
حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں :۔

ثبت ذلک عنہ من طرق تفید القطع عند کثیر من ائمۃ الحدیث [2]

(ترجمہ) یہ بات (کہ آپ کا خون عثمان میں کوئی دخل نہیں) آپ سے اتنے طرق سے مروی ہے کہ بہت سے ائمہ حدیث کے نزدیک یہ تواتر اور قطعیت کو پہنچتے ہیں۔

بلکہ آپ سے (حضرت علی سے) یہ بھی منقول ہے کہ آپ نے حضرت عثمانؓ کے قاتلوں پر لعنت فرمائی اور کہا :۔

لعن اللہ قتلۃ عثمان فی السہل والجبل والبر والبحر [3]

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ حضرت عثمانؓ کے قاتلوں پر خشکی تری میدانوں اور پہاڑوں پر لعنت کرے انہیں ہر جگہ پر اپنی رحمت سے دور رکھے۔

آپ نے انہیں بد دعا دی " ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہاری بربادی ہو"

نہج البلاغۃ میں متعدد ایسے خطوط ملتے ہیں جنمیں آپ نے اس الزام سے اپنے آپ کو پاک کہا ہے سو آپ اس ناپاک کام (حضرت عثمان کے خلاف باغیانہ کاروائی) میں کسی طرح شریک نہ تھے شریف رضی (۴۰۴ھ) لکھتا

---

[1] مصنف لعبد الرزاق جلد ۱۱ ص ۴۵۰ المصنف لابن ابی شیبہ جلد ۱۵ ص ۲۰۸۔ [2] طبقات ابن سعد جلد ۳ ص ۵۶ [illegible] الاشراف جلد ۵ ص ۱۰۱۔ [3] البدایہ والنہایہ جلد ۷ ص ۱۹۳۔ [4] المصنف لابن ابی شیبۃ جلد ۱۵ ص ۲۶۸ [5] المصنف جلد ۱۵ ص ۲۱۰ طبقات جلد ۳ ص ۱۹۔

ہے آپ نے فرمایا :۔

کان بدء امرنا انا التقینا والقوم من اہل الشام والظاہر ان ربنا واحد ونبینا واحد و دعوتنا فی الاسلام واحدۃ لا نستزیدہم فی الایمان باللہ والتصدیق برسولہ و لا یستزیدوننا الامر واحد الا ما اختلفنا فیہ من دم عثمان ونحن منہ براء (نہج البلاغۃ جلد ۳ ص ۱۱۴)

(ترجمہ) ہمارے معاملے کی ابتدا یہ کہ ہم اور اہل شام آپس میں ایک دوسرے کے سامنے آگئے یہ ظاہر ہے کہ ہم (دونوں فریق) ایک خدا اور ایک نبی کے ماننے والے ہیں اسلام میں ہم دونوں کی پکار ایک ہے ہم ان سے (امیر معاویہ اور ان کے ساتھیوں سے) ایمان باللہ اور تصدیق رسالت میں کسی اور چیز کے طالب نہیں اور نہ وہ ہم سے (ایمانیات میں) کسی امر زائد کے طالب ہیں ہم دونوں کی (دین میں) بات ایک سی ہے سوائے اس کے کہ خون عثمان کے بارے میں ہمارا اختلاف ہو گیا۔ (وہ ہمیں خون عثمان میں شامل کر رہے ہیں) اور ہم اس الزام سے بالکل بری ہیں۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت علی ایمان باللہ اور تصدیق رسالت میں کمی بیشی کے قائل نہ تھے ایمان اپنی کمیت (ایمانیات یا امور مومن بہ) میں ان کے ہاں کمی بیشی قبول نہیں کرتا قوت وضعف کے اعتبار سے کمی بیشی ہو یہ امر دیگر ہے (۲) یہ بھی پتہ چلا کہ حضرت علی اپنے لیے کسی ایسی امامت کے قائل نہ تھے جس کا ماننا ایمانیات میں سے ہو اور یہ بھی پتہ چلا کہ آپ حضرت معاویہ کو اپنے برابر کا مسلمان سمجھتے تھے اور ان کا آپس میں اختلاف دینی نہیں محض سیاسی تھا عقائد کا نہیں معاملات کا تھا۔

ہاں آپ کا خوارج سے اختلاف سیاسی نہیں دینی تھا انہوں نے اپنی الگ دینی صورت قائم کر لی تھی یہ اہل حضرت علی اور ان کے سب پیروؤں کی تکفیر کرتے تھے حضرت علیؓ نے ایک دن انہیں کہا میں نے تحکیم قبول کر کے اگر غلطی کی ہے تو تم اس باریک اختلاف میں پوری امت کو کیوں گمراہ کہہ رہے ہو؟

فان ابیتم الا ان تزعموا انی اخطات وضللت فلم تضللون عامۃ امۃ محمد بضلالی و تاخذونہم بخطائی وتکفرونہم بذنوبی۔ (نہج البلاغۃ ص ۸)

(ترجمہ) سو اگر تم اس کے سوا کہ میں نے خطا کی ہے اور راہ حق گم کر چکا ہوں اور کوئی بات ماننے کے لیے تیار نہیں تو تم حضورؐ کی پوری امت کو میری گمراہی کے عنوان سے کیوں گمراہ ٹھہرا رہے ہو اور انہیں میری غلطی پر کیوں پکڑ رہے ہو اور میرے گناہوں پر انہیں کیوں کافر کہہ رہے ہو۔

سوال: حضرت علی اور امیر معاویہ کے اختلافات میں عام صحابہ کی کیا رائے تھی وہ جسکے بھی ساتھ تھے قطعی طور پر اسے حق پر جانتے تھے یا ظنی طور پر اسے حق کے قریب سمجھتے تھے اس دوسری صورت میں یہ مسئلہ ایک اجتہادی صورت اختیار کر جاتا ہے اور ضروری نہیں رہتا کہ ہم کسی ایک کو باطل پر کہیں، اس کی وضاحت کریں۔

جواب: بعض اکابر صحابہ نے فریقین سے گفتگو کی اور دونوں کو ایک دوسرے کے خیالات پہنچائے اور مصالحت کرانے میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کے بعد وہ دونوں سے کنارہ کش ہو گئے اور کسی فریق کے ساتھ جنگ میں حصہ نہ لیا اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ مسئلہ اجتہادی تھا اور یقین سے نہ کہا جا سکتا تھا کہ کس کا موقف صحیح ہے، اجتہادی مسائل میں قطعیت نہیں ہوتی ظنیت کا دخل ہوتا ہے اگر انہیں قطعی طور پر معلوم ہوتا کہ حق پر کون ہے، تو وہ کبھی اہل حق سے کنارہ کش نہ رہتے۔

حضرت علی نے حضرت جریر بن عبداللہ کو امیر معاویہ کے پاس بھیجا تھا اور انہوں نے دونوں میں سفارت کے فرائض سرانجام دیئے جب وہ مصالحت میں کامیاب نہ ہو سکے تو مقام قرقیا میں وہ کنارہ کش ہو کر بیٹھ گئے۔

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں:۔

ثم انعزل الفریقین وسکن قرقیاحتی مات ۵۱ھ[1]

(ترجمہ) پھر انہوں نے دونوں فریقوں کو چھوڑ دیا اور قرقیا کے مقام پر سکونت پذیر ہو گئے یہاں تک ۵۱ ہجری میں وفات پائی

اسی طرح حضرت ابو الدرداء اور حضرت ابو امامہ نے پہلے امیر معاویہ سے بات کی پھر حضرت علی سے بات کی حضرت علی نے قاتلین عثمان کے غلبے کا عذر کیا پھر یہ دونوں حضرات بھی دونوں طرف سے کنارہ کش ہو گئے حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:۔

فرجع ابو الدرداء وابو امامۃ فلم یشھدا لھم حربًا[2]

(ترجمہ) سو حضرت ابو الدرداء اور ابو امامہ دونوں واپس لوٹے اور دونوں میں سے کسی نے کسی جنگ میں حصہ نہ لیا۔

اس صورت حال سے پتہ چلتا ہے کہ مسئلہ کسی طرف قطعی درجہ میں نہ رہا تھا ہر صورت حال میں اجتہاد اور تاویل کی گنجائش تھی بعض صحابہ کا ان اختلافات میں غیر جانبدار رہنا اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ ان حضرات کے

---

[1] الاصابہ جلد ۱ صہ ۲۳۴ [2] البدایہ والنہایہ جلد ۷ صہ ۲۵۹۔

اختلافات اجتہادی درجہ میں تھے حضرت عمار بن یاسر حضرت علی کے طرفدار تھے ان کے سامنے کسی نے امیر معاویہ اور ان کے ساتھیوں کی تکفیر کی آپ نے اسے اس سے روکا اور فرمایا کہ وہ لوگ ایک آزمائش کا شکار ہو گئے ہیں لیکن ان کا اور ہمارا دین ایک ہے۔

لاتقولوا ذلک نبینا ونبیھم واحد وقبلتنا وقبلتھم واحدہ ولکنھم قوم مفتونون[1]

(ترجمہ) تم اس طرح نہ کہو ہمارا اور ان کا نبی ایک ہے ہمارا اور ان کا قبلہ ایک ہے لیکن وہ ایسے لوگ ہیں جو آزمائش کا شکار ہو گئے

علامہ خفاجی شرح شفا میں لکھتے ہیں:۔

انھا امور وقعت باجتھاد منھم لا لاغراض النفسانیہ ومطامع دنیویۃ کما یظنہ الجھلۃ[2]

(ترجمہ) یہ کچھ ایسے امور تھے جو ان سے اجتہاداً صادر ہوئے ان کا منشا کوئی اغراض نفسانیہ نہ تھیں نہ ان کا مطمح نظر کوئی دنیوی امور تھے جیسا کہ جاہلوں نے سمجھ رکھا ہے۔

مورخ اسلام علامہ ابن خلدون کی رائے بھی یہی ہے:۔

کان طریقھم فیھا الحق والاجتھاد ولم یکونوا فی محاربتھم لغرض دنیوی او لایثار باطل او لاستشعار حقد کما قد یتوھمہ متوھم وینزع الیہ ملحد[3]

(ترجمہ) ان کا ان امور میں عمل حق اور اجتہاد کا تھا اور ان کی آپس میں جنگیں کسی دنیوی غرض یا کسی غلط اختیاری یا کسی سلگتے عناد کے باعث نہ تھیں جیسا کہ توہمات کے پرستار سمجھ لیتے ہیں اور ملحدین اس طرف جھک جاتے ہیں:۔

حافظ ابن کثیر (۷۷۴ھ) کی تحقیق بھی یہی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) بھی لکھتے ہیں:۔

والظن بالصحابۃ فی تلک الحروب انھم کانوا فیھا متاولین وللمجتھد المخطئ اجر واذا ثبت ھذا فی حق احاد الناس فثبوتہ للصحابہ بالطریق الاولی[4]

---

[1] المصنف جلد ۱۵ صہ ۲۹۰ [2] نسیم الریاض جلد ۳ صہ ۴۶۷ [3] مقدمہ تاریخ ابن خلدون صہ ۳۶۴ [4] الاصابہ جلد ۴ صہ ۱۵۱

(ترجمہ) اور ان جنگوں میں صحابہ کے بارے میں یہی گمان کیا جائے کہ وہ ان میں کسی نہ کسی تاویل میں تھے
اور مجتہد نتیجہ تک پہنچنے میں خطا پر بھی ہو تو وہ ایک اجر کا مستحق ہوتا ہے پس جب یہ حق تاویل
عام امادہت کے لیے ثابت ہے کہ اس کا ثبوت صحابہ کے لیے بدرجہ اولیٰ ہونا چاہیئے ۔
(کیونکہ یہ وہ لوگ تھے خدا جن کے دلوں میں جھانک چکا اور ان سے راضی ہو چکا)

انہم کانوا مجتہدین فیما تعاطوہ من القتال ولیس کل مجتہد مصیباً بل المصیب
لہ اجران والمخطئ لہ اجر [1]

(ترجمہ) انہوں نے جو کچھ بھی کیا گو قتال ہو مجتہدین کی حیثیت سے کیا اور ہر مجتہد مصیب نہیں ہوتا
ہاں جو مصیب ہوا سے دو اجر ملیں گے اور جو جو اجتہاد میں خطا کر جائے وہ بھی ایک اجر کا مستحق
ہوتا ہے ۔

سوال جن لوگوں نے حضرت علیؓ کی خلافت نہ مانی اور ان کے خلاف بغاوت کی ان کا شرعی حکم کیا ہے کیا
وہ فاسق ہیں ؛ اور کیا پھر ان کی شہادت مردود ٹھہرے گی ؟

جواب علامہ تفتازانی عقائد کی مشہور کتاب شرح مقاصد میں اہل شام کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

ولیسوا کفاراً ولا فسقة ولا ظلمة لما لهم من التاویل وان کان باطلاً فغایة
الامر انهم اخطأوا فی الاجتهاد وذلك لا یوجب التفسیق فضلاً عن
التکفیر ولهذا منع علی اصحابه عن لعن اهل الشام وقال اخواننا بغوا علینا [2]

(ترجمہ) اور وہ کافر نہیں نہ فاسق ہیں اور نہ ہی انہیں ظالم ٹھہرایا جا سکتا ہے کیونکہ ان کے پاس کوئی
نہ کوئی وجہ ضرور تھی گو وہ باطل ہی کیوں نہ ہو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے
اجتہاد میں خطا کی اور اس سے فسق لازم نہیں آتا چہ جائیکہ کفر اور اسی لیے حضرت علیؓ نے ان
لوگوں کو جو اہل شام پر لعنت کر رہے تھے اس سے روکا اور فرمایا وہ ہمارے بھائی ہیں جو
ہم پر چڑھ دوڑے ہیں ۔

علم کلام کی مشہور تالیف کتاب التمہید میں علامہ ابوالشکور السالمی لکھتے ہیں :۔

---

[1] البدایہ والنہایہ ۳ صہ ۲۱۸ [2] شرح مقاصد جلد ۲ صہ ۲۲۳

ان الباغی لا یفسق لان شهادته مقبولة بالاتفاق والثانی ان الباغی
ماوّل فی دعواه [1]

(ترجمہ) باغی فاسق نہیں ٹھہرتا کیونکہ اس کی شہادت بالاتفاق مقبول ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ
باغی اپنے دعویٰ میں کسی تاویل سے کام لے رہے تھے ۔

پھر آگے جا کر لکھتے ہیں :۔

ولانه یجوز الصلوٰة والجمعة والحج وتولیة القضاء وغیر ذلك من الولایة
من جهة الباغی دلّ انه ما کان فاسقاً

(ترجمہ) باغی کی طرف سے حق ولی قائم ہونا تولیۃ القضا ادائیگی حج اور اس کا جمعہ و نماز جائز ہے یہ صورت
حال بتلاتی ہے کہ وہ باغی فاسق نہ تھا ۔

محدث جلیل ملا علی قاری بھی لکھتے ہیں :۔

کان معاویة مخطیاً الّا انه فعل ما فعل عن تاویل فلم یصر به فاسقاً [2]

(ترجمہ) حضرت معاویہ (اپنے اجتہاد میں) خطا پر تھے انہوں نے جو کچھ کیا سو کسی تاویل کے سہارے کیا ہو
آپ اس سے فاسق نہیں ہوئے (آپ کا عادل ہونا مجروح نہیں ہوتا)

حق یہی ہے اور یہی اہل حق کا مسلک ہے البتہ معتزلہ ان حضرات کو فاسق قرار دیتے ہیں اور وحق نے
ان کی پر زور تردید کی ہے علامہ ابن اثیر الجزری لکھتے ہیں :۔

وذهب جمهور المعتزلة الی ان عائشة وطلحة والزبیر ومعاویة وجمیع
اهل العراق والشام فساق بقتالهم الامام الحق [3]

(ترجمہ) جمہور معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ حضرت طلحہ حضرت زبیر حضرت معاویہ اور جمیع اہل عراق اور
اہل شام سب امام برحق سے لڑنے کے باعث فاسق قرار پائے ہیں ۔

پھر آگے جا کر ان الفاظ میں اس کی تردید کرتے ہیں :۔

وکل هذا جرأة علی السلف یخالف السنة فان ما جری بینهم کان

---

[1] کتاب التمہید صہ ۱۶۸ [2] شرح فقہ اکبر صہ ۸۲ [3] جامع الاصول جلد ۱ صہ ۸۳ ۔

مبنیاً علی الاجتہاد.

ترجمہ. یہ سلف پر ایک بہت بڑی جرأت ہے اور یہ سنت کے خلاف ہے کیونکہ ان میں جو کچھ بھی پیش آیا اور جو کچھ ہوا وہ اجتہاد پر مبنی تھا.

امامِ ربانی حضرت احمد مجدد الف ثانی فرماتے ہیں :-

وکتب القوم مشحونة بالخطاء الاجتہادی کما صرح بہ الغزالی والقاضی ابوبکر وغیرھما پس تفسیق وتضلیل در محاربان حضرت امیر جائز نباشد[1]

ترجمہ. اور اہلسنت کی سب کتابیں اس خطا کے اجتہادی ہونے سے بھری پڑی ہیں جیسا کہ امام غزالی قاضی ابوبکر باقلانی اور دوسرے اکابر اہلِ حق تصریح کر چکے ہیں. سو حضرت علیؓ کے ساتھ محاربہ کرنیوالوں کو فاسق کہنا یا انہیں گمراہ قرار دینا کسی طرح جائز نہ ہوگا (کیونکہ انہوں نے جو کچھ بھی کیا اس میں ان کے پاس کوئی نہ کوئی عذر یا تاویل ضرور موجود تھی).

حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ کا اجتہاد

حضرت امیر معاویہؓ کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ شخص جو مملکت کے کسی طاقتور فرد یا گروہ پر انصاف کا ہاتھ نہ ڈال سکے وہ خلافت کے لائق نہیں. حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے خطبہ خلافت میں حکومت کا جو چارٹر پیش کیا اس میں صراحت کی تھی کہ تم سے جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے (مجھ سے اپنا حق لینے میں طاقتور ہے) اور جو قوی اور طاقتور ہے وہ میرے نزدیک کمزور ہے. اس پر ہر حال میں انصاف کا ہاتھ ڈالا جائے گا.

خلافت کے اس اصول کی روشنی میں حضرت معاویہؓ سمجھتے تھے کہ جب حضرت علیؓ قاتلانِ حضرت عثمانؓ کو پکڑ نہیں سکتے اور عذر کرتے ہیں کہ باغی اس قدر قوت اختیار کر چکے ہیں کہ میں سر دست اُن پہ ہاتھ نہیں ڈال سکتا تو وہ خلافت کی ذمہ داریوں کے لائق کیسے ہو سکتے ہیں؟

حضرت علیؓ خود بھی اس اصول کو تسلیم کرتے تھے لیکن اس وقت ان کا خلافت سے دستبردار ہونا سلطنت اسلامی کے لیے اور بھی مہلک ہو سکتا تھا. ان کا اجتہاد یہ کہتا تھا کہ جس طرح بھی بن پڑے پہلے اپنی بکھری قوتوں کو جمع کیا جائے اور پھر قاتلانِ حضرت عثمانؓ پر ہاتھ ڈالا جائے —— اصولاً وہ خود مانتے تھے :-

ایھا النّاس ان احق النّاس بھٰذا الامر اقواھم واعلمھم بامر اللہ فیہ.[2]

اس نازک صورت حال میں دونوں طرف اجتہاد کی گنجائش ہے. سو ان دونوں گروہوں میں کسی کی تفسیق جائز نہ ہوگی. گو اکابر صحابہؓ کے نزدیک حضرت علیؓ کی خلافت قائم ہو چکی تھی. واللہ اعلم بالصواب   خالد محمود عفا اللہ عنہ

---

[1] مکتوبات دفتر ص   [2] نہج البلاغۃ جلد ۱ ص ۳۲۱

سوال: حضرت علیؓ پوری سلطنت اسلامی کے فرمانروا نہ تھے قلمرو اسلامی کے ایک حصہ پر حضرت امیر معاویہؓ کا قبضہ تھا انہیں خلفاء راشدین میں کیسے شمار کیا جا سکتا ہے وہ خلافت تامہ نہ تھی نہ اس کا پہلے تین خلفاء سے تسلسل تھا. ان کے چوتھے خلیفۂ راشد ہونے پر دلیل پیش کیجئے؟   سائل: محمد اسد اللہ قاسمی خطیب جامع مسجد قطب الدین جھنگ صدر

جواب: حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جب سیدنا حضرت علیؓ کی بیعت لی گئی تو اس وقت آپ کی یہ بیعت خلافت پوری قلمرو اسلامی کے لیے تھی. صحابہ کرامؓ جنہوں نے حضرت علیؓ کی بیعت کی تھی نہ انہیں علم تھا کہ عملاً یہ خلافت مصر و شام تک نہ جا سکے گی نہ حضرت علی مرتضیٰؓ کو آئندہ ہونیوالے واقعات کا علم تھا. علم غیب خاصہ باری تعالیٰ ہے. خاصانِ خدا بھی غیب کی وہی بات جان سکتے ہیں جو عالم الغیب بتلائے. بسو عقداً یہ خلافت پوری قلمرو اسلامی کے لیے تھی گو عملاً ایسا ظہور میں نہ آیا. خلافت کے احکام عقد سے چلتے ہیں عمل سے نہیں. دو خلیفہ بنا لیے جائیں تو فیصلہ پہلے کے حق میں ہوتا ہے. حضرت علیؓ اپنے آپ کو اگر پوری سلطنت اسلامی کا حکمران نہ سمجھتے تو حضرت معاویہؓ کو بیعت کے لیے کیوں لکھتے اور پھر انہیں شام کے گورنر کی حیثیت سے معزول کیوں کرتے. اگر حضرت علیؓ پوری قلمرو اسلامی کے فرمانروا نہ تھے تو حضرت معاویہؓ ان سے قاتلین عثمانؓ کو پکڑنے کے لیے نہ کہتے. حقیقت یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کا ان سے یہ مطالبہ ان کی خلافت کے انکار پر مبنی نہ تھا. یہ صرف بیعت سے توقف تھا اور انہوں نے خلافت قائم ہونے تک اپنی سابق پوزیشن (عامل خلافتِ عثمانؓ) بحال رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا.

حضرت علی مرتضیٰؓ کی خلافت حضرت حسنؓ کی خلافت سے اصولاً مختلف ہے. اوّل الذکر بوقتِ عقد پوری قلمرو اسلامی کے فرمانروا تھے اور ثانی الذکر بوقتِ عقد اسی خطہ پر حکمران تھے جو حضرت علیؓ کے قبضہ میں تھا سو حضرت علیؓ کی خلافت باعتبار عقد خلافتِ تامہ ہے اور خلافتِ راشدہ کی تمام شرطوں کو پورا کرتی ہے. پھر یہ خلافت پہلی تین خلافتوں سے مسلسل بھی ہے. حضرت علیؓ اپنے ایک مکتوب[1] میں صراحت کرتے ہیں کہ میری بیعت انہی لوگوں نے کی ہے جنہوں نے پہلے تین بزرگوں کی بیعت کی اور انہی شرطوں پر انہوں نے مجھے خلیفہ مانا ہے جن شرطوں پر انہوں نے انہیں خلیفہ مانا تھا. شیعہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ اپنے دورِ خلافت میں لوگوں کو تراویح باجماعت سے روک سکے نہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کو فدک دے سکے. ان کی خلافت پہلی تین خلافتوں کا ہی تتمہ رہی. قاضی نور اللہ شوستری (۱۰۱۹ھ) لکھتا ہے :-

اکثر اہل آں زماں را اعتقاد آں بود کہ امامت حضرت امیر مبنی بر امامت ایشاں است و فساد امامت ایشاں را دلیل فساد امامت او مے دانند.[2]

ترجمہ. اس وقت اکثر لوگوں کا اعتقاد یہ تھا کہ حضرت علیؓ کی امامت ان پہلے تین کی امامت پر

---

[1] نہج البلاغۃ حصہ ۳ ص ۸   [2] مجالس المومنین جلد ۱ ص ۵۴

مبنی ہے اور وہ ان کی امامت ٹوٹنے سے حضرت علیؓ کی امامت کو ٹوٹا سمجھتے ہیں۔

یعنی وہ تین صحیح اور جائز خلیفہ ہوں تو یہ چوتھے بھی صحیح اور جائز خلیفہ ہوں گے اور وہ تین خلیفہ برحق نہیں تو یہ چوتھے بھی صحیح خلیفہ نہ ہوں گے۔ واللہ اعلم بالصواب

سوال۔ حضرت عثمانؓ کے خلاف بغاوت کرنے والوں میں کیا کوئی صحابی بھی تھا؟ شیعہ کہتے ہیں حضرت عائشہؓ اس سانحہ پر بہت خوش تھیں کیا یہ درست ہے؟

جواب۔ یہ درست ہے کہ ان باغیوں نے اپنی قوت بتلانے کے لیے یہ بات بنا رکھی تھی کہ بعض صحابہ ان کے ساتھ ہیں لیکن جب پوچھا جاتا تو کوئی نام نہ بتاتے یہ محض ان کی ایک سیاسی چال تھی ان باغیوں کے ساتھ شامل ہونا تو درکنار اس سانحہ پر رضامندی کا اظہار بھی کسی صحابی سے ثابت نہیں حافظ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) لکھتے ہیں۔

واما ما یذکرہ بعض الناس من ان بعض الصحابہ اسلمہ ورضی بقتلہ فھذا لا یصح عن احد من الصحابة انہ رضی بقتل عثمان رضی اللہ عنہ بل کلھم کرھہ ومقتہ وسب من فعلہ [1]

(ترجمہ) جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ بعض صحابہ نے حضرت عثمان کو باغیوں کے سپرد کیا تھا اور وہ ان کے قتل پر راضی تھے یہ کسی صحابی سے ثابت نہیں کہ وہ قتل عثمان پر راضی ہوا ہو بلکہ ہر ایک نے اسے ناپسند کیا برا جانا اور جنہوں نے یہ کیا انہیں برا کہا۔

باغی اپنی بات کو مضبوط کرنے کے لیے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کا نام بھی لیتے اور یہ سراسر جھوٹ ہے یہ بات حضرت ام المومنین کو پہنچی تو انہوں نے اس کی پرزور تردید کی اور فرمایا:۔

لو اَحْبَبْتُ قتلہ لقتلت [2] — اگر میں ان کے قتل سے راضی ہوں تو میں بھی قتل کی جاؤں۔

ابن جریر طبری لکھتے ہیں کہ حضرت ام المومنین کو شہادت عثمان کی خبر پہنچی تو آپ نے فرمایا۔

قتل واللہ عثمان مظلوماً واللہ لاطلبن بدمہ۔ [3]

(ترجمہ) بخدا عثمان مظلوم مارے گئے میں ان کے خون کا مطالبہ کروں گی تاکہ قاتلوں کو سزا دی جائے۔

پھر آپ لوگوں کو قاتلین عثمان کے خلاف برابر بیدار کرتی رہیں [4] اور آپ کی کل ہمدردیاں حضرت عثمان کے ساتھ تھیں۔

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۷ صہ ۱۹۸ [2] فتح الباری جلد ۱۳ صہ ۴۳۲ [3] تاریخ طبری جلد ۳ صہ ۵۰۳ وکذا ذکر فی البدایہ جلد ۷ صہ ۲۲۷۔ [4] البدایہ والنہایہ جلد ۷ صہ ۲۲۳۔

اور آپ ہمیشہ ذہناً حضرت عثمان کے ساتھ رہے ہیں۔

سوال۔ کیا یہ صحیح ہے کہ حضرت عثمان کا برتاؤ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ابوذر غفاری اور حضرت سلمان فارسی سے اچھا نہ تھا اور ان حضرات نے آپ سے بہت سی تکلیفیں اٹھائی ہیں (معاذاللہ)

جواب بعض مورخین نے کچھ اس قسم کی غلط روایات نقل کی ہیں لیکن یہ روایات تحقیق کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتیں جتنا بڑا الزام ہو اسکے ثبوت میں دلیل ویسی ہی قوی ہونی چاہیئے یہودیوں کی گھڑی روایات سے ان شخصیتوں کو داغدار کرنا جن کے جنتی ہونے کی خبر خود سرور کائنات دے چکے ہیں یہ کونسی تحقیق ہے حافظ ابن تیمیہ ان الزامات کے بارے میں جو حضرت عبداللہ بن مسعود کے نام سے حضرت عثمان پر لگائے گئے۔ لکھتے ہیں ہذا کذب [1] (یہ محض جھوٹ ہے)

حضرت ابوذر غفاری کو ربذہ [2] جلاوطن کرنے کا الزام بھی درست نہیں حضرت ابوذر نے ربذہ منتقل ہونے کے لیے خود حضرت عثمان سے اذن طلب کیا تھا اور کہا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا ہے جب مدینہ کی آبادی سلع پہاڑی تک جا پہنچے تو تم مدینہ سے چلے جانا اور ظاہر ہے کہ حضرت عثمان حدیث نبوی کے خلاف چلنے پر حضرت ابوذر کو کسطرح مجبور کر سکتے تھے حضرت ابوذر ربذہ چلے گئے تو حضرت عثمان انہیں ضرورت کی چیزیں بھی برابر بھجواتے رہے [3] اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے اور حضرت ابوذر کے مابین کوئی کدورت نہ تھی باہمی تعلقات پہلے کی طرح اب بھی مخلصانہ اور دوستانہ تھے

سوال۔ حضرت عثمان نے اپنے ماں جائے بھائی ولید بن عقبہ کو کوفہ کا والی بنایا پھر اس پر شراب پینے کا الزام لگا اور اس پر شہادت بھی گزری اور اسے کوڑے بھی لگے تو کیا حضرت عثمان کی نظر انتخاب ایسے لوگوں پر ہی پڑتی تھی جن کا کردار خیرالقرون میں یہ ہو۔

جواب ولید بن عقبہ فتح مکہ کے دن مسلمان ہوئے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قبیلہ بنی مصطلق کے صدقات وصول کرنے پر عامل مقرر کیا تھا [4]۔ پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے عہد خلافت میں انہیں بنو قضاعہ کے صدقات کی وصولی پر عامل ٹھہرایا [5] پھر حضرت عمرؓ نے انہیں بنو تغلب کے صدقات کی وصولی پر عامل مقرر فرمایا [6] تو کیا یہاں

---

[1] منہاج السنۃ ۳ صہ ۱۹۲۔ [2] ربذہ مدینہ منورہ سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر ایک جگہ کا نام ہے تاریخ طبری جلد ۳ صہ ۳۲۶ طبقات ابن سعد جلد ۴ صہ ۲۲۷ [3] دیکھئے طبری ۳ صہ ۳۳۷۔ [4] تہذیب التہذیب جلد ۱۱ صہ ۱۴۲۔ [5] تاریخ ابن جریر طبری جلد ۴ صہ ۲۹ [6] تہذیب جلد ۱۱ صہ ۱۴۳۔

بھی وہی سوال نہیں اٹھتا کہ جس شخص کا کردار آئندہ یہ ظاہر ہونے والا تھا اس پر شراب نوشی کی شہادت بھی گزرنی تھی اور اسے کوڑوں کی سزا بھی ملنی تھی حضور نے حضرت صدیق اکبر اور حضرت عمر فاروق نے ایسے شخص کو یہ سرکاری ذمہ داریاں کیوں بخشیں ؟ پھر یہی سوال اب حضرت عثمان کے خلاف کیوں اٹھتا ہے ۔ شخص ایک ہی ہے اگر پہلے حضرات کے خلاف یہ سوال نہیں اٹھا تو اب بھی یہ نہ اٹھنا چاہیئے اصل بات وہی ہے جو حضرت شاہ عبدالعزیز رح نے لکھی ہے ۔

علم غیب اصلاً نزد اہل سنت بلکہ جمیع طوائف مسلمین غیر از شیعہ شرط امامت نیست عثمان باہر کہ حسن ظن داشت و کار کردنی دانست و امین و عادل شناخت و مطیع و منقاد خود گمان برد ریاست و امارت باو داد [1]

(ترجمہ) اہل سنت کے نزدیک بلکہ مسلمانوں کے کسی گروہ کے ہاں علم غیب امامت اور خلافت کی شرط نہیں شیعہ اسے نہیں مانتے حضرت عثمان رض کا جس سے نیک گمان ہوا اور اسے کام کے لائق سمجھا اور اسے امین و عادل جانا اور اپنا تابعدار دیکھا تو اسے کسی نہ کسی علاقے میں والی بنا دیا.

(اس میں کوئی حرج کی بات نہ تھی) .

حضرت عمر کی شہادت کے وقت ولید بن عقبہ الجزیرہ کے والی تھے پھر حضرت عثمان رض نے انہیں کوفہ بلا لیا کوفہ میں بھی پانچ سال تک آپ کے خلاف کوئی بات نہ اٹھی آپ رعیت سے اتنے مانوس تھے کہ وہاں تک آپ کے دروازے پر نہ ہوتا تھا [2] آپ نے آذربائیجان اور آرمینیا کو دوبارہ فتح کیا رومی مسلمانوں کے مقابلہ میں دوبارہ اٹھے تو حضرت عثمان رض نے ولید کو ہی لکھا تھا کہ وہ اہل شام کی مدد کے لیے آٹھ ہزار کا فوجی دستہ روانہ کرے اور پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی نصرت فرمائی تھی اب آپ ہی غور کریں کہ سیدنا حضرت عثمان رض کی نگاہ انتخاب اہل افراد پر تھی یا نا اہل افراد پر ؟

رہا شراب نوشی کا الزام تو یہ یہودی کارندوں کی مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی ترقی کے خلاف ایک سازش تھی ۔ ابو زینب ازدی اور ابو مورع اسدی اس کام کے لیے تیار کیے گئے تھے انہوں نے ایک سازش سے ولید کی انگوٹھی اتاری اور ان پر بے ہوشی کی گواہی دی ۔ ان دو شخصوں کی حضرت عثمان نے مزید کرید نہ کی کہ لوگ اسے اپنے رشتہ داروں کی حمایت پر محمول نہ کریں اور بھائی پر سزا جاری فرما دی اور کہا ۔

---

[1] تحفہ اثنا عشریہ صہ ۳۰۵ [2] البدایہ والنہایہ جلد ۷ صہ ۱۵۱ ۔

گواہ اگر جھوٹے ہیں تو ان کا ٹھکانہ جہنم ہوگا اے بھائی صبر کیجیے [1] ۔

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں :۔

ویقال ان بعض اهل الكوفة تعصبوا عليه فشهدوا عليه بغير الحق [2]

(ترجمہ) یہ بات کہی جاتی ہے کہ بعض اہل کوفہ نے ان سے تعصب برتا اور ان پر ناحق گواہی دی ۔

اور حافظ سخاوی بھی کہتے ہیں :۔

ان بعض اهل الكوفة تعصبوا عليه فشهدوا عليه بغير الحق [3]

امام فخر الدین رازی رح نے لکھا ہے کہ ولید بن عقبہ پر فاسق کا اطلاق درست نہیں ۔

ان اطلاق لفظ الفاسق على الوليد شئ بعيد لانه توهم وظن فاخطاء والمخطئ لا يسمى فاسقاً [4]

(ترجمہ) ولید بن عقبہ کو فاسق کہنا بڑی بات ہے آپ زیادہ سے زیادہ توہم ظن اور خطاء کے ملزم ٹھہرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ مخطی کو فاسق نہیں کہا جا سکتا ۔

سوال کیا یہ صحیح ہے کہ جناب رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حکم بن ابی العاص کو مدینہ منورہ سے شہر بدر کیا تھا خلافت شیخین میں بھی وہ باہر رہا پھر حضرت عثمان رض نے اسے مدینہ آنے کی اجازت کیوں دے دی ؟

جواب ۔ حکم بن ابی العاص کا شہر بدر کیا جانا بعض مورخین نے بیان کیا ہے لیکن اس واقعہ کی نسبت چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے اس لیے ضروری ہے کہ یہ واقعہ کتب حدیث میں کسی سند صحیح سے ملے اور صحیح ہے کہ اس واقعہ پر کوئی صحیح حدیث نہیں ملتی جن روایات میں یہ قصہ مذکور ہے ان میں سے کسی کی بھی سند صحیح نہیں ہشام کلبی اور واقدی جیسے راویوں کے بیان پر اسے حضور ص کی طرف منسوب کرنا درست نہیں حافظ ابن تیمیہ رح لکھتے ہیں ۔

قصة نفى الحكم ليست فى الصحاح ولا لها اسناد يعرف به امرها [5]

(ترجمہ) حکم کے جلاوطن کیے جانے کا قصہ صحاح کی کتابوں میں نہیں ملتا اور نہ اس کی کوئی ایسی سند ملتی ہے کہ اس کے حالات کو پہچانا جا سکے

---

[1] تاریخ طبری جلد ۵ صہ ۶۲ [2] الاصابہ جلد ۳ صہ ۶۰۱ [3] فتح المغیث جلد ۳ صہ ۱۰۴ [4] تفسیر کبیر جلد ۷ صہ ۵۸۹ [5] منہاج السنۃ جلد ۳ صہ ۱۹۶ ۔

اگر تاریخ کی روایت کو کسی درجہ میں لائق اعتنا سمجھا جا سکتا ہے تو وہاں یہ بھی مذکور ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے واپس آنے کی اجازت بھی دے رکھی تھی ابن جریر طبری روایت کرتے ہیں :-

ان الحکم کان مکیا فسیرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی الطائف ثم ردہ الی بلدہ فرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سیرہ بذنبہ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ردہ بعفوہ [1]

(ترجمہ) حکم مکہ کا رہنے والا تھا رسول پاکؐ نے اسے طائف کی طرف بھجوا دیا تھا پھر آپ نے ہی اس کی وطن واپسی کی اجازت بھی دے رکھی تھی سو آپ ہی اس کے قصور پر اسے وہاں بھجوانے والے تھے اور آپ ہی اسے اس کے اظہار ندامت پر واپس بلانے والے ہوئے پھر بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ حضرت عثمان رضؓ نے اس پر لوگوں کی شہادت طلب کی تھی۔

أکذلك ؟ قالوا اللهم نعم۔

(ترجمہ) کیا بات اسی طرف ہے انہوں نے کہا ہاں بیشک اسی طرح ہے۔

پھر یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ اگر حضورؐ نے اسے شہر بدر کیا تھا تو کیا ہمیشہ کے لیے کیا تھا اور کیا کتاب و سنت میں کسی بھی جرم کی سزا اس طرح ابدی ہے ؟ جس زانی پر شہادت گزرے اسے بھی حاکم وقت زیادہ سے زیادہ ایک سال کے لیے شہر بدر کر سکتا ہے مخنث بھی صرف اس وقت تک شہر بدر رہے گا جب تک توبہ نہ کرے شریعت نے کسی کو دائمی طور پر جلاوطن نہیں کیا جن لوگوں نے حکم بن ابی العاص کا ہمیشہ کے لیے شہر بدر ہونا بتلایا ہے وہ اس پر کوئی شرعی دلیل نہیں پیش کر سکے حافظ ابن حزم لکھتے ہیں :-

ونفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم للحکم لم یکن حداً واجباً ولا شریعۃ علی التابید وانما کان عقوبۃ علی ذنب استحق بہ النفی والتوبۃ مبسوطۃ فاذا تاب سقطت عنہ تلك العقوبۃ بلا خلاف من احد من اھل الاسلام [2]

(ترجمہ) اور حضورؐ کا حکم کو جلاوطن کرنا حد واجب کے طور پر نہ تھا اور کسی کو ہمیشہ کے لیے جلاوطن کرنا یہ کوئی اسلامی قانون نہیں ہے یہ ایک گناہ پر ایک سزا تھی جس سے وہ جلاوطنی کا مستحق ہوا اور توبہ

[1] تاریخ طبری جلد ۵ صد ۱۳۵ [2] کتاب الفصل جلد ۴ صد ۱۵۴۔

کا سلسلہ وسیع ہے جب وہ توبہ کرے تو یہ سزا معاف ہو جاتی ہے اور اس میں اہل اسلام کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ بھی لکھتے ہیں :-

واذا کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قد عزر رجلاً لم یلزم ان یکون منفیا طول الزمان فان ھذا لا یعرف فی شئ من الذنوب ولم تات الشریعۃ بذنب یبقی صاحبہ منفیاً دائماً [1]

(ترجمہ) اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شخص پر تعزیر جاری کی ہو تو لازم نہیں کہ وہ عمر بھر جلاوطن ہی رہے کیونکہ یہ اصول کسی بھی جرم میں وارد نہیں ہے۔ اور نہ شریعت نے کوئی ایسا گناہ بتلایا ہے جس کا مرتکب دائمی طور پر جلاوطن رہے گا۔

رہا یہ سوال کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے حکم کو مدینہ آنے کی اجازت کیوں نہ دی ؛ اس کا جواب یہ ہے کہ ان حضرات میں سے کسی نے حضورؐ کے اس حکم جلاوطنی کو مدت العمر کی سزا نہیں کہا ہے بطور حاکم وقت کے اس وقت کے لیے یہ ان کا اپنا فیصلہ تھا اور حضرت عثمانؓ نے اپنے وقت میں اپنا فیصلہ کیا اور حاکم وقت ہونے کی حیثیت سے انہیں اس کا پورا اختیار تھا فقہا کا مسلمہ اصول ہے کہ حالات بدلنے پر فتوے مختلف ہو جاتے ہیں

یہ سب جواب اس صورت میں ہے کہ حکم کی جلاوطنی کسی صحیح حدیث سے ثابت ہو اس صورت میں ہر حاکم وقت کو جسکو اس کی توبہ اور ندامت کی خبر پہنچے اس کی سزا معاف کرنے کا حق ہو گا اسلامی قانون کسی کو ہمیشہ کے لیے جلاوطن نہیں رکھتا۔

بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حکم بن ابی العاص جب سے اسلام لایا مکہ میں ہی رہا طائف جانے کا قصہ بے اصل ہے پھر حضرت عثمان نے انہیں مدینہ آنے کی اجازت دی کہ وہ یہاں آئے ابن سعد لکھتے ہیں :-

اسلم یوم فتح مکہ ولم یزل بھا حتی کانت خلافۃ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ فاذن لہ فدخل المدینۃ فمات بھا فی خلافۃ عثمان بن عفان رضؓ [2]

(ترجمہ) فتح مکہ کے دن مسلمان ہوا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت تک وہیں رہا حضرت عثمان رضؓ نے اسے

[1] منہاج السنۃ جلد ۳ صد ۱۹۶ [2] طبقات ابن سعد جلد ۵ صد ۳۳۱۔

مدینہ آنے کی اجازت دی تو وہ مدینہ آیا اور دورِ عثمانی میں اس نے وہیں وفات پائی۔

پھر مروان کا تو اسمیں کوئی قصور نہیں نہ حضورؐ نے اسے جلاوطن کیا اور نہ وہ آپ کے سامنے اس عمر میں تھا کہ حضورؐ اس کے لیے کوئی سزا تجویز کریں حکم کا قصہ (اگر وہ ثابت ہو) مروان کے سر لگانا کسی طرح درست نہیں مروان اگر اس درجہ قصور وار ہوتا تو حضرت زین العابدین اسے اپنا استاد حدیث نہ بناتے حضرت عثمان نے جب مروان کو اپنا سکریٹری بنایا تھا تو اس وقت اس کا باپ حکم فوت ہو چکا تھا شیعہ کی یہ بات درست نہیں کہ عملاً اس وقت بھی حکم اپنے بیٹے کو چلا رہا تھا۔

سوال:۔ حضرت عثمان نے امیر معاویہ کو شام میں اتنا طول اقتدار بخشا کہ اس کی قیمت پھر حضرت علیؓ کو ادا کرنی پڑی۔ شام میں معاویہ کی سیاسی پوزیشن اتنی قوی ہو چکی تھی کہ خلیفہ وقت حضرت علیؓ انہیں عملاً معزول کرنے پر قادر نہ تھے سلطنت اسلام دو حصوں میں منقسم ہوئی تو اس کا ایک سبب کیا معاویہ کا یہ غیر معمولی سیاسی اقتدار نہ تھا؟

جواب:۔ حضرت معاویہؓ کو شام میں حضرت عثمانؓ نے مقرر نہ کیا تھا حضرت ابوبکر صدیق نے ۱۳ ہجری میں جو کمک شام بھیجی اس پر آپ نے حضرت معاویہ کو امیر مقرر کیا تھا اور اموی حضرات کو آگے کرنے کی یہ تحریک بھی حضرت ابوبکر صدیق نے کی تھی آپ نے حضورؐ کو انہیں اپنا نمائندہ بناتے ہوئے دیکھا تھا حضورؐ نے وائل بن حجر کو ایک قطعہ زمین دینے کے لیے حضرت معاویہ کو اپنا نمائندہ بنایا تھا امام بخاری حضرت وائل بن حجر سے روایت کرتے ہیں۔

فبعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معی معاویۃ بن ابی سفیان قال وامرہ ان یعطینی ارضا فیدفعھا الی [1]

(ترجمہ) حضورؐ نے میرے ساتھ معاویہ بن ابی سفیان کو بھیجا اور کہا کہ وہ مجھے ایک قطعہ اراضی دے دیں گے۔

حضورؐ نے یہ جانتے ہوئے کہ ابوسفیان ہر معرکے میں مسلمانوں کے خلاف رہے ہیں ان حضرات کو کیوں آگے کیا ہم اس سوال کی جسارت نہیں کر سکتے حضورؐ کو ان کے اخلاص و ایمان پر پورا بھروسہ تھا تبھی تو وہ انہیں اپنے ابتدار اسلام میں ہی اسلام کے کاموں کے لیے آگے بڑھا رہے تھے کیا حضورؐ نے ابوسفیان کو اسلام لاتے ہی نجران کا والی نہ بنا دیا تھا [2] حضرت ابوبکر صدیق نے اسی ذہن سے امیر معاویہ کو شام کی طرف جانے والی کمک کا امیر بنایا ان دنوں اس علاقے کے والی یزید بن ابی سفیان ان کے بڑے بھائی تھے۔

---

[1] تاریخ کبیر امام بخاری جلد ۴ صد ۱۷۶۔ [2] نسب قریش صہ ۱۲۲۔

واجتمع الی ابی بکر اناس فامر علیھم معاویہ وامرہ باللحاق بیزید فخرج معاویۃ حتی لحق بیزید [1]

(ترجمہ) حضرت ابوبکرؓ کے پاس بہت سے لوگ جمع ہو گئے آپ نے معاویہ کو ان پر امیر بنایا اور آپ کو کہا کہ (اپنے بھائی) یزید سے جا ملو آپ نکلے اور یزید بن ابی سفیان سے آملے۔

شام کے علاقہ میں دو اموی بھائیوں کو جمع کرنا کیا یہ حضرت عثمانؓ نے کیا تھا: پھر حضرت عمرؓ کا دور آیا تو کیا یزید بن ابی سفیان شام کے والی نہ تھے؟ وہ فوت ہوئے تو حضرت عمرؓ نے حضرت صدیق اکبر کی پیروی میں ان کے بھائی حضرت معاویہ کو وہاں کا والی بنایا اور حضرت عثمانؓ نے سیرت شیخین کی پیروی کرتے ہوئے انہیں ہی وہاں مقرر رکھا اور شام کی پوری قلمرو اسلامی بھی حضرت عثمان نے نہیں حضرت عمرؓ نے آپ کو دی تھی حافظ ذہبی لکھتے ہیں

ثم جمع عمر الشام کلھا لمعاویۃ واقرہ عثمان [2]

(ترجمہ) پھر حضرت عمرؓ نے پورا شام معاویہ کو دے دیا تھا اور حضرت عثمان نے بھی آپ کو وہاں ٹھہرائے رکھا، حضرت معاویہؓ اپنی اس حیثیت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان معصوماً فولانی فادخلنی فی امرہ ثم استخلف ابوبکرؓ فولانی ثم استخلف عمر فولانی ثم استخلف عثمان فولانی۔

(ترجمہ) حضورؐ معصوم شخصیت تھے آپ نے مجھے اپنی ولایت بخشی اور مجھے اپنے کام میں داخل کیا پھر حضرت ابوبکر خلیفہ ہوئے تو آپ نے بھی مجھے والی بنایا پھر حضرت عمر خلیفہ ہوئے تو آپ نے بھی مجھے اپنی ولایت بخشی پھر حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو آپ نے بھی مجھے والی رکھا۔

ان حالات میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شام میں اموی اقتدار کا ذمہ دار ٹھہرانا قرین انصاف نہیں بلکہ دیکھا جائے تو حضرت ابوبکر و عمرؓ نے اس دور میں انہیں وہاں ٹھہرایا جب ان سے بہتر اور بزرگ اور صحابہ موجود تھے اور حضرت عثمانؓ نے تو ان سے اس دور میں وہاں خدمات لیں جب حضرت معاویہ خود اکابر کی صف میں آچکے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے علم، ان کی بزرگی اور ان کی ہاشمیت میں کسے شک ہو سکتا ہے آپ فرماتے ہیں۔

---

[1] ابن جریر طبری جلد ۴ صہ ۳۰، البدایہ والنہایہ جلد ۷ صہ ۴۔ [2] سیر اعلام النبلاء جلد ۳ صہ ۸۸۔
[3] تاریخ ابن جریر طبری جلد ۵ صہ ۸۷۔

ليس احد منا اعلم من معاويه [1]

(ترجمہ) اس دور میں ہم میں سے کوئی معاویہ سے زیادہ علم رکھنے والا نہ رہا تھا

آپ نے یہ بھی فرمایا "انہیں جانے دیجیے آپ حضور کے صحابی ہیں آپ نے (وتر میں) درست عمل کیا ہے بیشک آپ فقیہ ہیں [2] سلطنت اسلامی کا دو حصوں میں ہونا یہ صرف آپ کی تجویز نہ تھی ——— حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں نے ۴۰ھ میں آپس میں یہ معاہدہ کیا تھا کہ دونوں اپنی اپنی جگہ حکومت پیرا ہیں۔ ابن جریر طبری (۳۱۰ھ) ۴۰ھ کے واقعات کے تحت لکھتا ہے ۔

وفى هذه السنة جرت بين على ومعاوية الهدنة بعد مكاتبات يطول ذكرها على وضع الحرب بينهما . . وامسك كل واحد منهما عن قتال الآخر [3]

(ترجمہ) اور اس سال (یعنی ۴۰ ہجری میں) حضرت علی اور حضرت معاویہ میں طویل خط وکتابت رہی اور آپس میں جنگ بند کرنے پر صلح ہوئی اور ہر ایک دوسرے پر حملہ کرنے سے رک گیا ۔

اب آپ ہی خیال کریں سلطنت اسلام کیا ہر دو کے مشورے سے دو حصوں میں منقسم نہ ہوئی ؟ پھر صرف حضرت امیر معاویہ کو اس کا ذمہ دار ٹھہرانا کیسے درست ہو سکتا ہے ؟

سوال :۔ امیر معاویہؓ اور حضرت حسن نے جب پھر دو سلطنتوں کو ایک سلطنت اسلام بنا دیا تو کیا پھر بھی حضرت معاویہ پر تفریق سلطنت کی کوئی ذمہ داری رہی ؟ پھر حضرت حسنؓ کے شہید ہونے تک کیا ان کے اس معاہدہ صلح میں کوئی رخنہ آیا ؟ یا حضرت حسن نے اس پر کوئی سوال اٹھایا ؟ یا ان کے بعد ان کے بھائی حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کبھی کہا کہ اب ہماری وہ صلح باقی نہیں رہی یا اب ہم امیر معاویہ کی بیعت پہ قائم نہیں ہیں

حجر بن عدی جو حضرت علیؓ کے خاص احباب میں سے تھے انہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اس نقض بیعت پر بہت دفعہ آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس تجویز کو ہمیشہ مسترد کیا ۔ اور فرمایا :۔

انا قد بايعنا وعاهدنا ولا سبيل الى نقض بيعتنا [4]

---

[1] السنن الکبریٰ جلد ۳ صہ ۲۶ [2] صحیح بخاری جلد ۱ صہ ۵۳۱ [3] تاریخ طبری جلد ۶ صہ ۸ البدایہ والنہایہ جلد ۷ صہ ۳۲۲ ۔ [4] اخبار الطوال للدینوری صہ ۲۲۰ ۔

(ترجمہ) ہم نے بیعت کر لی ہوئی ہے اور عہد کیا ہوا ہے اور اب ہمارے لیے بیعت توڑنے کا کوئی جواز نہیں ہے ۔

پھر حضرت امیر معاویہؓ نے مغیرہ بن شعبہ کے کہنے پر جب یزید کو ولی عہد بنایا تو اس وقت بھی حضرت حسینؓ نے حضرت معاویہ کی بیعت نہیں توڑی آخر تک ان کے وفادار رہے اور اپنی بیعت پر قائم رہے ۔ وہ یزید کو ولی عہد بنانے کے حق میں نہ تھے لیکن اس ایک اختلاف پر وہ حضرت معاویہ کی بیعت سے نکلنے پر بھی آمادہ نہ تھے

سوال :۔ حضرت عثمان کی شہادت کی خبر جب شام پہنچی (جہاں امیر معاویہؓ حضرت عثمان کی طرف سے گورنر تھے) تو حضرت معاویہ کا حضرت علی کی بیعت سے انکار اگر محض اس لیے ہوتا کہ وہ قاتلین عثمانؓ سے قصاص چاہتے تھے تو شام میں مقیم دیگر صحابہ کیوں ان کے ساتھ شامل نہ ہوتے ؟ معلوم ہوتا ہے امیر معاویہ نے محض اپنے اقتدار کے لیے خلافت مرتضوی سے اختلاف کیا تھا ۔

جواب :۔ یہ غلط ہے کہ حضرت معاویہ کے ساتھ وہاں کے دیگر صحابہ اس مطالبہ قصاص عثمان میں شامل نہ ہوتے تھے حضرت عبادہ بن صامت (۳۴ھ) اور حضرت ابو الدرداء (۳۲ھ) اکابر صحابہ وہاں موجود تھے اور یہ سب حضرات اس مطالبہ میں حضرت امیر معاویہؓ کے ساتھ تھے یہ حضرات خود ہرگز شریک اقتدار نہ تھے کہ ان کے متعلق یہ شبہ راہ پا سکے کہ یہ خود کسی مصلحت سے خون عثمان کے قصاص کے لیے اٹھے ہوں حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں

وقام فى الناس معاوية وجماعة من الصحابة معه يحرضون الناس على المطالبة بدم عثمان ممن قتله من اولياء الخوارج فهم عباده بن الصامت و ابو الدرداء و ابو امامة وعمرو بن عبسة وغيرهم [1]

(ترجمہ) اور لوگوں میں امیر معاویہ اور آپ کے ساتھ صحابہ کی ایک جماعت اٹھ کھڑی ہوئی جو لوگوں کو ان خارجیوں سے جنہوں نے حضرت عثمان کو قتل کیا تھا خون عثمان کا قصاص لینے کے لیے آمادہ کرتے تھے ان میں حضرت عبادہ بن صامت حضرت ابو الدرداء حضرت ابو امامہ اور عمرو بن عبسہ سلمی حضرات شامل تھے

یہ بھی غلط ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ نے خود خلیفہ بننے کے لیے بیعت مرتضوی سے انکار کیا تھا آپ

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۷ صہ ۲۲۷ ۔

نے مطالبہ قصاص عثمان ۳۵ ہجری میں کیا اور اہل شام نے آپ کی (حضرت امیر معاویہ رض) بیعت ۳۷ ہجری کے آخری ذی القعدہ میں کی ہے اور یہ بھی اس وقت جب حکمین (حضرت ابو موسیٰ اشعری اور حضرت عمرو بن العاص) قیام امن اور صلح فریقین میں کامیاب نہ ہو سکے تھے اور انہوں نے حضرت علی کو خلافت سے ہٹانے کا فیصلہ کیا تھا اور اس صورت حال میں لوگوں میں اختلاف اور پھیلتا جا رہا تھا۔ خلیفہ ابن الخیاط لکھتا ہے:

وبایع اھل الشام لمعاویۃ بالخلافۃ فی ذی القعدۃ سنۃ سبع و ثلثین [1]

(ترجمہ) اور اہل شام نے حضرت معاویہ کی خلافت کی بیعت ۳۷ ہجری ذوالقعدہ میں کی ہے۔

پھر یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ مصر میں بھی بعض لوگوں نے حضرت علی کی بیعت سے انکار کیا تھا اور انکا بھی مطالبہ تھا کہ جب تک آپ قاتلین حضرت عثمان سے قصاص نہ لیں آپ کی بیعت نہ کی جائے حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ جلد ۷ صہ ۲۲۹ پر ۳۶ھ ہجری کے واقعات میں ذکر کیا ہے کہ مصر میں بعض لوگوں نے حضرت علی رض کے مقرر کردہ عامل قیس بن سعد کی بیعت سے انکار کر دیا تھا اسی طرح کوفہ میں حضرت علی رض نے عمارہ بن شہاب کو امیر بنا کر بھیجا تو وہاں طلحہ بن خویلہ نے ان سے معارضہ کیا تھا کہ جب تک قاتلین عثمان کو نہ پکڑا جائے حضرت علی کی خلافت تسلیم نہ ہوگی حضرت عمارہ اس پر واپس آ گئے تھے۔ سو مطالبہ قصاص عثمان رض کی بات ہر جگہ پھیلی ہوئی تھی اس کے لیے صرف حضرت معاویہ رض کو مورد الزام بنانا درست نہیں ہے۔

ان دنوں مکہ مکرمہ میں حضرت طلحہ حضرت زبیر حضرت عبداللہ بن عمر یعلی بن امیہ (حاکم یمن) حضرت عبداللہ بن عامر (حاکم بصرہ) پہنچے ہوئے تھے اور بعض امہات المومنین بھی وہاں موجود تھیں۔ وہاں بھی یہی موقف اختیار کیا گیا تھا کہ حضرت عثمان رض کو ظلماً شہید کیا گیا ہے ان کے خون کا بدلہ لینا قیام امن کے لیے ضروری ہے اور وہاں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ بصرہ پہنچ کر اس پر اجتماع کیا جائے وہ جگہ ان دنوں ایک بڑا فوجی مرکز تھا اور وہاں کسی بغاوت کا اندیشہ نہ تھا علامہ محمود آلوسی لکھتے ہیں کہ انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہ سے بھی گذارش کی آپ بھی اس میں شامل ہوں تاکہ فتنہ اٹھ جائے

والحوا علی امھم رضی اللہ تعالیٰ عنہا ان تکون معھم الیٰ ان ترتفع الفتنہ ویحصل الامن [2]

---

[1] تاریخ خلیفہ جلد ۱ صہ ۱۷۴۔ [2] روح المعانی ۲۲ صہ ۹

(ترجمہ) اور انہوں نے اپنی ماں (حضرت عائشہ جن سے خدا راضی ہو چکا) سے بھی اصراراً کہا کہ وہ ان کے ساتھ وہاں جائیں تاکہ فتنہ اٹھ جائے اور امن عام قائم ہو جائے

سوال: حضرت عائشہ جنگ جمل پر جنگ کے لیے روانہ ہوئی تھیں یا اس سفر کا مقصد وہاں اصلاح احوال کی میٹنگ اور مشورہ تھا جس نے بعد کے ناقابل کنٹرول حالات میں جنگ کی شکل اختیار کر لی۔

جواب۔ حضرت ام المومنین کی وہاں تشریف آوری اصلاح احوال کے جذبہ سے تھی جنگ کے لیے نہ تھی جب آپ وہاں کے لیے روانہ ہوئیں تو آپ نے اللہ رب العزت سے دعا کی تھی:

اللھم انک تعلم انی لا ارید الا الاصلاح فاصلح بینھم [1]

(ترجمہ) اے اللہ تو جانتا ہے کہ میرا یہاں سے جانے کا مقصد اصلاح احوال کے سوا کچھ نہیں سو تو ان لوگوں میں حالات کی بہتری فرما۔

مورخ اسلام حافظ شمس الدین الذھبی لکھتے ہیں۔

انما خرجت بقصد الاصلاح بین المسلمین [2]

حضرت ام المومنین کے بھانجے حضرت عبداللہ بن الزبیر اس سفر میں حضرت ام المومنین کے ساتھ تھے اور رستے میں نماز کی امامت آپ ہی کراتے تھے ان دنوں بصرہ کے حاکم حضرت علی کی طرف سے عثمان بن حنیف رض تھے حضرت علی ان دنوں بصرہ میں نہ تھے آپ وہاں بعد میں پہنچے بصرہ کے قبائل بنو ضبہ اور ہوازن کو صورت حال سے پوری واقفیت نہ تھی مختلف اثرات کے تحت یہ لوگ آپس میں بھی مختلف رائے ہو چکے تھے۔ وہاں منافقوں نے یہ پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ حضرت ام المومنین جنگ کے ارادہ سے یہاں آئی ہیں حضرت عمار بن یاسر نے ایک شخص کو حضرت ام المومنین کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے پایا تو فرمایا اسکت مقبوحاً منبوحاً واللہ انھا الزوجۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الدنیا والاخرۃ [3]

پھر یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت ام المومنین رض نے حضرت علی کو پیغام بھجوایا کہ آپ یہاں اصلاح احوال کے لیے آئی ہیں حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

وارسلت عائشۃ الیٰ علی تعلمہ انھا جاءت للصلح ففرح ھولاء و ھولاء [4]

---

[1] کتاب الثقات لابن حبان جلد ۲ صہ ۲۸۰ [2] المنتقیٰ صہ ۲۲۲ [3] المصنف جلد ۱۵ صہ ۲۶۴ ۔ [4] البدایہ والنہایہ جلد ۷ صہ ۲۳۷

(ترجمہ) اور حضرت عائشہؓ نے حضرت علیؓ کی طرف کسی شخص کو اطلاع کے لیے بھیجا کہ آپ لوگوں میں صلح کے ارادہ سے آئی ہیں اس اطلاع سے دونوں طرف کے لوگ خوش ہوئے [1]

سوال :۔ حضرت علی بیعت خلافت لینے کے بعد جب بصرہ گئے تو کیا وہ وہاں حضرت طلحہ و زبیر سے جنگ کے ارادہ سے آئے تھے یا وہ بھی صلح کی فضا چاہتے تھے وہاں جو لوگ صلح کے حق میں تھے حضرت علی ان کے ساتھ تھے یا آپ لڑانے والوں کے ساتھ تھے

جواب :۔ پہلے جب قعقاع بن عمرو تمیمی صحابی رسول حضرت علی کی طرف سے حضرت ام المومنین کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور آپ سے استفسار کیا تھا :۔

ای امہ ما اشخصک وما اقدمک ھٰذہ البلدۃ

(ترجمہ) اے ماں یہاں آپ کو کس بات نے آگے کیا اور آپ یہاں کس لیے تشریف لائی ہیں ؟

تو حضرت ام المومنین نے کہا ای بنی اصلاح بین الناس اے بیٹا میں لوگوں میں اصلاح احوال کے لیے نکلی ہوں جب انہوں نے حضرت علی کو حضرت طلحہ و زبیر اور ام المومنین کے اس جواب کی خبر دی تو آپ کو یہ جواب بہت پسند آیا مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہیں یہ جواب اچھا نہ لگا حضرت علی ان لوگوں کے ساتھ تھے جنہیں اس وقت پہلی بات پسند آئی حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں :۔

فرجع الیٰ علی فاخبرہ فاعجبہ ذلک واشرف القوم علی الصلح ۔ کرہ ذلک من کرھہ ورضیہ من رضیہ [2]

(ترجمہ) جب حضرت قعقاع حضرت علی کے پاس آئے اور انہیں صورت حال کی خبر دی تو آپ اس سے بہت خوش ہوئے اور لوگ صلح پر تیار ہو گئے لیکن ایسے بھی تھے جنہوں نے اس صلح پسندی کو ناپسند کیا اور ایسے بھی تھے جو اس بات سے راضی تھے (اسے پسند کرنے والے تھے) ۔

ان لوگوں کی ناراضگی سے آپ (حضرت علی) سمجھ گئے کہ یہی لوگ ہیں جو حضرت عثمان کے خلاف اٹھے تھے سو حضرت علی نے ارادہ کیا کہ قیام ان بزرگوں کے قریب رکھیں (جہاں حضرت ام المومنین اتری ہوئی ہیں) تاکہ بات چیت میں آسانی ہو آپ نے اعلان فرمایا کہ آپ کل وہاں روانہ ہوں گے اور آپ نے یہ اعلان بھی کیا کہ جو شخص

[1] روح المعانی جلد ۲۲ صہ ۱۰ [2] البدایہ والنہایہ جلد ۷ صہ ۲۳۷۔

بھی حضرت عثمان کے خلاف کسی درجہ میں ملوث رہا ہو وہ ہمارے ساتھ نہ آئے آپ نے فرمایا :۔

الا وانی راحل غداً فارتحلوا ولا یرتحلن غداً احدٌ اعان علیٰ عثمان بشئی فی شئی من امور الناس ۔ [1]

(ترجمہ) خبردار میں صبح (اس دوسری جگہ) روانہ ہونے والا ہوں تم بھی وہیں چلو اور وہ شخص ہرگز (ہمارے ساتھ) نہ آئے جس نے کسی درجہ میں بھی حضرت عثمان کے خلاف ان لوگوں کی مدد کی ہو ۔

اس تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت علی جنگ کے ارادہ سے بصرہ نہ آئے تھے یہ سبائی منافق تھے جنہوں نے مجلس صلح کو جنگ جمل میں بدل کر رکھ دیا اور مسلمانوں کو آپس میں لڑا دیا ۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون ۔

اس اعلان سے یہ سبائی مفسدین حضرت علی کے بھی خلاف ہو گئے اور آپ کو شہید کرنے کا فیصلہ کر لیا مگر جسے خدا رکھے اسے کون چکھے حضرت علامہ عبدالوہاب شعرانی لکھتے ہیں :۔

فان بعضھم کان عزم علی الخروج علی الامام علیؓ وعلیٰ قتلہ لما نادی یوم الجمل بان یخرج عنہ قتلۃ عثمان [2]

(ترجمہ) ان میں سے بعض نے امام وقت حضرت علی پر خروج کرنے اور آپ کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا یہ اس وقت ہوا جب آپ نے یوم الجمل پر اعلان فرمایا کہ عثمان کے قاتل ان کے ساتھ نہ رہیں یہاں سے نکل جائیں ۔

افسوس کہ یہ لوگ پھر زبردستی وہاں خروج کر آئے اور رات کی تاریکی میں دفعۃً جنگ شروع کرنے کا اعلان کر دیا علامہ قرطبی (۶۷۱ھ) لکھتے ہیں :۔

ثم اتفقت آراءھم علی ان یفترقوا فریقین ویبدؤا بالحرب سحرۃ فی العسکرین وتختلف السھام بینھم ویصیح الفریق الذی فی عسکر علی غدر طلحۃ و الزبیر والفریق الذی فی عسکر طلحۃ والزبیر غدر علی ۔ فتم لھم ذلک ما علی ما دبروہ [3]

[1] الفتنۃ و وقعۃ الجمل صہ ۱۴۷ تالیف سیف بن عمر والضبی [2] کتاب الیواقیت والجواہر جلد ۲ صہ ۷۷
[3] تفسیر احکام القرآن جلد ۱۶ صہ ۳۱۸ الحجرات ۔

(ترجمہ) وہ (مفسدین) اس بات پر متفق ہوگئے کہ آپس میں دو فریقوں میں بٹ جایں اور صبح دونوں طرف کے لوگوں میں جنگ کی صورت حال پیدا کریں اور آپس میں تیر زنی شروع ہوجائے اور ان کے (ان مفسدین کے) جو لوگ حضرت علی کے ساتھیوں میں ہوں وہ پکار کر کہیں "طلحہ اور زبیر نے عہد توڑ دیا ہے" اور انکا دوسرا گروہ جو طلحہ اور زبیر کے ساتھیوں میں داخل ہوا ہو وہ پکارے "علی نے غدر کیا ہے" سو انہوں نے جو سوچا تھا وہ ہو کر رہا۔ ان کی بات پوری ہوئی۔

مورخ اسلام علامہ ذہبی (۷۴۸ھ) بھی لکھتے ہیں:-

وقع القتال بغتة فانهم تعاتبوا وا تفقوا هم وعلى على المصلحة واقامة الحد على قتلة عثمان فتواطت القتلة على اقامة الفتنة اذا كما اقاموها اولاً [1]

(ترجمہ) جنگ اچانک واقع ہوگئی کیوں کہ فریقین (حضرت طلحہ و زبیر اور ان کے ساتھی) اور حضرت علی سب اصلاح و احوال اور قاتلین عثمان سے قصاص لینے پر متفق تھے سو یہیں قاتلین عثمان فتنہ پیدا کرنے کے لیے جم گئے جیسا کہ انہوں نے پہلے (حضرت عثمان کے خلاف شہید کرنے کا) فتنہ پیدا کیا تھا

قاضی صدر الدین شرح عقیدہ طحاویہ میں لکھتے ہیں:-

فجرت فتنة الجمل على غير اختيار من على ولا من طلحة والزبير وانما اثارها المفسدون بغير اختيار السابقين [2]

(ترجمہ) سو جنگ جمل حضرت علیؓ کے اذن و اختیار کے بغیر واقع ہوئی اور اسی طرح حضرت طلحہ اور حضرت زبیرؓ نے اس کا ارادہ نہ کیا تھا جنگ کی آگ مفسدوں نے (جو حضرت عثمان کو شہید کرنے والے تھے) بھڑکائی تھی بغیر اس کے کہ پہلے لوگوں نے اس کا ارادہ کیا ہو۔

مزید تحقیق کے لیے علامہ ابن حزم (۴۵۶ھ) کی کتاب الاحکام جلد ۲ صہ ۲۰۴ امام ابن تیمیہؒ (۷۲۸ھ) کی منہاج السنہ جلد ۳ صہ ۲۴۱ ۔ حافظ ابن کثیر (۷۷۴ھ) کی البدایہ والنہایہ جلد ۷ صہ ۲۳۹ اور علامہ محمود آلوسی (۱۲۷۰ھ) کی تفسیر روح المعانی پ ۲۲ صہ ۱۰ کی مراجعت فرمایں۔

اگر یہ جنگ بغیر اختیار و تعین اور اندھا دھند نہ لڑی گئی ہوتی تو حضرت طلحہ کے قاتلوں میں مروان بن حکم کا

---

[1] المنتقیٰ صہ ۴۰۴ [2] شرح عقیدہ طحاویہ صہ ۴۳۱ ۔

نام کیوں آتا وہ تو بالاتفاق فریقین حضرت عثمان کے خیر خواہوں میں تھا وہ حضرت طلحہ پر کیسے حملہ آور ہوسکتا تھا!

سو یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ سیدنا حضرت علیؓ بصرہ میں جنگ کے لیے ہرگز نہ آئے تھے ان کے مذکورہ ارشادات پر نظر رکھیں اور ان کی شان میں کوئی بدگمانی نہ کریں۔

سوال حضرت عثمانؓ پر جن لوگوں نے چڑھائی کی اور انہیں شہید کیا ان میں کیا کوئی صحابی شامل ہوا کیا حضرت علی ان میں شامل تھے کیا یہ درست ہے! یا آپ پر یہ ایک تہمت ہے؟

جواب حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ لکھتے ہیں ان میں کوئی صحابی نہ تھا نہ کوئی ان میں صحابہ کے تابعین میں سے تھا آپ لکھتے ہیں

قومے از مصریاں کہ نہ از صحابہ بودند و نہ از تابعین لہم باحسان بلکہ لقلت تدین موصوف و بہ نہاد ی معروف . . . . بر ذوالنورین تضییق نمودند [1]

۱۔ محدث جلیل امام نووی (۶۷۶ھ) لکھتے ہیں:-

ولم يشارك فى قتله احد من الصحابة [2]

۲۔ علامہ ابو الشکور سالمی رقمطراز ہیں:-

ولم يكن معهم من الصحابة احد فنقبوا جداره و دخلوا عليه وقتلوه مظلوماً [3]

۳۔ علامہ ابن کثیر (۷۷۴ھ) بھی لکھتے ہیں:-

وليس فيه احد من الصحابة [4]

۴۔ قاضی ابوبکر ابن العربی (۵۴۳ھ) بھی رقمطراز ہیں:-

ان احد من الصحابة لم يسع عليه ولا قعد عنه

حضرت علی ان میں ہرگز شامل نہ تھے آپ نے بارہا خون عثمان سے لاتعلقی کا اظہار فرمایا ہے حضرت امیر معاویہؓ کی یہ رائے صحیح نہ تھی کہ حضرت علی جان بوجھ کر حضرت عثمان کے قاتلوں کو نہیں پکڑتے جن لوگوں نے عمرو بن الحمق جیسے لوگوں کو اس قتل میں شریک ٹھہرایا ہے ان کی یہ روایات قاطبۃً غلط ہیں ان میں کوئی روایت بھی سنداً صحیح نہیں۔

---

[1] قرۃ العینین صہ ۱۴۳ ۔ [2] شرح صحیح مسلم جلد ۲ صہ ۱۴۳ [3] کتاب التمہید صہ ۲۴۴ [4] البدایہ والنہایہ جلد ۷ صہ ۱۸۵ [5] العواصم من القواصم صہ ۱۳۶ طبع لاہور۔

ابن میثم بحرانی بھی لکھتے ہیں

انه لزم بیته وانعزل عنه بعد ان دافع عنه طویلاً بیده ولسانه فلم یمکن الدفع [1]

(ترجمہ) آپ پھر اپنے گھر آ کر بیٹھ گئے اور آپ سے بعد اس کے کافی عرصہ تک ہاتھ اور زبان سے آپ کی مدافعت کرتے رہے کنارہ کش ہو بیٹھے حملہ آوروں کو روکنا اب آپ کے بس میں نہ تھا۔

سوال کیا یہ صحیح ہے کہ یہود کے ایجنٹ جو مسلمانوں میں تفریق پیدا کر کے خلافت راشدہ کو پامال کرنا چاہتے تھے انہوں نے اکابر صحابہ حضرت علی، حضرت طلحہ حضرت زبیر وغیرہم کے نام سے کچھ جعلی خطوط اطراف میں لکھے تھے جو حضرت عثمان کے خلاف تھے اور اس طرح ان اکابر کو آپس میں بدگمان کرنے کی سعی کی گئی تھی۔

جواب۔ ہاں اس قسم کے جعلی خطوط ان دنوں پکڑے گئے تھے حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:۔

و ذورت کتب علی لسان الصحابة الذین بالمدینة وعلی لسان علی وطلحة والزبیر یدعون الناس الی قتال عثمان ونصر الدین وانه اکبر الجهاد الیوم [2]

(ترجمہ) اور یہ صحابہ جو مدینہ میں موجود تھے ان کے نام سے اور علیؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ کے نام سے خطوط گھڑے گئے ان میں یہ مفسدین لوگوں کو حضرت عثمان کے خلاف اکساتے تھے اسے دین کی نصرت کہتے اور کہتے اس وقت یہ سب سے بڑا جہاد ہے۔

اور آگے جا کر لکھتے ہیں۔ هذا کذب علی الصحابة وانما کتبت کتب مزورة علیهم ص۱۷۵

سو یہ صحابہ پر صریح جھوٹ ہے کہ وہ حضرت عثمان کے خلاف یہ بغاوت پیدا کر رہے تھے۔

اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہ کے خلاف باتیں گھڑی گئیں علامہ محمود آلوسی لکھتے ہیں:۔

کذب لا اصل له وهو من مفتریات ابن قتیبة وابن اعثم الکوفی والسمیساطی وکانوا مشهورین بالکذب والافتراء [3]

(ترجمہ) یہ سب جھوٹ ہے جسکی کوئی اصل نہیں یہ ابن قتیبہ، ابن اعثم اور سمیساطی جو مشہور کذاب و مفتری تھے ان کی گھڑی ہوئی باتیں ہیں۔

---

[1] شرح نہج البلاغۃ جلد۴ ص۳۵۴ [2] البدایہ جلد۷ ص۱۷۵ [3] تفسیر روح المعانی ۲۲ ص۱۱۔

سوال: بندہ ہفت روزہ "دعوت" کا خریدار ہے اور میرا خریداری نمبر ۱۹۲ ہے۔ ایک سوال کا جواب دعوت میں شائع فرمائیں۔ یہاں کے شیعہ حضرات ظہر اور عصر ملا کر پڑھتے ہیں اور اسی طرح مغرب اور عشاء ملا لیتے ہیں حالانکہ ابھی عشاء کا وقت نہیں ہوتا میں نے ان سے پوچھا تو وہ کہنے لگے۔ اہل سنت کی کتابوں میں بیسیوں حوالے ایسے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کبھی دو نمازیں ملا کر پڑھی ہیں اس کی وضاحت فرمائیں؟

سائل۔ محمد بخش فاروقی از رجوعہ سادات تحصیل چنیوٹ

جواب: قرآن عزیز کا ارشاد ہے:۔

ان الصلوٰة کانت علی المؤمنین کتاباً موقوتاً۔ (پ ۵ سورۃ النساء آیت ۱۰۳)

ترجمہ۔ نماز مومنوں پر بہ قید وقت فرض کی گئی ہے۔

پس کوئی ایسی روایت جس میں کسی نماز کے اس کا وقت ہونے سے پہلے ادا کرنے کا بیان ہو۔ قرآن عزیز کے اس واضح فیصلے کی معارض ہو گی اور ظاہر ہے کہ اس کا اعتبار نہیں ہو سکتا یا اس کی سند میں کوئی خلل ہو گا۔ یا اس کی قبل از وقت پر اس کی دلالت قطعی نہ ہو گی۔

یہ حضرات جن احادیث سے نمازیں جمع کرنے پر استدلال کرتے ہیں ان میں اس امر کی صراحت نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی نماز اس کا حقیقی وقت آنے سے پہلے ادا کی ہو۔ بلکہ ان روایات کا حاصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ظہر کو اس کے آخر وقت میں اور عصر اپنے اول وقت میں ادا فرماتے اور اس طرح مغرب کبھی اس کے اخیر وقت میں اور عشاء اپنے اول وقت میں ادا فرماتے۔ اس طرح نماز دو کا جمع کرنا جمع حقیقی نہیں بلکہ جمع صوری ہے۔ کیونکہ ہر نماز اپنے اپنے وقت میں ادا ہوتی ہے۔ کوئی اپنے آخری وقت میں اور کوئی اپنے اول وقت میں۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں:۔

کان رسول الله صلی الله علیه وسلم فی السفر یؤخر الظهر ویقدم العصر ویؤخر المغرب ویقدم العشاء۔ [1]

ترجمہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں بھی ظہر کو مؤخر اور عصر کو مقدم فرما لیتے اور اسی طرح کبھی مغرب کو مؤخر اور عشاء کو مقدم کر لیتے۔

اگر اس تدبیر کے بغیر کوئی اور صورت جمع بھی جائز ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ تکلف ہرگز اختیار نہ فرماتے۔ پس مسئلہ یہی ہے کہ ہر نماز صرف اپنے ہی وقت میں ادا ہو سکتی ہے۔ الا یہ کہ جمع صوری ہو جائے کہ ایک نماز اپنے وقت میں اور دوسری اپنے اول وقت میں ادا ہو جائے اور ظاہر ہے یہ جمع حقیقی نہیں۔

خالد محمود عفا اللہ عنہ

---

[1] اس حدیث کو امام طحاوی، امام احمد اور امام حاکم نے روایت کیا ہے اور اس کی سند حسن ہے۔

سوال : ایک ہفت روزہ اخبار نے ۲ جون کی اشاعت میں غالباً آپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ آپ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو بھی قتل عثمان رضی اللہ عنہ کا ذمہ دار بلکہ حصہ دار گردانتے ہیں۔ ص۵ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بھی اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ ان امور کی تفصیل فرمائیں؟

سائل۔ اویس احمد شبلی از کرشن نگر لاہور

جواب : راقم الحروف اہل سنت والجماعت عقائد کا پابند اور فروعی مسائل میں حضرت امام اعظم رحمہ اللہ کے مسلک پر ہے میرا مسلک کوئی نیا یا آوارہ مسلک نہیں کہ کسی کو میرے خود ساختہ مسائل یا میری اختیار کردہ نئی نئی تاویلات کسی تجسس اور بحث پر آمادہ کریں۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے متعلق میرا وہی عقیدہ ہے جو اکابر امت، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ، حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ، حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ اور جمہور علمائے اہلسنت کا ہے اور میرے اس پر متصلب ہونے کی شہادت دار العلوم دیوبند سے لے کر جامعہ اشرفیہ لاہور تک سے مل سکتی ہے۔ ناموس صحابہ رضی اللہ عنہم کے موضوعات جو شیعہ کے اٹھائے ہوئے ہیں ان میں بریلوی مسلک کے علماء و مشائخ کی بھی مجھے پوری تائید حاصل رہی ہے اور احقر نے بارہا ان مسائل پر صاحبزادہ قمر الدین صاحب سجادہ نشین سیال شریف اور کئی دوسرے مشائخ و سجادہ نشینان کی صدارتوں میں اپنے خیالات اور تحقیقات کا اظہار کیا ہے اور اب بھی کئی دفعہ ان جیسے حضرات کی طرف سے دعوت ہوتی ہے کہ احقر ان کے علاقوں میں حاضر ہو کر مسلک اہل سنت کی تائید اور اثبات میں کوئی علمی اور مسلکی خدمت کرے۔ احقر مغربی پاکستان کے اس سنی بورڈ کا بھی ایک رکن رہا ہے جس کے دوسرے ارکان شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری رحمہ اللہ حضرت مولانا ابو الحسنات، حضرت مولانا السید محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ، حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی رحمہ اللہ وغیرہم کئی بزرگ تھے۔ نہایت تعجب ہے کہ معاصر موصوف نے یہ سوال ایک ایسے شخص کے متعلق اٹھایا ہے جس کی مسلکی حیثیت پاکستان اور ہندوستان کے علمی حلقوں میں اپنی جگہ پوری معین ہے اور جس کے موقف پر بیرونی ممالک کے لاکھوں افراد بھی پورا اعتماد رکھتے ہیں۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ خلافت راشدہ کے خلیفہ راشد تھے۔ امام مظلوم امیر المومنین حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے خون سے بالکل بری اور پاک تھے اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں زیادہ صائب تھے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بھی کسی خطائے اجتہادی پر رب العزت کے ہاں مثاب و ماجور ہوں۔ مگر احقر اپنے بزرگوں کی اتباع میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہی خلیفہ برحق مانتا ہے۔ میں اب ہی اس عقیدہ کی صراحت نہیں کر رہا میری برسوں پہلے کی بعض تصنیفات میں بھی اس امر کی پوری صراحت موجود ہے کہ سیدنا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا دامن

حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے خون سے بالکل بری اور پاک تھا۔ باقی یہ بات کہ احقر نے پچھلے دنوں لاہور میں کسی تقریر میں کہا ہے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا حضرت سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہ تھا۔ تو یہ ایک کذب اور سراسر جھوٹ ہے۔ پچھلے دنوں کی بات تو درکنار احقر جب سے لاہور میں اقامت پذیر ہے اس موضوع پر کبھی میری تقریر نہیں ہوئی۔ فلعنة الله على الكاذبين۔ اگر کوئی شخص پچھلے پانچ سال سے اس بات کی کوئی جھوٹی رپورٹ بھی دکھا دے تو احقر پھر اس کی پوری وضاحت کر سکے گا۔ اور اگر یہ سالہا سال کے پرانے غلط الزامات اور شیعہ حضرات کے جھوٹے بہتانات ہیں جن کی پوری تردید خود اسی دور میں کر دی گئی تھی۔ تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ معاصر موصوف شیعہ رضا کار جیسے شیعہ جرائد کی زلہ ربائی کیوں کر رہے ہیں۔ یہ محض آپ کے استفسار کا جواب تھا۔ ورنہ ان باتوں میں الجھنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال : جناب رسول کریم علیہ السلام نے جب حضرت سیدہ اور حضرات حسنین کریمین کو ایک چادر میں لے کر ان بزرگوں پر مع سیدنا مولا علی رضی اللہ عنہ کے آیت تطہیر پڑھی تھی تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا تھا، یا رسول اللہ! کیا میں اہلبیت میں سے نہیں۔ اس کے جواب میں حضور نے کیا فرمایا تھا؟ شیعہ علماء کہتے ہیں کہ حضور نے صرف یہ کہا تھا کہ تو بھی اچھے مقام پر ہے انك على خير لیکن یہ نہیں کہا تھا کہ تو بھی اہل بیت میں داخل ہے۔ اس کی تحقیق مطلوب ہے؟

سائل۔ عبدالغفار از ڈیرہ غازی خاں

جواب : آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو صرف اتنا ہی نہ کہا تھا کہ انك على خير کہ تو بھی اچھے مقام پر ہے۔ بلکہ ان کے اس سوال پر ألست من اهلك؟ (کیا میں آپ کے اہلبیت میں سے نہیں) ارشاد فرمایا تھا بلی،، (کیوں نہیں؟) یعنی ہاں تو بھی میرے اہلبیت میں سے ہے اہل سنت کی کتابوں میں سے مسند امام احمد میں یہ روایت موجود ہے اور اہل تشیع کے ہاں بحار الانوار جلد ۱۰ ص۲۷۹ پر یہ روایت ملتی ہے اور حضرات امہات المومنین کا اہل بیت نبوی میں سے ہونا صرف اس ایک روایت پر موقوف نہیں۔ خود قرآن پاک اپنی اعجازی ترتیب سے ان کے اہل بیت ہونے پر نص فرما رہا ہے۔ سورۃ احزاب پ۲۲ کے شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کا ذکر ہے اور اس کے ساتھ ہی رب العزت نے آیت تطہیر اتاری ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں۔ انما یرید الله لیذهب عنكم الرجس اهل البيت ويطهركم تطهيرا۔ یہ آیت اپنے سیاق و سباق سے اس امر پر نص کر رہی ہے کہ یہاں اہلبیت سے مراد ازواج مطہرات ہی ہیں تذکیر کے صیغے لفظ اہل کی رعایت سے ہیں یہ لفظ عربی میں مذکر آتا ہے اور اس پر قرآن پاک کی اور بھی بہت

سی آیات شاہد ہیں۔ علاوہ ازیں بعض ایسے مقامات بھی ہوتے ہیں جہاں صیغہ تذکیر کسی اشتباہ کا موجب نہیں۔
کما قال الحماسی ؎

فلا تحسبی انی تخشعت بعدھم لشیءٍ ولا انّی من الموت افرق

فلا تحسبی کا مخاطب یقینی طور پر مؤنث ہے اور بعد کہ میں بھی وہی مخاطب ہے اور ضمیر مذکر ہے۔
واللہ اعلم بالصواب۔ کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال : جب امیر المؤمنین حضرت عثمانؓ خلیفہ منتخب ہوئے تو کیا حضرت علیؓ نے ان کی بیعت کی تھی۔ اس کا حوالہ درکار ہے ؟ سائل سعید الرحمٰن از سرگودھا

جواب : یہ امر تحقیق شدہ اور ایک حقیقتِ مسلّمہ ہے کہ سیدنا حضرت علی المرتضیٰؓ نے امیر المؤمنین سیدنا حضرت عثمانؓ کی باقاعدہ بیعت فرمائی تھی۔ اہل سنت اور اہل تشیع سب اس بیعت کا اقرار کرتے ہیں۔ البتہ شیعہ حضرات اس کی یہ تشریح کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے یہ بیعت ڈرتے ہوئے کی تھی اور انہیں دوسرے صحابہ کرامؓ نے بہت سی دھمکیاں دے کر حضرت عثمانؓ کی بیعت کرنے پر مجبور کیا تھا۔ لیکن اس توجیہ سے جو فاتحِ خیبر کی شان کے یقیناً لائق نہیں۔ وجودِ بیعت کا اقرار بہر صورت لازم آتا ہے۔ مجلسی دوم نہایت صراحت سے اس بیعت کا اقرار کرتا ہے :۔

"چوں حضرت ایں تہدید را شنید برگشت و بیعت کرد"[1] واللہ اعلم بحقیقۃ الحال

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال : تنظیم اہل سنت کرشن نگر نے ۱۲ اپریل کو جامع مسجد دیانند روڈ میں "یوم معاویہؓ" منایا تھا۔ اس پر بعض حضرات نے یہ سوال پیدا کیا ہے کہ اس طرح یوم منانا کس طرح جائز ہے کیا یہ بدعت نہیں۔ اگر ہے تو پھر یوم معاویہؓ کیوں منایا گیا؟ اس کی تشریح فرمائیں ؟ سائل محمد عبد اللہ ایم اے شیخوپورہ

جواب : دن منانے کے بدعت ہونے کا سوال یوم معاویہؓ سے ہی متعلق نہیں۔ بلکہ سوال یوم صدیقؓ اور یوم فاروقؓ کے متعلق بھی بعینہٖ وارد ہوتا ہے۔ اس سوال کی روح دبے انداز میں یوم صدیقؓ اور یوم فاروقؓ اور ہر ایسے عنوان کے خلاف بھی مصروفِ پیکار ہے۔ نہایت تعجب ہے کہ جن حلقوں میں بیسیوں دفعہ یوم صدیقؓ، یوم فاروقؓ اور یوم ذوالنورینؓ وغیرہ منائے جا چکے ہوں اور جس ملک میں ہر سال یوم اقبال بڑے تزک و وقار

[1] حق الیقین ص۱۵۶ مطبوعہ لکھنؤ و ص۲۵۶ مطبوعہ ایران

سے منایا جاتا ہو۔ وہاں یوم معاویہؓ کے موقع پر اس کے بدعت اور عدم بدعت کی بحث چھیڑی جائے۔ سوال مسئلے سے نہیں تخصیص سے ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ معترض حضرات کی اصل ناراضگی اس یوم کے شرعی یا انتظامی تعیّن سے نہیں بلکہ اس کی بنا، سیدنا حضرت امیر معاویہؓ سے وہ پرانا بغض ہے جسے ہمارے ائمہ اعلام اور اسلافِ کرام ایک بدعت شمار کرتے آئے ہیں۔ حضرت امیر معاویہؓ کا احترام مسلکِ اہلسنت ہے اور ان سے کسی قسم کا بغض یہ خود ایک بدعت ہے بمقامِ حیرت ہے کہ وہ لوگ جو خود اس داغِ بدعت سے داغ دار ہیں سنت کے عقیدے پر نہیں رہے۔ سیدنا حضرت امیر معاویہؓ کے خلاف دائرہ اہل سنت میں کسی قسم کی مجال گنجائش نہ پا کر اب یوم معاویہؓ کی شرعی حیثیت کو زیرِ بحث لا رہے ہیں۔ یاد رکھیئے کہ کسی بزرگ کے یوم پیدائش یا وفات کے تعیّن کے بغیر جو یوم منایا جائے اور پھر اس یوم کا بھی سالانہ التزام نہ کیا جائے۔ بلکہ کبھی کسی موقع پر اور کبھی کسی موقع پر یہ تبلیغی تقریب منعقد ہو جائے ہر سال ایک ہی تاریخ پر نہ ہو تو اس طرح یوم منانے کو بدعت نہیں کہا جا سکتا۔ یہاں یوم کا تعیّن محض ایک انتظامی امر ہے کوئی شرعی معاملہ نہیں اور یوم کا معنی یہاں صرف یہ ہے کہ پورا دن اس بزرگ کے کمالات و محامد اور فضائل و خدمات کے بیان کے لیے ہے اور بلا التزام تاریخ یہ اس دن کا ایک انتظامی پروگرام ہے۔ اس طرح کی "یوم کی تقریبات" اس بدعت کے ذیل میں نہیں آتیں جس سے ہمارے بزرگوں نے روکا ہے۔ ہاں احتیاط یہ ہے کہ اسے یوم کی بجائے یاد سے موسوم کر لیا جائے۔ جیسے یادِ معاویہؓ میں جلسہ لیکن حکومت کی مشینری اور نظام تعطیلات میں اسے یوم کے بغیر جگہ نہ دی جا سکے گی۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ یوم کے نام سے یادِ رفتگان منانا سلف صالحین سے نہیں ملتا اور جو ان کے نزدیک دین نہ تھا وہ آج بھی دین نہیں بن سکتا۔

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال : سات آدمیوں نے گائے کی قربانی میں حصہ ڈالا۔ ان میں سے ایک بریلوی عقیدے کا ہے۔ کیا اس کی شمولیت سے باقی چھ کی قربانی ادا ہو گئی؟ سائل محمد یٰسین غریب امام مسجد محمدی کاٹن ملز نوری گیٹ سرگودھا

جواب : وہ قربانی ادا ہو گئی۔ ہاں اگر کچھ حصہ داروں کی گمراہی کفر کے درجے تک پہنچی ہوئی ہو تو ان کی شمولیت سے قربانی کسی ایک کی بھی ادا نہ ہو گی۔ ہمارے اکابر کی تحقیق کے مطابق عام بریلویوں پر حکم کفر نہیں اور دار العلوم دیوبند نے انہیں ہرگز کافر قرار نہیں دیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے ہر جگہ حاضر و ناظر ہونے کا عقیدہ کفر ہے۔ لیکن جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ بریلوی حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بالوجود الموجود حاضر و ناظر نہیں کہتے۔ بلکہ اس میں تاویل کرتے ہیں اور حاضر بالعلم وغیرہ کی توجیہات کرتے ہیں۔ یہ امر دیگر ہے کہ ان کی یہ تاویل ہمارے نزدیک معتبر نہ ہو۔ لیکن اس تاویل سے وہ اس حکم کفر کے ماتحت نہیں آتے۔

جو فقہائے کرام کے ہاں ملتا ہے اور ان میں بیشتر تو ایسے افراد ہیں جو ایسے کلمات اعتقاداً نہیں محض عناداً کہتے ہیں ہاں ان کے علماء جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ باتیں کہہ جاتے ہیں اور آپ کو ظاہری حقیقی معنوں میں حاضر و ناظر سمجھتے ہیں ان کا حکم دوسرا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت فرمائے۔ حق حقیق یہی ہے کہ عام بریلویوں پر حکم کفر نہیں اور ان کی شمولیت سے باقیوں کی قربانی اکارت نہیں جاتی۔ احتیاط کی کوئی حد نہیں اور احتراز بہر حال اولیٰ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: ایک افسر نے جو شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں اہلسنت کی کتابوں کے مجھے کچھ ایسے حوالے دکھائے ہیں جن میں آیات کی صورت موجودہ قرآن سے ذرا مختلف ہے مثلاً درمنثور جلد ۲ ص۲۹۸ میں، پھر اسی درمنثور جلد ۵ ص۱۹۲ میں آیات کچھ اس طرح درج ہیں کہ ان میں تبدیلی کا شبہ ہوتا ہے۔ کیا ہمارے کچھ بزرگ بھی قرآن مجید میں کمی بیشی کے قائل تھے؟ سائل۔ محمد یعقوب مسلم کتاب گھر چنیوٹ ضلع جھنگ

جواب: قرآن پاک صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے پاک ہاتھوں سے جمع ہوا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اختیار کردہ ترتیب کے مطابق یک جا لکھایا۔ حضرت عمر فاروقؓ اس میں مشیر تھے۔ کاتب وحی حضرت زید بن ثابتؓ نے اسے لکھا۔ حضرت عثمان ذوالنورینؓ نے اس کی نقلیں کرائیں اسے ایک لغت قریش پر جمع کیا اور مختلف بلاد اسلامیہ میں اس کی نقول بھجوائیں۔ اب مقام غور ہے کہ اہل سنت و الجماعت جو جمیع صحابہ کرامؓ کو بالعموم اور ان صف اول کے صحابہؓ کو بالخصوص ہر اعتبار سے اپنا مقتدا، پیشوا اور امام سمجھتے ہیں انہیں اس قرآن میں کیسے شک ہو سکتا ہے؟ ہاں اگر صحابہؓ کی مقدس جماعت پر اعتماد نہ ہوتا (معاذ اللہ) تو پھر اس قرآن عزیز میں البتہ شک کی بہت راہیں نکل سکتی تھیں۔ آپ کے اس دوست نے آپ کو جو حوالے دکھائے ہیں وہ اہل سنت کی معتمد اور معتبر کتابوں میں سے نہیں۔ بلکہ طبقہ رابعہ کی ان کتابوں میں سے ہیں جو اپنے مصنفین کے نزدیک بھی منقح اور تحقیق شدہ درجے کی نہ تھیں۔ علامہ سیوطیؒ نے درمنثور میں ہر طرح کی صحیح و سقیم اور رطب و یابس روایات جمع کر رکھی ہیں جن میں شیعہ راویوں کی بھی کچھ نقول درج ہیں۔ علامہ سیوطیؒ نے ان کا تنقیدی محاسبہ نہیں کیا۔ صرف ذخیرہ جمع کر دیا ہے اور تحقیق و تنقیح پڑھنے والوں کے ذمہ لگائی ہے۔ وہ اسے درمنثور سے موسوم کرتے ہیں جس کے معنی ہیں "بکھرے ہوئے موتی"۔ پس جب کہ یہ حوالے مصنف کے اپنے نزدیک بھی ایک تحقیق شدہ درجے میں نہیں بلکہ منتشر اور متفرق روایات کا ایک ذخیرہ ہیں تو ان پر اعتماد کر کے قرآن میں کمی بیشی کا قول کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان سے امام سیوطیؒ کے اپنے اعتقاد کے متعلق کسی قسم کے شک کو جگہ دی جا سکتی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے "قرۃ العینین" میں اور حضرت شاہ عبد العزیزؒ

محدث دہلویؒ نے "عجالہ نافعہ" میں امام سیوطی کی ایسی تصانیف پر اس انداز میں تنقید فرمائی ہے۔ علاوہ ازیں امام سیوطیؒ اکثر ایسی غیر معتبر روایات کی سند پیش کر دیتے ہیں جس سے اتنی ذمہ داری علامہ سیوطیؒ پر عائد نہیں ہوتی جتنی خود ان راویوں پر عائد ہوتی ہے جو اسے روایت کر رہے ہوتے ہیں۔ آپ نے جس قسم کے حوالے پیش کیے ہیں شیعہ راویوں کی اپنی اختراع ہیں اور علامہ سیوطیؒ نے انہیں کذاب اور وضاع قسم کے راویوں کے حوالہ سے ہی پیش کیا ہے۔ پس اس سے علامہ سیوطیؒ پر یا مذہب اہل سنت پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا یا ایسے حوالوں میں کچھ ایسے جملے ملحق ہوتے ہیں جو ہو سکتا ہے کہ منسوخ التلاوۃ اجزاء پر مشتمل ہوں یا بسا اوقات، ہوتا ہے۔ کہ وہ مفسرین کے اپنے تشریحی اقوال اور تفسیری جملے ہوں۔ ان حوالوں کی تحقیق اور پھر ہر ایک کے محل کو پہچاننا اور ہر روایت کو اپنے اپنے محل پر محمول کرنا اس کے لیے پوری علمی شان درکار ہے۔ عوام کو علمی اور اخلاقی اعتبار سے یہ حق قطعاً حاصل نہیں کہ وہ ایسے چند حوالے دیکھ کر خود اپنے ایمان میں ہی تردد کر بیٹھیں اور قرآن کریم میں شک کرنے لگیں۔ واللہ ہو العلیم الحفیظ۔

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: آپ نے یہاں ایک دفعہ تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ملت کو انتشار اور آوارگی سے بچانا اتنا اہم اور ضروری ہے کہ اس کے لیے امر ضروری اور امر واجب کو بھی ترک کرنا پڑے تو شریعت اس کی اجازت دیتی ہے۔ اس کی تحقیق اور اس پر حوالہ درکار ہے۔ تاکہ اس سے پیدا شدہ غلط فہمیوں کا پوری طرح ازالہ ہو سکے؟ سائل منظور احمد آریہ محلہ راولپنڈی۔

جواب: سجدہ سہو ساقط ہونے کی ایک صورت سامنے رکھیئے، نماز میں ترک واجب پر سجدہ سہو لازم آتا ہے۔ اور اسے ادا کرنا واجب ہے۔ مگر ایسی جماعات جن میں مقتدیوں کی تعداد بہت زیادہ ہو۔ آخری صف اور امام میں اتنا زیادہ فاصلہ ہو کہ امام کی حرکات آسانی سے مقتدیوں تک منتقل نہ ہو سکتی ہوں اور اندیشہ ہو کہ شاید امام اور مقتدیوں میں ہم آہنگی نہ رہ سکے تو اس صورت میں سجدہ سہو ساقط ہو جاتا ہے۔ کیونکہ فتنہ اور انتشار کے جو منطقات یہاں ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ فقہائے کرام نے اس آوارگی اور انتشار سے بچنے اور جماعت کو بچانے کی بہت تاکید کی ہے۔ لوگوں میں انتشار کے اندیشے میں وہ سجدہ سہو کو واجب قرار نہیں دیتے۔ یہی متاخرین حنفیہ کا مختار ہے۔ درمختار میں ہے:

والسہو فی صلوٰۃ العید والجمعۃ والمکتوبۃ والتطوع سواء والمختار عند المتاخرین عدمہ فی الاولین لدفع الفتنۃ کما فی جمعۃ البحر

اس سے معلوم ہوا کہ جمعہ اور عید کی نماز میں جب کہ مقتدیوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے اور آخری صف کے نمازیوں سے امام کا اتنا فاصلہ ہو جاتا ہے کہ سجدہ سہو کی صورت میں بہت سے فتنے پیدا ہوتے نظر آتے

ہوں تو ایسی صورت میں اگر واجب ترک بھی ہو جائے یا فرض میں تاخیر ہو جائے تو سجدہ سہو لازم نہیں آتا۔[1] اس سے معلوم ہوا کہ شریعت نے فتنہ و انتشار سے بچنے اور بچانے کو کتنی اہم نظر سے دیکھا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے راولپنڈی میں کیا بیان کیا تھا۔ سوال کی صورت سے ذہن اس طرف گیا ہے کہ اگر کچھ اس سلسلہ میں بیان ہوا ہو گا تو یہی کچھ ہو گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ۔ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: حضرت مولانا اسمٰعیل صاحب شہید حنفی العقیدہ تھے یا غیر مقلد تھے۔ اہلحدیث حضرات انہیں مقلد تسلیم نہیں کرتے تفصیل فرمائیں کہ اس باب میں علمائے دیوبند کا مؤقف کیا ہے؟

سائل عطاء الرحمٰن از خانیوال

جواب: حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ حنفی المذہب عالم ربانی اور بزرگ تھے اور رد بدعات میں بہت زیادہ ساعی تھے۔ ہر دینی کام میں جہاں ذرا بھی خلل دیکھتے تھے اس کا رد فرماتے تھے۔ مسئلہ تقلید میں بھی ہندوستان میں افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے۔ جیسا کہ بعض غیر مقلدین نے تقلید میں تفریط کی اور تقلید کو شرک، مقلدین کو مشرک قرار دیا۔ ائمہ سلف پر طعن و تشنیع کو شیوہ بنا لیا۔ اسی طرح بعض مقلدین نے بھی تقلید میں غلو اور افراط سے کام لیا کہ ائمہ مجتہدین کو چھوڑ کر ہر پیر و فقیر کی تقلید شروع کر دی۔ خواہ اس کا قول و فعل شریعت کے دائرہ میں ہو یا نہ ہو۔ تقویۃ الایمان میں چونکہ تمام رسوم بدعیہ پر رد لکھا گیا ہے اس لیے اس غلو اور افراط فی التقلید کو بھی منع فرمایا گیا ہے اسی کے متعلق یہ فصل لکھی گئی ہے۔ جیسا کہ خود تقویۃ الایمان سے معلوم ہوتا ہے:۔

"سو سننا چاہیئے کہ اکثر لوگ مولویوں اور درویشوں کے کلام اور کام کو سُن کر سند پکڑتے ہیں (الی قولہ) ان مولویوں اور درویشوں کے قول و فعل کے خلاف کوئی آیت اور حدیث پڑے تو اس کا انکار اور اس کے مطلب میں تکرار کرنے کو موجود ہو جائیں۔"

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شہیدؒ مطلقاً تقلید کو منع نہیں فرماتے۔ بلکہ صرف اس غلو اور افراط کو رد کرتے ہیں کہ ائمہ دین مجتہدین سے گزر کر ہر کس و ناکس کی تقلید اختیار کر لی جائے۔ چنانچہ اسی فصل میں ائمہ مجتہدین کی تقلید کی خود ہدایت فرمائی ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"تو ایسی بات پر (یعنی جس میں کوئی نص صریح قرآن و حدیث و اجماع میں موجود نہ ہو) مجتہدوں کے قیاس صحیح کے موافق عمل کرے پر وہ مجتہد بھی ایسا ہو کہ جس کا اجتہاد امت کے اکثر مسلمانوں نے قبول کیا ہو۔ جیسے امام اعظمؒ اور امام شافعیؒ اور امام مالکؒ اور امام احمدؒ الخ" فقط

حضرت مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی جو حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے ہمعصر تھے لکھتے ہیں:۔

[1] منقول از فتاوے دارالعلوم دیوبند جلد ۷، ص۲۷

"مولوی اسمٰعیل صاحب کو ہم نے دیکھا اہل سنت اہل مذہب حنفی و محدث و مفسر تھے"۔[1]

پھر اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"گو اب لوگوں نے مولوی اسمٰعیل صاحب کو نہیں دیکھا۔ پر ہم نے ان کو دیکھا ہے، وہ ایک عالم، مقلد، نیک نیت، باخدا اور شہید تھے۔ وہ ہرگز لامذہب غیر مقلد نہیں تھے"۔

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ ان محدثین دہلویہ کے پورے گھرانے کے متعلق رقمطراز ہیں:۔

بل ھم بیت علم الحنفیۃ۔[2]

"یعنی یہ حضرات دہلویہ حنفیہ مذہب کے علم کا گھر ہیں"۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: کیا حضرت فاطمۃ الزہراؓ باغ فدک مانگنے کے لیے حضرت صدیق اکبرؓ کے پاس تشریف لے گئیں؟ نیز مطلع کریں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے حین حیات باغ فدک حضرت فاطمہؓ کو دے دیا ہوا تھا یا نہیں؟ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اور بھی بیٹیاں تھیں تو صرف انہوں نے کیوں حق وراثت مانگا؟

سائل۔ محمد ممتاز الرحمٰن صدیقی از جامع مسجد سرگودھا۔

جواب: حضرت سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کا باغِ فدک کے لیے تشریف لے جانا کوئی یقینی نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بعض روایات میں آپ کا جانا "جاءت" کے لفظ سے مذکور ہے۔ لیکن بخاری کی بعض دوسری روایات میں لفظ "ارسلت" بھی موجود ہے کہ حضرت سیدہؓ نے کسی دوسرے شخص کو اپنا پیغام دے کر بھیجا تھا۔ بعض راویوں نے اس بھیجنے کو مجازاً جانے سے تعبیر کر دیا ہے۔ حضرت سیدہؓ کا خود جانا ایک امر مشتبہ ہے جس کا دعوے یقینی طور پر نہیں کیا جا سکتا۔ نہ یہ حضرت کی شان کے مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ثانیاً: یہ امر صحیح نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں باغِ فدک حضرت سیدہؓ کو ہبہ کر دیا تھا۔ ہبہ کی تمام روایات اسناداً صحیح نہیں اور بیشتر وضاع و کذاب قسم کے راویوں پر مشتمل ہیں۔ بلکہ سنن ابی داؤد میں ہے کہ حضرت سیدہؓ نے ارضِ فدک کا سوال خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کیا تھا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی کیا تھا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دینے سے انکار کر دیا تھا (دیکھئے سنن ابی داؤد جلد ۲ ص۱۴۵) پس جب کہ حضرت صدیق اکبرؓ کی تمام عملی زندگی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منہاج پر قائم تھی تو یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ حضرت صدیق اکبرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے خلاف باغِ

[1] کشف الحجاب ص۲۳ [2] الحطہ ص۱۰ یہ بحث آگے ص پر بھی ملاحظہ فرمائیں۔

فدک حضرت سیدہؓ کو دے دیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ خود ارشاد فرماتے ہیں :-

انّی واللہ لا اغیر شیاءً من صدقات النبی صلی اللہ علیہ وسلم التی کانت علیہا فی عہد النبی صلی اللہ علیہ وسلم لاعملن فیہا بما عمل فیہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتشہد علیؓ ثم قال انا قد عرفنا یا ابا بکرؓ فضیلتک[1]۔

ترجمہ: خدا کی قسم یہ چیزیں جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھیں میں ان میں کچھ بھی تبدیلی نہ کروں گا اور ان امور میں میرا عمل اسی طریق پہ ہو گا جو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق عمل تھا۔ اس پہ حضرت علی المرتضیٰؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے اس ارشاد کی تصدیق فرمائی اور کہا کہ اے ابوبکرؓ ہم نے آپ کی فضیلتِ شان کو پہچان لیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دوسری بیٹیاں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی فوت ہو چکی تھیں۔ اس لیے ان کے حقِ وراثت یا طلبِ وراثت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر حضورؐ کی دوسری بیٹیاں زندہ ہوتیں تو آپ انہیں دعوتِ مباہلہ کے وقت ساتھ کیوں نہ لے جاتے۔ یہ دعوتِ مباہلہ کا واقعہ حضورؐ کے اواخرِ حیات میں پیش آیا اور اس وقت حضورؐ کی کوئی بیٹی حضرت سیدہؓ کے سوا زندہ نہ تھی۔
اس مسئلے کی مکمل تفصیل کے لیے امامِ پاکستان حضرت مولانا سیّد احمد شاہ صاحب چوکیروی کی کتاب تحقیقِ فدک اپنے موضوع پہ لاجواب ہے آپ اس کا مطالعہ فرمائیں۔ یہ کتاب انشاء اللہ جامع و مانع ہوگی اور تحقیق کے اعتبار سے ہمالا مزید علیہ کا مصداق۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال : مقیاسِ حنفیت میں لکھا ہے کہ مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی کا مولوی غلام دستگیر صاحب قصوری سے بہاولپور میں کوئی مناظرہ ہوا تھا کیا یہ صحیح ہے؟ سائل۔ محمد یٰسین غریب انبالوی از سرگودھا

جواب : مقیاسِ حنفیت ہم نے دیکھی نہیں اور نہ اس کی کبھی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کا مولوی غلام دستگیر صاحب قصوری سے کوئی مناظرہ نہیں ہوا۔ یہ بالکل بے بنیاد بات ہے اس کا بارِ ثبوت اسی کے ذمہ ہے جو اس کا دعوٰے کرے۔ آپ اس سلسلہ میں مقیاسِ حنفیت کے مصنف سے حوالہ مانگیں، حقیقت خود بخود کھل جائے گی۔ ہاں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری کا ایک مناظرہ مولوی غلام دستگیر قصوری سے ضرور ہوا تھا۔ مولوی صاحب موصوف علماء دیوبند کی تکفیر نہ کرتے تھے بلکہ انہوں نے ایک رسالہ

---

[1] بخاری جلد ا صفحہ ۵۲۶

الجواہر المضیہ جو نیچریوں کے رد میں لکھا تھا۔ اس کی دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے تصدیق حاصل کی تھی اور وہاں حضرت مولانا کو بڑے بڑے القاب اور نہایت با اعتماد الفاظ سے ذکر کیا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب۔ کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال ۱: قربانی کی کھالوں سے انجمن تبلیغ اسلام کے لئے لاؤڈ اسپیکر خریدا جا سکتا ہے یا نہیں اور کیا زکوٰۃ اس کام پر لگ سکتی ہے یا نہیں؟

۲: حضرت امام حسنؓ اور حسینؓ کے متعلق یہ حدیث ہے کہ یہ دونوں جنت کے جوانوں کے سردار ہوں گے تو جنت میں انبیاء کرام بھی ہوں گے۔ حضرت صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ بھی ہوں گے اور حضرت علی المرتضیٰؓ بھی ہوں گے تو کیا امام حسینؓ اور امام حسنؓ ان سب کے بھی سردار ہوں گے۔ کیونکہ جنت میں تو سب ہی جوان ہوں گے؟

۳: یہ جو حدیث میں آیا ہے کہ میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہیں ان سے کونسے علماء مراد ہیں؟

۴: کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیر معاویہؓ کو شادی کرنے سے منع فرمایا تھا کہ مجھے تیری پُشت سے بُو آتی ہے۔ کیا یہ روایت صحیح ہے؟ سائل۔ ماسٹر محمد ابراہیم ساکن بڈرانجھ تحصیل بھیوال

الجواب : قربانی کی کھالوں اور زکوٰۃ ہر دو کے لیے تملیک ضروری ہے یعنی کسی کو مالک بنانا۔ وقف چیزوں کا چونکہ کوئی مالک نہیں ہوتا۔ اس لیے کسی چیز کو وقف کے سپرد کر دینے سے تملیک کا تحقق نہیں ہوتا۔ پس انجمن تبلیغ الاسلام پہ یا مسجد پہ یا کسی پل پہ یا کسی اور وقف یا رفاہِ عام کے کام پہ قربانی کی کھالوں اور زکوٰۃ کا صرف کرنا جائز نہیں۔ ایسے صدقات کی روح غریب اور بے سہارا لوگوں کو سہارا دینا ہے۔

۲۔ حضرت امام حسنؓ اور حضرت حسینؓ جنت میں ان تمام لوگوں کے سردار ہوں گے جو اس دنیا میں جوان ہونے کی حالت میں فوت ہوئے۔ پس اس سے ان کے انبیاء کرامؑ یا شیخین کریمینؓ یا حضرت علی المرتضیٰؓ کے بھی سردار ہونے کا گمان لازم نہیں آتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ جنت میں سب جوان ہی ہوں گے۔ جنتیوں کا بڑھاپا اعزاز و انعام کی صورت میں جوانی میں بدلا جا چکا ہو گا۔ لیکن اس روایت میں کہ حضرت امام حسنؓ اور امام حسینؓ جنت کے جوانوں کے سردار ہوں گے۔ جوانوں سے مراد اس دنیا کے جوان ہیں جو جنت سے سرفراز ہوں گے۔ اس عالم جنت کے جوان مراد نہیں کیونکہ وہاں تو سبھی جوان ہوں گے پھر تخصیص کا کیا فائدہ۔

۳۔ حدیث کی کتابوں میں یا شروح حدیث میں یہ حدیث نظر سے کہیں نہیں گزری کہ حضورؐ نے فرمایا ہو میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہیں۔ بعض رسائل میں یہ الفاظ ضرور دیکھے ہیں علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل۔ لیکن اس کی کوئی سند اور اس پر کوئی مستند حوالہ ہمیں نہیں مل سکا۔ آپ اس روایت کا

حالہ پیش کریں۔ پھر اس امر کی وضاحت کردی جائے گی۔ ہاں یہ عقیدہ اسلام میں قطعی درجہ رکھتا ہے کہ کوئی غیرنبی کسی چھوٹے سے چھوٹے درجہ کے نبی تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔

۴۔ یہ روایت بھی تاریخ کی بعض غیر معتبر روایات میں درج ہے۔ بسند صحیح یا حسن کے ساتھ کسی معتبر کتاب میں یہ روایت نہیں ملتی۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: کعبہ شریف کی ولادت افضل ہے یا روضہ منورہ کی مجاورت ــــ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کو حضورؐ کے پہلو میں دفن ہونے کی جو شان حاصل ہے وہ ان بزرگوں کے علاوہ کیا اور کسی کو بھی حاصل ہوئی؟ اس کی تشریح فرمائیں؟

سائل۔ محمد طفیل از منڈی کاموںکے ضلع گوجرانوالہ

جواب: ولادت ایک "امر آنی" ہے جس کا وقت چند لمحوں سے زیادہ نہیں اور مجاورت ایک امر دائمی ہے جو قیامت تک کے لیے قائم ہے اور ارشادِ نبوت ہے۔ احب الاعمال الی اللہ ادومھا۔ پس ان دونوں میں مقابلے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

ثانیاً۔ ولادت ایک ابتداء ہے اور مجاورت بعد الوفات ایک منزل انتہا۔ اور حضورؐ کا ارشاد ہے انما العبرۃ بالخواتیم کہ اعتبار انتہائی امور کا ہی ہے پس اس جہت سے بھی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔

ثالثاً۔ ولادت اور مجاورت کو اگر آپ مکانی اعتبار سے سوچتے ہیں کہ فلاں جگہ کی ولادت اور فلاں جگہ کی مجاورت۔ تو پھر اسے زمانی اعتبار سے بھی دیکھنا چاہیئے کہ کون سی بات زمانہ قبل اسلام کی ہے اور کون سی زمانہ بعد اسلام کی جو بات زمانۂ اسلام کی ہو گی وہ یقیناً دوسری پر فائق ہو گی۔

اس سوال میں جو اصل مسئلہ اصولی طور پر سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ کعبہ افضل ہے یا روضہ منورہ۔ تاکہ دونوں کے مضاف (ولادت اور مجاورت) میں محاکمہ ہو سکے۔ سو اس باب میں ہمارا مؤقف یہی ہے کہ اگر روضۂ منورہ بایں طور مراد ہے تو پھر کعبہ یقیناً افضل ہے اور اگر روضہ منورہ بایں طور مراد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس میں تشریف فرما ہیں تو پھر کعبہ کیا عرش معلی حملۃ العرش جنت عدن افلاک دائرہ سب مل کر بھی اس روضۂ طاہرہ کی برابری نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس میں ایک ایسا جسد اطہر موجود اور فائز الحیات ہے کہ اگر اس کا دونوں جہانوں سے موازنہ کیا جاتے تو دونوں کونین اس سے ہلکے ہوں گے۔ حافظ ابن قیمؒ نقل کرتے ہیں کہ امام ابن عقیل حنبلیؒ سے پوچھا گیا:۔

ایّھما افضل حجرۃ النبیؐ او الکعبہ۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا روضہ منورہ افضل ہے یا کعبہ؟"

تو انہوں نے یہی جواب دیا جو ہم اوپر عرض کر آئے ہیں اور وہ یہ ہے:۔

ان اردت مجرد الحجرۃ فالکعبۃ افضل وان اردت وھو فیھا فلا واللہ و
لا العرش وحملتہ ولا جنت عدن ولا الافلاک الدائرۃ لان بالحجرۃ
جسداً لو وزن بالکونین لرجح۔[1]

پس اس روضۂ طاہرہ کی مجاورت جس شرف کی حامل ہے اس کی نظیر بھی آسمانوں اور زمینوں میں ہرگز ممکن نہیں۔ حضرت صدیق اکبر اور حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہما کے علاوہ اگر کسی کو یہ شرف حاصل ہے تو وہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سوال ۲: قرآن پاک کا اردو ترجمہ عربی متن کے بغیر شائع کرنا کیسا ہے اور قرآن کے محض اردو ترجمے کو قرآن کہہ سکتے ہیں یا نہیں۔ اس کی تفصیل کیجئے؟

سائل۔ عبد الجبار غلہ منڈی خانیوال

جواب: اس مسئلہ کا سمجھنا اس پر موقوف ہے کہ قرآن پاک اپنے الفاظ اور معانی ہر دو ابواب میں شان اعجاز رکھتا ہے یا نہیں اور اس کے الفاظ اور معانی ہر دو معجزہ ہیں یا نہ؟ ہمارا موقف اس باب میں یہی ہے کہ قرآن پاک لفظ اور معنی دونوں طرح سے شانِ اعجاز کا حامل ہے نہ ان حقائق و معانی کی نظیر لانا ممکن ہے اور نہ ان الفاظ اور تعبیرات پر کسی مخلوق کو کوئی قدرت حاصل ہے۔ قرآن پاک کو اگر کسی اور زبان میں منتقل کریں تو اگر معانی و مطالب ویسے کے ویسے ہی نظر آئیں تو بھی ان کے الفاظ اور تراکیب خالق کے اختیار کردہ نہیں بلکہ مخلوق کے اختیار کردہ ہوں گے اور ظاہر ہے کہ اس میں کوئی اعجاز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک کے جتنے بھی تراجم ہیں الفاظ اور تراکیب کے لحاظ سے سب آپس میں مختلف ہیں۔ حافظ ابن رجب (۷۹۵ھ) نے القواعد کے نام سے اسلام کے کچھ ضروری آداب و قواعد نہایت نفیس انداز میں ترتیب دیئے ہیں۔ اس میں قاعدہ عاشرہ کے ماتحت لکھتے ہیں:۔

منھا ما یعتبر لفظہ و معناہ وھو القرآن لاعجازہ بلفظہ و معناہ فلا تجوز
الترجمۃ عنہ بلغۃ اخری۔[2]

یعنی قرآن پاک لفظ اور معنی دونوں اعتبار سے شانِ اعجاز رکھتا ہے۔ پس اس کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنا جائز نہیں۔ ہاں اگر اس طرح ہو کہ عربی متن بھی ساتھ ہی شامل رہے تو پھر ترجمہ کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن وہ اردو ترجمہ قرآن نہیں کہلائے گا اسے صرف ترجمہ ہی کہا جائے گا۔ قرآن وہی ہے جو عربی میں ہے۔ اور عربیت کی صفت قرآن پاک سے ایک لمحے کے لیے جُدا نہیں کی جا سکتی۔ قال اللہ تعالیٰ:۔

---

[1] بدائع الفوائد جلد ۲ ص ۱۳۶ طبع منیریہ مصریہ لابن القیمؒ [2] القواعد للحافظ۔ عبد الرحمٰن بن رجب ص ۱۳ مصر

انا جعلناہ قرآناً عربیاً لعلکم تعقلون۔ (پ ۲۵ زخرف ع ۱)

ترجمہ۔ ہم نے کیا ہے اسے قرآن عربی کا۔ تاکہ تم سمجھ سکو۔

فقیہ شہیر علامہ برہان الدین صاحب ہدایہ کتاب التجنیس میں رقمطراز ہیں:۔

ویمنع من کتابہ القرآن بالفارسیۃ بالاجماع لانہ یؤدی للاخلال بحفظ القرآن لانا امرنا بحفظ النظم والمعنی جمیعاً فانہ دلالۃ علی النبوۃ۔[1]

ترجمہ۔ قرآن مجید کو غیر عربی میں لکھنا ممنوع ہے کیونکہ ایسا کرنا قرآن مجید کے محفوظ رکھنے پر اثر انداز ہوگا اور ہم لوگ قرآن کے الفاظ اور معانی دونوں کی حفاظت کے لیے مامور ہیں اور یہ نبوت کا ایک معجزہ ہے۔

مزید تفصیل کے لیے فتح القدیر باب کیفیت الصلوٰۃ (جلد ۱ صـ۲۰۱ مصر) رد المحتار شامی جلد ۱ صـ۳۵۸) کفایہ شرح ہدایہ بہامش الفتح صـ۲۴۹ اور مغنی ابن قدامۃ (جلد ۱ صـ۵۳۰) وغیرہا من المعتبرات کی طرف مراجعت کی جائے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ؛ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: براہِ کرم ہفت روزہ "دعوت" میں مندرجہ ذیل امور کا جواب دیں۔ دلائل ایسے قطعی ہوں کہ ان کی تاویل نہ کی جاسکتی ہو:۔

۱۔ مرزا غلام احمد قادیانی نبی کیوں نہیں تسلیم کیئے جاتے؟ ۲۔ مرزا صاحب مجدد کیوں نہیں تسلیم کیے جاتے؟

۳۔ مرزا صاحب عالم کیوں نہیں تسلیم کیے جاتے؟ ۴۔ مرزا صاحب عابد و زاہد کیوں نہیں تسلیم کئے جاتے؟

۵۔ مرزا غلام احمد قادیانی مسلمان کیوں نہیں تسلیم کیے جاتے؟ آپکا مخلص نذیر احمد بٹ، رحیم سٹریٹ سرفراز پورہ اچھرہ لاہور

جواب: مرزا صاحب نبی اس لیے نہیں تسلیم کیئے جاسکتے کہ وہ حضورؐ کے بعد تیرہویں صدی میں پیدا ہوئے اور حضور خاتم النبیینؐ کے بعد میں پیدا ہونے والا کوئی شخص کبھی نبی نہیں ہوسکتا۔ حضرت عیسیٰؑ اپنی آمد پر محض اس لیے نبی تسلیم کر لیے جائیں گے کہ وہ حضور ختمی مرتبتؐ سے بہت پہلے کے پیدا ہوئے ہیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیدا ہونے والا کوئی شخص نبی نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ہر طرح کی نبوت حضورؐ پر ختم ہوچکی ہے اور وحی نبوت کا سلسلہ منقطع ہوچکا ہے۔ علاوہ ازیں پیغمبروں کی شان یہ ہے کہ وہ اللہ رب العزت کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ قال اللہ تعالیٰ:۔

الذین یبلّغون رسالات اللہ ویخشونہ ولا یخشون احداً الا اللہ۔ (پ ۲۲۔ احزاب آیت ۳۹)

ترجمہ۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی رسالت آگے پہنچاتے ہیں۔ اور وہ اسی سے ڈرتے ہیں اور اسکے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

اور مرزا صاحب انگریزوں سے ڈرتے تھے۔ مسلمانوں سے ڈرنے کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے حج نہیں کیا تھا اور محض اسی لیے نہیں کیا تھا کہ انہیں حجاز کے مسلمانوں سے جان کا خوف تھا اور پھر یہ نہیں کہ یہ ڈر کوئی امر وقتی تھا بلکہ زندگی بھر مرزا صاحب کے ساتھ رہا اور انگریزوں سے ڈرنے کی دلیل یہ ہے کہ ڈوئی کی عدالت میں انہوں نے محض ڈرتے ہوئے اپنے طریقِ کار کے خلاف آئندہ ضمانت کے طور پر دستخط کر دیئے تھے اور پھر ساری عمر انگریزوں کی مدح خوانی اور سلطنتِ برطانیہ کی قصیدہ خوانی کرتے رہے۔ پس ایسے اشخاص کے متعلق جن کی قلبی اور ذہنی کیفیت اس قدر کمزور ہو نبوت کے تصور کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۲۔ مرزا صاحب مجدد اس لیے تسلیم نہیں کیے جاسکتے کہ مجدّد کا کام قوم کو پہلی بدعات اور پہلی آلائشوں سے نجات دلانا ہے۔ جو زمانے کے تاثرات اور رسم ورواج سے وہ داخلِ دین کر چکے ہوں اور وہ بھی زیادہ تر علمی میدان میں معروف کے قیام اور منکرات کی روک تھام کے لیے عمل میں آتا ہے۔ مرزا صاحب بجائے اس کے کہ قوم کو کسی پہلے انتشار سے نجات دلاتے، خود ایک وجہ انتشار بن گئے۔ بجائے اس کے کہ پہلی فرقہ بندی میں کچھ کمی ہوتی ایک اور فرقے کا ان میں اضافہ ہوگیا اور وہ فرقہ بھی ایسا بنا جو پوری قوم سے کٹ کر ایک جُداگانہ ملت بن گیا۔ پس جب کہ مرزا صاحب کا کوئی کام مجددین سابقین کے منہاج پر نہ تھا انہیں مجدد کس طرح تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ مرزا صاحب کو ایک عالم اس لیے تسلیم نہیں کیا جاتا کہ وہ معقول منقول اور ادب ہر اعتبار سے کمزور اور خام تھے۔ ادبِ عربی کے اعتبار سے وہ متعدد غلطیوں کے مرتکب ہوئے۔ جن کی تفاصیل سب اپنی اپنی جگہ موجود ہیں۔ منقول میں بھی انہوں نے بہت سی غلطیاں کی ہیں۔ حدیث کی بحث کرتے ہیں تو قواعدِ محدثین اور آدابِ محدثین سے ناواقف دکھائی دیتے ہیں۔ تفسیر کرتے ہیں تو قرآنی علوم سے خالی نظر آتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس ان میں کوئی علمی ممتاز شان نہ تھی کہ انہیں امتیازی طور پر عالم تسلیم کیا جائے۔

۴۔ مرزا صاحب کا غیر محرم عورتوں سے عام اختلاط اور متعدد غلط بیانیوں کا ارتکاب، انہیں ایک زاہد اور پرہیزگار انسان سمجھنے کی اجازت نہیں دیتا۔

۵۔ مرزا صاحب کو مسلمان تسلیم کرنے سے یہ امور مانع ہیں:۔

(۱)— انہوں نے مراق سے افاقہ کی حالت میں بھی ختمِ نبوت کے ان معنوں کا انکار جاری رکھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لے کر آخر تک امتِ مسلمہ نے بالاجماع سمجھ رکھے تھے اور ختمِ نبوت کا یہ انکار ایک مستقل وجہِ کفر ہے۔

(۲)— انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین کی اور انہیں بہت سے نامناسب الفاظ کے ساتھ

ذکر کیا اور قاعدہ شرعیہ ہے کہ نبی کی توہین اور اس کی شان میں کسی قسم کی گستاخی ہر دو موجبِ کفر ہیں۔

(۴) — مرزا صاحب نے بعض اُن امورِ شرعیہ کو جو حضور ختمی مرتبتؐ کی شریعت میں عبادات تھے حرام قرار دے کر تحریم حلال اور تحلیل حرام کا ارتکاب کیا۔ جیسے جہاد کو حرام قرار دینا وغیرہ۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ

نوٹ: حضرت ام کلثوم بنت علیؓ کا حضرت عمرؓ کے نکاح میں ہونا تاریخِ اسلام کی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ اس سلسلے میں دو شبہے دفتر میں موصول ہوئے ہیں جنہیں غلام محمد صاحب فاروقی نے پنڈی بھٹیاں سے ارسال کیا ہے۔ ان کے جوابات حضرت علامہ صاحب کے قلم سے ہدیۂ قارئین ہیں۔

سوال ۱: حضرت ام کلثومؓ عمر میں بہت چھوٹی تھیں اور حضرت عمر فاروقؓ کافی سن رسیدہ تھے۔ اس لیے یہ نکاح بظاہر ایک امرِ مستبعد معلوم ہوتا ہے؟

جواب: حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی عمروں میں بھی کافی فرق تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ حضرت فاطمۃ الزہراؓ سے بھی چھوٹی تھیں اور نہایت چھوٹی عمر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئی تھیں۔ اگر اس نکاح میں کوئی استبعاد نہیں تو حضرت ام کلثومؓ کا حضرت عمرؓ کے نکاح میں آنا کون سا امرِ مستبعد ہے۔ تمدنِ عرب میں خاوند اور بیوی کا قریب العمر ہونا چنداں ضروری نہ تھا۔

ثانیاً حضرت علی المرتضیٰؓ کی صاحبزادی ام کلثومؓ جو اس وقت صغیرہ تھیں اور پانچ سال کے قریب تھیں وہ اور ام کلثومؓ تھیں جو حضرت فاطمہؓ کے بطن سے نہ تھیں۔ یہ ام کلثوم صغریٰ کہلاتی ہیں۔ ام کلثومؓ کبریٰ جو حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی بیٹی تھیں وہ ہرگز صغیرہ نہ تھیں اور حضرت فاروق اعظمؓ کے نکاح میں وہی تھیں۔ ان پر اگر کہیں صغرسنی کا اطلاق ہے تو وہ صرف فی نفسہٖ چھوٹا ہونے کی وجہ سے ہے۔

ثالثاً حضرت ام کلثومؓ حضرت فاطمہؓ کی چوتھی اولاد تھیں۔ حضرت امام حسینؓ اور حضرت ام کلثومؓ کے مابین صرف ایک بیٹی حضرت زینبؓ ہیں۔ شیخ الطائفہ ابو جعفر محمد بن حسن طوسی کے بیان کے مطابق حضرت امام حسینؓ ہجرت کے تیسرے سال ربیع الاول کے آخر میں پیدا ہوئے۔

الحسین بن علی بن ابی طالب الامام الشہید سید شباب اہل الجنۃ ولد بالمدینۃ اٰخر شہر ربیع الاول سنۃ ثلاثہ من الہجرۃ۔[1]

حضرت سیدہ کی اولاد میں فاصلہ عمر بہت کم تھا۔ امام حسنؓ اور امام حسینؓ کی عمروں میں فرق ایک سال

[1] تہذیب الاحکام جلد ۲ ص۱۴ کتاب المزار ایران

سے زیادہ نہ تھا۔ بس قرینِ قیاس یہی ہے کہ حضرت ام کلثومؓ پانچ یا زیادہ سے زیادہ چھ ہجری کے قریب پیدا ہوئیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ کے نکاح میں یہ کس وقت آئیں۔ حافظ ابن حبان (متوفی ۳۵۴ھ) اس واقعہ نکاح کو کتاب الثقات کے ۱۷ھ کے وقائع میں ذکر کرتے ہیں۔ اندریں صورت حضرت ام کلثومؓ کا یہ نکاح بارہ سال کی عمر میں ہوا اور عرب کی گرم آب و ہوا کے پیشِ نظر یہ عمر کوئی ایسی نہیں ہے کہ اسے صغرسنی کہا جا سکے۔

یہ ملحوظ رہے کہ شیعہ حضرات اسی ام کلثومؓ کو ہبہ فدک کے گواہوں میں بھی پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ ہمارے نزدیک ہبہ فدک کی تمام روایات یکسر باطل اور موضوع ہیں لیکن شیعہ حضرات کے اس موقف سے یہ امر ضرور واضح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک حضرت ام کلثومؓ ۱۱ھ میں ادائے شہادت کے قابل تھیں۔ سیرۃ حلبیہ جلد ۳ ص۴۰۷ میں شیعہ حضرات کا یہ موقف پوری طرح منقول ہے۔ اسی طرح شمس الدین احمد جزری نے حدیث من کنت مولاہ فعلی مولاہ کو حضرت فاطمہؓ کی روایت سے حضرت ام کلثومؓ کی سند کے ساتھ بھی نقل کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی وفات کے وقت حضرت ام کلثومؓ نقل روایت کے ضرور لائق تھیں۔

ان حقائق سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت ام کلثومؓ پر صغرسنی کا اطلاق محض ایک امرِ اضافی ہے حقیقت میں وہ اس وقت نہ صغیرہ تھیں اور نہ ان کا لائقِ نکاح ہونا کسی صورت میں محلِ تردد تھا۔ واقعات بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔

شبہ ثانیہ ۲: حضرت ابو بکرؓ کی بھی ایک صاحبزادی کا نام ام کلثوم تھا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی وفات کے بعد ان کی بیوی اسماء بنت عمیسؓ نے حضرت علی المرتضیٰؓ سے نکاح کیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ جس طرح محمد بن ابی بکرؓ نے حضرت علیؓ کے گھر پرورش پائی اسی طرح یہ ام کلثومؓ حضرت علیؓ کی ربیبہ ہی ہوں اور اسی ام کلثومؓ کا حضرت عمرؓ سے نکاح ہوا ہو؟

جواب: جو ام کلثومؓ حضرت عمرؓ کے نکاح میں تھیں وہ حضرت علیؓ کی صاحبزادی تھیں اور حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے بطن سے تھیں۔ اگر وہ حضرت علیؓ کی ربیبہ ہوتیں اور ان کی دوسری بیوی کی پچھلگ ہوتیں تو حضرت عمرؓ حضرت علیؓ سے رشتہ طلب کرتے وقت قرابتِ رسول کے حصول کا ذکر کیوں کرتے۔[1]

ثانیاً حضرت ابو بکر صدیقؓ کی بیٹی ام کلثومؓ حضرت اسماء بنت عمیسؓ کے بطن سے نہ تھیں وہ حبیبہ بنت خارجہ کے بطن سے تھیں جو حضرت علیؓ کے گھر کبھی نہیں رہیں۔ محمد بن ابی بکرؓ تو حضرت علیؓ کے اس

[1] دیکھیے کشف الغمہ ص۱۰ آخری سطر مطبوعہ ایران

لیے پروردہ تھے کہ اسماء بنت عمیسؓ کے لڑکے تھے اور انہوں نے حضرت علی المرتضیٰؓ سے نکاح کر لیا تھا لیکن ام کلثومؓ تو اسماء بنت عمیسؓ کی لڑکی نہ تھیں۔ پس ان کے حضرت علیؓ کی ربیبہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ثالثاً۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی صاحبزادی ام کلثومؓ حضرت صدیق اکبرؓ کی وفات کے بعد پیدا ہوئی تھیں ان کا نکاح طلحہ بن عبیدہؓ سے ہوا تھا اور ان سے دو بچے ذکریا اور عائشہ نامی پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ حبیبہ بنت خارجہ نے حضرت صدیق اکبرؓ کی وفات کے بعد حبیب بن یسارؓ سے نکاح کیا تھا۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں :-

حبیبه بنت خارجه بن زید الخزرجي وقيل الملكية ام ام كلثوم بنت الصديق ثم تزوجها بعد الصديقؓ حبيب بن يسار۔[1]

ترجمہ۔ حبیبہ بنت خارجہ بن زید الخزرجی ام کلثومؓ کی والدہ تھیں۔ حضرت صدیق اکبرؓ کی وفات کے بعد انہوں نے حبیب بن یسار سے نکاح کیا تھا۔

رابعاً۔ حضرت اسماء بنت عمیسؓ کی اولاد کا تذکرہ مفصل طور پر استیعاب جلد ۲ صفحہ ۷۲۵ میں موجود ہے ان میں کہیں ام کلثوم کا نام نہیں ملتا۔ جب یہ حضرت علیؓ کے نکاح میں آئیں تو ان کے ساتھ ان کا ایک ہی بیٹا تھا جو حضرت صدیق اکبرؓ سے تھا۔ پھر حضرت علیؓ سے ان کے ہاں یحییٰ بن علی بن ابی طالب پیدا ہوئے تھے۔

ان حقائق سے واضح ہوا کہ جو ام کلثوم حضرت عمرؓ کی بیوی تھیں وہ یقیناً حضرت علیؓ کی بیٹی تھیں اور خاتونِ جنت حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے بطن سے تھیں۔ ابن قتیبہ دینوری لکھتے ہیں :-

ام كلثومؓ كبرىٰ وهي بنت فاطمة رضى الله تعالىٰ عنها فكانت عند عمرؓ بن الخطاب وولدت له ولدًا۔[2]

ترجمہ۔ ام کلثوم کبریٰؓ یہ خاتونِ جنت حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی بیٹی تھیں ان کا نکاح حضرت عمرؓ بن الخطاب سے ہوا تھا اور ان کے ہاں حضرت عمرؓ سے اولاد بھی ہوئی۔

بایں ہمہ اگر اس غلط بیانی کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ وہ حضرت علیؓ کی اپنی بیٹی ہی نہ تھیں محض ربیبہ تھیں۔ تو بات پھر بھی وہیں رہتی ہے۔ کہ اگر حضرت عمرؓ کا ایمان حضرت علی المرتضیٰؓ کے نزدیک مشتبہ تھا تو انہوں نے حضرت ام کلثومؓ حضرت عمرؓ کے نکاح میں کیوں دیں۔ جب وہ حضرت علیؓ کی کفالت اور تربیت میں تھیں اور وہ ان کے ہر طرح سے نگران تھے تو حضرت علیؓ نے حکم قرآن کے خلاف یہ بچی حضرت عمرؓ کے نکاح میں کیوں دی ؟ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اپنی لڑکیاں تو کافروں کو نہ دو اور یتیم بچیوں پر بے شک ظلم کرو اور انہیں کافروں سے بیاہ دو (معاذاللہ ثم معاذاللہ)

---

[1] تجرید اسماء الصحابہ جلد ۲ صفحہ ۲۷۲ [2] معارف صفحہ ۷۸ مصر

صورتِ واقعہ خواہ کچھ ہو۔ حضرت علی المرتضیٰؓ کا ام کلثومؓ کو حضرت عمر فاروقؓ کے نکاح دینا اُن کے ایمان و اخلاص اور کمالات پر مہرِ تصدیق ثبت کرتا ہے۔ واللہ علیٰ ما نقول شہید۔ تمت بالخیر واللہ الحمد ظاهرًا وباطنًا۔

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ

نوٹ: حضرت علامہ صاحب کے جلاوطنی کے دور میں باب الاستفسارات مسلسل نہ رہ سکا تھا۔ استفسارات دفتر میں موصول ہوتے رہے اور حضرت علامہ دوست محمد صاحب قریشی ناظم اعلیٰ تنظیم اہلسنت پاکستان کی خدمت میں بھیجے جاتے رہے۔ مگر حضرت قریشی صاحب کی مصروفیات کچھ اس قسم کی رہیں کہ وہاں سے جوابات بروقت موصول نہ ہو سکے جس کے لیے ہم قارئین "دعوت" سے معذرت خواہ ہیں۔ اب حضرت علامہ خالد محمود صاحب لاہور تشریف لے آئے ہیں اور باب الاستفسارات پھر بدستور جاری کر دیا گیا ہے۔ انور

سوال : ربیع الاول میں پہلی تاریخ سے لے بارہ تاریخ تک حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد میں جلسے اور جلوس قائم کیے جاتے ہیں۔ کیا یہ بدعت نہیں ؟

۲. حضرت علیؓ اور ابوبکر صدیقؓ کے آپس میں تعلقات کیسے تھے ؟

۳. حضرت امام حسینؓ کا جو وظیفہ مقرر تھا وہ حضرت امیر معاویہؓ نے بند کیا یا ان کے بعد بند ہوا ؟

سائل۔ یار محمد خاں نمبردار خریدار "دعوت" ۱۹۵ ٹبی سولگیاں تحصیل جام ضلع ڈیرہ غازیخاں

جواب : کسی عمل پر بدعت کا حکم لگانے سے پہلے بدعت کا معنیٰ معلوم کر لینا چاہیئے۔ بدعت اسے کہتے ہیں کہ جو کام دین کا نہ ہو اُسے دین سمجھ کر کیا جائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

من احدث فی امرنا هذا ما ليس منه فهو رد۔[1]

ترجمہ۔ جس نے دینِ اسلام میں کوئی نئی بات داخل کی جو دین کی نہ ہو تو وہ عمل مردود ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ شریفہ، سیرتِ طیبہ اور وفاتِ کریمہ کا تذکار و بیان کتاب و سنت میں موجود اور معمولِ صحابہؓ سے منقول ہے، یہ قطعاً بدعت نہیں۔ بلکہ اعلیٰ درجے کے مندوبات اور حلاوتِ ایمان کے موجبات میں سے ہے۔ ہاں اس ذکرِ خیر کے لیے کسی ایک دن کو خاص کر لینا اور اس تعین یوم میں فضیلت کا اعتقاد رکھنا یہ امر یقیناً ائمہ دین اور سلف صالحین سے منقول نہیں۔ پھر اس تعین یوم کی دو صورتیں ہیں ایک تعین شرعی، دوم تعین انتظامی۔ تعین شرعی یہ ہے کہ کسی عمل کے متعلق یہ اعتقاد رکھنا کہ اسے خاص فلاں

---

[1] مشکوٰۃ صفحہ ۲۷

دن میں کرنا حکم شریعت ہے جیسے جمعہ کی نماز، رمضان کے روزے اور عید وغیرہ۔ اور تعین انتظامی یہ ہے کہ اس کام کے خاص اس دن سے متعلق ہونے کا کوئی اعتقاد نہ ہو۔ بلکہ محض بر سبیل انتظام کسی دن کا تعین کر لیا جائے۔ جیسے شادی کے دنوں کا تعین کر لیا جائے۔ کاروبار کے اوقات کا تعین، اوقات سفر کا تعین وغیرہ وغیرہ۔ اس تعین کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ جب بھی کوئی کام کرنا ہو کسی نہ کسی دن کا تعین تو کرنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تعینات محض ایک انتظامی درجے کے ہیں شرعی مسئلے کے درجے میں نہیں اور اس کی کھلی شہادت یہ ہے کہ ان ایام کے تعین میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ ایک خاندان میں ایک شادی کے دن اور معین ہوتے ہیں اور اسی خاندان میں پھر جب کوئی دوسری شادی منعقد ہو تو اس کے لیے اور دنوں کا تعین ہوتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تعین کوئی امر شرعی نہ تھا۔ ورنہ بار بار پہلے دنوں کا ہی التزام کیا جاتا۔ پس یہ ایک امرِ انتظامی ہے جس کے تعین ایام و اوقات سے چارہ نہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر ولادت تذکار سیرت اور بیان وفات کے واقعات کی بارہ ربیع الاول سے تخصیص ایک امرِ شرعی ہے یا محض ایک امر انتظامی ہے۔ جیسا کہ حکومت کی طرف سے بھی اس دن چھٹی کی جاتی ہے۔

حالات کا مشاہدہ بتلاتا ہے کہ یہ تخصیص و تعین شرعی ہرگز نہیں محض ایک تعین انتظامی ہے کیونکہ یہ جلسے صرف بارہ ربیع الاول یا یکم سے بارہ تک کے دنوں سے ہی خاص نہیں۔ بلکہ بسا اوقات کئی مقامات پر ۱۲ ربیع الاول کے بعد بھی ہوتے رہتے ہیں۔ بلکہ ربیع الاول کے بعد بھی کچھ عرصے تک یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ کئی جگہوں میں یہ جلسے ربیع الاول سے بھی پہلے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ تمام واقعات اس امر کا شہادت ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تذکار سیرت اور بیان ولادت کو کسی ایک دن یا چند معین دنوں کے ساتھ کبھی بھی خاص نہیں سمجھا جاتا اور ان دنوں کے یہ اہتمامات محض ایک تعین انتظامی ہیں نہ کہ تعین شرعی۔ ایک عرصے تک حضرت مفتی کفایت اللہ کی بھی یہی رائے رہی ہے۔ ثم رجع الشیخ عنہ کما فی کفایۃ المفتی۔

باقی رہا جلوس کا معاملہ تو گو اس کے التزام، طریق کار اور صورت عمل سے متفق نہیں۔ مگر منانے والوں کے نزدیک بھی یہ ایک محض دنیوی اظہار مسرت ہے کوئی دینی شعار نہیں۔ ابھی پچھلے دنوں بعض لوگوں نے جو ان جلوسوں کا اہتمام کرتے ہیں اعلان کیا تھا کہ وہ اہل سنت کی انتہائی مظلومیت کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے یہ جلوس نہیں نکالیں گے۔ چنانچہ ناروال اور کوہاٹ وغیرہ کئی مقامات پر امسال یہ جلوس نکالے بھی نہیں گئے۔ یہ واقعات اس امر کی کھلی شہادت دیتے ہیں کہ یہ جلوس کسی شرعی حکم کی صورت میں برآمد نہیں ہوتے۔ ورنہ انہیں کسی بھی صورت میں بند کرنے کی تجویز نہ ہوتی۔ آج تک کبھی کسی نے نماز، روزہ، صدقاتِ فطر یا اس قسم کے اور کسی شرعی حکم کو بھی احتجاجاً ترک کیا ہے؟ ہرگز نہیں، شرعی احکام کے احتجاجاً ترک کرنے

یا ملتوی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اندریں صورت متبادر ہوتا ہے کہ یہ جلوس ایک شرعی مسئلے کی صورت ہیں نہیں محض ایک دنیوی شوکت کا اظہار ہیں اور وہ بھی دوسری قوموں کے بالمقابل تو اسے بدعت کہنا مشکل ہوگا۔ تاہم اس سے ان دوسرے کئی غیر شرعی امور کو جو ان جلوسوں میں عمل میں لائے جاتے ہیں، مبترا عن البدعت اور بری عن الحرمت ہونے کا حکم حاصل نہیں ہو سکتا۔ جو کام اپنی ذات میں مکروہ عبث یا حرام ہیں انہیں اپنانا کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔ ان امور کی اصلاح ازبس ضروری ہے۔ یہ ایک واقعاتی مشاہدہ ہے کوئی فتوے نہیں۔ فتوے کے لیے کسی اور مرکزی دارالافتاء کی طرف رجوع کیجیے۔

۲۔ حضرت علی المرتضیٰؓ کے حضرت صدیق اکبرؓ سے نہایت اچھے تعلقات تھے۔ انہوں نے حضرت صدیق اکبرؓ کے دست مبارک پر بیعت بھی کی تھی (دیکھیے احتجاج طبرسی مطبوعہ ایران) اور ان کے پیچھے بھی نمازیں پڑھتے تھے۔ (احتجاج طبرسی) حضرت فاطمۃ الزہراؓ سے حضرت علیؓ کا نکاح بھی حضرت صدیق اکبرؓ کی تحریک پر ہی ہوا تھا اور وہ اس نکاح کے گواہوں میں سے بھی تھے۔ (بحارالانوار جلد ۱۰) اور جب خاتونِ جنت حضرت سیدہ زہراؓ کی وفات ہوئی تو انہیں غسل بھی حضرتِ صدیق اکبرؓ کی بیوی ہی نے دیا تھا۔ اور یہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت مبارک کا دور تھا۔

۳۔ حضرت امیر معاویہؓ کی خلافت تک حضرت امام حسینؓ اور امیر معاویہؓ کے تعلقات اچھے تھے۔ حضرت امیر معاویہؓ کی پوری کوشش تھی کہ وہ روابط جو انہوں نے حضرت حسینؓ کے ساتھ نہایت بہترین انداز میں قائم کر رکھے ہیں ٹوٹنے نہ پائیں۔ شیخ ابن بابویہ قمی حضرت زین العابدینؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہؓ نے آخری وقت میں یزید کو جو نصیحتیں کیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی:۔

حق حرمت او را بشناس و منزلت و قرابت او را با پیغمبر بیاد آورد با کرده ہائے او مواخذه مکن و روابطی که من با او دریں مدت محکم کرده ام قطع مکن[1]

ترجمہ: امام حسینؓ کے حق احترام کو پہچاننا اور انہیں جو قرب اور درجہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاں حاصل ہے اسے یاد رکھنا، ان کے کسی عمل پر ان سے مواخذہ نہ کرنا اور وہ تعلقات جو میں نے اب تک ان سے نہایت مضبوط کر رکھے ہیں انہیں ہرگز قطع نہ کرنا۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت امام حسینؓ حضرت امیر معاویہؓ کی زندگی تک وہ وظیفہ وصول کرتے رہے جو حضرت امام حسنؓ کے ساتھ بوقتِ صلح مقرر ہوا تھا اور حضرت امیر معاویہؓ آخر دم تک کوشاں رہے کہ اہلبیت کے ان بزرگوں کے ساتھ تعلقات نہایت اچھے اور محبت کے انداز میں قائم رکھے جائیں۔

---

[1] جلاء العیون ص ۳۸۵ ایران

سوال: بندہ کا خریداری نمبر ۱۳۴۸ ہے۔ "دعوت" کا باقاعدہ مطالعہ کرتا ہوں۔ میری ایک شیعہ سے گفتگو ہوئی اس نے کہا کہ جناب رسالت مآب نے فرمایا تھا کہ کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنا جانشین مقرر نہیں کر سکتا۔ یہ صحیح ہے تو پھر امیر معاویہؓ نے اپنی زندگی میں اپنا جانشین کیوں مقرر کیا؟ مشتاق احمد از خانیوال

جواب: آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ ایک بہتان اور افتراء ہے۔ حضورؐ نے کہیں نہیں فرمایا کہ کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنا جانشین مقرر نہیں کر سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنصِ جلی اپنا کوئی جانشین مقرر نہیں کیا۔ امامت حضرت صدیق اکبرؓ کو تفویض فرمائی، یہ ایک نصِ خفی ہے۔ امامتِ کبریٰ کا انعقاد مہاجرین اور انصار صحابہؓ کے اجماع سے ہوا لیکن اس سے یہ نتیجہ کیسے نکل آیا کہ زندگی میں جانشین مقرر کرنا جائز نہیں حضرت صدیق اکبرؓ نے حضرت فاروق اعظمؓ کو جانشین مقرر کیا اور تمام صحابہؓ نے اسے اجماعاً قبول کیا۔ شیعہ حضرات کی اپنی روایات ہیں کہ حضرت علی المرتضیٰؓ نے اپنے بیٹے امام حسنؓ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ یہ پیشِ نظر رہے کہ ایسا اگر ہوا بھی ہے تو محض نظر بر اہلیت ہے نظر بر وراثت نہیں۔ حضرت علی المرتضیٰؓ جیسی عظیم شخصیت کے متعلق یہ کبھی نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے سب سے پہلے سنّتِ اسلام بدلی اور اپنے بیٹے کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ اوّلاً تو یہ صرف شیعہ حضرات کا اعتقاد ہے۔ اہل سنّت کا نظریہ یہی ہے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ انتخاب کے ذریعہ برسرِ خلافت آئے تھے۔ ثانیاً اگر ایسا ہو بھی تو اسے مبنی بر وراثت ہونے کی بجائے مبنی بر اہلیت قرار دینا چاہیئے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: "دعوت" میں حیاتِ مسیح پر ایک مسلسل مضمون کئی قسطوں میں آرہا ہے۔ اس موضوع پر ایک شبہ وارد ہوتا ہے۔ اس کا جواب "دعوت" میں ہی دے کر مشکور فرمائیں۔ سوال یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر قرآن کی رُو سے واوصانی بالصلوٰۃ والزکوٰۃ مادمت حیاً کے مطابق ہر وقت جب تک وہ زندہ ہیں نماز اور زکوٰۃ فرض ہے۔ اگر وہ اب آسمانوں میں زندہ ہیں تو وہاں نماز اور زکوٰۃ کیسے ادا کرتے ہوں گے اور وہ زکوٰۃ لیتا کون ہو گا۔ اس کا جواب مطلوب ہے؟ سائل۔ مختار حسن صدر لاہور کینٹ

جواب: آپ پہلے اس آیت کے معنی سمجھ لیجیئے، جو آپ نے نقل کی ہے اس میں انشاء اللہ العزیز تمام شبہات زائل ہو جائیں گے۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے:۔

واوصانی بالصلوٰۃ والزکوٰۃ مادمت حیاً۔ (پ ۱۶، مریم)

ترجمہ۔ اور اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے نماز اور زکوٰۃ کا جب تک میں زندہ رہوں۔

اس آیت کی تفسیر میں شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحؒ فرماتے ہیں:۔

"یعنی جب تک زندہ رہوں، جس وقت اور جس جگہ کے مناسب جس قسم کی صلوٰۃ و زکوٰۃ کا حکم ہو اس کی شروط و حقوق کی رعایت کے ساتھ برابر ادا کرتا رہوں گا۔ جیسے دوسری جگہ مومنین کی نسبت فرمایا "الذین ھم عن صلوٰتھم دائمون" اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر آن اور ہر وقت نماز پڑھتے رہتے ہیں۔ بلکہ یہ مراد ہے کہ جس وقت جس طرح کی نماز کا حکم ہو ہمیشہ پابندی سے تعمیلِ حکم کرتے ہیں اور اس کی برکات و انوار ہمہ وقت ان کو محیط رہتی ہیں۔ کوئی شخص کہے کہ ہم جب تک زندہ ہیں، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، وغیرہ کے مامور ہیں۔ کیا اس کا مطلب یہ لیا جائے گا کہ ہر ایک مسلمان مامور ہے کہ ہر وقت نماز پڑھتا رہے، ہر وقت زکوٰۃ دیتا رہے۔ (خواہ نصاب کا مالک ہو یا نہ ہو) ہر وقت روزے رکھتا رہے، ہر وقت حج کرتا رہے۔ حضرت مسیحؑ کے متعلق بھی "مادمت حیاً" کا ایسا ہی مطلب سمجھنا چاہیئے۔ یاد رہے کہ لفظ "صلوٰۃ" کچھ اصطلاحی نماز کے ساتھ مخصوص نہیں۔ قرآن نے ملائکہ اور بشر سے گزر کر تمام جہان کی طرف صلوٰۃ کی نسبت کی ہے۔ الم تر ان اللہ یسبح لہ من فی السمٰوات والارض والطیر صافات کل قد علم صلوٰتہ وتسبیحہ۔ (نور رکوع ۲) اور یہ بھی بتلا دیا کہ ہر چیز کی تسبیح و صلوٰۃ کا حال اللہ ہی جانتا ہے کہ کس کی صلوٰۃ و تسبیح کس رنگ کی ہے اسی طرح زکوٰۃ کے معنی بھی اصل میں طہارت، نماز، برکت و مدح کے ہیں جن میں سے ہر ایک معنی کا استعمال قرآن و حدیث میں اپنے اپنے موقع پر ہوا ہے۔ اسی رکوع میں حضرت مسیحؑ کی نسبت "غلاماً زکیاً" کا لفظ گزر چکا جو زکوٰۃ سے مشتق ہے اور یحییٰ علیہ السلام کو فرمایا۔ "وحناناً من لدنا وزکوٰۃ" سورۂ کہف میں ہے خیراً منہ زکوٰۃ واقرب رحماً اسی طرح کے عام معنی یہاں بھی زکوٰۃ کے کئے جا سکتے ہیں اور ممکن ہے "اوصانی بالصلوٰۃ والزکوٰۃ" سے "اوصانی بان آمر بالصلوٰۃ والزکوٰۃ" مراد ہو جیسے اسمٰعیل علیہ السلام کی نسبت فرمایا "وکان یامر اھلہ بالصلوٰۃ والزکوٰۃ" پھر لفظ "اوصانی" اپنے مدلول لغوی کے اعتبار سے اس کو مقتضی نہیں کہ وقت الیصاء ہی سے اس پر عمل درآمد شروع ہو جائے نیز بہت ممکن ہے کہ "مادمت حیاً" سے یہ ہی زمینی حیات مراد لی جائے۔ جیسے ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ جابرؓ کے والد کو اللہ نے شہادت کے بعد زندہ کر کے فرمایا کہ ہم سے کچھ مانگ، اس نے کہا کہ مجھے دوبارہ زندہ کر دیجئے کہ دوبارہ تیرے راستہ میں قتل کیا جاؤں،

اس زندگی سے یقیناً زمینی زندگی مراد ہے۔ ورنہ شہداء کے لیے نفسِ حیات کی قرآن میں اور خود اسی حدیث میں تصریح موجود ہے۔" واللہ اعلم بالصواب

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: جب ہم آپس میں ملتے ہیں تو ایک دوسرے کو السلام علیکم کہتے ہیں جو جمع کا صیغہ ہے اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام پیش کیا جاتا ہے تو کہا جاتا ہے "السلام علیک یا رسول اللہ" جو واحد کا صیغہ ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

شوکت علی خریداری ۴۹؁ سیالکوٹ

جواب: سلام صرف حق اسلام ہے اور غیر مسلم اصالۃً سلام کا مستحق نہیں۔ یہ سلامتی کا تحفہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو نعمتِ اسلام سے سرفراز ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہلِ کتاب کو سلام کہنے میں پہل نہ کرو اور اگر وہ سلام کہیں تو تم صرف وعلیکم پر اکتفا کرو۔ اس سے واضح ہے کہ تحفۂ اسلام صرف حق اسلام ہے اسی طرح ہم اگر کسی شخص کو پہلے سے نہ جانتے ہوں ناواقفی کا ماحول ہو اور وہ ہمیں سلام کہہ دے تو ہم مکلّف ہیں کہ اُسے مسلمان سمجھیں۔ قرآن عزیز میں ہے:۔

ولا تقولوا لمن القیٰ الیکم السلام لست مومناً۔ (پ۵ النساء ع۱۴)

ترجمہ: جو شخص تم پر سلام ڈالے اُسے یہ ہرگز نہ کہو کہ تو مومن نہیں۔

ایمان کی حقیقت بے شک یہ سلام نہیں۔ یہ صرف اس کی ایک علامت ہے لیکن ہم اس علامت سے ہی اسے مسلمان سمجھنے پر مجبور ہیں جب تک ایمان کی حقیقت جو خدا اور اس کے رسول کی جملہ تعلیمات کی تصدیق ہے اس کے کسی پہلو کی نفی نہ ہو۔ یہ علامت اسلام ہی کی دلیل سمجھی جائے گی۔ تاہم اس میں ظنّیت کو بہت دخل ہے۔ بواطن امور صرف اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں۔ ہمارا اسلام اور اسلام صرف ایک ظاہر کا نام ہے اور ہم گمان رکھتے ہیں کہ باطن بھی ایسا ہی ہو گا۔ لیکن کسی دوسرے کے متعلق یہ محض ایک مرتبۂ ظن ہے، مرتبۂ یقین نہیں۔ اس لیے یہ سلام ایک عمومی شکل میں پیش ہوتا ہے اور ہم کہتے ہیں السلام علیکم۔ اگر وہ خاص مخاطب حقیقۃً اس سلام کا مستحق نہیں تو پھر یہ سلام کسی مستحق پر جا پڑے گا۔ جمع کے صیغے میں جو جو افراد داخل تھے خواہ وہ افرادِ مجلس ہوں یا افرادِ جنس ملائکہ حاضرین ہوں یا کراماً کاتبین۔ کوئی نہ کوئی تو اس سلام کا ضرور اہل ہو گا جس کے لیے صیغہ جمع بہت مناسب ہے۔ ہاں دربارِ رسالت میں ایسا کوئی احتمال نہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم علیٰ وجہ القطع و الیقین اس مقامِ سلامتی پر فائز اور اس سلام کے مستحق ہیں۔ اس لیے وہاں پوری صراحت کے ساتھ بدون کسی احتمالِ ثانی کے صیغہ واحد سے عرض کیا جاتا ہے السلام علیک یا رسول اللہ اور اسی طرح شیخین کریمین حضرت

صدیق اکبرؓ اور حضرت فاروق اعظمؓ جن کے بواطن امور لسانِ نبوت سے تصدیق شدہ ہیں اور جن کے انجام کی خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارات جنت سے بکمال ہویدا ہے۔ ان پر بھی صیغۂ واحد سے سلام عرض کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہاں کوئی مرتبۂ ظن نہیں وہ یقینی طور پر فلاحِ آخرت سے ممتاز ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: اہل سنّت والجماعت کے نزدیک چاروں امام برحق ہیں۔ امام اعظمؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ۔ امام اعظمؒ کا عقیدہ ہے کہ خرگوش کا کھانا جائز ہے۔ امام شافعیؒ کا قول ہے کہ حرام ہے۔ جب ایک بزرگ حلال کہتے ہیں اور دوسرے حرام تو پھر دونوں حق پر کیسے ہو سکتے ہیں۔ خرگوش کے حلال ہونے کا مسئلہ واضح کیا جائے؟ سائل۔ محمد شریف سیکریٹری مسلم ویلفیئر ایسوسی ایشن موضع میترانوالی ضلع سیالکوٹ۔

جواب: اہلسنّت کے نزدیک بے شک چاروں امام برحق ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ حق میں تعدد ہے حق بلاشبہ واحد ہے اور وہ ایک ہی حقیقت ہے۔ یہ چاروں امام اصولی عقائد میں پوری طرح متفق ہیں۔ اور فروعِ متواترہ میں بھی ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ ہاں وہ فروعی مسائل جو اخبارِ احاد سے منقول ہیں ان میں کسی امام کے نزدیک حدیث ثابت ہونے یا نہ ہونے کی وجہ سے ان میں کہیں کہیں اختلاف ضرور پایا جاتا ہے۔ اسی طرح کئی ان مسائل میں بھی جو کتاب و سنّت میں منصوص نہیں اور ان کا حکم صرف اجتہاد سے ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ ان بزرگوں میں اختلاف موجود ہے۔ ان اجتہادی مسائل میں بھی حق بے شک واحد ہے اور مجتہد مصیب صرف ایک ہی ہوتا ہے۔ لیکن رحمۃ للعالمین کی شریعت کا دامنِ رحمت اتنا وسیع پھیلا ہوا ہے کہ بفحوائے حدیث نبوی مجتہد مخطی بھی محلِ ملامت نہیں بلکہ ایک اجر کا مستحق ہے اور اس حدیث پر امام بخاریؒ اور مسلمؒ دونوں متفق ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس مجتہد میں اجتہاد کی تمام شرطیں اصولاً موجود ہوں اور اس کا مجتہد ہونا ان علمی حلقوں میں مسلّم ہو جن پر مسائل کی نقد و جرح میں عمومی اعتماد پایا جاتا ہے۔ اس علمی مقام اور شانِ اجتہاد کے بغیر اگر کوئی نااہل اجتہاد کرتا ہے تو اس کی خطا ہرگز قابلِ درگزر نہیں۔ بلکہ وہ مصیب بھی ہو تو پھر بھی ملامت کا مستحق ہے۔

اس ارشادِ نبوّت کی رُو سے کہ مجتہد خطا بھی کرے تو اپنی سعیِ اجتہاد کی وجہ سے ایک اجر کا مستحق ہے وہ مجتہدین کرام جو اصولی عقائد اور فروعِ متواترہ میں پوری طرح متفق اور متحد ہیں اور صرف بعض اجتہادی مسائل میں علل اجتہاد میں اختلاف ہونے کی وجہ سے آپس میں مختلف ہیں سب کے سب برحق ہیں اور ان میں سے کسی ایک کی اتباع بھی کر لی جائے تو ہر وہ شخص جس کی اصل دلیل پر نظر نہ ہو عند اللہ ضرور مثاب و ماجور ہے۔ چاروں اماموں کے برحق ہونے کا مطلب یہی ہے اور حق کے واحد ہونے سے انکار نہیں۔ جو مجتہد اس پر فائز ہو

اور مصیب ہو وہ دُگنے اجر کا مستحق ہے۔ ارشادِ نبوت کا فیصلہ یہی ہے۔

یہ ائمہ کرام کوئی مامور من اللہ افراد نہیں کہ انہیں خدا کی طرف سے مرتبۂ امامت ملا ہو۔ بلکہ یہ ائمہ اعلام تعلیم و تعلّم اور نظر و اکتساب سے اس بلند علمی مقام پر فائز ہوئے کہ مسائل غیر منصوصہ کا حکم دریافت کرنے میں اُمت نے ان کے علم و فہم پر اعتماد کیا اور انہوں نے مسائل غیر منصوصہ کو مسائل منصوصہ کی طرف لوٹا کر اجتہاد و استنباط سے ان کا حکم شرعی دریافت کیا۔ بس یہ بزرگانِ کرام مسائل کے ظاہر کرنے والے ہیں قائم کرنے والے نہیں ہیں۔ شریعت کا اثبات صرف نبوت کی شان ہے اجتہاد صرف مظہر ہے مثبت ہرگز نہیں۔ وہ آخری امام جن کا منصب اثبات شریعت ہے صرف اور صرف جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے اور اس اعتبار سے نبوت اور امامت ایک ہی منصب کے دو اعتبار ہیں۔

۴۔ یہ غلط ہے کہ امام شافعیؒ خرگوش کو حرام کہتے ہیں اس پر حوالہ پیش کیا جائے تاکہ اس کی وضاحت ہو سکے؟ خرگوش کا حلال ہونا خود عملِ نبوت سے ثابت ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے مروی ہے۔

عن انسؓ قال انفجنا ارنباً ونحن بمرّ الظّهران فسعى القوم فلغبوا فاخذتها فجئت بها الى ابي طلحة فذبحها فبعث بوركيها او قال بفخذيها الى النبي صلى الله عليه وآله وسلم فقبلها۔[1]

ترجمہ۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ہم وادیٔ ظہران کے پاس سے گزر رہے تھے کہ ہم نے ایک خرگوش کا پیچھا کیا سب لوگ دوڑے اور تھک گئے پس میں نے اسے پکڑ لیا اور اسے حضرت ابوطلحہؓ کے پاس لے آیا انہوں نے اسے ذبح کیا اور اس کی دو رانیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھجوا دیں۔ آپ نے انہیں قبول فرمایا (یعنی تناول فرمایا یا اس کے حلال ہونے کی توثیق فرمائی)۔

خرگوش نہ مردار خور ہے اور نہ درندوں میں سے ـــــ پس اس کے حرام ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی مادہ کو خون آنے کی بناء پر جو اس کی کراہت بیان کی جاتی ہے۔ ابن خزیمہؒ کی وہ روایت سنداً بالکل ضعیف ہے اور سُنن نسائی کی روایت میں حضورؐ کا اسے نہ کھانا محض طبعاً تھا۔ جس طرح کسی چیز کو دل نہیں چاہتا شرعاً نہ تھا۔ ورنہ آپ اسی وقت دوسروں کو اس کے کھانے کا حکم نہ فرماتے۔

انه قال كلوا۔[2] "حضورؐ نے فرمایا، اس خرگوش کا گوشت کھاؤ"

ابن صفوان کہتے ہیں کہ میں نے دو خرگوش شکار کئے اور انہیں تیز دھار پتھر سے ذبح کیا اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا۔

---

[1] بخاری جلد ۲ صفحہ ۸۳۰ [2] نسائی جلد ۲ صفحہ ۱۷۵

فامرني باكلهما۔[1] "حضورؐ نے مجھے ان دونوں کے کھانے کی اجازت فرمائی"

ولا بأس باكل الارنب لان النبي صلى الله عليه وسلم اكل منه حين اهدي اليه مشويًا وامر اصحابه رضي الله عنهم بالاكل منه ولانه ليس من السباع ولا من اكلة الجيف فاشبه الظبي۔[2]

اور مادہ کو خون آنا کسی طرح کراہت کی دلیل نہیں۔ حیض اور نفاس کی جنس ایک ہے انواع مختلف ہیں اگر حیض کی بناء پر حرمت لازم آتی ہے تو نفاس (بچہ پیدا ہونے کے وقت آنے والا خون) بھی حرمت کی دلیل ہو جائے گا۔ جو بھیڑ، بکری، گائے اور اونٹنی سب میں برابر کا مشترک ہے۔ اس صورت میں تو کوئی بھی جانور حلال نہیں رہے گا۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔

بہرحال امام شافعیؒ کے ذمہ یہ لگانا کہ وہ خرگوش کی حرمت کے قائل تھے۔ یہ ایک بہت بڑا جھوٹ اور بہتان ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال ۱: حضرت امام اعظم صاحبؒ کے متعلق: کیا ہم آپ کا مذہب رکھتے ہیں۔ اگر ہم ان کا مذہب رکھتے ہیں تو یہ کون ہیں؟ کیا یہ بارہ اماموں میں سے ہیں؟ اگر یہ بارہ اماموں میں سے نہیں ہیں تو یہ کون بزرگ ہیں اور کس زمانے میں ان کو امامت ملی اور کس نے دی؟

۲۔ میں نے قرآن شریف میں خود پڑھا ہے کہ قیامت کے دن ہر ایک اپنے اپنے امام کے پیچھے اٹھیں گے آپ تحریر فرمائیں کہ وہ کون سے امام ہوں گے جن کے پیچھے قیامت کے دن اٹھیں گے؟

سائل۔ مرزا خاں سکنہ منہالہ ڈاک خانہ چوہا سیدن شاہ تحصیل پنڈ دادن خاں ضلع جہلم

جواب: جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مذہب پر ہیں تو ہماری مراد اس سے یہی ہوتی ہے کہ وہ مسائل جو کتاب و سنّت میں منصوص نہیں یا منصوص ہیں مگر متعارض ہیں تو ان مسائل غیر منصوصہ یا مسائل منصوصہ متعارضہ غیر معلومۃ التقدیم والتاخیر میں ہم حضرت امام اعظمؒ کے اجتہاد پر پورا اعتماد رکھتے ہیں کہ وہ علتِ حکم پر نظر کر کے ان مسائل کا حل کتاب و سنّت کے دوسرے منصوص مسائل کی روشنی میں واضح فرما دیتے ہیں۔ ہمارے یہ ائمہ کرام مجتہدین ہیں اور مجتہدین کا کام اثباتِ شریعت نہیں۔ استنباط و استخراج سے اظہارِ شریعت ہے۔

امام اعظمؒ تابعین میں سے ہیں جنہوں نے کئی صحابہ کرامؓ کی زیارت کی۔ آپ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔ اپنے وقت میں علم کلام، حدیث اور فقہ کا مرکز تھے۔ آپ کی امامت کوئی آسمانی منصب

---

[1] سنن نسائی جلد ۲ صفحہ ۱۷۵ [2] ہدایہ جلد ۳ صفحہ ۳۲۴

نہیں جس کے ملنے اور بعثت کا کوئی وقت مقرر ہو۔ بلکہ یہ ایک مرتبہ علمی ہے جو علم و فن کی تحصیل اور فہم و ذکاوت کی عملی تربیت کے ساتھ قائم ہوتا ہے اور یہ کائنات کی عملی ترتیب ہے کہ ہر فن میں اس کے کاملین پر اعتماد کیا جاتا ہے اور یہی ان ائمہ اجتہاد کی پیروی کی حقیقت ہے۔ ان کے حالات کے لیے آپ حضرت امام اعظمؒ کا شجرہ علمی کا مطالعہ فرمائیں۔ یہ احقر کی ایک پرانی تصنیف ہے۔

ہم اہل سنت کے نزدیک مشہور بارہ امام بھی کسی آسمانی امامت کے حامل نہ تھے۔ آسمانی مرتبۂ امامت حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اور کسی کے لیے ثابت نہیں۔ یہ مرتبۂ امامتِ آسمانی صرف پیغمبروں کی شان ہے۔ نبوت کے بغیر کسی آسمانی مرتبۂ امامت کا حاصل ہونا کتاب و سنت سے اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ ان بارہ اماموں کی امامت بھی محض ایک علمی اور اکتسابی مرتبہ ہے اور ان کی امامت کی حقیقت وہی ہے جو حضرت امام محمد بن حنفیہؒ، امام محمد بن سیرینؒ، حضرت امام حسن بصریؒ اور ان جیسے کئی دوسرے ائمہ دین کی امامت تھی۔ ہاں ان ائمہ دوازدہ میں سے جو شرفِ صحابیت پر فائز ہوئے وہ ان ائمہ اجتہاد سے کہیں بالا ہیں۔ وہ ان صحابہ کرامؓ میں معدود ہوتے ہیں جن کے مرتبے کو کوئی غیر صحابی نہیں پہنچ سکتا۔ ان کی بہت بڑی شان ہے۔ جس کا انکار ممکن نہیں ہے۔

۲۔ قیامت کے دن ہر کسی کو جو اُس کے امام کے نام سے بلایا جائے گا تو یہاں امام سے مراد ہر وہ پیشوا ہے جس کی کسی نے پیروی کی۔ فرعون کے پیرو اس کے نام سے بلائے جائیں گے اور نمرود کے پیرو نمرود کے نام سے۔ یہ ائمۃ الکفر اپنے اپنے پیروؤں کے امام ہوں گے۔ امام اچھے بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی۔ یہ کوئی آسمانی منصب نہیں کہ جس کے ایک ہی معنی ہوں۔ جیسے نبی اور رسول وغیرہ کے الفاظ صرف اچھا معنی ہی رکھتے ہیں۔ مرزا غلام احمد کے پیرو اس کے نام سے پکارے جائیں گے اور اہل اسلام انشاء اللہ العزیز الرحمٰن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے پکارے جائیں گے۔ کیونکہ ہمارے امام اور پیشوا وہی ہیں۔ ہم نے فروعی مسائل میں جن ائمہ کی پیروی کی ہے وہ ایک مصلحتی امر ہے کہ اجتہاد کی اہلیت نہ ہونے کے باعث ہم نے ان مجتہدین کرام کی پیروی کرلی لیکن یہ کوئی بنیادی امر نہیں۔ جس سے کسی ملت کی نشاندہی ہو۔ ہماری ملی نشاندہی انشاء اللہ العزیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے ہی ہوگی اور اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ ہم انہیں کے نام سے اُٹھائے جائیں۔ واللہ اعلم بالصواب

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال : حضور پیغمبر اسلامؐ نے اپنے آخری وقت میں حضرت عمرؓ کو قلم دوات لانے کا حکم دیا۔ حضورؐ کا منشاء یہ تھا کہ حضرت علیؓ کے لیے خلافت کا فیصلہ فرمادیں، اس بات کو حل کریں کہ حضرت عمرؓ نے قلم دوات کیوں پیش نہیں کیا؟

سائل : محمد اکرم ٹیچر ۲ گورنمنٹ ہائی سکول کوہاٹ

جواب : یہ غلط ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو قلم دوات لانے کے لیے کہا تھا۔ کسی حدیث میں اس کا ثبوت نہیں۔ یہ حضرت فاروق اعظمؓ پر ایک بہتان اور افترا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضور ختمی مرتبتؐ نے قلم دوات لانے کا یہ حکم حضرت علی مرتضیٰؓ کو دیا تھا۔ حضرت علیؓ خود فرماتے ہیں:

امرنی النبیؐ ان آتیه بطبق یکتب فیه ما لا تضل امته من بعده قال فخشیت ان تفوتنی نفسه[1]

ترجمہ۔ حضورؐ نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں آپ کے پاس ایک بڑا کاغذ لاؤں جس میں آپ وہ کچھ دیں کہ آپ کی امت آپ کے بعد گمراہ نہ ہو مگر میں وہ نہ لاسکا کہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں میرے پیچھے ہی آپ کی وفات نہ ہو جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس واقعہ کے پانچ دن بعد تک اس دنیا میں تشریف فرما رہے بس قلم دوات پیش نہ کرنے کی ذمہ داری حضرت عمرؓ پر کسی طرح عائد نہیں ہوتی۔ حضورؐ کا یہ حکم حضرت علیؓ کو تھا نہ کہ حضرت فاروق اعظمؓ کو۔ علاوہ ازیں اس کا مقصد خلافت کا فیصلہ لکھنا ہرگز نہ تھا۔ بلکہ جب آپ سے پوچھا گیا تو آپ نے یہی تین نصیحتیں فرمائیں کہ:

① —— یہود کو ہرگز جزیرہ عرب میں بالکل نہ رہنے دیا جائے۔
② —— بیرونی وفود کو اسی طرح آتے رہنے دینا جس طرح کہ میں انہیں آنے دیتا رہا۔
③ —— میری قبر کو عبادت گاہ نہ بنانا۔

پہلے دو حکم بخاری و مسلم میں منقول ہیں اور تیسرا مؤطا امام مالک میں موجود ہے اور اگر اس طلب قرطاس کا مقصد خلافت کا فیصلہ ہی تھا تو بھی حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا حکم لکھانے کا ارادہ فرمایا تھا لیکن جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو مطلع کر دیا کہ خدا کا فیصلہ اور مومنین کا اجماع ابوبکرؓ کے سوا اور کسی پر نہ ہوگا تو آپؐ نے اس ارادہ سے درگزر فرمایا۔ کیونکہ مقصود از خود حاصل تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کے لیے فیصلہ خلافت لکھوانے کا یہ ارادہ خود صحیح مسلم میں موجود ہے[2]۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سوال : حضرت عمرؓ نے حضورؐ کو ہذیان کہنے والا کہا اور یہ حضورؐ کی بہت سخت توہین ہے۔ اس کا جواب دعوت میں شائع فرمائیں؟

سائل۔ سعید الرحمٰن متعلم جامعہ عربیہ سراج العلوم سرگودھا

جواب : یہ محض افتراء اور بہتان ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہذیان کا لفظ کہا

---

[1] مسند امام احمد مبوب جلد ۲ ص ۸۴ مصر [2] صحیح مسلم جلد ص ۲۷۳

ہو کسی بھی معتبر سند سے یہ حضرت عمرؓ سے مروی نہیں بلکہ قالوا بصیغہ جمع کے الفاظ میں اسے نقل کیا گیا ہے۔ صحیح بخاری کے چھ مقامات پر پہلے ہمزہ استفہام انکاری موجود ہے۔ صرف ایک جگہ یہ نہیں پس وہاں بھی اسے محذوف مانا جائے گا اور حاصل یہ ہو گا کہ لوگوں نے کہا "کیا پیغمبر کو بھی ہذیان ہو سکتا ہے؟" ہرگز نہیں اور اس کا قرینہ اگلا جملہ ہے کہ استفہموہ ...... الخ حضورؐ جو فرما رہے ہیں اسے سمجھنے کی کوشش کرو ——
پس اگر پہلے جملے میں ہذیان کا اثبات ہو تو اگلے جملے کا اس سے کوئی ربط قائم نہیں رہتا۔ لہٰذا پہلے جملے میں ہمزہ استفہام انکاری کے اقرار سے چارہ نہیں۔ بایں ہمہ یہ الفاظ حضرت عمرؓ سے قطعاً منقول نہیں۔ یہ ان پر ایک افترا اور بہتان ہے یا محض شارحین کا ایک گمان۔ اس سے زیادہ اس امر کی کوئی حقیقت نہیں۔ واللہ اعلم۔

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: حضرت عمرؓ نے ایک زانیہ عورت کے رجم کرنے کا حکم دیا۔ حالانکہ وہ حاملہ تھی۔ حضرت علیؓ نے انہیں روکا اور فرمایا کہ آپ کو اس بچے پر کوئی حق نہیں۔ اس پر حضرت عمرؓ بہت نادم ہوئے اور اپنے حکم کو روک لیا۔ مخالفین کہتے ہیں کہ انہیں معاذ اللہ مسائل شرعیہ کی بھی پوری واقفیت نہ تھی۔ اس کا جواب بذریعہ دعوت دیا جائے؟

سائل۔ سعید ظفر چوک سنج اختیار سیالکوٹ

جواب: حضرت عمرؓ فاروق کو اس کے حاملہ ہونے کا علم نہ تھا۔ یہ نہیں کہ حضرت عمرؓ کے نزدیک حاملہ عورت پر حد جاری کرنا جائز تھا۔ مسئلے کا حضرت عمرؓ کو پورا علم تھا لیکن یہ واقعہ معلوم نہ تھا کہ عورت حاملہ ہے اور حمل کے ابتدائی مراحل محض دیکھنے سے پہچانے بھی نہیں جا سکتے۔ حضرت علیؓ اس عورت کو پہلے سے جانتے تھے اور انہیں علم تھا کہ وہ حاملہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت امیر المومنینؓ کی خدمت میں عرض کر دیا اور حقیقتِ حال کی اطلاع دے دی۔ حضرت عمر فاروقؓ اس اطلاع یابی پر بہت خوش ہوئے۔ اور اس پر حد جاری نہ فرمائی۔ اگر حضرت عمرؓ کو مسئلہ معلوم نہ ہوتا تو وہ حضرت علیؓ کی اس اطلاع دہی پر کہ وہ عورت حاملہ ہے حد جاری کرنے کو کیوں روک دیتے اس کی وجہ پوچھتے۔

باقی رہا یہ امر کہ فیصلہ کرتے وقت ایسے امور مخفیہ کا معلوم کرنا قاضی کے ذمہ ہے۔ سو یہ باتفاقِ فریقین ضروری نہیں۔ فقہ کی کسی کتاب میں ایسا استفسار نفاذِ حکم کے لیے شرط نہیں بتلایا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے حضرت علیؓ کو ایک دفعہ حکم دیا کہ فلاں زانی عورت پر حد قائم کریں، وہ تازہ تازہ حالتِ نفاس میں تھی۔ حضرت علیؓ نے اس پر حد قائم نہ کی اور حضورؐ کے پاس آکر صورت حال عرض کر دی۔ حضورؐ نے فرمایا احسنت تو نے اچھا کیا اور بہت خوش ہوئے۔ یہ حدیث فریقین کی کتابوں میں موجود ہے۔ پس اگر آنحضرت صلی اللہ

علیہ و سلم کا یہ حکم موجبِ اعتراض نہیں اور حضرت علیؓ کا یہ انکشاف موجبِ افضلیت نہیں تو حضرت فاروق اعظمؓ کا وہ حکم کس طرح موجبِ اعتراض ہو سکتا ہے اور حضرت علیؓ کا مذکورۃ الصدر انکشاف، کس اعتبار سے موجبِ افضلیت قرار دیا جا سکتا ہے؟ فتفکروا یا اولی الابصار۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے زمانے میں ایک عورت نماز پڑھنے کے لیے نکلی تو ایک شخص نے اسے راستے میں گرا لیا اور اس کے ساتھ زنا کیا۔ اس عورت نے شور کیا اور وہ شخص بھاگ گیا۔ ایک دوسرا شخص اس کے پاس سے گزرا تو اس عورت نے اسے زانی سمجھ لیا اور مجرم قرار دیا۔ پاس سے گزرنے والی مہاجرین کی ایک جماعت نے اسے پکڑا اور حضور صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے پاس لے آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے ظاہر حال کے مطابق اس پر حد جاری کرنے کا حکم دے دیا۔ اس پر وہ اصل مجرم جس نے عورت کے ساتھ زنا کیا تھا بول اٹھا اور کہا کہ حقیقی مجرم میں ہوں۔ آپ نے پہلے شخص سے حکم روک لیا اور اصل مجرم پر حد جاری فرما دی۔ اس کی حق گوئی پر حضورؐ نے فرمایا:۔

لقد تاب توبة لو تابها اهل المدينة تقبل منهم[1]

ترجمہ۔ اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اسے سارے اہلِ مدینہ کی طرف سے شمار کیا جاتا تو یہ سب کے لیے کافی تھی۔

اس طرح کے بیسیوں واقعات احادیث و سیر کی کتابوں میں موجود ہیں۔ شریعت ظاہری حالات پر مبنی ہے۔ بواطن امور کا کھوج لگانا قانون کی رسائی سے بالا ہے۔ ہاں اگر ان امور مخفیہ پر کسی اور طریق سے اطلاع ہو جائے تو پھر یہ بواطن بھی ظواہر کا حکم اختیار کر لیتے ہیں۔ اندریں صورت حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کے انکشاف کو قبول فرمایا اور اپنے حکم کو روک لیا۔ باقی آپ کا یہ کہنا کہ لولا علی اهلك عمر۔ یہ از روئے تواضع اور انکسار تھا اور ایسی شخصیاتِ کریمہ کا اندازِ کلام ایسا ہی ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

کتبہ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: حضرت عمرؓ نے نمازِ تراویح ایجاد کی اور اسے نعمت البدعة هذه کہہ کر اچھی بدعت قرار دیا۔ حالانکہ پیغمبر اسلامؐ نے کل بدعة ضلالة کہہ کر ہر بدعت کو گمراہی کہا تھا۔ بدعت میں اچھائی کیسے آ سکتی ہے۔ اس کا جواب دے کر مشکور فرمائیں؟

سائل۔ ارشاد احمد از سرائے عالمگیر

جواب: حضرت فاروق اعظمؓ نے نماز تراویح خود ایجاد نہیں کی بلکہ اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے مشروع فرمایا تھا۔ حضورؐ خود فرماتے ہیں:۔

---

[1] سنن ابی داؤد جلد ۲ صفحہ ۶۰۱

شہر کتب اللہ علیکم صیامہ وسننت لکم قیامہ[1]

ترجمہ: یہ ایسا مہینہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے روزے تم پر فرض کئے اور میں نے اس کا قیام (نمازِ تراویح) تمہارے لیے سنت بنایا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مواظبت ترک فرمائی۔ کہ کہیں اس نماز کی فرضیت لازم نہ آجائے بایں ہمہ صحابہ کرامؓ متعدد جماعتوں کی صورت میں نمازِ تراویح کرتے رہے اور حضورؐ کو اس کی اطلاع بھی ہوتی رہی۔ سنن ابی داؤد میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تراویح کی جماعت ہوتے دیکھی اور فرمایا:۔

اصابوا ونعم ما صنعوا۔ "انہوں نے صحیح کیا ہے اور جو کیا اچھا کیا ہے"

ابوداؤد کی یہ روایت امام بیہقی کی کتاب معرفۃ السنن والآثار میں بھی سند جید کے ساتھ موجود ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز تراویح پر جب مواظبت ترک کی تو اُسے عن اصلہٖ ترک نہ کیا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو جو صحابہؓ علیحدہ علیحدہ جماعتوں کی صورت میں عمل پیرا رہے۔ حضورؐ ان کی تصدیب نہ فرماتے بلکہ انہیں منع کرتے۔

حضرت عمرؓ نے جو کچھ کیا وہ یہی تھا کہ انہیں متعدد اور متفرق جماعتوں سے ہٹا کر ایک مرکزی جماعت پر جمع کر دیا۔ کیونکہ حضورِ حتمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریفہ کے بعد اب اس مواظبت سے اس کے فرض ہونے کا کوئی امکان باقی نہ تھا۔ حضرت عمرؓ کا عمل محض یہی ہے ایجاد تراویح ——— یا ایجاد جماعت تراویح ہرگز نہیں اور صحیح بخاری میں اس پر نص موجود ہے۔ باقی رہا آپ کا یہ فرمانا کہ یہ اچھی بدعت ہے۔ یہ محض برسبیل الزام تھا۔ گویا حضرت عمرؓ یہ کہہ رہے ہیں کہ "اگر یہ بدعت ہے تو چلو بدعت ہی سہی یہ اچھی بدعت ہے" اور یہ پورے الفاظ جن سے اس جواب کا الزامی ہونا واضح ہوتا ہے۔ امام محمد بن نصر مروزی کی کتاب قیام اللیل میں موجود ہیں۔ کنز العمال میں بھی اس کی تائید موجود ہے۔

فتح الملہم میں ہے کہ آپ نے پوری بات یوں فرمائی تھی۔ لئن کانت ھذہ لبدعۃ نعمت البدعۃ ھی[2] (جلد ۲ ص ۳۱۹) پس مجمل روایت کو دوسری مفصل روایات کی روشنی میں حل کرنا چاہیئے۔

جو بات پہلے نہ ہوئی ہو وہ تو بدعت ہے۔ لیکن جو عمل پہلے ہوتا رہا اور پھر بلا اعلان نسخ اسے چھوڑ دیا گیا۔ اسے کسی طرح بدعت نہیں کہا جا سکتا۔ اسے اس کی حیثیت میں دوبارہ لے آنا لغۃً تو نئی بات ہو سکتا ہے شرعاً نہیں۔ نعمت البدعۃ ھذہ۔ اسی کو کہتے ہیں۔

پھر بدعۃ شرعی کی حد تو صحابہؓ کے بعد سے شروع ہوئی ہے۔ وہ خود بدعت کا موضوع کیسے بن سکتے

[1] سنن ابن ماجہ ص ۹۵ [2] فتح الملہم جلد ۲ ص ۳۱۹

ہیں۔ ان کا اپنا قول اور عمل خود امت کے لیے حجت ہے۔ اسے اگر چھوڑا جا سکتا ہے تو کسی دوسرے صحابی کے قول و عمل سے تمسک کرتے ہوتے ——— اپنے طور پر اسے چھوڑنے کا کسی کو حق نہیں۔ حضرت حذیفہؓ (۳۶ھ) فرماتے ہیں:۔

کل عبادۃ لم یتعبدھا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلا تعبدوھا۔[1]

ترجمہ: ہر وہ عمل عبادت جسے حضورؐ کے صحابہؓ نے عبادت نہیں جانا تم اسے عبادت کے طور پر عمل میں نہ لانا۔

جب صحابہؓ پر تنقید کرنا خود بدعت ہے تو وہ خود بدعت کا موضوع کیسے ہوں گے۔ علامہ عبدالشکور السالمی تمہید میں لکھتے ہیں:۔

الکلام فی البدعۃ علی خمسۃ اوجہ الکلام فی اللہ والکلام فی قدرۃ اللہ والکلام فی عبید اللہ والکلام فی اصحاب رسول اللہ۔[2]

ترجمہ: بدعت پانچ طرح کی ہے۔ اللہ کے بارے میں وہ بات کہنا جو پہلوں نے نہیں کہی، قرآن کے بارے میں نیا قول کرنا، اللہ کی قدرت میں لب کشائی کرنا، اللہ کے پیغمبروں کے بارے میں نئی بات کہنا اور صحابہ پر کسی قسم کی تنقید کرنا۔

حافظ ابن کثیر (۷۷۴ھ) لکھتے ہیں:۔

اما اھل السنۃ والجماعۃ فیقولون فی کل فعل وقول لم یثبت عن الصحابۃ رضی اللہ عنھم ھو بدعۃ۔[3]

ترجمہ: اہل السنۃ والجماعۃ ہر اس قول اور عمل کو جو صحابہؓ سے ثابت نہ ہو بدعت کہتے ہیں۔

پس ہر چہ خلفاء راشدین بداں حکم کردہ باشند۔ ۔ ۔ ۔ اطلاق بدعت برآں نتواں کرد۔[4]

واللہ اعلم بالصواب۔ کتبہ خالد محمود عفا اللہ عنہ

بخدمت جناب ایڈیٹر صاحب ہفت روزہ دعوت لاہور

السلام علیکم! بعض دفعہ دعوت کے باب الاستفسارات میں شہید اول، شہید ثانی، شہید ثالث وغیرہ کے الفاظ دیکھنے میں آتے ہیں۔ شیعہ علماء کی یہ اصطلاح عام لوگوں کو معلوم نہیں۔ اس بات کی دعوت میں وضاحت کر دیں کہ یہ کون کون بزرگ تھے؟

[1] الاعتصام للشاطبی جلد ۱ ص ۵۴ [2] التمہید لابی شکور السالمی ص ۱۸۹ [3] تفسیر ابن کثیر ص ۱۵۶ ج ۴ [4] اشعۃ اللمعات ج ۱ ص ۱۲۰/۱۷۰

۷۔ حضور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث کس کتاب میں ہے کہ اس امت میں ہر صدی کے شروع میں مجددین آتے رہیں گے کیا شیعہ لوگ بھی اس حدیث کو مانتے ہیں۔ ان کے عقیدہ میں کون کون سے علماء مجدد ہو گزرے ہیں؟

۴۔ شیعہ لوگ اہل تشیع کے الفاظ سے بہت ناراض ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں ہمیں اہل شیعہ کہا کرو، اہل تشیع نہ کہو۔ ہمارے شیعہ اسلاف نے اپنے لیے تشیع کا لفظ کبھی استعمال نہیں کیا۔ اس بات کے لیے کوئی حوالہ بتائیں کہ شیعہ علماء نے شیعہ کے لیے کہیں تشیع کا لفظ استعمال کیا ہو؟ سائل عبدالصمد نور بادار خانیوال

جواب ۱: شیعہ حضرات اپنے مندرجہ ذیل علماء کو خاص شہید شمار کرتے ہیں۔ یہ علماء اپنے عقائد میں اس قدر متعصب اور اپنے معمول میں اس قدر سفاک، بے باک اور زبان دراز تھے کہ ان کی زبان تبرائیہ صحابہ کرام کو معاف کرتی تھی اور نہ ان کے سب وشتم سے کسی بزرگ اور ولی کا دامن محفوظ تھا۔ اس جرم کی پاداش میں یہ اپنے کیفرِ کردار کو پہنچے اور وقت کی مسلمان حکومتوں نے ناموسِ صحابہ کے باب میں اپنی اسلامی غیرت کا پورا ثبوت دیا۔ ان کے نام یہ ہیں:۔

① شہید اول: شیخ شمس الدین محمد بن مکی الآملی —— یہ قاضی برہان الدین مالکی اور علامہ ابن جماعۃ الشافعی کے حکم سے قتل کیے گئے۔ بعض شیعہ شیخ محمد بن جمال الدین کو شہید اول کہتے ہیں۔ یہ علامہ حلی کے بیٹے فخر المحققین کے شاگرد تھے۔ ان کا زمانہ امیر تیمور کا تھا۔

② شہید ثانی: شیخ زین الدین —— یہ مشہور شیعہ عالم شیخ بہاؤ الدین آملی کے باپ شیخ حسین کے استاد تھے۔ ترکوں کے حکم سے صحابہ کرامؓ کو سب وشتم کرنے کے جرم میں قتل کیے گئے۔

③ شہید ثالث: قاضی نوراللہ شوستری —— یہ مغل تاجدار جہانگیر کے حکم سے قتل کیے گئے۔ ان کی قبر آگرہ میں ہے۔ مجالس المومنین اور احقاق الحق کے مصنف یہی ہیں۔ ان کی قبر کے پاس سے آگرہ کا مشہور نالا بہتا ہے۔ زائرین اس طرح ان کا پتہ چلاتے ہیں۔

۲۔ ہر صدی میں مجدد آنے کی حدیث اہل سنت کی کتابوں میں سے سنن ابی داؤد وغیرہ میں موجود ہے شیعہ حضرات بھی اسے روایت کرتے ہیں اور ان کی معتبر کتاب مستدرک میں جامع الاصول سے یہ روایت منقول ہے۔ شیعہ کے نزدیک قرونِ ماضیہ کے مجددین یہ گزرے ہیں:۔

① پہلی صدی کے مجدد حضرت امام باقر وفات ۱۱۴ھ
② دوسری صدی کے مجدد حضرت امام رضا وفات ۲۰۳ھ
③ تیسری صدی کے مجدد ملا محمد بن یعقوب الکلینی وفات ۳۲۹ھ

④ چوتھی صدی کے مجدد سید مرتضیٰ علم الہدیٰ وفات ۴۳۶ھ
یا بقول بعض علماء شیخ مفید وفات ۴۱۳ھ
⑤ پانچویں صدی کے مجدد شیخ فضل بن حسین صاحب تفسیر مجمع البیان وفات ۵۴۸ھ
⑥ چھٹی صدی کے مجدد خواجہ نذیر طوسی وزیر ہلاکو خاں وفات ۶۷۲ھ
⑦ ساتویں صدی کے مجدد ابن مطہر حلّی وفات ۷۲۶ھ
⑧ آٹھویں صدی کے مجدد محمد جمال الدین شہید اول وفات ۷۸۶ھ
⑨ نویں صدی کے مجدد شیخ علی بن عبدالعال الکرکی العاملی (محقق ثانی) وفات ۹۴۰ھ
⑩ دسویں صدی کے مجدد شیخ محمد بن الحسینی العاملی المعروف شیخ بہائی وفات ۱۰۳۰ھ
⑪ گیارہویں صدی کے مجدد ملا محمد باقر مجلسی وفات ۱۱۱۱ھ
⑫ بارہویں صدی کے مجدد ملا محمد باقر بھبہانی وفات ۱۲۰۸ھ
⑬ تیرہویں صدی کے مجدد مرزا محمد بن حسن الشیرازی ۱۳۱۲ھ
(یہ فہرست شیعہ مذہب کے ثقہ جلیل رکن الاسلام محمد ہاشم الخراسانی المشہدی نے پیش کی ہے۔[۱]
⑭ چودہویں صدی کے شیعہ علامہ روح اللہ خمینی وفات ۱۴۰۹ھ کا نام لیتے ہیں۔

◉

۳۔ تشیع کا لفظ کوئی مخالفانہ نام نہیں۔ شیعہ حضرات خواہ مخواہ اس سے ناراض ہیں۔ شیعہ حضرات کے نامور عالم یوسف بن یحییٰ الیمنی الصنعانی نے ان شعراء پر جو شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے تھے ایک مستقل کتاب لکھی تھی اس کتاب کا نام ہی یہ ہے "نسیمۃ السحر فیمن تشیع وشعر" اس میں شیعہ مذہب کے اختیار کرنے کو صریح طور پر تشیع کہا گیا ہے۔ ہلاکو خاں کے پڑپوتے شاہ خدابندہ کو علامہ ابن مطہر حلّی نے شیعہ کیا تھا۔ اس کے متعلق علامہ محمد ہاشم الخراسانی یوں لکھتے ہیں:۔

مرحوم علامہ سبب شد از برائے تشیع سلطان محمد الملقب بہ شاہ بندہ ص[۲] طہران ایران

اس میں شیعہ ہونے کے لیے صریح طور پر تشیع کا لفظ موجود ہے پس شیعہ علماء کی اس لفظ سے گریز پائی محض ان کی کم علمی اور ضد کی وجہ سے ہے۔ وہ اس لیے اس لفظ سے بچتے ہیں کہ اس میں علیحدگی اور تفرقہ پسندی کا مفہوم نمایاں طور پر پایا جاتا ہے کہ یہی لوگ فرقہ بندی کرنے والے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب خالد محمود عفا اللہ عنہ

---

[۱] منتخب التواریخ ص۷۵ یہ کتاب ۱۳۴۹ھ میں طہران سے شائع ہوئی ہے۔ [۲] ایضاً ص۷۶

سوال ۱۲ : مکرمی ایڈیٹر صاحب دعوت لاہور

سلام مسنون ۔ حضرت علامہ خالد محمود صاحب ایم اے ۔ پروفیسر ایم اے ۔ او کالج لاہور آپ مورخہ ۴ اگست کو ہمارے ہاں علاقہ حصار میں تشریف لائے تھے ۔ آپ نے یہاں ایک گفتگو میں فرمایا تھا کہ حضرت حسین رض کی بیٹی حضرت سکینہ کا نکاح حضرت عثمان رض کے پوتے کے ساتھ ہوا تھا ۔ شیعہ حضرات کہتے ہیں کہ بی بی سکینہ کا انتقال چار سال کی عمر میں ہوا تھا ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان کا اس عمر میں کہیں نکاح ہوا ہو ۔ اس مسئلہ کی تحقیق فرمائیں ؟

صوفی غلام سرور از حصار

جواب : شیخ مفید ارشاد میں اور علامہ طبرسی اعلام الورے میں لکھتے ہیں کہ حضرت امام حسین رض کی دو بیٹیاں تھیں ، ۱ ۔ فاطمہ خاتون ۔ ۲ ۔ سکینہ خاتون ۔ ان دونوں کے متعلق نکاحوں کی تحقیق حسب ذیل ہے :۔

۱ ۔ فاطمہ خاتون ۔ ان کی والدہ ام اسحاق بنت طلحہ تھیں ۔ ان کا نکاح حضرت امام حسین رض نے اپنے بھتیجے حسن مثنیٰ سے کیا ۔ ان سے ان کے ہاں تین بیٹے پیدا ہوئے ۔ ان کے بعد اس فاطمہ بنت حسین رض کا نکاح حضرت عثمان رض کے پوتے عبداللہ بن عمرو سے ہوا ۔

۲ ۔ سکینہ خاتون ۔ ان کی والدہ رباب بنت امرؤ القیس تھیں ۔ علامہ طبرسی اعلام الورے میں لکھتے ہیں کہ ان کا نکاح امام حسین رض نے عبداللہ الحسن سے کیا تھا ۔ مگر رخصتی سے پہلے ہی عبداللہ الحسن انتقال کر گئے ان کے بعد ان کا نکاح حضرت مصعب بن زبیر رض سے ہوا ۔ ان کے بعد اسی سکینہ بنت الحسین رض کا نکاح حضرت عثمان رض کے چھوٹے بیٹے سے ان کے پوتے حضرت زید بن عمرو سے ہوا ۔

اس طرح حضرت حسین رض کی دونوں بیٹیاں حضرت عثمان رض کے خاندان میں بیاہی گئیں ۔ ان نکاحوں کی تصریح شیعہ کی معتبر کتابوں تذکرہ سبط ابن جوزی اور منتخب التواریخ ص ۲۴۰ مطبوعہ طہران وغیرہ میں موجود ہے ۔ مشہور شیعہ مؤرخ اور جج سید امیر علی نے اپنی کتاب تاریخ صحرا نشیناں کے ص ۲۰۲ کے حاشیہ پر اس سکینہ بنت الحسین رض کے حضرت عثمان رض کے پوتے کے نکاح میں آنے کو صریح لفظوں میں تسلیم کیا ہے ۔ واللہ اعلم بالصواب

کتبہ ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال : ہمارے علاقہ میں ایک پادری صاحب قرآن شریف کی آیات سے مسلمانوں کو ایک مغالطہ دے رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب عیسیٰ مسیح روح اللہ ہے تو کیا اس سے اس کی الوہیت ثابت نہیں ہوتی ؟ خدائے قدوس کی روح کچھ خدا سے کم تر نہیں ۔ اس لیے حضرت یسوع مسیح خدا کے بیٹے ہیں ۔ وہ ان آیات سے استدلال کرتا ہے :۔

۱ ۔ ومریم ابنت عمران التی احصنت فرجها فنفخنا فیه من روحنا ۔ (پ ۲۸ تحریم ۲)

ترجمہ ۔ اور مریم بیٹی عمران کی تھی جس نے روکے رکھا اپنے آپ کو مرد سے ۔ پس ہم نے اس کے گریبان میں اپنی روح پھونک دی ۔

۲ ۔ انما المسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ وکلمته القاها الیٰ مریم وروح منه ۔ (پ ۶ نساء ۴۴)

ترجمہ ۔ مسیح عیسیٰ ابن مریم اللہ کے رسول اور اس کا کلمہ ہیں جو اس نے اتارا مریم کی طرف اور روح ہے اس کی طرف سے ۔

ان آیات سے الوہیتِ مسیح اور ابنیتِ مسیح کے حق میں بہت سے شبہات پیدا ہو گئے ہیں ۔ ان کی تفصیل و تحقیق مطلوب ہے ؟

سائل ۔ غلام مصطفیٰ از بہاولپور

جواب : قرآن پاک میں صرف حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں ہی روح کی نسبت خدا کی طرف نہیں ہے بلکہ کئی مقامات پر روح کی نسبت خدا کی طرف ہونا کچھ اور برگزیدہ ہستیوں کے لیے بھی وارد ہے پس اگر روح اللہ یا خدا کی طرف سے روح وغیرہ کے اطلاقات الوہیت یا ابنیت خداوندی کا شبہ پیدا کرتے ہیں تو ان برگزیدہ شخصیتوں کے متعلق تو کوئی بھی اس اعتقادِ باطل کا قائل نہیں ۔ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے سلسلے میں قرآنی ہدایت یہ ہے :۔

ثم سواه ونفخ فیه من روحه ۔ (پ ۲۱ السجدہ ع ۱)

ترجمہ ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے برابر کیا اور اس میں اپنی روح پھونک دی ۔

اس آیت میں روح کا لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف مضاف ہے ۔ اور اس کا موردِ نفخ حضرت آدم علیہ السلام کی ذات ہے ۔ اگر روح سے مراد (معاذ اللہ) ذاتِ خداوندی یا ابنیت خداوندی ہو تو لازم آئے گا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو بھی خدا یا خدا کا بیٹا کہا جائے اور اس صورت میں کل بنی آدم ابنائے باری تعالیٰ قرار پائیں گے ۔ حالانکہ ان لوازم کا کوئی بھی قائل نہیں ، پس ملزوم بالبداہتہ باطل ہے ۔ ایک اور مقام پر وارد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق فرمائی تو فرشتوں کو حکم دیا :۔

فاذا سویته ونفخت فیه من روحی فقعوا له ساجدین ۔ (پ ۱۴ الحجر ۳ ، پ ۲۳ ع ۵)

ترجمہ ۔ پھر جب میں آدم کو ٹھیک بنا لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے سامنے سجدہ میں جا پڑو ۔

ان آیات میں اللہ رب العزت نے صریح طور پر حضرت آدم علیہ السلام کے نفسِ ناطقہ کو اپنی روح فرمایا اور اس کے لیے روحہ اور روحی کے اطلاقات فرمائے ۔ پس معنی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

انسان میں اپنی جان ڈالی یعنی اپنی طرف سے انہیں زندگی عطا فرمائی۔

تحقیق یہ ہے کہ ویسے تو ہر مخلوق اللہ رب العزت کی ہے اور وہی سب کا مالک، مدبر اور متصرف ہے۔ لیکن اللہ رب العزت بعض اوقات کسی مخلوق کو خصوصیت کے ساتھ اپنی طرف نسبت اور اضافت کر لیتے ہیں اور اس سے مقصد اس مخلوق کا اکرام، اعزاز اور تشریف ہوتی ہے اس شرف ہی کو اضافتِ تشریفی کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں کسی ایک گھر میں مکین نہیں۔ مگر مسجد حرام پھر بھی بیت اللہ شریف کہلاتی ہے اور اس کے معنی ہیں "اللہ کا گھر"، اس سے کعبہ کی عظمت مقصود ہے۔ یہ اضافت صرف تشریفی ہے۔ قرآن عزیز میں ہے:۔

وعهدنا الى ابراهيم واسماعيل ان طهرا بيتي للطائفين والعاكفين والركع السجود۔ (پ البقرہ آیت ۱۲۵)

یہاں صریح طور پر کعبہ مکرمہ کو اللہ کا گھر کہا گیا ہے۔ اسی طرح حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو "ناقۃ اللہ" کہا گیا ہے ——— وہ ایامِ ماضیہ جن میں رب العزت کی قدرت کا خصوصی اظہار ہوا "ایام اللہ" کہلاتے ہیں۔ ماہِ رجب کو "شہر اللہ (اللہ کا مہینہ)" کہا جاتا ہے اور مساجد بھی خانہ خدا کہلاتی ہیں۔

ایسے سب اطلاقاتِ مذکورہ مخلوقات کے لیے خواہ وہ زمانی ہوں یا مکانی تشریفات اور کرامات ہیں۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے روح اللہ ہونے کی حقیقت بھی اکرام اور تشریف ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی وہ روحِ مقدسہ جس کے اختصاصات کی وجہ سے رب العزت نے اسے اپنی خاص روح ارشاد فرمایا ——— علاوہ ازیں جن چیزوں کی پیدائش اللہ تعالیٰ کی عادتِ عامہ کے خلاف عجیب طور پر ہو، اللہ تعالیٰ اس کی نسبت بھی اپنی طرف فرما لیتے ہیں۔ جیسے ہر ایک کا رازق اور روزی رساں اللہ تعالیٰ ہے مگر حضرت مریم طاہرہ کے پاس جب خلافِ موسم میوے آتے تھے تو انہوں نے انہیں خصوصیت کے ساتھ ہو من عند اللہ فرمایا۔ کیونکہ ان کا ظہور عام عادت اللہ کے خلاف تھا اور مقام کی نزاکت بھی یہی چاہتی تھی کہ ان کی نسبت براہِ راست خدا تعالیٰ کی طرف ہو۔ سورۂ جاثیہ میں تو زمین اور آسمان کی ہر مخلوق کو خدا تعالیٰ کی طرف سے اسی انداز میں ظاہر کیا گیا ہے۔ جیسے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "روح منہ" کہا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

سخر لكم ما في السموات وما في الارض جميعًا منه۔ (پ۲۵ الجاثیہ ع ۲)

پس روح منہ کے معنے کرتے ہوئے اس قرآنی اطلاق جمیعًا منہ کو بھی کبھی دیکھ لیا کریں۔ اس سے ہر اشتباہ جاتا رہے گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال ۲: محرم میں حضرت امام حسینؓ کا یومِ شہادت جس طرح یوم عاشورہ کو منایا جاتا ہے۔ اس طریق کا آغاز کب سے ہوا۔ یہاں ایک عالمِ دین نے یہ کہا ہے کہ بارہ اماموں کے دور تک اس رسم کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ یہ طریق ماتم بہت بعد میں قائم ہوا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس پر کوئی تاریخی حوالہ پیش فرمائیں۔ ہو سکے تو کسی شیعہ مصنف کا حوالہ بھی پیش کر دیں؟ سائل۔ ارشاد احمد سرائے عالمگیر

جواب: یہ ٹھیک ہے کہ گیارہ اماموں کے عہدِ مبارک تک تقریباتِ محرم کا یہ انداز روئے زمین پر کہیں نہ تھا۔ نہ شیعہ کتبِ فقہ میں اسے کوئی مذہبی تقاضا بتلایا گیا ہے۔ یوم عاشورہ کی یہ صورت بہت بعد کی ایجاد ہے۔ دسویں صدی عیسوی میں المستکفی باللہ عباسی حکمران تھا۔ اس کے دربار میں معز الدولہ دیلمی ایک مشہور شیعہ امیر تھا۔ جس نے ۹۴۶ء میں اسے تخت سے اتار کر المطیع کو تخت پر بٹھایا۔ شیعہ کی موجودہ تقریبات کا موجد یہی دیلمی ہے اور یہ سب رسوم اسی کی شریعت ہیں۔ بارہ اماموں کا دامن ان رسوم سے بالکل پاک رہا ہے۔ المطیع نے ۹۴۶ء سے لے کر ۹۷۴ء تک حکومت کی۔ مشہور مستشرق Hitti اس دور کے متعلق لکھتے ہیں:۔

Shia Festivals were now established, particularly the Public mourning on the anniversary of al-Husayn's death (10th of Muharram)[1]

ترجمہ۔ شیعہ میلے اب اس دور میں قائم ہوئے خاص طور پر حضرت امام حسینؓ کا پبلک مقامات پر ماتم جو دسویں محرم کو ہوتا ہے اسی دور کی ایجاد ہے۔[1]

جسٹس امیر علی بھی Justice Ameer Ali رقمطراز ہیں:۔

Muiz-ud-Daula, although a patron of Arts and Literature was cruel by nature. He was a Shia and it was he who established the 10th Day of the Muharram as a day of mourning in commemoration of the Massacre of Karbla.[2]

ترجمہ۔ معز الدولہ اگرچہ علم و ادب کا مربی تھا۔ مگر اس کی فطرت بہت ظالم تھی۔ وہ شیعہ تھا اور یہی وہ شخص ہے جس نے دسویں محرم کو شہادتِ کربلا کی یاد میں یہ طریقہ قائم کیا۔ واللہ اعلم۔ خالد محمود عفا اللہ عنہ

۱؎ ص۴۷۰ مطبوعہ لندن ۱۹۵۳ء History of the Sarcens ۲؎ ص۳۰۳ مطبوعہ لندن ۱۹۵۱ء

ل : قادیانی کہتے ہیں کہ مرزا صاحب نے نبوت کا دعوے کیا۔ اگر یہ محض افترار اور جھوٹ تھا تو وہ
تِ طبعی تک زندہ کیسے رہے۔ جو شخص خدا پر افترار باندھے وہ نہایت ذلت کی موت مرتا ہے۔
تِ طبعی تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ مگر مرزا صاحب کا سلسلہ تو ان کے بعد بھی قائم ہے اس مغالطے
ضاحت کیجئے؟ سائل فضل رحیم از شیخوپورہ

اب : "فلاح نہ پانا اور فائز المرام نہ ہونا" یہ صرف انہیں کفار سے خاص نہیں جو اللہ رب العزت
افترار کر کے اللہ پر جھوٹے دعوے کریں۔ بلکہ قرآن کی رو سے کوئی کافر بھی فوز و فلاح کا مستحق نہیں
رآن کریم میں ہے :۔

انہٗ لا یفلح الکافرون۔ (پ۱۸۔ المومنون)

ترجمہ۔ بے شک کافر فلاح نہیں پائیں گے۔

اس آیت کی رو سے کوئی کافر خواہ وہ ہندو یا عیسائی، دہریہ ہو یا یہودی، ہرگز فلاح نہیں پائیں گے۔ اب اس فلاح نہ پانے اور کامیاب نہ ہونے کو کسی خاص قسم کے کافروں سے مخصوص کرنا اور یہ کہنا کہ جو شخص نبوت کا جھوٹا دعوے کرے وہ فلاح نہیں پائے گا۔ یہ محض سینہ زوری اور تحکم ہے۔ قرآن کریم اس خیال کی تائید نہیں کرتا۔ وہ شخص جو خدا پر افترار باندھے اور وہ شخص جو اللہ کی آیتوں اور نشانیوں کو جھٹلائے قرآن میں دونوں کو ایک ہی لڑی میں پرو دیا گیا ہے اور پھر دونوں کا ایک ہی حکم ہے کہ ایسے ظالم ہرگز فلاح نہیں پائیں گے۔ قرآن پاک کہتا ہے :۔

ومن اظلم ممن افتریٰ علی اللہ کذبًا او کذّب بآیاتہ انہٗ لا یفلح الظالمون۔ (پ۷ انعام ع ۳)

ترجمہ۔ اور اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے جو خدا پر جھوٹ باندھے یا اس کی نشانیوں کو جھٹلائے۔ بے شک ایسے ظالم ہرگز فلاح نہیں پائیں گے۔

پھر ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے :۔

فمن اظلم ممن افتریٰ علی اللہ کذبًا او کذّب بآیاتہ انہٗ لا یفلح المجرمون۔ (پ۱۱ یونس ع ۲)

ترجمہ۔ اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہے جس نے خدا پر جھوٹ باندھا یا اس کی آیات کی تکذیب کی۔ ایسے گنہگار یقینًا فلاح نہیں پائیں گے۔

ان آیاتِ کریمہ میں "مفتری علی اللہ" اور "مکذب بآیات اللہ" دونوں کو ایک ہی حکم میں داخل کیا گیا ہے۔ پس اس عدم فلاح اور ناکامی کو مفتری علی اللہ سے خاص کرنا فہم قرآن سے خالی ہونے کی وجہ سے ہے۔

فلاح نہ پانے سے یہ مراد لینا کہ وہ عمر طبعی پوری نہ کریں گے۔ یا دُنیا میں کسی قسم کی عزت نہ پائیں گے۔ یہ نظریہ بالکل غلط اور ہدایت کے خلاف ہے۔ جن لوگوں نے تاریخ عالم کے نشیب و فراز دیکھے ہیں اور نیکوں اور بدوں کی دنیوی تاریخ ان کی نظر سے اوجھل نہیں۔ انہیں یقین ہے کہ ان آیاتِ قرآنیہ میں کامیابی سے مراد دنیا کی کامیابی نہیں۔ بلکہ آخرت کی فوز و فلاح مقصود ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کے تمام ساتھیوں سے خطاب فرمایا تھا :۔

قال لہم موسیٰ ویلکم لا تفتروا علی اللہ کذبًا فیسحتکم بعذاب وقد خاب من افتریٰ۔ (پ۱۶ طٰہٰ ع ۳)

ترجمہ۔ موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا کہ تمہارے حال پر افسوس ہے خدا تعالیٰ پر تم افترار نہ باندھنا۔ ایسا کرنے سے خدا تمہیں کسی عذاب سے برباد کر دے گا۔ بے شک جس نے خدا پر افترار باندھا وہ نامراد اور خاسر رہا۔

اس آیت شریفہ میں فرعون اور اس کے ماننے والوں سب کو مفتری علی اللہ کہا گیا ہے اور پھر سب کے لیے کہا گیا ہے کہ وہ یقینًا نامراد رہیں گے۔ فرعون نے چار سو برس تک حکومت کی اور اس مدتِ دراز میں اسے کبھی سر درد تک نہ ہوئی۔ مگر بایں ہمہ وہ قرآن کی رو سے خائب و خاسر اور محروم الفلاح تھا۔ مرزا صاحب اس آیت کا آخری جملہ قد خاب من افتریٰ تو پیش کرتے ہیں۔ مگر پوری آیت نقل نہیں کرتے۔ تاکہ بات کھل نہ جائے اور حقیقت سے پردہ نہ اٹھ جائے کہ خدا پر افترار باندھنے والے چار سو برس تک بھی کامیابی سے زندہ رہ سکتے ہیں۔ یہ محض دنیوی زندگی ہے حقیقی زندگی میں یہ لوگ ایک آن واحد کے لیے بھی فائز الفلاح نہیں کہے جا سکتے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال ۲ : تاریخ کی رو سے کیا کسی شخص کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ جس نے جناب پیغمبر اسلام کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا ہو اور پھر آخر عمر تک وہ باعزت اور محفوظ رہا ہو۔ یہاں تک کہ اس کا سلسلہ اس کے بعد بھی چلتا رہا ہو۔ اس کی بھی تحقیق مطلوب ہے؟ فضل رحیم از شیخوپورہ

جواب : انتہائے مغرب میں برغواطہ قوم کا ایک شخص صالح بن طریف گزرا ہے۔ جس نے نبوت کا

دعوےٰ کیا تھا اور یہ بھی دعوےٰ کیا تھا کہ اس پر ایک قرآن بھی اُترتا ہے۔ اس قرآن کی بعض سورتوں کے نام یہ تھے۔ سورۃ الدیک، سورۃ الحمر، سورۃ آدم، سورۃ ہاروت و ماروت، سورۃ غرائب الدنیا وغیرہ وغیرہ۔ صالح کا یہ بھی دعوےٰ تھا کہ میں مہدی اکبر ہوں جن کی خبر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ دعوےٰ نبوت کے ساتھ اسے اتنا فروغ ہوا کہ اپنے پورے علاقہ کا بادشاہ بن گیا۔ سینتالیس سال کے قریب اس نے حکومت کی اور اپنی تمام سیاسی اور مذہبی مہمات کا سربراہ رہا۔ اس کے بعد سرداری اس کے بیٹے الیاس کو ملی۔ اس نے پچاس سال کے قریب حکومت کی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا یونس برسرِ اقتدار آیا۔ جس نے اپنے دادا صالح بن طریف کے مذہب کو بہت ترقی دی اور چوالیس برس کے قریب حکومت کی۔ صالح بن طریف کے زمانے میں خلافتِ بغداد پر ہشام بن عبد الملک کا قبضہ تھا۔ مؤرخِ شہیر علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:-

زعم انه المهدی الاکبر الذی یخرج فی اٰخر الزمان وان عیسٰی یکون صاحبه ویصلی خلفه وان اسمه فی العرب صالح وفی سریانی مالك وفی العجمی عالم وفی العبرانی روبیا وفی البربری دربًا ومعناه الذی لیس بعده نبی۔[1]

ترجمہ۔ اس کا دعوےٰ تھا کہ وہی مہدی اکبر ہے جو قربِ قیامت میں ظاہر ہوگا اور حضرت عیسٰی اسی کے ساتھی ہوں گے اور اس کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔ عرب میں اس کا نام صالح تھا، سریانی میں مالک، عجمی میں عالم، عبرانی میں روبیا اور بربری میں دربا تھا اور اس کا معنی ہے الذی لیس بعدہ نبی۔ اس کے بعد اب کوئی اور نبی نہ ہوگا۔

یونس کے بعد صالح کا پڑپوتا ابوغفیر برسرِ حکومت آیا (یہ معاذ بن الیسع بن طریف تھا) اس کے متعلق فاضل ابن خلدون لکھتے ہیں:-

واشتدت شوكته وعظم امره۔

ترجمہ۔ اسے عظیم شوکت حاصل تھی اور اس کی حکومت بلند پایہ تھی۔

ابوغفیر کے بعد ابوالانصار برسرِ اقتدار آیا۔ جس نے اپنے باپ دادا کے مذہب کو بہت فروغ دیا۔ اس کے بعد ابو منصور عیسٰی کا دور آیا جو برغواطہ کا ساتواں بادشاہ تھا۔ اس نے بھی دعویٰ نبوت کیا۔ ابن خلدون لکھتے ہیں:-

---

[1] تاریخ ابن خلدون جلد ۶ صفحہ ۲۰۷

وادعى النبوة والكهانة واشتد امره وعلا سلطنة ودانت له قبائل الغرب۔[1]

ترجمہ۔ اس نے بھی نبوت اور غیب دانی کا دعوےٰ کیا۔ اس کی حکومت اور سطوت بہت زور کی تھی اور مغرب کے تمام قبائل اس کے آگے سرنگوں تھے۔

اس کے بعد اس خاندان کا سلسلہ نہایت ذلت سے ختم ہوا۔

ان حقائق سے یہ امر روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ یہ دعوےٰ کہ مفتری کے سلسلے کو بقا نہیں ہوتی یا ضروری ہے کہ وہ بیس یا تئیس سال کے اندر اندر ہلاک ہو جائے۔ اس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے۔

مقامِ غور: علاوہ ازیں یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ کسی مدعی نبوت کا لازمی طور پر قتل ہونا اگر اس کے جھوٹا ہونے کی دلیل ہو تو پھر وہ پیغمبرانِ کرام جو سچے ہو کر بھی مقام شہادت پا گئے اور انہیں ان کے مخالفین نے قتل کیا۔ ان کی صداقت کیوں کر مشتبہ نہ ہو جائے گی۔ جب لازم ممکن نہیں تو ملزوم بالبداہت خود بخود باطل ہے۔ حضرت یحیٰی علیہ السلام نے ۲۲ سال کی عمر میں جامِ شہادت نوش فرمایا۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں:-

قتل یحیٰی قبل رفع عیسٰی علیه السلام۔[2]

ترجمہ۔ حضرت یحیٰی علیہ السلام قتل ہوئے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے اوپر اٹھائے جانے سے بہت پہلے۔ ایسا ہی تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۱۳، الاخبار الطوال صفحہ ۴۲، تاریخ کامل جلد ۱ صفحہ ۱۰۴، فتوحاتِ الٰہیہ جلد ۱ صفحہ ۲۷۲، تفسیر فتح البیان جلد ۱ صفحہ ۱۲، بحر محیط جلد ۱ صفحہ ۲۳۶، تفسیر جمل جلد ۱ صفحہ ۲۷، کشاف صفحہ ۷۹، درمنثور جلد ۴ صفحہ ۲۶۲ اور تفسیر مراح لبید لامام النووی میں مذکور ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال۔ ۱۔ سورۂ کوثر کب نازل ہوئی؟

۲۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی زندگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا کوئی اور بیوی بھی تھی؟

۳۔ حضرت فاطمہؓ کی ولادت سورۂ کوثر نازل ہونے کے بعد کی ہے یا پہلے؟

۴۔ حضورؐ کی دوسری بیٹیاں بھی حضرت خدیجہؓ کے بطن سے ہی تھیں یا کسی اور بیوی کے بطن سے؟

۵۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتنا عرصہ دنیا میں زندہ رہے؟

---

[1] تاریخ ابن خلدون جلد ۶ صفحہ ۲۰۷ [2] تفسیر ابی السعود جلد ۱ صفحہ ۲۶۲، تفسیر کبیر جلد ۲ صفحہ ۲۶۴

(یہ سوالات مولانا عبدالرحمٰن صاحب استاذ الحدیث و التفسیر جامعہ اشرفیہ لاہور کی معرفت دفتر میں موصول ہوئے تھے۔ مولانا صاحب نے جواب کے لیے یہ سوالات دفتر دعوت میں بھجوا دیے ہیں۔)

الجواب: ۱۔ سورۂ کوثر مکہ معظمہ میں نازل ہوئی اور یہ مکی سورت ہے۔ مگر شیعہ مفسرین کہتے ہیں کہ بعض کے نزدیک، مدنی ہے۔[1]

علامہ علی بن ابراہیم قمی جو ملا محمد بن یعقوب الکلینی کے استاد ہیں۔ اس سورت کو مدنی قرار دیتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم ۸ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کی وفات پر بعض لوگوں نے آپ کو ابتر کہا (ابتر اسے کہتے ہیں جس کی نرینہ اولاد نہ ہو) اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ انا اعطینٰك الکوثر

علامہ قمی لکھتے ہیں:۔

الکوثر نهر فی الجنة اعطی الله محمداً صلی الله علیه وسلم عوضاً عن ابنه ابراهیم۔[2]

ترجمہ: کوثر جنت کی ایک نہر ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے بیٹے ابراہیم کے بدل میں عطا فرمائی۔

اس حقیقت سے یہ بات واضح ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی ولادت اس سورت کے نازل ہونے سے بہت پہلے کی ہے اور اگر اس سورت کو مکی قرار دیا جائے تو پھر اسے آپ کے بیٹے طاہر کی وفات پر پیغام تسکین کے طور پر تسلیم کرنا چاہیئے اور یہی سید عمار علی کی رائے ہے۔ علامہ کلینی کے بیان کے مطابق حضرت طاہر حضرت سیدہ فاطمۃ الزہراؓ سے پہلے پیدا ہوئے اور علامہ محمد ہاشم الخراسانی کے بیان کے مطابق ایام کودکی میں وفات پائی۔ ظاہر ہے کہ یہ سانحہ حضرت سیدہؓ کی ولادت کے بعد کا ہے بس اس صورت میں بھی یہ سورت حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی پیدائش کے کافی بعد نازل ہوئی ہے۔

۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں جب تک حضرت خدیجہ رہیں، آپ نے دوسرا نکاح نہیں کیا۔ ان کی وفات کے بعد آپ کا سب سے پہلا نکاح حضرت سودہؓ بن زمعہ سے ہوا۔ اور یہ آپ کی نبوت کا دسواں سال تھا۔[3]

۳۔ اس کا جواب ۱ کے ضمن میں گزر چکا۔

۴۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری بیٹیاں بھی حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے بطن سے ہی تھیں۔ ملا محمد بن یعقوب الکلینی لکھتے ہیں:۔

---

[1] دیکھیئے تفسیر عمدۃ البیان ص۶۹۰ طبع قدیم [2] تفسیر قمی ص۳۷۱ مطبوعہ ایران

[3] تفصیل کے لیے دیکھیئے زرقانی جلد ۳ ص۲۲۶

وتزوّج خدیجةؓ وهو ابن بضع وعشرین سنة فولد له منها قبل مبعثه القاسم ورقیة وزینب وام کلثوم وولد له بعد البعث الطیب و الطاهر والفاطمة۔[1]

ترجمہ۔ اور آپ نے خدیجہؓ سے نکاح کیا اور آپ کی عمر چوبیس پچیس سال کی تھی۔ ہاں ان کے بطن سے بعثت سے پہلے قاسم، رقیہ، زینب اور ام کلثوم پیدا ہوئے اور بعثت کے بعد طیب طاہر اور حضرت فاطمہ پیدا ہوئیں۔

منتخب التواریخ میں ہے:۔

از اصول کافی مستفاد مے شود کہ آں بزرگوار از خدیجہ کبریٰ سہ پسر داشت، و چہار دختر۔[2]

ترجمہ۔ اصول کافی سے پتہ چلتا ہے کہ حضورؐ کے خدیجۃ الکبریٰؓ سے تین بیٹے اور چار بیٹیاں پیدا ہوئیں۔

۵۔ حضرت خدیجہ الکبریٰ کی وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تقریباً تیرہ یا چودہ سال تک اس دنیا میں تشریف فرما رہے۔ واللہ اعلم بالصواب

سوال ۲: آدم علیہ السلام سے گناہ سرزد ہونے میں کیا اسلام اور عیسائیت ہمنوا ہیں؟ اس میں بھی اختلاف ہے کہ آیا یہ گناہ اولاد آدم میں وراثتہً منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ جس کے لیے کفارہ یسوع ضروری ہے؟ کیا آپ سے گناہ کا صادر ہونا قرآن پاک کی نص صریح ہے۔ اس کی وضاحت فرمائیں؟

سائل۔ عبدالرحیم گارڈن ٹاؤن لاہور

جواب ۲: ہم اہلسنت کے نزدیک عصمت نبوت لازمہ نبوت ہے اور انبیاء کرام کے معصوم ہونے کا اعتقاد ضروریات دین میں سے ہے۔ عقیدہ عصمت نبوت یہ ہے کہ انبیاء کرام حکم باری تعالیٰ کی ارادی مخالفت سے بالکل معصوم ہیں اور اگر کبھی غیر ارادی خطا ہو جائے تو اس پر انہیں باقی نہیں رہنے دیا جاتا۔ آدم علیہ السلام سے بیشک خطا سرزد ہوئی لیکن وہ اس پر اڑے یا ڈٹے نہیں رہے۔ قرآن عزیز میں ہے:۔

ولم نجد له عزماً۔ اور ہم نے آدم کی اس خطا پر پختگی نہ پائی۔

جب آدم علیہ السلام ہی اس خطا پر نہ اڑے اور اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہ کہ ان کی توبہ قبول فرمائی بلکہ انہیں نبوت سے بھی سرفراز فرمایا اور اپنا مجتبیٰ گردانا تو پھر اس گناہ کے ان کی اولاد میں وراثتہً منتقل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسلام فطرت کے مطابق ہے۔ وہ اسے تو جائز قرار دیتا ہے کہ اللہ

---

[1] الکافی مع الصافی جلد ۲ ص۱۴۶ [2] منتخب التواریخ ص۲۳ ایران

رب العزت کسی کی خطاسے درگزر فرمائیں لیکن اس عمل کی اسلام کے قانون انصاف میں کوئی گنجائش نہیں کہ گنہگاروں کے گناہ ایک بے گناہ کے سر لگا دیئے جائیں اور پھر اُسے پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔
تعالی اللہ عن ذٰلک علوًا کبیرا۔ ان اللہ لا یظلم مثقال ذرۃ۔

سوال : ائمہ اہلبیت کے پاس جو قرآن پاک تھا وہ ترتیب نزول کے مطابق تھا یا بالکل ہو بہو وہی تھا جو ہمارے پاس موجود ہے۔ اس کی سند اور حوالہ چاہیئے؟ سائل نعیم از سنت نگر لاہور

جواب : ائمہ اہلبیت کا مسلک و اعتقاد بالکل وہی تھا جو صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدینؓ کا تھا۔ دین کے متعلق ان میں کوئی اختلاف نہ تھا سب باہم متحد اور متفق تھے۔ رحماء بینھم کی شان اُن میں پوری طرح جلوہ گر تھی۔ ابان بن میمون القداح کہتے ہیں کہ مجھے حضرت امام باقرؒ نے قرآن پڑھنے کا حکم فرمایا۔ میں نے عرض کی کہ کہاں سے پڑھوں تو آپ نے فرمایا :۔
من السورۃ التاسعۃ۔ " قرآن پاک کی نویں سورت سے[1]" پھر آپ نے اس کی وضاحت یوں فرمائی۔ سورۂ یونس اور موجودہ ترتیب میں یہ واقعی نویں سورت ہے۔
فاتحہ تو قرآن کا دیباچہ ہے۔ اسے چھوڑ کر سورۂ یونس قرآن پاک کی نویں سورت التاسعہ بنتی ہے اور یہ موجودہ ترتیب کے بالکل مطابق ہے۔ ائمہ اہل بیت نے اگر ترتیب نزولی سے قرآن جمع کیا ہوتا تو حضرت امام باقر سورۂ یونس کو نویں سورت ہرگز قرار نہ دیتے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ موجودہ قرآن بالکل اسی ترتیب کے مطابق ہے جو ترتیب ائمہ اہل بیت کے ہاں مسلّم اور معتمد تھی۔ واللہ اعلم
کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ ۲۵، اکتوبر ۱۹۶۳ء

سوال : ایک شیعہ صاحب نے کہا ہے کہ سید زادی کا نکاح غیر سید سے اگر ناجائز ہے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹیاں جو سید زادیاں تھیں ان کا نکاح غیر سیدوں سے کس طرح ہو گیا۔ وہ کہتا ہے کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ سید زادی کا نکاح غیر سید سے نہیں ہو سکتا۔ اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ بیٹیاں آپ کی حقیقی بیٹیاں ہوتیں تو آپ ان کا نکاح غیر سیدوں سے کسی طرح نہ کرتے۔ اگر ہو سکے تو کسی شیعہ مصنف کا بھی کوئی حوالہ دیں؟ سائل۔ احقر عبدالعزیز دکاندار محلہ مکران ٹیکسلا

جواب : سب سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ سید سے کیا مراد ہے۔ ہمارے بلاد میں سید سے عام طور پہ

[1] اصول کافی مع شرح الصافی جلد ۶ ص۱۷

اولادِ رسول مراد لی جاتی ہے اور جن کے نسب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دخل ہے۔ انہیں ہی سادات سمجھا جاتا ہے۔ اس صورت میں حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ تو بے شک سید بلکہ سادات ہیں لیکن حضرت علی مرتضیٰؓ صرف قریشی اور ہاشمی ہیں۔ ان کے نسب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی دخل نہیں بلکہ حضرت علیؓ اپنے دادا عبدالمطلب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا ملتے ہیں۔ سید کی اس تعبیر سے ان پر بھی سید کا اطلاق نہیں ہو سکتا کیونکہ ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خون نہیں۔ ہاں یہ اعزاز و اکرام حضرت فاطمۃ الزہراؓ کو حاصل ہے اور ان کے بعد یہ مرتبہ ان کی اولاد میں منتقل ہوا ہے۔ حضرت علی مرتضیٰؓ کی وہ اولاد جو دوسری بیویوں سے تھی۔ انہیں سید نہیں کہا جاتا۔ حضرت علی مرتضیٰؓ اگر سید ہوتے تو ان کی سب اولاد بھی سید کہلاتی۔ حالانکہ یہ اعزاز صرف اولاد فاطمہ الزہراؓ کو حاصل ہے۔
بایں ہمہ یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ حضرت سیدہ کا نکاح حضرت علی مرتضیٰؓ سے ہوا۔ یہ اس امر کی واضح شہادت ہے کہ سید زادی کا نکاح غیر سید سے جائز ہے بشرطیکہ وہ غیر سید خاندان قریش میں سے ہو یا کسی ایسے خاندان میں سے ہو جو شرافت یا وجاہت کے لحاظ سے سید کا کفو بن سکے۔ قریش ایک دوسرے کے کفو ہیں۔ خواہ کوئی ہاشمی ہو، خواہ اُموی ہو۔ ہاں عجمی ممالک میں کفارت کا مدار حریت اور اسلام پہ ہے۔ درمختار میں ہے :۔

الکفاءۃ نسبًا فقریش بعضھم اکفاء بعض وبقیۃ العرب بعضھم اکفاء بعض ھذا فی العرب واما فی العجم فیعتبر حریۃً واسلامًا۔[1]

ترجمہ۔ کفو ہونے کا اعتبار نسب پہ ہے۔ قریش سب ایک دوسرے کے کفو ہیں۔ اسی طرح باقی عرب آپس میں ایک دوسرے کے برابر ہیں۔ یہ معاملہ عرب کا ہے۔ عجم میں کفارت کا مدار حریت اور اسلام پہ ہے۔
علامہ شامی لکھتے ہیں :۔

فلو تزوجت ھاشمیۃ قریشیا غیر ھاشمی لم یرد عقدھا وان تزوجت عربیًا غیر ھاشمی لھم ردہ ...... الخ

ترجمہ۔ اگر کسی ہاشمی عورت نے کسی ایسے قریشی سے نکاح کیا جو ہاشمی نہیں تو یہ عقد قبول ہوگا ہاں اگر وہ کسی عرب سے نکاح کرے جو قریشی بھی نہیں تو اسکے اولیاء کو اسکی واپسی کا حق ہے۔
ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ صدیقی، فاروقی اور عثمانی وغیرہم سب بنی ہاشم اور سادات

[1] درمختار جلد ۲ ص۸۶ مع الشامیہ بالاختصار

بنی ہاشم کے کفو ہیں۔ ایسے نکاح بدوں اجازت اولیاء بھی درست ہیں۔ ہاں ان عظیم خاندانوں کے علاوہ جو دوسرے عجمی شیوخ ہیں جیسے مغل، پٹھان وغیرہ ان اقوام کا نکاح سیدزادی سے اولیاء کی اجازت کے بغیر جائز نہیں۔ ہاں ان اقوام میں اگر کوئی شخص کسی مرتبے پر فائز ہو یا کوئی بلند پایہ عالم دین ہو تو اس کا یہ اعزاز و اکرام اسے (قاضی خاں کے نزدیک) سیدزادی اور دوسری قریش عورتوں کا کفو بنا دیتا ہے اور الاشباہ والنظائر میں اسی طرح ہے۔ البتہ علامہ ابن ہمام نے قاضی خاں کا قول نقل کر کے اور پھر اس کی تائید میں قاضی ابو یوسف کے ایک فیصلے سے استدلال کر کے اس کفائت کے قائم نہ ہونے پر ینابیع سے ایک نقل پیش کی ہے[1] پس یہ عجمی اقوام اگر عام درجے میں ہیں تو فیصلہ یہی سمجھنا چاہیئے کہ نکاح بغیر اجازت اولیاء کے منعقد نہ ہوگا۔ اور عالم ذی منصب یا شخص ذی وجاہت ہونے کی صورت میں انعقاد نکاح تسلیم کیا جائے گا۔ ہاں اولیاء کو فسخ کا پورا اختیار ہوگا۔

شیعہ فقہ کی معتبر کتاب شرائع الاسلام فی مسائل الحلال والحرام میں واضح طور پر لکھا ہے کہ ہاشمی عورت کا نکاح غیر ہاشمی مرد سے بالکل جائز ہے۔ اس کی شرح میں فخر مجتہدین شیعہ شہید ثانی زین الدین بن علی بن احمد آملی لکھتے ہیں:۔

زوج النبی ابنته عثمان وزوج بنته زینب بابی العاص ولیسا من بنی هاشم وکذلك زوج علی ابنته ام کلثوم من عمر وتزوج عبد الله بن عمرو بن عثمان فاطمة بنت الحسین وتزوج مصعب بن الزبیر اختها سکینة وهم من غیر بنی هاشم[2]

ترجمہ:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بیٹی کا نکاح حضرت عثمان سے اور ایک کا ابوالعاص سے کیا۔ حالانکہ دونوں بنو ہاشم میں سے نہ تھے۔ اسی طرح حضرت علی نے اپنی بیٹی ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر سے کیا، حضرت عثمان کے پوتے کا نکاح حضرت امام حسین کی بیٹی فاطمہ سے ہوا اور حضرت زبیر کے بیٹے کا نکاح امام حسین کی بیٹی سکینہ سے ہوا۔ حالانکہ یہ سب مرد بنو ہاشم میں سے نہ تھے۔

مشہور شیعہ محدث ابن بابویہ قمی من لا یحضرہ الفقیہ میں لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

انما انا بشر مثلکم اتزوج فیکم وازوجکم[3]

ترجمہ: میں بھی تمہاری طرح ایک انسان ہوں، تم میں نکاح کرتا بھی ہوں اور تمہیں نکاح دیتا بھی ہوں۔

---

[1] دیکھئے فتح القدیر جلد ۳ صفحہ ۱۹۰ مصری [2] مسالک الافہام مصنفہ ۹۶۳ھ [3] من لا یحضرہ الفقیہ صفحہ ۴۱۲ ایران

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنے آپ کو بشر کہنا محض انکساری اور تواضع کے لیے نہ تھا۔ بلکہ اس میں حقیقت بھی تھی۔ اس لیے کہ جو الفاظ محض کسر نفسی کے طور پر کہے جاتے ہیں ان پر آگے کوئی حکم مرتب نہیں کیا جاتا۔ احکام اسی تمہید پر مبنی ہوتے جو امر واقع ہو محض تواضع نہ ہو۔ یہی محدث ابن بابویہ قمی ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔

لیس سهو النبی کسهونا لان سهوه من الله عزوجل وانما اسهاه لیعلم انه بشر مخلوق فلا یتخذ ربا معبودا[1]

ترجمہ:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سہو ہمارے سہو کی طرح نہیں بلکہ اس کا منشاء اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے یہ حقیقت کھل جائے کہ آپ بشر مخلوق ہیں۔ پس یہ نہیں کہ انہیں رب اور معبود بنایا جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو صاحبزادیاں حضرت عثمان ذوالنورین کے نکاح میں تھیں ان کے متعلق حضرت امام جعفر صادق پوری صراحت کے ساتھ فرماتے ہیں کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی صاحبزادیاں تھیں۔ شیعہ محدثین کے نزدیک اس حدیث کی سند بالکل معتبر ہے[2]

مسئلہ مذکورۃ الصدر میں فیصلہ یہی ہے کہ سیدزادی کا نکاح غیر سید سے اس صورت میں بالکل جائز ہے کہ وہ اعزاز و اکرام میں اس کا کفو ہو۔ اور قریش سب ایک دوسرے کے کفو ہیں اور ہاشمیہ کا نکاح غیر ہاشمی قریش سے بالاتفاق جائز ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ یکم نومبر ۱۹۶۳ء

سوال: امیر معاویہ صحابی رسول تھے اور صحابہ کرام کی شان میں قرآن شریف میں لکھا ہے۔ رحماء بینھم وہ آپس میں بہت رحمدل تھے۔ سوال یہ ہے کہ حضرت امیر معاویہ صحابی ہو کر پھر مسلمانوں سے کیوں لڑتے رہے۔ ان کی جنگی مہمات مسلمانوں کی ہی آپس کی لڑائیاں تھیں بعض لوگ اس خیال سے حضرت امیر معاویہ کے خلاف ہیں۔ اس کی تشریح دعوت میں فرمائیں؟ نصر اللہ از میانوالی

جواب: یہ الزام واقعات کی روشنی میں بالکل غلط ہے کہ حضرت امیر معاویہ مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کے موجب ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ اس بات سے طبعاً متنفر تھے کہ مسلمان کی تلوار مسلمان کے مقابلہ میں بے نیام ہو۔ آپ امیر المؤمنین سیدنا عثمان کے نہایت قریبی رشتہ دار تھے اور جس طرح

---

[1] من لا یحضرہ الفقیہ جلد ۱ صفحہ ۹۸ [2] حیات القلوب للمجلسی جلد ۲ صفحہ ۵۸۸

حضرت عثمانؓ مسلمانوں کی باہمی خونریزی سے اس درجہ متنفر تھے کہ آپ نے شہادت قبول فرمالی مگر مدعیان اسلام کے مقابلہ میں تلوار اُٹھانے کی اجازت نہ دی۔ اسی طرح آپ کے یہ تاثرات حضرت امیر معاویہؓ کی سیرت میں بھی پوری طرح جلوہ گر تھے۔ حضرت امیر معاویہؓ کو مسلمانوں کے خلاف نبرد آزما ہونے سے حکمت ایزدی نے تکوینًا روک رکھا تھا۔ حضرت ابو سفیانؓ عہدِ جاہلیت میں ایک عرصہ تک مسلمانوں کے مقابلہ میں برسر کمان رہے۔ ان کی عمر کا بیشتر حصہ انہی مہم آرائیوں میں گزرا۔ یہ امر بہت عجیب ہے کہ ان تمام معرکوں میں ان کے ساتھ ان کے بیٹے (امیر معاویہؓ) کہیں نظر نہیں آتے اور بدر سے لے کر جنگِ احزاب تک کوئی شخص آپ کی نشاندہی نہیں کرتا۔ کہ کبھی آپ بھی اپنے باپ کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہوئے ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ رب العزت نے تکوینی طور پر آپ کو اس سے بچا رکھا تھا کہ آپ مسلمانوں کے مقابلہ میں چڑھائی کریں۔

۲۔ حضرت عثمانؓ کے خلاف عجمی بغاوت زوروں پر تھی اور آپ کے زیر کمان شامی افواج بہت مضبوط تھیں۔ اس وقت بھی آپ نے از خود کوئی پیش قدمی نہ فرمائی۔ بلکہ حضرت عثمانؓ کے منشاء کا پوری طرح احترام کیا کہ اُن کی حیاتِ طیبہ میں مسلمانوں کی باہمی خونریزی کسی صورت میں واقع نہ ہونے پائے۔ پھر جنگِ جمل میں جب کہ حضرت علیؓ اور حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ کے درمیان چھڑ گئی تو باوجودیکہ حضرت امیر معاویہؓ کا ذہن حضرت علیؓ کے متعلق صاف نہ تھا۔ آپ نے ان کی مخالفت میں حضرت طلحہؓ و زبیرؓ کے ساتھ کوئی شرکت نہ کی۔ ان تمام واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ اس سے طبعًا متنفر تھے کہ مسلمان کی تلوار مسلمان سے ٹکرائے۔ حافظ ابن تیمیہؒ رقمطراز ہیں:۔

لم یکن معاویۃؓ ممن یختار الحرب ابتداءً بل کان من اشد الناس حرصًا علی ان لا یکون بین المسلمین قتال[1]

ترجمہ۔ حضرت معاویہؓ جنگ کی ابتدا کرنے والے نہ تھے بلکہ آپ اس بات کے سب سے زیادہ خواہاں ہوتے تھے کہ مسلمانوں میں باہمی قتال ہرگز نہ ہو۔

جنگِ صفین میں بھی آپ نے حضرت علیؓ کے خلاف چڑھائی نہیں کی۔ بلکہ اس میں پہل حضرت علیؓ کی طرف سے تھی اور جب عراقی افواج مقام وخلیتہ تک پہنچیں تو حضرت امیر معاویہؓ کو مجبورًا دفاع کے لیے نکلنا پڑا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ جب تک امام مظلوم کے قاتل گرفتار نہ کر لیے جائیں وہ نئے خلیفہ کی بیعت نہیں کریں گے۔ وہ خود مدعی خلافت ہرگز نہ تھے۔ صرف اس امر کے منتظر تھے کہ امام مظلوم کا بے گناہ خون

[1] منہاج السنۃ جلد ۳ ص ۲۱۹، ۲۲۰

دادرسی پا سکے۔ پھر اس جنگ صفین میں بھی باوجودیکہ شامی افواج بہت قوی اور کثیر تھیں۔ آپ نے کھلے ہوئے قرآنوں کا واسطہ دے کر خونریزی کو بند کرایا اور معاملہ کو حل کرنے کے لیے فکر و تدبر اور نظر و استدلال کی راہ اختیار فرمائی۔

یہ گمان ہرگز نہ کیا جائے کہ آپ کا لڑائی سے طبعًا دور رہنا کسی کمزوری یا بزدلی کی وجہ سے تھا۔ جس ذاتِ گرامی نے روم کی [illegible] قوت پر وہ کاری ضرب لگائی ہو کہ صدیوں کا تمدن اور سالہا سال کی قوت سب پامال کر کے رکھ دیئے ہوں۔ اس کے بارے میں ایسا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

علامہ ابن کثیر "البدایہ والنہایہ" میں لکھتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہؓ رومی ممالک پر سولہ دفعہ حملہ آور ہوئے تھے[1] بحری لڑائیوں میں حضرت امیر معاویہؓ کی پیش قدمی تاریخ اسلام کے وہ اَنمٹ نقوش ہیں جنہیں مستقبل کی کوئی غلط بیانی نہیں دھو سکتی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سوال ۲: بندہ "دعوت" کا باقاعدہ مطالعہ کرتا ہے اور میرا خریداری نمبر ۱۳۸۸ ہے۔ براہِ مہربانی مندرجہ ذیل سوالات کے جواب سے مطمئن فرمائیں:۔

۱۔ عربیت کا اصول ہے کہ مشبہ بہ (جس سے کسی چیز کو تشبیہ دی جائے) مشبہ (جس کو کسی سے تشبیہ دی جائے) سے اقوی ہوتا ہے لیکن ہم درود شریف پڑھتے وقت حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابراہیمؑ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ حالانکہ حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قطعًا افضل و ارفع اور اکرم و اعلیٰ تھے۔

۲۔ کنت نبیًا وآدم بین الماء والطین کا درجہ محدثین کے نزدیک کیا ہے۔ بہ تقدیر سوال یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت آدم علیہ السلام سے بھی پہلے نبی تھے۔ جب نفس نبوت بدن عنصری سے پہلے متحقق ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بشریت کا اطلاق کیونکہ صحیح ہو گا؟ سائل مشتاق احمد فاروقی

الجواب: ۱۔ یہ ٹھیک ہے کہ مشبہ بہ مشبہ سے اقوی ہوتا ہے۔ زید کو شیر سے تشبیہ دینا اسی صورت میں ہے کہ بہادری کا وصف شیر میں (جو مشبہ بہ ہے) زید سے (جو مشبہ ہے) زیادہ قوی ہو۔ لیکن یہ امر بھی پیشِ نظر رہے کہ مشبہ بہ کے مشبہ سے اقوی ہونے کے کئی اعتبار ہیں۔ کبھی یہ زیادتی تحقیق وصف کے پیشِ نظر ہوتی ہے کہ واقعی وہ مشبہ بہ مشبہ سے اس صفت میں آگے ہو اور کبھی یہ زیادتی نفس وصف میں نہیں۔ صرف شہرت وصف میں ہوتی ہے کہ مشبہ بہ میں وہ صفت شہرت عام کا درجہ رکھتی ہو۔ اس صورت

[1] دیکھیئے البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۱۲۳

ہیں مشبہ نفس وصف میں مشبہ بہ سے فائق بھی ہو سکتا ہے اور بایں ہمہ بنا بر شہرت اسے مشبہ قرار دیا جاتا ہے۔ کیونکہ مشبہ بہ شہرت میں اس سے آگے ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قطعی اور یقینی طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے افضل و ارفع اور اکرم و اعلیٰ ہیں۔ مگر آپ سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سلام و درود پر فائز ہونا النفسی اور آفاقی طور پر اس قدر شہرت پاچکا تھا کہ آپ بھی انہی کے ملت کے ہمنوا ٹھہرے اور آپ پہ درود و سلام بنا بر شہرت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درود و سلام سے تشبیہ پانے لگا۔ آج اگرچہ شہرت بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ ہے۔ مگر ہمارے اعمال اسلامی کی قانونی حیثیت جس وقت سے متعین ہوتی ہے اس وقت کیفیت یہی تھی اور آج کے اعمال اس وقت کے احکام کی محض اتباع ہیں۔

ثانیاً۔ ہمارے اس درود شریف میں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مشبہ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام مشبہ بہ نہیں۔ بلکہ اصل مشبہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مع اپنی آل" کے اور مشبہ بہ حضرت ابراہیم علیہ السلام مع اپنی آل کے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آل میں سینکڑوں نبی ہوئے اور خود خاتم الانبیاء (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی آلِ ابراہیم میں شامل ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باوجودیکہ افضل و اکمل ہیں۔ مگر آپ کی آل میں کوئی نبی نہیں۔ پس جب آل کو بھی شامل کر لیا جائے تو مشبہ بہ بے شک اقویٰ اور اکمل ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو مشبہ اور مشبہ بہ دونوں میں شامل ہیں۔ اس قدر مشترک کو دونوں طرف سے جدا کرنے کے بعد مشبہ میں کوئی نہیں رہتا۔ اور مشبہ بہ میں انبیاء کرام کا ایک عظیم گروہ ملتا ہے۔ اب اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دونوں طرف شامل کر لیا جائے تو صورتِ مسئلہ وہی رہتی ہے کہ مشبہ بہ مشبہ سے بنا بر وجود معصومین افضل ہے۔ اس تحقیق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت اور آل میں کوئی فرد یا طبقہ ایسا نہیں جو انبیاء سابقین سے افضل ہو اور یہ کہ غیر نبی کسی صورت میں بھی نبی سے افضل نہیں ہو سکتا۔ ائمہ کرام کو انبیاء سابقین سے افضل کہنا اہل سنت کے نزدیک زندقہ و الحاد ہے اور درود شریف کی یہ ترتیب اس عقیدے کی ایک کھلی دلیل ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۲۔ حدیث کنت نبیًا و آدم بین الروح والجسد کی ہم معنی حدیث ترمذی شریف جلد ثانی ص۲۰۲ میں موجود ہے اور محدثین کے نزدیک مقبول ہے۔ وہاں الفاظ یہ ہیں کہ حضورؐ سے سوال کیا گیا تھا متیٰ وجبت لک النبوۃ کہ آپ کے لیے نبوت کب ثابت ہوئی؟ تو آپؐ نے فرمایا تھا۔ و آدم بین الروح والجسد۔ کہ جب آدمؑ ابھی روح و جسد میں منقسم تھے۔ امام ترمذی اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں ھذا حدیث حسن صحیح غریب

بہر حال اس وقت آپؐ کی نبوت عالمِ علوی سے متعلق تھی۔ ہاں بنی نوع انسان کا تعلق آپ کی جس شانِ رسالت سے ہے۔ اس کا تحقق بشریت کے بغیر ہرگز نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال :۱۔ وہ تمام رسوم جو ایک مسلمان معصوم بچے (عمر کا تعین فرمائیں کہ کس عمر تک بچہ معصوم کہلاتا ہے) اور معصومیت کی حد سے تجاوز کردہ مسلمان کی وفات پر شرعی طور پر ضروری ہیں۔ بالتفصیل اور قرآن و سنت کے حوالوں سے عامۃ الناس کی آگاہی کے لیے بیان فرما کر عند الاحقر مشکور اور عند اللہ ماجور ہوں۔

۲۔ جناب چودھری اللہ دتہ صاحب ایم اے نے اپنے مقالہ "عورت کا مقام اسلامی اور غیر اسلامی معاشرہ میں" میں تحریر فرمایا ہے کہ نبیؐ نے اپنی صاحبزادی فاطمۃ الزہراؓ کی شادی پر نہایت سادے جہیز کا معیار قائم کیا۔ اس کے برعکس میں نے اکثر علماء کی تحریروں میں پڑھا ہے کہ جو چند ضرورت کی اشیاء حضورؐ نے اپنی بیٹی کو شادی کے وقت دیں، وہ قطعاً جہیز نہ تھا۔ بلکہ چونکہ حضرت علیؓ کا کوئی الگ مکان نہ تھا۔ اس لیے شادی پر انہیں الگ مکان کی ضروریات کے لیے انہی کے خرچ سے چند اشیاء خرید کر مرحمت فرمائی تھیں۔ مطلب یہ ہے کہ اسلام میں سرے سے جہیز کا (خواہ وہ سادہ ہو یا پُر تکلف) کوئی وجود نہیں۔ براہِ نوازش اس کی وضاحت فرمائیں؟ احقر اختر واصفی

جواب :۱۔ بچے کی وفات کے متعلق شرعی آداب کیا ہیں؟ اس سلسلہ میں سب سے پہلے بچے کی عمر سامنے آتی ہے۔ امام اعظمؒ کے نزدیک بچے میں اگر زندگی کی علامت پائی گئی (خواہ اس نے ایامِ حمل پورے کئے بھی نہ ہوں اور عام طور پر حمل کے چوتھے مہینے میں زندگی کے آثار محسوس ہونے لگتے ہیں) تو اُسے غسل دینا، کفن پہنانا اور اس کی نمازِ جنازہ پڑھنا سب ضروری ہیں۔ حافظ ابو عبد اللہ محمد بن محمد المنجلی الحنبلی نے اسے ہی جمہور کا مسلک قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

وجمہور العلماء علی انہ یصلی علی الطفل الصغیر وان کان سقطًا قد نفخ فیہ الروح۔[1]

جو مسلمان بچہ دار الحرب سے مسلمانوں کے ہاتھ لگے اور اسی حالت میں اس کی وفات ہوئی ہو تو حضرت امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس کا اسلام معتبر نہیں۔

جو بچہ زندگی کی علامت کے بغیر مردہ ہی پایا گیا ہو۔ اس کے لیے غسل اور کفن کے احکام تو ہیں لیکن جنازہ نہیں بعض علماء کے نزدیک بچے کی نماز جنازہ ضروری نہیں۔ ابن ماجہ میں ہے:۔

[1] تسلیۃ اہل المصائب، ص۱۱۲ طبع قاہرہ

صلوا علی اطفالکم فانہم من افراطکم۔ (عن ابی ہریرہؓ عن النبیؐ)

فوت شدہ خواہ بچہ ہو خواہ بڑا، ہر مسلمان کی وفات پر نوحہ و ماتم سے بچنا نہایت ضروری ہے کیونکہ یہ سب عہدِ جاہلیت کے رواج تھے جن کی سنّتِ اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ حضورؐ کے بیٹے ابراہیم فوت ہوئے تو ایک روایت میں آتا ہے، صحابہؓ کہتے ہیں:۔

نہانا عن الصیاح۔ حضورؐ نے ہمیں ماتم سے منع فرمایا۔ اسی طرح حضورؐ نے اپنے بیٹے طاہر کی وفات پر حضرت خدیجہؓ کو آہ و بکا سے منع فرمایا تھا۔ (فروع کافی) بچے کی وفات پر اس کی وراثت بھی (اگر وہ کچھ اموال کا شرعاً مالک تھا) اسی طرح قابلِ تقسیم ہے جس طرح کہ بڑے کی وفات پر ——— ابن ماجہ حضرت جابرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا:۔

اذا استہل الصبی صلی علیہ وورّث (اوکما قال علیہ السلام)

بچے کی نمازِ جنازہ میں کچھ زائد الفاظ بھی موجود ہیں۔ اگر کوئی مسلمان فوت ہو جائے تو دوسرے مسلمانوں کو چاہیئے کہ اس کے پسماندگان کے لیے کھانے کا انتظام کریں۔ کیونکہ اہل بیت انتہائے غم میں یہ اہتمام خود نہیں کر سکتے ہیں۔ جب حضرت جعفر طیارؓ کی شہادت کی خبر پہنچی تو حضورؐ نے فرمایا:۔

اصنعوا لآل جعفرؓ طعامًا فقد اتاھم ما یشغلھم۔[1]

ترجمہ۔ جعفرؓ کے گھر والوں کے لیے کھانا تیار کرو وہ خود مصروف ہیں اور اپنے کھانے کا انتظام نہیں کر سکتے۔

۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہراؓ کو جو چیزیں رخصتی کے وقت مہیا کیں وہ اگرچہ حضرت علی مرتضیٰؓ کی مالیت سے تھیں اور اسی لیے تھیں کہ ان کی زندگی کی ضروریات ایک گھر کی شکل میں تیار ہو جائیں۔ لیکن اس پر جہیز کے الفاظ پھر بھی آ سکتے ہیں۔ جہیز اور جہاز کے معنی سامان تیاری کے ہی ہیں۔ اس لفظ کی اس رسم سے کوئی تخصیص نہیں جو ہند و تمدن میں پائی جاتی تھی۔ محمد ہاشم الخراسانی نے منتخب التواریخ دوسرے باب کے امر پنجم میں اس پر یہ عنوان قائم کیا ہے "در جہازِ بیہ فاطمۃ الزہراؓ"۔ ——— بحار الانوار میں شیخ طوسی کے امالی سے منقول ہے حضرت امام جعفر صادقؒ حضرت علی المرتضیٰؓ سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زرہ فروخت کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اس کی قیمت لے آؤ (یہ زرہ تقریباً چار سو درہم میں فروخت ہوئی تھی اور یہ حضرت سیدہؓ کا حق مہر تھا جو حضرت علی المرتضیٰؓ نے ادا فرمایا تھا) حضرت علیؓ نے اسے بیچ کر قیمت حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دی۔ حضورؐ نے اس کا ایک تہائی حضرت بلالؓ کو دیا اور فرمایا کہ فاطمہؓ کے لیے خوشبو خرید کر لاؤ اور تہائی اپنے رفیقِ غار حضرت ابوبکر صدیقؓ

[1] رواہ ابوداؤد والترمذی وابن ماجہ

کو دیا کہ فاطمہؓ کے لیے کپڑے اور گھر کی باقی ضروریات خرید لائیں۔ حضرت عمار بن یاسرؓ بھی حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ بھیجے گئے۔ جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ہدایات کے مطابق خرید کرتے تھے۔ بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ حضرت علی مرتضیٰؓ نے حضورؐ کے حکم سے پہلے ہی حضرت فاطمہؓ کے مہر کے لیے زرہ پیش کر دی تھی۔[1]

حضرت عکرمہؓ کی روایت کے مطابق حضرت فاطمہؓ کا جہیز یہ تھا:۔

۱۔ ایک نقشی تخت۔ ۲۔ ایک چمڑے کا تکیہ (اس میں کھجور کی چھال تھی)۔ ۳۔ ایک پیالہ۔
۴۔ ایک مشکیزہ۔ بعض حضرات نے دو چکیاں اور دو گھڑے بھی ذکر کیے ہیں۔[2]

جہیز کی اس تفصیل سے ہند و تمدن کے اس طریقے کی تائید نہیں ملتی جس کی رُو سے جہیز باپ کے گھر سے ضروری اور لازمی سمجھا جاتا ہے۔ اسلام میں ایسے جہیز کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اس ضمن میں حضرت صدیق اکبرؓ کی اس فضیلت کا پتہ چلتا ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کا جہیز انہوں نے خریدا اور جو کچھ خریدا گیا سب حضرت ابوبکرؓ کی صوابدید پر ہی موقوف تھا۔ حضرت بلالؓ، حضرت سلمانؓ اور حضرت عمارؓ سب حضرت ابوبکرؓ کے خدام میں سے تھے۔ وہاں اس حقیقت کا اظہار بھی ازبس ضروری ہے کہ حضرت علی المرتضیٰؓ جب اپنی زرہ بیچنے گئے تو انہوں نے اسے حضرت عثمانؓ بن عفان کے ہاتھ بیچا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے جب زرہ لے لی اور درہم حضرت علیؓ نے پکڑ لیے تو حضرت عثمانؓ نے پھر وہ زرہ بھی حضرت علی المرتضیٰؓ کو ہی تحفہ میں دے دی اور فرمایا:۔

یا ابا الحسن ألست اولیٰ بالدرع منك وانت اولیٰ بالدراھم منی۔

ترجمہ۔ اے علیؓ میں اس زرہ کا تجھ سے زیادہ حقدار نہیں اور تو ان دراہم کا مجھ سے زیادہ مستحق ہے۔

حضرت علی مرتضیٰؓ نے یہ سارا ماجرا حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا:۔

فاخبرتہ ما کان من امر عثمان فدعا لہ بخیر۔[3]

الحاصل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ کے لیے دُعا فرمائی۔

سبحان اللہ! حضرت عثمانؓ کی عجیب شان تھی کہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کا حق مہر ان کے مال سے ادا ہوا اور حضرت سیدہ کا جہیز اور اثاثۃ البیت بھی سب اسی پاکیزہ مال سے خریدا گیا۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

سوال ۲:۔ میں نے کسی کتاب میں پڑھا ہے کہ حضرت علیؓ کی خدائی امامت کا عقیدہ سب سے پہلے عبداللہ بن سبا نے مشہور کیا تھا اور حضرت علیؓ کے متعلق طرح طرح کے جھوٹے عقیدے وہی رائج کرتا تھا۔ یہاں

[1] دیکھیئے الاستیعاب ص ۷۷۱ [2] دیکھیئے طبقات ابن سعد ص ۱۴ تا ص ۱۶ [3] بحار الانوار جلد ۱۰ ص ۴۰

کہ شیعہ اس کے وجود سے انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ ایک فرضی آدمی ہے۔ اس نام کا کوئی حقیقی شخص موجود نہیں ہوا؟

احقر عبدالعزیز دکاندار محلہ مکران ٹیکسلا

جواب: شیعہ کی معتبر کتاب منہج المقال فی تحقیق الرجال میں رجال کشی سے منقول ہے۔

ذکر بعض اہل العلم ان عبداللہ بن سبا کان یہودیاً فاسلم و والی علیاً وکان یقول وھو علی یہودیتہ فے یوشع وصی موسیٰ بالغلو فقال فی اسلامہ بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی علی مثل ذالک فکان اول من شہر القول بفرض امامۃ علی علیہ السلام واظہر البراءۃ من اعدائہ۔[1]

ترجمہ: عبداللہ بن سبا جو پہلے یہودی تھا، اپنی یہودیت کے دنوں میں حضرت یوشع بن نون کے وصی موسیٰ ہونے کا اعتقاد رکھتا تھا اسلام میں آنے کے بعد اس نے یہی عقیدہ حضرت علیؓ کے متعلق بنا لیا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی تھے۔ پس سب سے پہلے جس شخص نے حضرت علیؓ کی امامت کا عقیدہ مشہور کیا اور ان کے مخالفین سے تبرا کیا وہ یہی عبداللہ بن سبا یہودی ہے۔

امام جعفر صادقؓ فرماتے ہیں:۔

انا اہل بیت صادقون لا نخلو من کذاب۔ ہم اہل بیت سچے ہیں۔ لیکن ہمیں کسی نہ کسی کذاب کا سامنا ضرور کرنا پڑتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سچے تھے لیکن ان کے سامنے مسیلمہ کذاب تھا۔ اسی طرح حضرت علی مرتضیٰؓ سچے تھے لیکن:۔

کان الذی یکذب علیہ ویعمل فی تکذیب صدقہ بما یفتری علیہ من الکذب عبداللہ بن سبا لعنہ اللہ۔[2]

ان پر جھوٹ باندھنے والا ان کی سچی تعلیمات کو جھٹلا کر ان کے متعلق طرح طرح کے اعتقاد گھڑنے والا عبداللہ بن سبا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب

کتبہ: خالد محمود عفا اللہ عنہ ۲۵ نومبر ۱۹۶۳ء

نوٹ: مندرجہ ذیل دو سوالوں کا جواب حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دامت برکاتہم کے قلم سے مرقوم ہے۔

سوال: کتاب الجمیل ص۵۶ میں مرقوم ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیہم تین شب غار میں ہی رہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ دن بھر قریش کے بچوں کے ساتھ کھیلا کرتے اور رات کو چیزیں پہنچاتے تھے۔ تیسری شب کی صبح کو عبداللہ بن اریقط دونوں اونٹنیاں لے کر حاضر ہوا اور ساحل کے

---

[1] رجال کشی ص۱۰۸ [2] بحار الانوار جلد اول ص۵۷۲

راستے چلا۔ چونکہ حضرت ابوبکرؓ تجارتی سفروں سے کثیر آشنا شخص تھے۔ اس واسطے آنے جانے والے مسافر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت جب پوچھتے تھے کہ یہ کون شخص ہے تو کہتے تھے رجل یہدینی السبیل۔ یہ جھوٹ نہیں بلکہ توریہ تھا۔ اس طور پر زید کا اعتراض ہے کہ جس طرح مذہب شیعہ میں تقیہ جائز ہے اسی طرح مذہب اہلسنت میں توریہ جائز ہو گیا۔ اگر توریہ اور تقیہ میں کچھ فرق ہے تو اس کی وضاحت کر دی جائے۔ زید کا بیان ہے کہ ایک مولوی صاحب سے ہم نے مسئلہ توریہ دریافت کیا۔ جواب دیا کہ شرع شریف میں توریہ لا اصل لہ ہے۔ جو شخص توریہ کو شرعاً حلال سمجھتا ہے ہرگز اس کی اقتدار نماز میں جائز نہیں۔ کیونکہ جھوٹ کو من حیثیت توریہ حلال سمجھنا کفر ہے اور حضرت ابوبکرؓ پر جس کا لقب صدیق ہے کتاب الجمیل سے اتہام جھوٹ کہنے کا وارد ہوتا ہے۔ کتب تواریخ سے حضرت ابوبکرؓ کا لفظ رجل یہدینی السبیل کہنا ثابت نہیں۔

جواب: رجل یہدینی السبیل بالکل صحیح راست امر اور واقعی بات ہے۔ جس میں جھوٹ کا شائبہ نہیں بخلاف تقیہ کے کہ جن کا شعار یہ ہے وہ اس کی آڑ میں صریح کذب و افترا پردازی کرتے ہیں چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ رجل یہدینی السبیل جس معنی کے اعتبار سے انہوں نے فرمایا۔ وہ بالکل صحیح اور واقعی امر تھا۔ مخاطبین نے اگر اس کا مطلب دوسرا سمجھا بسبب اس کلام کے ذو معنیین ہونے کے تو اس میں متکلم پر کوئی عیب نہیں۔ باقی مسئلہ توریہ کا کتب فقہ میں اس طرح ہے کہ جن ضرورتوں میں جھوٹ بولنا درست ہے جیسے کسی مسلمان کی جان و مال بچانے کے لیے تو اس موقع پر فقہاء کہتے ہیں کہ حتی الوسع صریح جھوٹ نہ بولے۔ اگر توریہ سے کام چل سکے ورنہ صریح جھوٹ بھی ایسے مواقع میں اس مثل کا مصداق ہے۔ دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز۔

سوال: مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوے مسیحیت اور مہدویت سے واقف ہو کر بھی اگر کوئی شخص مرزا کو مسلمان سمجھتا ہے تو کیا وہ شخص مومن کہلا سکتا ہے؟

جواب: مرزا قادیانی کے عقائد و خیالاتِ باطلہ اس حد تک پہنچے ہوئے ہیں کہ ان سے واقف ہو کر کوئی مسلمان مرزا کو مسلمان نہیں کہہ سکتا۔ البتہ جس کو علم اس کے عقائد باطلہ کا نہ ہو تاویل کرے اور کافر نہ کہے تو ممکن ہے بہرحال بعد علم عقائد باطلہ مرزا مذکور کو کافر کہنا اس کا ضروری ہے۔ اس کو اور اس کے اتباع کو جن کا شمول اس کے ہو مسلمان نہ کہا جاوے۔ وہ مسلمان نہ تھا جیسا کہ اس کی کتب سے ظاہر ہے۔ باقی یہ کہ جو شخص بسبب کسی شبہ اور تاویل کے کافر نہ کہے اس کو بھی کافر نہ کہا جاوے موقع تاویل میں احتیاط عدم تکفیر میں ہے۔ فقط

(مفتی) محمد شفیع غفرلہٗ

سوال: اگر کوئی شخص سرکارِ مدینہ کی تشریف آوری کے بعد مندرجہ ذیل عقائد میں سے کسی ایک عقیدے کا معتقد ہو تو وہ اہلِ کتاب میں داخل ہوگا یا نہیں اور اس کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور ہمارے لیے حلال ہے یا نہ. اس مسئلہ کی پوری وضاحت فرمائیں:۔

۱. حضور پیغمبر عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد اور نبی بھی پیدا ہو سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ نبی صاحبِ کتاب ہو۔ قرآن پاک بیشک سچی اور حق کتاب ہے. مگر اب یہ منسوخ ہے اور اسکے احکام اب باقی نہیں؟

۲. حضور پیغمبر عربیؐ کے بعد ایسا نبی پیدا ہو سکتا ہے جو حضورؐ کی شریعت کے تابع ہو کر رہے. حضورؐ پر ختمِ نبوت ہونے کا یہ معنی ہے کہ حضورؐ کے مرتبے کا کوئی پیدا نہ ہوگا؟

۳. حضور پیغمبر عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد کوئی نیا نبی پیدا نہیں ہو سکتا. لیکن اس کا معنی صرف یہ ہے کہ آپ کے بعد نبی کا نام یا نبی کا لفظ کسی نئے آنے والے کے لیے نہیں۔ نبوت کی شرائط اور صفات (جیسے معصوم ہونا، مامور من اللہ ہونا، مفترض الطاعت ہونا، حلال و حرام میں لسان فیصل ہونا یہ سب امور خاتم النبیین کے بعد بھی باقی اور جاری ہیں. ختمِ نبوت صرف لفظِ نبوت کے لیے روک ہے صفاتِ نبوت بہرصورت باقی ہیں اور ان کے حامل ائمہ کرام اور اولوالامر حضرات ہیں؟

۴. حضور پیغمبر عربی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد کوئی نیا نبی پیدا نہیں ہوگا. البتہ پہلے پیغمبروں میں سے اگر کوئی زندہ ہو اور وہ آپ کے عہدِ مبارک میں دوبارہ آجائے تو اس کی آمد عقیدہ ختمِ نبوت کے خلاف نہ ہوگی؟

سائل۔ نذیر احمد مدرس مدرسہ عربیہ خیر العلوم کمالیہ

الجواب: سوال مذکور الصدر کی پہلی تینوں صورتوں کا حکم ایک ہے اور یہ تینوں طبقے ختمِ نبوت کے اسلامی معنوں کے منکر ہیں. ختمِ نبوت کا عقیدہ ضروریاتِ دین میں سے ہے اور ضروریاتِ دین میں تاویل قطعاً معتبر نہیں. مندرجہ بالا تینوں صورتوں میں صرف تاویل اور تعبیر کا اختلاف ہے. حقیقت میں ختمِ نبوت کے اسلامی معنوں کے تینوں نہایت واضح طور پر خلاف ہیں. پہلی صورت کے قائل ختمِ زمانی کے منکر ہیں ظاہر ہے کہ عقیدہ نبوت کے لیے صرف ختمِ نبوت مرتبی کا اقرار کافی نہیں، ختمِ نبوت زمانی کا اقرار بھی لازمی ہے اور وہ اس عقیدے کا اساسی جزو ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اگر کوئی اور نیا نبی پیدا ہو اور وہ حضورؐ کے ماتحت ہو کر رہے تو ختمِ نبوت مرتبی کے عقیدہ پر براہِ راست زد نہیں پڑتی. لیکن ختمِ نبوت زمانی کے انکار سے عقیدہ ختمِ نبوت بُری طرح زخمی ہو جاتا ہے. ختمِ نبوت کے اسلامی اعتقاد کا تقاضا ہے کہ ختمِ نبوت مرتبی، ختمِ نبوت زمانی اور ختمِ نبوت مکانی کے ہر مفہوم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ختمی مرتبت پر

ختم مانا جائے. بانیٔ دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں:۔

اپنا دین و ایمان ہے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی اور نبی کے ہونے کا احتمال نہیں جو اس میں تامل کرے اس کو کافر سمجھتا ہوں[1]

تیسری صورت کے منکر عنوان ختمِ نبوت کے منکر نہیں لیکن حقیقت ختمِ نبوت کے صریحاً منکر ہیں. عقیدہ ختمِ نبوت کوئی لفظوں کا کھیل نہیں. کہ لفظ نبی کی روک تو تسلیم کر لی جائے اور نبوت کی حقیقت اور معنویت امامت کے نام سے جاری رکھی جائے.

حجۃ الہند حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ شرح مؤطا میں لکھتے ہیں:۔

او قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبوۃ ولکن معنی ھذا الکلام انہ لا یجوز ان یسمی بعدہ احد بالنبی واما معنی النبوۃ وھو کون الانسان مبعوثا من اللہ تعالیٰ الی الخلق المفترض الطاعۃ معصوماً من الذنوب ومن البقاء علی الخطاء فیما یری فھو موجود فی الائمۃ بعدہ فذٰلک الزندیق وقد اتفق جماھیر المتاخرین من الحنفیۃ والشافعیۃ علی قتل من یجری ھذا المجری[2]

حضرت شاہ صاحبؒ کے اس فیصلے کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کچھ ایسے افراد بھی اس امت میں پیدا ہوں گے جو مامور من اللہ اور معصوم ہوں تو ایسا اعتقاد رکھنے والا عقیدہ ختمِ نبوت کا قطعاً قائل نہیں. خواہ زبان سے ہزار دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین کہتا رہے.

چوتھی صورت کے قائل اگر یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اگر کوئی پرانا نبی اس زمین پر دوبارہ آجائے تو خواہ اس کی اپنی پرانی شریعت "شریعت محمدیہ" سے مختلف ہی تھی لیکن اب وہ اس پر عمل پیرا نہیں ہوگا. بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہو کر رہے گا. تو بے شک ایسا عقیدہ رکھنے والا ختمِ نبوت کے اسلامی معنوں کا پورا قائل ہے اور عقیدہ ختمِ نبوت سے خارج نہیں لیکن اگر کوئی شخص کسی پرانے نبی کی آمد کا اس صورت میں قائل ہو کہ وہ حضورؐ کے تابعِ شریعت نہ رہے گا. تو یہ صورت بھی عقیدہ ختمِ نبوت کے صریح طور پر خلاف ہے. محدث شہیر حضرت مولانا علامہ سید انور شاہ صاحبؒ اپنی فارسی کتاب "خاتم النبیین" میں اس اعتقاد کو بھی لوازمِ ختمِ نبوت سے قرار دیتے ہیں کہ پرانا آنے والا نبی بھی ضروری ہے کہ حضورؐ کے تابع شریعت ہو کر رہے. اس کے بغیر ختمِ نبوت زمانی کا اقرار تو ہو جاتا ہے لیکن ختمِ نبوت مرتبی کا اقرار قائم نہیں رہتا اور مفہوم ختمِ نبوت کا تقاضا ہے کہ نبوت ہر اعتبار سے حضورؐ

---

[1] جوابات محذورات ص۱۰۳ [2] المسوی عربی شرح المؤطا جلد دوم ص۱۳۰

کی ذاتِ اقدس پر ختم مانی جائے۔

پہلی تینوں صورتوں کے قائل قطعی طور پر اسلام کے عقیدہ ختم نبوت کے منکر ہیں اور ہرگز ہرگز اہلِ کتاب میں شامل نہیں۔ قرآن پر عنوانی اعتقاد رکھتے ہوئے زندقہ و الحاد کی راہ چلنا اہلِ کتاب کے حکم میں آنے کا موقع ہرگز نہیں دیتا۔ کتابی وہی ہے جو قرآن سے پہلے کی کسی ایسی کتاب پر ایمان رکھتا ہو جو اب منسوخ ہو چکی ہے۔ علامہ ابو البقاء کتابی ہونے کی یہ تعریف بیان کرتے ہیں:۔

الکافر ان کان متدیناً ببعض الادیان والکتب المنسوخة فھو الکتابی۔[1]

ترجمہ۔ کافر اگر پہلے کے کسی آسمانی دین اور پہلے کی کسی آسمانی کتاب کا قائل ہو تو وہ کتابی ہے۔

قرآن عزیز آخری اور دائمی کتاب ہے جو ہرگز منسوخ نہیں۔ جس شخص کا اعتقاد اس پر صحیح ہوگا وہ مومن اور مسلم قرار پائے گا اور جو شخص اس کے اساسی معنوں میں غلط راہ چلے گا وہ زندیق اور ملحد سمجھا جائے گا، کتابی اسے کسی صورت میں بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ کتابی صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ کسی منسوخ کتاب پر ایمان رکھتا ہو اور اس کے مصداق اس وقت صرف یہود اور نصاریٰ ہی ہیں۔ علامہ شامی لکھتے ہیں:۔

الکتابی من یعتقد دیناً سماویاً ای منزلاً بکتاب کالیھود والنصاریٰ۔[2]

پس وہ زنادقہ و ملحدین جو کتابی تعریف میں نہیں آتے۔ ان کا ذبح کیا ہوا جانور مسلمانوں کے لیے کھانا ہرگز جائز نہیں ہے۔

اہلِ کتاب کا ذبیحہ صرف اسی صورت میں جائز ہے کہ وہ اصالتاً اہلِ کتاب ہوں ارتداداً نہ ہوں۔ اگر کوئی مسلمان عیسائی ہو جائے تو اب اس کا ذبح کیا ہوا جانور ذبیحہ کتابی نہیں ہوگا۔ بلکہ ذبیحہ مرتد ہوگا۔ کتابی وہ اسی صورت میں تھا کہ پہلے مسلمان نہ ہو۔ جو پہلے مسلمان ہو اور بعد ازاں کسی اور دین میں منتقل ہو جائے تو خواہ وہ نیا دین مسیحی اور یہودی دین ہی کیوں نہ ہو وہ شخص بہر صورت مرتد سمجھا جائے گا۔

علامہ ابو البقاء فرماتے ہیں:۔

الکافر ان طرأ کفرہ بعد الایمان فھو المرتد۔[3]

اور حضرت علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:۔

الراجع عن دین الاسلام ورکنھا اجراء بکلمة الکفر علی اللسان بعد الایمان۔[4]

پس مرتد ہونے کے لیے ضروری نہیں کہ سارے اسلام کا ہی انکار ہو۔ کسی ایک ایسے امر کا انکار

---

[1] کلیات ص۵۵۳ [2] شامی جلد ۳ ص۲۷۰ [3] کلیات ابی البقاء ص۵۵۳ [4] شامی جلد ۳ ص۳۹۱

جس کا اسلام کی تعلیم ہونا قطعی اور یقینی طور پر معلوم ہو۔ جیسا کہ عقیدہ ختم نبوت قطعی اور یقینی درجہ رکھتا ہے تو اس کے اسلامی مفہوم کا انکار بھی انسان کو دائرہ اسلام سے یقیناً دور کر دیتا ہے۔ ایمان شرعی کے لیے تو ضروری ہے کہ تمام قطعی تعلیماتِ اسلام کا اقرار ہو۔ لیکن کفر اور ارتداد کے لیے جمیع کی قید نہیں۔ موجبہ کلیہ کی نقیض سالبہ جزئیہ آتی ہے اور کسی ایک قطعی عقیدہ اسلام کا انکار بھی انسان کو اسی طرح ارتداد کے جال میں لے آتا ہے جس طرح کہ پورے اسلام کا انکار ارتداد تھا۔

حاصل اینکہ سوال مذکورہ کی پہلی تینوں صورتیں عقیدہ ختم نبوت کا قطعی انکار ہیں۔ پس ان میں سے کوئی بھی کتابی کی تعریف کے تحت نہیں آتا اور نہ ہی ان میں سے کسی ایک کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے حلال ہے۔

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:۔

وشرط کون الذابح مسلماً حلالاً خارج الحرم ان کان صیداً فصید الحرم لا تحلہ الزکوٰة فی الحرم مطلقاً او کتابیاً ذمیاً او حربیاً الا اذا سمع منہ عند الذبح ذکر المسیح۔

ترجمہ۔ اور ذابح کے لیے شرط ہے کہ وہ مسلمان ہو احرام میں نہ ہو۔ حدودِ حرم سے باہر ہو حرم کے اندر شکار کو ذبح کرنا اسے حلال نہیں کر سکتا۔ کتابی ذمی ہو یا حربی اس کا ذبیحہ بھی جائز ہے مگر جب کہ وہ ذبح کے وقت مسیح کا نام لے۔

لا تحل ذبیحة غیر کتابی من وثنی و مجوسی و مرتد۔[1]

مرتد ہونے کو علامہ شامی نے عدم حلت کی علت قرار دیا ہے۔ قنیہ کی اس عبارت پر لانہ صار کمرتد لکھتے ہیں "علة لعدم الحل"۔ واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم واحکم فی کل باب۔

خالد محمود عفا اللہ عنہ ۲۷/ دسمبر ۶۳ء

نوٹ: سیدنا حضرت علی المرتضیٰؓ سے متعلق استفسارات مختلف اوقات میں موصول ہوتے رہے۔ چونکہ حضرت کی ذاتِ اقدس کے متعلق خصوصی نمبر نکالنے کا کافی دنوں سے ارادہ تھا۔ اس لیے یہ سب سوالات دفتر میں جمع ہوتے رہے۔ ان میں سے اکثر سوالوں کے جواب اس خاص نمبر میں ہدیۂ قارئین ہیں۔

انور منیجر ہفت روزہ دعوت لاہور

سوال: حضرت علی حیدرؓ کی علمی بصیرت ہر طبقے میں مسلّم ہے۔ مگر یہ بات بہت تعجب خیز ہے کہ آپ نے آئندہ فرقہ بندی کے متعلق کوئی پیشگوئی نہیں فرمائی کہ جناب پیغمبر برحق کے طریقے اور حضرت علیؓ کے مسلک کا سچا تابعدار کون ہے۔ اتنے اہم موضوع کے بارے میں آپ کی خاموشی سمجھ میں نہیں آتی؟ سائل۔ حافظ محمد ظفر میانوالی

---

[1] درمختار بحاشیہ ردالمحتار جلد ۵ ص۲۵۹

جواب: یہ صحیح نہیں کہ سیدنا حضرت علی المرتضیٰؓ اس باب میں یکسر خاموش رہے۔ آپ نے نہایت واضح طور پر فرمادیا تھا کہ اہل سنت والجماعت ہی حضور خاتم النبیینؐ کے نقش قدم پر ہوں گے اور وہی آپ کے (یعنی حضرت علی المرتضیٰؓ کے) سچے تابعدار رہیں گے۔ آپ جب بصرہ تشریف لائے تو چند دنوں کے بعد ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس میں آپ نے اس سوال کا جواب دیا تھا۔ آپ نے ارشاد فرمایا تھا:۔

اما اهل السنة فالمتمسكون بما سنّهُ الله لهم ورسوله۔

"اہل سنت وہ ہوں گے جو خدا اور اس کے رسول کے صحیح طریقے پر گامزن ہوں گے"

اور الجماعت کے متعلق ارشاد فرمایا تھا:۔

اما اهل الجماعة فانا ومن اتبعني [1]

"الجماعت سے وہ لوگ مراد ہیں جو میرے نقش قدم پر چلنے والے ہوں گے"

اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے اپنی خداداد علمی بصیرت سے اہل سنت والجماعت کے طائفہ منصورہ اور فرقہ ناجیہ ہونے کی تصریح فرمادی تھی۔

آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا تھا:۔

سيهلك فيّ صنفان محب مفرط يذهب به الحب الى غير الحق ومبغض مفرط يذهب به البغض الى غير الحق وخير الناس فيّ حالاً النمط الاوسط فالزموا السواد الاعظم فان يد الله على الجماعة واياكم والفرقة فان الشاذ من الناس للشيطان كما ان الشاذ من الغنم للذئب الا من دعا الى هذا الشعار فاقتلوه ولو كان تحت عمامتي هذه [3]

ترجمہ: میرے بارے میں دو قسم کے لوگ ہلاکت کی راہ پر ہوں گے۔ ایک وہ جو محبت میں حد سے زیادہ بڑھ جائیں گے اور ایک وہ جو مخالفت میں حد سے زیادہ بڑھ جانے والے ہوں گے (جیسے خوارج) میرے بارے میں بہترین عقیدے والے وہ لوگ ہوں گے جو درمیانے قسم کے ہوں گے تم اسی سواد اعظم کے ساتھ رہنا۔ انہی پر اللہ کا ہاتھ ہوگا۔ ان سے ہرگز نہ کٹنا جمہور سے جدا ہونے والا اسی طرح شیطان کے ساتھ لگتا ہے جس طرح ریوڑ سے جدا ہونے والا جانور بھیڑیئے کا شکار بنتا ہے خبردار! جو اس تفرقے کی دعوت دے وہ واجب القتل ہے اگرچہ وہ میری پگڑی کا ہی سہارا لے رہا ہو۔ (یعنی اپنی علامت میری وابستگی ہی کیوں نہ قرار دے رہا ہو)۔

---

[1] کتاب الاحتجاج للطبرسی صفحہ ۹ مطبوعہ نجف اشرف [2] نہج البلاغہ جلد ۲ صفحہ ۱۲

اس سے یہ امر پوری طرح واضح ہے کہ حضرت علی المرتضیٰؓ نے اپنی علمی بصیرت کا پورا حق ادا فرمایا اور اپنے بعد کے رشد و ہدایت کی پوری راہیں متعین فرمادیں۔ وہی مسلک اب اہل سنت والجماعت کے نام سے معروف ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: حضور سرور صلی اللہ علیہ وسلم نے مروان کو (اس کی سازشوں کے باعث مدینہ سے نکال دیا تھا پھر اسے حضرت عثمانؓ نے واپس آنے کی اجازت دے دی تھی۔ مگر اس نے پھر سازشیں شروع کردیں۔ یہاں تک کہ جنگ جمل میں گرفتار ہوگیا اور حضرت علیؓ کے ہاتھ لگ گیا۔ سوال یہ ہے کہ ایسے مفسد کو حضرت علیؓ نے کیوں چھوڑ دیا۔ حضور آں سرورؐ جسے مدینہ سے باہر نکالیں۔ حضرت علی المرتضیٰؓ اس پر اتنے مہربان کیوں ہوئے؟

سائل، قاضی مسعود الحسن کلور کوٹ

جواب: یہ غلط ہے کہ مروان کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے سزا کے طور پر نکالا تھا۔ مروان کی تو عمر ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریفہ کے وقت بمشکل ایک سال کی تھی۔ بلکہ بعض کہتے ہیں کہ وہ پیدا ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہوا۔

پس مروان کے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کسی سازش کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ وہ سزا کے طور پر مدینے سے نکالا گیا ہو۔

یہ مروان مدینہ سے باہر اپنے باپ حکم کے ساتھ مقیم تھا۔ یہاں تک کہ اس نے حضرت علی المرتضیٰؓ کی بیعت کرلی۔ حضرت علیؓ نے جب اس کی بیعت، قبول فرمالی تو حضرت عثمانؓ نے اسے مدینہ شریف بلالیا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما میں تعلقات کچھ اس قسم کے تھے کہ وہ ایک دوسرے کی بات کو رد نہ کرتے تھے اب یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ حضرت علیؓ تو اسے قبول فرمائیں اور حضرت عثمانؓ اسے رد کردیں۔ حضرت عثمانؓ نے تو اس کے باپ حکم کو بھی مدینہ واپس آنے کی اجازت دے دی۔ کیونکہ اب وہ اس قدر بوڑھا اور ناکارہ ہوچکا تھا کہ اس سے کسی سازش کا امکان باقی نہ رہا تھا۔ حضرت عثمانؓ مقام اجتہاد پر فائز تھے انہوں نے اجتہاد سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو معلل بعلت سمجھا اور جب وہ علت اور سبب جاتے رہے تو انہوں نے اسے واپس آنے کی اجازت دے دی۔ باقی رہا اس کے بیٹے مروان کا مسئلہ سو اسے حضرت علی المرتضیٰؓ نے اپنی روحانی بیعت میں قبول فرمالیا تھا۔ مگر افسوس کہ اس نے اس کے باوجود پھر سازشیں شروع کردیں لیکن اس سے حضرت علی یا حضرت عثمان رضی اللہ عنہما پر کسی قسم کا حرف نہیں آتا ——— علم غیب خاصہ باری تعالیٰ ہے۔ یہ حضرات عالم الغیب ہرگز نہ تھے۔ انہوں نے ظاہر حالات پر نظر کرکے ارشاد نبوت کو علت پر

مردود قرار دیا تھا۔ پھر جنگ جمل کے دن یہ گرفتار ہوا تو شہزادۂ صلح و وفا حضرت حسنؓ اور شہید جور و وفا شہزادۂ گلگوں قبا حضرت حسینؓ نے اس کی سفارش فرمائی۔ حضرت علیؓ نے ان کی سفارش پر نہیں رہا کیا تھا۔ اگر یہ بزرگ اس کی سفارش نہ کرتے تو حضرت مرتضیٰؓ اسے کبھی معاف نہ کرتے۔ یہاں یہ گمان نہ کیا جائے کہ حضرت علیؓ کا نظامِ حکومت اپنے رشتہ داروں کی سفارشوں پر چلتا تھا۔ کیونکہ اس رہائی کے احکام کے پس پشت حضرت عثمانؓ کے فیصلے کا احترام بھی کار فرما تھا۔ بایں ہمہ حضرت علی المرتضیٰؓ مروان سے ناراض تھے۔ آپ نے اسے رہا تو فرما دیا۔ مگر یہ بھی ارشاد فرمایا:۔

اولم یبایعنی قبل قتل عثمانؓ لاحاجة لی فی بیعته انها کف یهودیة۔[1]

ترجمہ۔ کیا اس نے حضرت عثمانؓ کی شہادت سے پہلے میری بیعت نہیں کی تھی (یعنی بیعتِ روحانی۔ کیونکہ اس وقت بیعتِ خلافت کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا) اب مجھے اس کی بیعت (خلافت) کی کوئی حاجت نہیں، یہ ایک یہودی ہاتھ ہے جس میں وفا نہیں۔

حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہما کا اس مروان کی سفارش کرنا اور حضرت علیؓ کا اسے قبول کرنا یہ بھی نہج البلاغۃ کے اسی مقام میں موجود ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سوال: حضرت علیؓ کا اپنے دورِ خلافت میں باغِ فدک کے علاقے پر پورا قبضہ تھا جب آپ امیر المؤمنین تھے تو آپ نے باغِ فدک حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے شرعی وارثوں میں کیوں تقسیم نہ کیا۔ کیا خلیفہ اسلام کے ذمہ نہیں کہ وہ عدل و انصاف کے تمام تقاضے پورے کرے؟ سائل۔ عبد الرحمٰن کبیر والہ ضلع ملتان

جواب: باغِ فدک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک قومی ملکیت کے طور پر تھا۔ پس اس کے نبی وراثت میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ قومی ملکیت آپ کے خلیفہ کے سپرد تھی اور وہ اسے برابر اسی طرح خرچ کرتے رہے۔ جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے صرف فرماتے تھے۔ حضرت امام جعفر صادقؒ نے ایسے اموال کے متعلق ارشاد فرمایا:۔

هو للامام من بعده یضعه حیث یشاء۔[2]

ترجمہ۔ ایسے اموال پیغمبر کے بعد خلیفہ اور امام کے تصرف میں ہیں وہ جس طرح مناسب سمجھے ان کا فیصلہ کرے۔

معلوم ہوا کہ فدک کا باغ حضرت علی المرتضیٰؓ کے ہی تصرف میں رہنا چاہیئے تھا۔ یہ صحیح نہ تھا کہ وہ

[1] نہج البلاغۃ جلد ۱ صفحہ ۱۲۰ مصر [2] اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۵۳۹ ایران

اسے حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے وارثوں میں تقسیم کرتے۔ حضرت علیؓ کا عمل اپنی جگہ بالکل صحیح تھا۔

ثانیاً۔ پیغمبروں کی علمی وراثت تو چلتی ہے لیکن ان کے دوائرِ عمل میں مالی وراثت کا کوئی سلسلہ نہیں ہوتا۔ ایک دفعہ حضرت علی مرتضیٰؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:۔

ما ارث منك یارسول اللّٰه۔

"یارسول اللہ! میں آپ کی وراثت میں کیا پاؤں گا؟"

آپ نے فرمایا:۔

ما ورثت الانبیاء من قبلی.

"جو کچھ مجھ سے پہلے انبیاء اپنی وراثت میں دیتے رہے وہی تم بھی حاصل کروگے"

حضرت علیؓ نے پھر سوال کیا:۔

ما ورثت الانبیاء من قبلك؟

"آپ سے پہلے انبیاء اپنی وراثت میں کیا چھوڑتے رہے؟"

اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

کتاب ربهم وسنة نبیهم۔[1]

"ان کے پروردگار کی کتاب اور ان کے نبی کی سنت"

حاصل اینکہ انبیاء کرام کی وراثت ہمیشہ علمی رہی ہے۔ نہ ان کے ہاں مالی وراثت کا سلسلہ ہوتا ہے اور نہ باغ فدک کے حضرت فاطمہؓ کے وارثوں میں تقسیم نہ کرنے سے حضرت علی المرتضیٰؓ کی ذات اقدس پر کوئی حرف آتا ہے۔ حضرت علیؓ نے جو کچھ کیا قواعد شریعت اور ارشاداتِ نبوت کے عین مطابق تھا۔

ثالثاً۔ حضرت علی المرتضیٰؓ اپنے عہدِ خلافت میں سیرتِ شیخین کے پوری طرح پابند تھے پس باغ فدک کے متعلق بھی حضرت علیؓ نے انہی حضرات کے فیصلوں کی تائید فرمائی اور جس طرح عہدِ صدیقی میں باغِ فدک کی آمدنی حضرات اہل بیت پر خرچ ہوتی تھی۔ خلافتِ مرتضویہ میں بھی بالکل اسی طرح عمل در آمد رہا۔ مشہور ایرانی مجتہد سید علی نقی نہج البلاغۃ کی شرح میں لکھتے ہیں:۔

خلاصہ ابوبکر غلہ و سود آں را گرفتہ بقدر کفایت اہل بیت علیہم السلام مے داد و خلفائے بعد۔

[1] یہ ساری روایت تیسری صدی کے مشہور امامی محدث فرات بن ابراہیم بن فرات الکوفی کی نادرِ روزگار تصنیف تفسیر فرات مطبوعہ نجف اشرف کے صفحہ ۸۲ پر موجود ہے۔ یہ علامہ فرات مشہور مفسر علی بن ابراہیم قمی کے استاد اور علامہ کلینی کے استاذ الاستاذ ہیں۔ مفسر قمی نے سورۂ ق کی تفسیر میں ان کی سند بھی ذکر کی ہے۔

از او ہم برآں اسلوب رفتار نمودند تاز مان معاویہ۔[1]

ترجمہ۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ باغ فدک کی آمدنی اور پیداوار ضرورت کے مطابق حضرات اہلِ بیت پر ہی صرف فرماتے اور اُن کے بعد کے خلفاء بھی امیر معاویہؓ کے زمانہ تک اسی طریقِ کار کے پابند رہے۔

واللہ اعلم بالصواب۔

سوال : ایک دفعہ جناب نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو ہاشم کے تمام بڑے بڑے اور اہم افراد کو جمع کیا۔ جن میں حضرت علیؓ بھی شامل تھے۔ پھر حضورؐ نے ان سے ایک سوال کیا تو ابولہب کے اکسانے پر یہ سب لوگ حضورؐ کو چھوڑ بھاگے۔ ابولہب کا ساتھ دینے اور حضورؐ کی مجلس چھوڑ دینے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ مطلع فرمائیں کہ کیا یہ واقعی صحیح ہے اور اگر صحیح ہے تو کہاں ہے؟

۲۔ اس موضوع میں حضرت علیؓ کے متعلق جو شبہ پیدا ہوتا ہے اس کا ازالہ فرمائیں؟ محمد اختر خانیوال

جواب : مشہور امامی مفسر علی بن ابراہیم القمی جو ملا محمد بن یعقوب الکلینی صاحب اصولِ کافی کے بھی اُستاد ہیں اپنی تفسیر میں آیت وانذر عشیرتک الاقربین کے تحت لکھتے ہیں کہ یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو ہاشم کے تمام بڑے بڑے اور اہم آدمیوں کو جو تعداد میں چالیس تھے۔ ایک دعوت پر بلایا:۔

فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من یکون وصیی ووزیری وخلیفتی فقال لہم ابولہب جزمًا سحرکم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فتفرقوا۔[2]

ترجمہ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تم میں سے کون میرا وصی و وزیر اور خلیفہ ہو گا ابولہب نے (انہیں اکسایا اور) کہا تم پر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم نے جادو کر رکھا ہے۔ پس سب کے سب چلے گئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے دن پھر اسی طرح دعوت کی اور دوسرے دن بھی تمام بنو ہاشم اسی طرح بھاگ گئے۔ اس سے انکار نہیں کہ تمام بنو ہاشم دو دفعہ ابولہب کی باتوں میں آگئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ بھاگے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ واقعہ بھی موجود ہے کہ تیسرے دن پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چالیس آدمیوں کی دعوت فرمائی اور پھر وہی سوال کیا تو اس دفعہ سیدنا علی المرتضیٰؓ ابولہب کی بات میں

[1] شرح نہج البلاغۃ جلد ۵ صفحہ ۹۶۰ مطبوعہ طہران [2] تفسیر قمی صفحہ ۴۸۶ ایران

نہ آئے اور آپ نے اپنے آپ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس روایت کی رُو سے حضرت علی المرتضیٰؓ پر اعتراض کرنا کہ وہ ابولہب کے کہنے پر چھوڑ بھاگے ایک صریح شقاوت اور بدبختی ہے۔

اوّلاً یہ کہ پہلے دو دن اس طرح چلے جانا محض اتفاقی اور ہنگامی طور پر واقع ہوا۔ وہ عنادی طور پر حضورؐ سے ہرگز جُدا نہ ہوئے تھے۔ ابولہب محروم الایمان اور حضرت علی المرتضیٰؓ سابق الایمان۔ بھلا ان میں کیا جوڑ ہو سکتا ہے یہ جو کچھ ہوا محض ایک وقتی معاملہ تھا۔ رب العزت نے تو بعض ان لوگوں کو بھی جو جنگ احد میں منتشر ہو گئے تھے معاف کر دیا تھا کیونکہ ان کا یہ محض اتفاقی عمل تھا عنادی نہ تھا اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے نیتوں پر مبنی ہوتے ہیں۔

ثانیاً حضرت علی المرتضیٰؓ نے تیسرے دن جب اپنے آپ کو پیش کر دیا اور تمام بنو ہاشم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے میں خاص طور پر ممتاز رہے تو اب کیا اعتراض باقی رہا۔ شریعت کا قاعدہ ہے۔ العبرۃ بالخواتیم کہ نتیجہ آخری اُمور سے اخذ ہوتا ہے اور انجام کار حضرت علیؓ کا دامن بالکل صاف اور طاہر و مطہر نظر آتا ہے۔

ثالثاً۔ یہ روایت صرف حضرات امامیہ کی ہے۔ ہم تسلیم نہیں کرتے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے مجمع میں جس میں ابولہب بھی شریک ہوا، اپنی خلافت کی بحث چھیڑی ہوا اور پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ مکہ میں جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک اسلام بالکل ابتدائی مراحل میں تھی۔ دین نے ابھی شرفِ تکمیل حاصل کرنا تھا اور رسالت کی شانِ غالبیت ابھی معرضِ ظہور میں نہ آئی تھی۔ یکایک خلافت کا مسئلہ کیسے زیرِ بحث آ گیا معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت کچھ ایسے لوگوں نے ہی وضع کی ہے جنہیں زندگی کے ہر باب میں خلافت کے سوا اور کوئی مسئلہ نہیں سوجھتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سوال : جناب نبی سرور علیہ السلام جب بیمار تھے آپ نے کچھ لکھنے کے لیے حضرت علیؓ سے قلم دوات طلب کی تو آپ نے حضورؐ کی خدمت میں قلم دوات کیوں پیش نہ کیا۔ خصوصاً جب کہ مانگا ہی حضرت علیؓ سے گیا تھا اور وہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سیکرٹری تھے؟ سائل۔ غلام مصطفےٰ فاروق گنج لاہور

جواب : حضرت علی مرتضیٰؓ کا قلم دوات پیش نہ کرنا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حکم عدولی یا حکم مصطفوی سے انحراف کے لیے نہ تھا۔ بلکہ محض اس لیے تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری حالت شدت میں تھی اور حضرت علیؓ کو اندیشہ تھا کہ ان کے جانے اور آنے کے دوران میں ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وفات نہ پا جائیں۔ حضرت علی المرتضیٰؓ خود فرماتے ہیں:۔

امرالنبیؐ ان اٰتیہ بطبق یکتب فیہ مالاتضل امتہ من بعدہ قال فخشیت ان

تفوتنی نفسه قال قلت انی احفظ واعی قال اوصی بالصلوٰۃ والزکوٰۃ وماملکت ایمانکم[1]

ترجمہ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ہی حکم دیا تھا کہ میں آپ کے پاس ایک بڑا کاغذ لاؤں جس میں وہ کچھ لکھ دیں کہ آپ کی امت آپ کے بعد گمراہ نہ ہو سکے۔ مگر میں اس لیے نہ لا سکا کہ مجھے ڈر تھا کہ میرے پیچھے ہی آپ کی وفات نہ ہو جائے۔

ایسی روایات کے سہارے صحابہ کرامؓ پر اعتراض کرنا علم و دیانت سے محروم ہونے کی علامت اور آخرت کی ابدی شقاوت ہے۔ حضرت علی المرتضیٰؓ کی ذاتِ قدسیہ ان کی حسنِ نیت اور ان کے پوری زندگی کے خلوص کے پیشِ نظر اس باب میں کسی غلط فہمی کی کوئی گنجائش نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سوال : حضرت فاطمۃ الزہراؓ کیا زندگی بھر کبھی حضرت علی المرتضیٰؓ سے ناراض بھی ہوئیں یا نہ؟ اگر ہوئیں تو پھر اس حدیث کا کیا مطلب ہے کہ جس نے فاطمہؓ کو ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا اور جس نے مجھے ناراض کیا اس نے خدا کو ناراض کیا۔ سوال یہ ہے کہ حضرت علی المرتضیٰؓ نے بی بی صاحبہ کو کیوں ناراض کیا یہاں تک کہ سیدہؓ اپنے والد مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر چلی گئیں اور اگر انہوں نے کبھی بی بی صاحبہ کو ناراض نہیں کیا تو پھر مطلع فرمائیں کہ بی بی صاحبہؓ نے حضرت علیؓ سے یہ درشت کلامی کیوں فرمائی:۔

ماند جنین در رحم پردہ نشین شدہ و مثل خائبان در خانہ گریختہ و بعد از انکہ شجاعان دہر را بر خاک ہلاک افگندی مغلوب ایں نامرداں گردیدہ[1]

نیز مطلع فرمائیں کہ اس تنازعہ میں حضرت علی المرتضیٰؓ حق پر تھے یا حضرت سیدہ خاتونِ جنتؓ۔ اس کا مفصل جواب دیجئے؟

سائل۔ محمد اقبال ظفر رکن نظام اسلام پارٹی سیالکوٹ

جواب : خاوند اور بیوی کے تعلقات کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں کہ کبھی نہ کبھی رنجش ہو ہی جاتی ہے۔ طبقاتِ ابن سعد صـ۱۶ میں ہے کہ حضرت فاطمہؓ حضرت علیؓ سے ناراض ہو کر ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلی گئیں۔ حضرت علیؓ بھی پیچھے پیچھے چل دیئے اور جا کر ایسی جگہ کھڑے ہو گئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت فاطمہؓ کی گفتگو سن سکیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے بیٹی! وہ کون سے مرد اور عورت ہیں جن کے درمیان کبھی کوئی رنجش واقع نہ ہوئی ہو اور یہ کیا ضروری ہے کہ مرد تمام کام بیوی کے منشاء کے مطابق ہی کرے۔ حضرت علیؓ پر اس مصلحانہ جواب کا بہت اثر ہوا۔ خود فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے فاطمہؓ پر کبھی کوئی سختی نہ کی۔[2]

---

[1] حق الیقین صـ۱۲۵ مطبوعہ مطبع جعفری لکھنؤ [2] تفصیل کے لیے دیکھئے اصابہ صـ۳۱۷

ایک دفعہ حضرت علی المرتضیٰؓ نے ابوجہل کی بیٹی عوراء سے نکاح کا ارادہ فرمایا۔ جب حضرت فاطمۃ الزہرؓ کو پتہ چلا تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئیں۔ سنن ابن ماجہ میں ہے:۔

فلما سمعت بذلك فاطمةؓ اتت النبیؐ فقالت ان قومك یتحدثون انك لا تغضب لبناتك وهذا علی ناكحا ابنة ابی جهل۔

ترجمہ۔ حضرت فاطمہؓ نے جب یہ سنا تو وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ سلم کے پاس گئیں اور کہا کہ قریش باتیں کرتے ہیں کہ آپ اپنی بیٹیوں کے لیے (دوسروں سے) کبھی ناراض نہیں ہوتے اور اب تو علیؓ ابوجہل کی بیٹی سے شادی بھی کرنے والے ہیں۔

اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمہ شہادت پڑھا اور ارشاد فرمایا:۔

اما بعد فانی قد انكحت ابا العاص بن الربیع فحدثنی فصدقنی وان فاطمةؓ بنت محمدؐ بضعة منی وانا اكره ان تفتنوها وانها والله لا تجتمع بنت رسول الله وبنت عدو الله عند رجل واحد ابدا[1]

ترجمہ۔ میں نے (اپنی بیٹی زینبؓ) ابوالعاصؓ بن ربیع کے نکاح میں دی تھی تو اس نے جو قول مجھ سے کیا پورا کر دکھایا اور بے شک فاطمہؓ بھی میرے جگر کا ٹکڑا ہے اور میں پسند نہیں کرتا کہ تم اسے کسی آزمائش میں ڈالو۔ بخدا خدا کے رسول کی بیٹی اور خدا کے دشمن کی بیٹی کبھی ایک شخص کے ہاں جمع نہیں ہو سکتیں۔

اور صحیح بخاری، باب ذب الرجل عن ابنتہ فی الغیرۃ والانصاف میں ہے کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا:۔

ان بنی هشام بن المغیرة استاذنونی فی ان ینكحوا ابنتهم علی بن ابی طالب فلا اذن ثم لا اذن ثم لا اذن الا ان یرید ابن ابی طالب ان یطلق ابنتی و ینكح ابنتهم فانما هی بضعة منی یریبنی ما ارابها و یوذینی ما اذاها[2]

ترجمہ۔ بنو ہشام نے مجھ سے اجازت مانگی ہے کہ وہ اپنی ایک بیٹی علیؓ کے نکاح میں دے دیں میں اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا، اجازت نہیں دیتا، اجازت نہیں دیتا۔ ہاں علیؓ بن ابی طالب اگر ضروری نکاح کرنا چاہیں تو پہلے میری بیٹی کو طلاق دے دیں اور پھر ان کی بیٹی سے نکاح کر لیں۔ فاطمہؓ میرے جگر کا ٹکڑا ہے جو چیز اسے بری لگے وہ مجھے بھی بری لگتی ہے اور جو بات اُسے تکلیف دے اس سے مجھے بھی تکلیف ہوتی ہے۔

---

[1] سنن ابن ماجہ صـ۱۴۵ باب الغیرہ۔ [2] صحیح بخاری جلد ۲ صـ۷۸۷

بعض روایات میں یُوں ہے :۔

من اغضبہا فقد اغضبنی۔ "کہ جس نے فاطمہؓ کو ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا"

اسد الغابہ میں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا :۔

انی لست احرم حلالًا ولا احل حرامًا ولاکن لا تجتمع بنت رسول اللہ وبنت عدو اللہ۔[1]

ترجمہ۔ میں خدا کے حلال کردہ امر (یعنی نکاح ثانی) کو حرام نہیں کرتا اور نہ ہی کسی حرام کو حلال کرتا ہوں لیکن خدا کے رسول کی بیٹی اور خدا کے دشمن کی بیٹی کس طرح ایک شخص کے ہاں جمع ہو جائیں۔

ان واقعات سے یہ بات تو ثابت ہوتی ہے کہ حضرت سیدہؓ کئی دفعہ حضرت علی مرتضیٰؓ سے ناراض ہوئیں۔ لیکن اس سے علیؓ کی ذات پر کوئی حرف نہیں آتا۔ کیونکہ حدیث میں جس بات پر وعید آئی ہے۔ وہ غضب یعنی مطلق ناراض ہونا نہیں۔ بلکہ اغضاب ہے۔ جس کے معنی قصدًا دوسرے کو ناراض کرنا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حضرت سیدہؓ ناراض ہوئیں۔ لیکن یہ ہرگز صحیح نہیں کہ حضرت علیؓ نے انہیں ناراض کیا۔ یعنی فعل اغضاب حضرت علیؓ سے ثابت نہیں ہوا۔ کیونکہ اس میں قصدًا ایذا ضروری ہے۔ اور حضرت علی المرتضیٰؓ کا ایسا قصد ہرگز نہ تھا۔ خاتم المحدثین حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی لکھتے ہیں :۔

آنچہ گفتہ اند کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فرمودہ است من اغضبہا فقد اغضبنی پس کمال نادانی است بلغت عرب زیرا کہ اغضاب آنست کہ شخصے بقول فعل در غضب آوردن شخصے قصد نماید۔[2]

حاصل اینکہ ارشادِ نبوت کی وعید میں لفظ اغضاب ہے غضب نہیں۔ اگر یوں ہوتا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یُوں ارشاد فرماتے :۔

من غضبت علیہ غضبت علیہ۔ پس معلوم ہوا کہ ان واقعات سے حضرت علی المرتضیٰؓ کی شانِ قدس پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ ملا باقر مجلسی نے بحار الانوار (جلد ۱۰ ص۴۵) پر ایسے کئی واقعات نقل کئے جن میں حضرت فاطمۃ الزہراؓ نے حضرت علی المرتضیٰؓ کے خلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں شکایتیں کیں لیکن ایسے واقعات سب کے سب محض ہنگامی اور وقتی قسم کے تھے۔ جن میں فریقین میں سے کسی فریق کے فسادِ نیت کا کوئی احتمال نہیں۔

ہمارا یہ منصب نہیں کہ ہم ان اختلافات اور غلط فہمیوں کا محاکمہ کریں۔ یہ ہر دو شخصیتیں ہمارے لیے

۱۔ تکملہ اسد الغابہ ص۴۳۸ ۲۔ تحفہ ص۲۷۸ نولکشور لکھنو۔

انتہائی درجہ میں لائق تعظیم ہیں۔ اجمالاً اتنی بات کافی ہے کہ ہر بناء اختلاف میں حضرت علی المرتضیٰؓ کا دامن پُوری طرح پاک اور بے غبار ہے۔ حضرت سیدہؓ کی نیت میں بھی کوئی بُرائی یا مقابلہ آرائی ہرگز نہیں تھی۔ ناراضگی بنت رسول کے یہ چند واقعات محض غلط فہمی یا ایک انداز غیرت پہ مبنی تھے۔ جس طرح ہم جنگ جمل کے فریقین حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ اور حضرت علی المرتضیٰؓ میں سے ہر ایک کو حق پر اور ان کے اختلاف کو محض غلط فہمیوں پہ مبنی قرار دیتے ہیں اور کسی ایک فریق کی بھی بے ادبی کی اجازت نہیں دیتے۔ اسی طرح ہم اسے بھی ہرگز جائز نہیں سمجھتے کہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ اور حضرت علی المرتضیٰؓ کے ان اختلافات کو خواہ مخواہ ہوا دی جائے۔ بالخصوص جب کہ انجام کار یہ سب اختلافات ختم ہو گئے ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام باوجودیکہ دونوں پیغمبر تھے اور دونوں معصوم۔ مگر دیکھیے ایک غلط فہمی اور ہنگامی صورتِ حال کی بناء پر کس طرح ایک دوسرے سے اُلجھ پڑے اور قرآن عزیز خود اس تصادم کو ذکر فرماتا ہے۔ اب یہاں کس تردید کی جائے گی، یقیناً کسی کی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فیصلے محض نیت پہ مبنی ہیں۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ کے اختلافات یا حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کے اختلافات یا حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے اختلافات ہم ان سب ابواب میں ہر ایک فریق کے حسنِ نیت کے قائل ہیں۔ اگر معصوموں کے مابین غلط فہمی ہو سکتی ہے جیسے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام میں ہوئی تو غیر معصومین بدرجہ اولیٰ غلط فہمی میں ایک دوسرے سے اُلجھ سکتے ہیں۔ فسادِ نیت سے بچتے ہوئے اگر کسی سے خطا بھی صادر ہو تو ایسی خطائے اجتہادی پر بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی گرفت نہیں۔ بلکہ مجتہد مخطی بھی مثاب و ماجور ہوتا ہے۔ ہاں مجتہد مصیب کو ارشادِ نبوت کی رو سے یقیناً دو اجر ملتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

ہاں آپ نے حق الیقین ص۱۲۵ سے جو الفاظ نقل کئے ہیں وہ واقعی بہت سخت ہیں۔ اگرچہ یہ روایت احتجاج طبرسی ص۶۵ مطبوعہ نجف اشرف اور بحار الانوار جلد ۱۰ ص۴۶ مطبوعہ ایران وغیرہ میں بھی موجود ہے۔ مگر ہماری عقیدت تسلیم نہیں کرتی کہ حضرت سیدہؓ جنہوں نے آغوشِ رسالت میں تربیت پائی تھی۔ کبھی انہوں نے ایسے الفاظ حضرت علی المرتضیٰؓ کے متعلق کہے ہوں۔ یہ تمام کتابیں جن میں یہ روایت ملتی ہے اہلسنت کی نہیں شیعہ حضرات کی ہیں۔ پس ہمیں چاہیئے کہ ان روایات کو غلط قرار دیں۔ مگر ان نفوسِ قدسیہ کے اخلاقِ فاضلہ اور عاداتِ کریمہ کے متعلق کسی قسم کا کوئی شبہ نہ کریں۔ افسوس کہ ان لوگوں نے ان پاک ہستیوں کو ایسے نازیبا کلمات کا موضوع بنانے کے لیے یہاں تک جسارت کی ہے کہ حضرت علی المرتضیٰؓ کو گالی دے سکنے کا جواز پیدا کرنے کے لیے روایات تک گھڑ لی ہیں۔ خود حضرت علی المرتضیٰؓ کے متعلق ہی لکھتے ہیں کہ (معاذ اللہ) انہوں نے فرمایا :۔

انکم ستدعون الی سبی فسبونی۔[1]

ترجمہ۔ تمہیں کہا جائے گا کہ مجھے گالی دو، بس مجھے گالی دے لیا کرنا۔

اہلسنت ایسی تمام روایات کو جن میں ان نفوسِ قدسیہ کو گالی دے سکنے کا کوئی ادنیٰ سا جواز بھی ملتا ہو یکسر باطل سمجھتے ہیں۔ ان روایات کا اور ایسے غلط مذاہب کا انکار کر دینا آسان ہے۔ مگر صحابہ کرامؓ اور اہلبیت عظام کی اس قسم کی گستاخی قطعاً حرام ہے۔ رب العزت اس جسارت سے محفوظ رکھے۔ واللہ اعلم بالصواب

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: حضرت علی المرتضیٰؓ کے والد حضرت ابوطالب نے اسلام قبول کیا تھا یا وہ انہی پرانے عقائد پر ان کی وفات ہوئی جو اُن دنوں قریشِ مکہ میں رائج تھے۔ جب حضور نبی پاکؐ کی انتہائی خواہش تھی کہ آپ ایمان لائیں تو وہ مشرف بالایمان ہوئے یا نہ؟ نیز مطلع فرمائیں کہ نکاح خواں کے لیے ایمان اور اسلام کی شرط ہے یا نہ؟ سائل بریلوی عقائد سے تعلق رکھتا ہے۔ مجھے اس کے مطابق تحقیق درکار ہے؟ سائل۔ غلام محمد فاروقی

جواب: ایسے سوالات میں اُلجھنا بالکل بے فائدہ اور فضول ہے۔ یہ لوگ اب دُنیا سے جا چکے ہیں اور ان کے عقائد و اعمال اب ان کے سامنے پوری طرح کھلے ہوئے ہیں۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے وہ یہی ہے کہ ان کی وفات انہی عقائد پر ہوئی جو اُس وقت قریشِ مکہ میں موجود تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش تھی کہ وہ ایمان لے آئیں لیکن رب العزت نے ارشاد فرمادیا تھا:۔

انك لا تهدي من احببت ولكن الله يهدي من يشاء۔ (پ۲۰ القصص)

ترجمہ۔ آپ ہر اس شخص کو جسے چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے۔ ہدایت خدا کے قبضے میں ہے

شیعہ حضرات کے مشہور محدث اور مفسر علی بن ابراہیم قمی اس آیت شریفہ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

نزلت فی ابی طالب۔[2]

ہمارے حضرات کا موقف یہ ہے کہ حضرت ابوطالب کا اسم گرامی پورے احترام سے لیا جائے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ مجھ سے اُن کا نام حضرت کے بغیر لیا ہی نہیں جا سکتا۔

بریلوی حضرات کا موقف اس باب میں مجھے معلوم نہیں۔

جامع الاخبار فصل سادس میں ابن بابویہ قمی کی سند سے ایک روایت لکھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوطالب کو معراج کی رات مع حضرت عبدالمطلب کے انوارِ اربعہ میں دیکھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

[1] اصول کافی مع الصافی جلد ۴ ص۔ و نہج البلاغہ جلد ۱ ص ۱۲۴ [2] تفسیر قمی ص ۲۹۱ مطبوعہ ایران

نے رب العزت سے عرض کی کہ انہیں یہ درجہ کیسے ملا تو جواب ملا:۔

بکتمانهم الایمان واظهارهم الکفر حتی ماتوا علی ذلك۔[1]

ترجمہ۔ ان لوگوں نے ایمان کو دل میں چھپائے رکھا، یہاں تک کہ ان کی وفات بھی اسی اظہارِ کفر پر ہوئی۔

باطن کا معاملہ تو خدا کے سپرد ہے۔ جہاں تک ظاہر کا تعلق ہے۔ ان کا قبول اسلام کہیں منقول نہیں۔ تاہم ان کی وہ شفقت اور محبت جو انہوں نے آقائے نامدار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کی بہر صورت انہیں نفع پہنچائے گی۔ ہمارے لیے یہی ہے کہ ان کا پوری طرح احترام کریں۔ یہ امر دیگر ہے کہ ان کی محبت کا مرکز محمد رسول اللہ کی بجائے محمد بن عبداللہ کی ذات ہو اور اس شفقت و محبت میں حق کی بجائے خون و نسل کا تعلق ملحوظ ہو لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ حضرت ابوطالب کے اس دورِ محبت میں بھی کتنے ہی ایسے بدبخت موجود تھے جو باوجود آپ کے قرابت دار ہونے کے آپ کے اشد ترین دشمن تھے۔ ان حالات میں حضرت ابوطالب کی شفقت آپ کے لیے ایک بڑا دُنیوی سہارا تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۲۔ نکاح خواں کے لیے مسلمان ہونا ضروری نہیں۔ خصوصاً ایسے وقت میں جب کہ خاوند بیوی کے لیے بھی ایک مذہب ہونا ضروری نہ ہو۔ شریعت کے تمام ضابطے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور نزول قرآن کے بعد ہیں۔ ہاں بعد میں بھی گواہوں کی موجودگی میں فریقین کا ایجاب و قبول نکاح کے لیے کافی سمجھا گیا ہے۔ نکاح خواں کی ذات نکاح کے لیے فرض درجے میں نہیں۔ جناب مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی لکھتے ہیں:۔

نکاح نام باہمی ایجاب و قبول کا ہے۔ اگرچہ بامن (برہمن) پڑھا دے۔[2]

خان صاحب بریلوی کا حوالہ آپ کے سوال کے پیشِ نظر دیا گیا ہے۔

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ ۲، جنوری ۱۹۶۴ء

سوال: ۱۔ ہم نے دعوت میں پڑھا تھا کہ روزہ اس وقت افطار کیا جائے جب سورج غروب ہو جائے اور سفیدی سیاہی میں تبدیل ہو جائے۔ اس پر شیعہ اعتراض کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ افطاری کا وقت نہیں ہے افطاری اس وقت کرنی چاہیئے جب سیاہی پوری طرح چھا جائے؟

۲۔ کیا حضرت علیؓ تراویح کی نماز پڑھتے تھے۔ اس کی تحقیق درکار ہے؟

سائل۔ رحیم بخش زبیر ناظم دفتر جمعیت علمائے اسلام ڈیرہ اسماعیل خاں

[1] جامع الاخبار شیخ صدوق ص ۱۶ [2] احکام شریعت جلد ۲ ص ۱۴۴ مطبوعہ مراد آباد

جواب : یہ صحیح ہے کہ جب سورج غروب ہو جائے افطار کا وقت ہو جاتا ہے۔ حضرت امام باقرؑ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

اذا غاب القرص افطر الصائم ودخل وقت الصلوٰۃ۔[۱]

ترجمہ۔ جب سورج کی ٹکیا چھپ جائے تو روزہ کھُل جاتا ہے اور نماز کا وقت ہو جاتا ہے۔

اگر کوئی شخص اس وقت میں جان بوجھ کر دیری کرے تاکہ درجہ اور فضیلت زیادہ حاصل ہو تو حضرت امام جعفر صادقؑ ارشاد فرماتے ہیں :-

ملعون من اخّر المغرب طلب فضلها۔[۲]

ترجمہ۔ جو شخص مغرب میں اس لیے تاخیر کرے کہ اس میں فضیلت ہے وہ شخص ملعون ہے۔

ایک شخص نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا :-

أؤخر المغرب حتّٰی تستبین النجوم۔

ترجمہ۔ میں مغرب میں دیری اس وقت تک کرتا ہوں کہ ستارے نظر آنے لگتے ہیں۔

اس پر حضرت امام نے فرمایا کہ یہ شخص فرقہ خطابیہ میں سے ہے۔ حضرت جبریلؑ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مغرب کا یہی وقت لائے تھے کہ جب سورج کی ٹکیا چھپ جائے۔

اور حضرت امام نے یہ بھی فرمایا :-

ابرأ الی اللّٰہ ممّا فعل ذٰلك متعمدًا۔[۳]

ترجمہ۔ میں اس شخص کے عمل سے جو جان بوجھ کر اس طرح کرے پُوری طرح بیزار ہوں۔

قرآن عزیز کی ہدایت روزے کے باب میں یہ ہے :-

اتمّوا الصیام الی اللّیل۔ (پ البقرہ)

ترجمہ۔ روزے کو رات تک پُورا کرو۔

اور ظاہر ہے کہ رات کی ابتداء اس وقت سے ہوتی ہے جب سُورج غروب ہو جائے۔ استبصار میں ہے :-

عن ابی عبد اللّٰہ علیہ السلام فی رجل صام ثم ظن اللیل قد کان دخل وان الشمس قد غابت وکان فی السماء سحاب فافطر ثم ان السحاب تجلّی فاذا الشمس لم تغب فقال تم صومه ولا یقضیه۔[۴]

ترجمہ۔ امام جعفر صادقؑ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے روزہ رکھا تھا اور پھر جب آسمان پر بادل

---

[۱] من لا یحضرہ الفقیہ ص۸۱ ج۲ ایران [۲] تہذیب الاحکام ص۲۴۳ ایران [۳] ایضاً [۴] استبصار طوسی جلد ۲ ص۱۱۵ ایران

تھے۔ اس نے گمان کر لیا کہ رات ہو گئی ہے اور سورج چھُپ گیا ہے تو اس نے روزہ کھول لیا ہے۔ پھر جب بادل ہٹے تو اس نے دیکھا کہ سورج ابھی تک غروب نہیں ہوا۔ حضرت امام نے فرمایا اور اس کا روزہ ہو گیا ہے اور اس پر قضا نہیں۔

اس جواب سے دوسرے ائمہ کو اتفاق ہو یا اختلاف یہ امر دیگر ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس روایت میں "رات آنے میں ابتدا" سورج غروب ہونے سے تسلیم کی گئی ہے۔ یہاں ظن ان اللیل قد کان دخل کے الفاظ ہیں اور ابو الصباح الکنانی کی روایت میں ظن ان الشمس قد غاب کے الفاظ وارد ہیں۔ مفہوم کا توارد صاف بتا رہا ہے کہ ائمہ اہل بیت کے ماحول میں سورج غروب ہونے کو ہی آغاز شب قرار دیا جاتا تھا۔ اور اس کے لیے یہ ہرگز ضروری نہ تھا کہ رات پُوری طرح چھا جائے اور ستارے دکھائی دینے لگیں۔ ستارے نظر آنے کا وقت "رات کا آغاز" نہیں "رات کا چھانا" ہے۔

قرآن کریم میں ہے :-

فلمّا جنّ علیه اللّیل رأی کوکبًا۔

ترجمہ۔ جب رات چھا گئی تو حضرت ابراہیمؑ نے ستارے دیکھے۔

صحیح ابن حبان اور مستدرک حاکم میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا :-

لاتزال امتی علی سنتی مالم تنتظر بفطرها النجوم۔[۱]

ترجمہ۔ میری امت اُس وقت تک میرے طریقے پر رہے گی جب تک کہ وہ افطاری کے وقت کے لیے ستاروں کے نکلنے کی منتظر نہ ہو۔

صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ ایک دفعہ کسی سفر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور رمضان کا مہینہ تھا۔ جب سورج غروب ہوا تو آپ نے کسی شخص کو فرمایا کہ "ستو تیار کرو" اس نے کہا۔ یارسول اللّٰہ انّ علیك نهارًا۔ ابھی تک تو دن کی کچھ روشنی موجود ہے۔ آپ نے پھر فرمایا سواری سے نیچے اُترو اور ستو تیار کرو۔ چنانچہ اس نے اسی طرح کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ستو پیئے اور ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا :-

اذا غابت الشمس من ھٰھنا وجاء اللیل من ھٰھنا فقد افطر الصائم۔[۲]

ترجمہ۔ جب (مغرب کی طرف) سورج چھُپ جائے اور اس دوسری طرف (یعنی مغرب کی طرف) سیاہی آجائے تو روزہ کھُلنے کا وقت ہو جاتا ہے۔

---

[۱] کذا فی الفتح جلد ۲ ص۱۲۱ [۲] صحیح مسلم جلد ۱ ص۳۵۱

یہاں تو آپ نے اسے اذا غابت الشمس کے الفاظ میں بیان فرمایا اور حضرت عمرؓ کی روایت کی رُو سے آپ نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے :-

اذا اقبل اللیل من ھٰھنا وادبر النہار من ھٰھنا وغربت الشمس فقد افطر الصائم۔[1]

ترجمہ: جب (مشرق کی طرف) رات آجائے اور (مغرب کی طرف) دن چھپ جائے تو روزہ کھل جاتا ہے۔

دونوں روایتوں کو ملانے سے یہ حقیقت پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ شارع کی نگاہ میں سورج کے غروب ہونے سے ہی رات کا آغاز ہوتا ہے۔ اس میں جان بوجھ کر تاخیر کرنا یہود کی علامت اور عبد اللہ ابن سبا کی وراثت ہے :-

ان الیھود والنصاریٰ یؤخرون۔[2]

ترجمہ: یہودی اور عیسائی افطار کے وقت میں تاخیر کیا کرتے تھے۔

۲۔ رمضان میں ایک نماز (تراویح کی نماز) زیادہ پڑھنے کے متعلق حضرت امام جعفر صادقؒ ارشاد فرماتے ہیں :-

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا دخل شہر رمضان زاد الصلوٰۃ فانا ازید فزیدوا۔[3]

ترجمہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے مہینے میں نماز زیادہ کر دیتے تھے۔ میں بھی اسی طرح (ایک نماز) زیادہ کرتا ہوں اور تم بھی رمضان میں (ایک) نماز زیادہ پڑھا کرو۔

حضرت امامؒ نے یہ بھی فرمایا :-

ان اصحابنا ھٰؤلاء ابوا ان یزیدوا فی صلاتھم فی شہر رمضان وقد زاد رسول اللہ فی صلوٰتہ فی شہر رمضان۔[4]

ترجمہ: ہمارے یہ (شیعہ) احباب رمضان کی اس نماز کا انکار کرتے ہیں حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں اس نماز کو زیادہ فرمایا ہے۔

باقی رہا اس نماز کی رکعات کا مسئلہ تو اس کے متعلق حضرت امام جعفر صادقؒ کا عمل یہ رہا ہے :-

منذ اول لیلۃ الیٰ تمام عشرین لیلۃ فی کل لیلۃ عشرین رکعۃ۔[5]

ترجمہ: پہلی رات سے لے کر بیسویں رات تک ہر رات میں حضرت امام بیس (رکعات تراویح) پڑھتے تھے۔

حضرت امام رضا فرماتے ہیں :-

کان ابی یزید فی العشر الاواخر فی شہر رمضان فی کل لیلۃ عشرین رکعۃ۔[6]

---

[1] صحیح بخاری جلد ۱ ص ۲۶۲ [2] ابو داؤد ص ۳۲۱ [3] استبصار جلد ۱ ص ۴۶۱ ایران [4] استبصار ص ۴۶۰
[5] استبصار ص ۴۶۲ [6] استبصار جلد ۱ ص ۴۶۶ ایران

ترجمہ: میرے والد (حضرت امام موسیٰ کاظم) رمضان کی آخری دس راتوں میں سے ہر رات بیس رکعات اور نماز پڑھا کرتے تھے۔

شرح نقایہ میں بیہقی سے باسناد صحیح منقول ہے کہ :-

کانوا یقیمون علیٰ عہد عمرؓ بعشرین رکعۃ وعلیٰ عہد عثمانؓ وعلیؓ۔[1]

ترجمہ: حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علی المرتضیٰؓ تینوں بزرگوں کے عہد میں لوگ بیس رکعت تراویح ہی پڑھتے تھے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت علی المرتضیٰؓ کے عہد خلافت میں بھی تراویح کی نماز بدستور پڑھی جاتی تھی اور پھر جب کہ حضرت علی المرتضیٰؓ اپنے پیشرؤوں کی سیرت پر پوری طرح عمل پیرا تھے۔[2] یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان کے عہد میں تراویح کی نماز ترک کر دی گئی ہو۔ قاری نور اللہ شوستری تصریح کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ پہلے بزرگوں کے طریق پر پوری طرح عمل پیرا تھے اور کسی ایک بات میں بھی اُن کی مخالفت کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ واللہ اعلم

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ ۲۱ فروری ۱۹۶۴ء

سوال : میرے دوستوں نے مجھ سے بحث کی ہے ایک نے کہا کہ امام رضا کی اذان میں "اشہد ان علیًا ولی اللہ" کے الفاظ کہے جاتے تھے۔ دوسرے نے کہا کہ حضرت فاطمہؓ آخر وقت تک باغ فدک کو اپنا حق سمجھتی رہیں۔ میں نے کہا کہ تم دونوں نے ان پاک ہستیوں پر بہتان باندھا ہے اور یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ میں نے غصے میں یہ بھی کہہ دیا کہ تم دونوں کے روزے ٹوٹ گئے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ بات ثابت کرو۔ آپ تحریر فرمائیں کہ مسئلہ کی رُو سے ان کا روزہ ٹوٹ گیا یا قائم رہا۔ حوالہ بھی تحریر کریں؟ محمد علی از شیخوپورہ

جواب : آپ کے دوستوں نے یہ دونوں باتیں غلط کی ہیں۔ وہ دونوں شیعہ ہوں گے۔ مذکورہ بالا کلمات بارہ اماموں میں سے کسی کی اذان میں ہرگز نہ تھے۔ یہ بہت بعد کی پیداوار اور شیعہ کے فرقہ مفوضہ کی ایجاد ہیں۔ علامہ ابن بابویہ قمی نے ایسے لوگوں پر لعنت بھی کی ہے۔ (دیکھئے من لا یحضرہ الفقیہ ص مطبوعہ ایران)

حضرت سیدہؓ پر بہتان ہے کہ وہ آخر دم تک باغ فدک کو اپنا حق سمجھتی رہیں۔ اگر ایسا ہوتا اور وہ واقعی حضرت صدیق اکبرؓ سے ناراض ہوتیں تو پھر باغ فدک کی آمدنی کبھی قبول نہ کرتیں۔ حالانکہ ان سب حضرات کا خرچ باغ فدک کی ہی آمدنی سے ادا ہوتا تھا۔ باقی رہا حضرت سیدہؓ کا کلام فرمانا تو اس کے لیے ناراضگی ضروری نہیں۔ یہ محض گمان اور ظن و تخمین ہے۔ حضرت سیدہؓ کی عادت شریفہ تھی کہ جب وہ سمجھ لیں کہ یہ حق نہیں بنتا تو پھر وہ اس

---

[1] فتح الملہم جلد ۲ ص ۳۲۲ [2] تفصیل کے لیے دیکھئے مجالس المومنین جلد ۱ ص ۵۴ ایران

کے لیے کلام نہ کرتیں بلکہ کلام نہ کرنے کا اعلان فرما دیتیں۔ ایک دفعہ ازواجِ مطہرات نے حضرت سیدہؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس لیے بھیجا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ حضرت عائشہؓ کی طرف اُن کے حق سے کچھ زیادہ ہے۔ حضرت فاطمہؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس گئیں اور بات عرض کی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

ای بنیہ ألست تحبین من احب۔

ترجمہ۔ اے میری بیٹی! جس سے میں محبت کروں کیا تم اس سے محبت نہ کرو گی۔

حضرت سیدہؓ نے کہا ——— کیوں نہیں

اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ پھر تم بھی عائشہؓ سے محبت رکھو۔

حضرت سیدہؓ نے واپس آکر ازواج مطہرات کو اس بات چیت سے مطلع کیا۔ انہوں نے حضرت سیدہؓ کو ایک دفعہ پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جانے کے لیے کہا۔ حضرت سیدہ سمجھ چکی تھیں کہ ازواج مطہرات جس بات کو اپنا حق سمجھتی ہیں وہ اُن کا حق نہیں بنتا۔ سنن نسائی جلد ثانی باب عشرۃ النساء میں ہے:۔

قالت فاطمۃؓ لا واللہ لا اکلمہ فیھا ابداً[1]

ترجمہ۔ حضرت فاطمہؓ نے کہا کہ خدا کی قسم میں اس باب میں آپ سے (یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے) کبھی بھی کلام نہ کروں گی۔

اس روایت سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت سیدہؓ کا کلام نہ کرنا کسی ناراضگی کی وجہ سے نہیں ہوتا تھا بلکہ جب وہ سمجھ لیں کہ یہ حق نہیں بنتا تو پھر وہ اس باب میں کبھی کلام نہ فرماتیں۔ بلکہ کلام نہ کرنے کا اعلان فرما دیتیں۔ یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سیدہؓ کو واپس کیوں لوٹایا۔ کیا حضرت سیدہؓ کا پیغام حق پر مبنی نہ تھا؟ اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا فیصلہ اور ارشاد شریعت کی اصل ہے اس کے خلاف جو بات بھی ہو خواہ ازواج مطہرات کا مطالبہ یا حضرت سیدہؓ کا پیغام ہر ایک کی تائید کی جائے گی اور ارشادِ نبوت کو اپنی جگہ حق اور ہر ایک کے لیے نافذ اور صحیح سمجھا جائے گا۔ واللہ اعلم بالصواب

باقی رہا آپ کا یہ کہنا کہ امام رضا اور حضرت سیدہؓ پر بہتان باندھنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ شیعہ مذہب کی رو سے امام رضا پر جھوٹ باندھنے سے تو روزہ ٹوٹ جاتا ہے لیکن حضرت فاطمہؓ پر جھوٹ باندھنے سے شیعہ مذہب میں روزہ نہیں ٹوٹتا۔ نجف اشرف کے مجتہد اعلیٰ ملا کاظم خراسانی ذخیرۃ العباد میں یہ لکھنے کے بعد کہ ائمہ طاہرین پر جھوٹ باندھنے سے روزہ باطل ہو جاتا ہے۔ پھر لکھتے ہیں:۔

---

[1] سنن نسائی جلد ۲ صفحہ ۷۸

باقی انبیاء اور اوصیاء اور صدیقہ طاہرہ فاطمۃ الزہراؓ پر جھوٹ باندھنے میں اشکال ہے اگرچہ اقوی عدم الحاق ہے یعنی رسول اللہ اور ائمہ کے حکم میں نہیں[1]

اس سے یہ بات واضح ہے کہ شیعہ مذہب میں حضرت فاطمہؓ پر جھوٹ باندھنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا لیکن امام رضا پر عمداً جھوٹ باندھنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ افسوس کہ ان لوگوں کے نزدیک حضرت سیدہؓ کا درجہ امام رضا کے برابر بھی نہیں۔ حالانکہ حضرت سیدہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی براہِ راست لختِ جگر ہیں۔ اور انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابیہ ہونے کا بھی شرف حاصل ہے اور ظاہر ہے کہ امام رضا صحابی ہرگز نہ تھے۔ انہیں حضرت فاطمہؓ پر ترجیح دینا یہ بات ہمیں سمجھ میں نہیں آتی۔ واللہ اعلم بالصواب

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: مشکوٰۃ باب المساجد میں ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

لعن اللہ زائرات القبور والمتخذین علیھا المساجد والسرج[2]

ترجمہ۔ لعنت کی اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں پر جو قبروں کی زیارت کرتی ہیں اور ان لوگوں پر لعنت فرمائی جو قبروں پر سجدے کرتے ہیں اور اُن پر جو چراغ جلاتے ہیں۔

اس پر سوال یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت فاطمۃ الزہراؓ بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر زیارت کے لیے جاتی رہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے جنت البقیع میں بھی عورتوں کا جانا ثابت ہے؟

۲۔ پختہ قبروں اور روضوں کی حدیث میں ممانعت ہے لیکن حضور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اکثر اولیاء اللہ کے روضے پختہ بنے ہوتے ہیں؟

۳۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہ تھا۔ حالانکہ انسان کا تو سایہ ضرور ہوتا ہے وہ پاک ذات سایہ سے کیوں محروم تھی۔ ان تینوں سوالوں کے جوابات "دعوت" میں شائع کریں؟ میرا خریداری نمبر ۹۵ ہے۔

سائل۔ یار محمد خان الکانی بلوچ بٹی سونگیاں تحصیل جام پور ضلع ڈیرہ غازیخاں

جواب: آپ نے زیارتِ قبور کی جو حدیث نقل کی ہے اسے بعض اہلِ علم اپنے ظاہر پر محمول قرار دیتے ہیں لیکن جمہور علماء اس میں تاویل کے قائل ہیں اور اس منع سے مراد وہ رسم لیتے ہیں جو آج کل عام طور پر رائج ہے کہ عورتیں بن سنور کر ایک رونق اور شغل کے طور پر درگاہوں اور مقابر پر حاضر ہوتی ہیں اور پھر اس طریق

---

[1] ذخیرۃ العباد صفحہ ۱۷۹ [2] مشکوٰۃ صفحہ ۷۱

عمل پر اس قدر اصرار اور اہتمام ہوتا ہے کہ ایسے اجتماع بسا اوقات بڑے بڑے فتنوں کا سبب بن جاتے ہیں۔ مقاماتِ عبرت پر اس قسم کے تفریحی انداز اور زیادہ مذموم ہیں اور پھر اس کا بھی بہت زیادہ احتمال رہتا ہے کہ عورتیں رقت کی زیادتی سے کچھ واویلا قسم کی آوازیں نکالنے لگیں جو شرعاً ہرگز جائز نہیں۔ علامہ قرطبی حدیث مذکور کی تشریح اس طرح کرتے ہیں:۔

اللعن المذکور فی الحدیث انما هو للمکثرات من الزیارة لما تقتضیه الصیغة من المبالغة ولعل السبب ما یفضی الیه ذٰلک من تضییع حق الزواج والتبرج وما ینشأ من الصیاح۔[1]

اگر یہ احتمالات اور عادات کسی حلقے میں نہ پائے جائیں اور عورتیں پورے دینی احترام اور اپنے تحفظ سے کبھی کبھی زیارت قبور کر لیں تو یہ جائز بلکہ مندوب و مستحسن ہے۔ جو طریق ممنوع ہے وہ محض بر سبیل رواج اور بطریق استمداد و احتیاج ہے۔ عورتوں کے لیے قبور کی مطلق زیارت ہرگز منع نہیں اور اس جواز کے شواہد یہ ہیں:۔

(۱) صحیح مسلم میں ہے حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:۔

کیف اقول یا رسول اللہ اذا زرت القبور۔

ترجمہ۔ یا رسول اللہ! میں جب کبھی کسی قبرستان کی زیارت کروں تو کیا کہوں۔

اس پہ حضورؐ نے فرمایا:۔

قولی السلام علیٰ اهل الدیار من المؤمنین۔[2]

ترجمہ۔ تم یہ دُعا کرو "السلام علیٰ اهل الدیار من المؤمنین"

(۲) صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک عورت کے پاس سے گزرے۔ جو ایک قبر کے قریب رو رہی تھی۔ آپ نے فرمایا:۔

اتقی اللہ واصبری۔[3]

ترجمہ۔ اللہ سے ڈرتی رہو اور صبر سے کام لو۔

(۳) مستدرک حاکم میں ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ حضرت حمزہؓ کی قبر کی ہر جمعہ زیارت کرتی تھیں۔ ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ "مطلق زیارتِ قبور" عورتوں کے لیے منع نہیں۔ جو امر منع ہے وہ وہی طریق مذموم ہے جس کی تفصیل اُوپر مذکور ہے۔ حضرت علامہ ابن عابدین شامی نے تطبیق بین الروایات میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

قال الخیر الرملی ان ذٰلک لتجدید الحزن والبکاء والندب علیٰ ما جرت به عادتهن فلا تجوز وعلیه حمل حدیث لعن اللہ زائرات القبور وان کان الاعتبار والترحم من غیر

[1] کذا فی الفتح جلد ۲ صفحہ ۵۱۲ [2] صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۳۱۴ [3] صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۱۷۱

بکاء والتبرک وزیارۃ قبور الصالحین فلا بأس اذا کن عجائز ویکره اذا کن شواب الحضور الجماعت فی المساجد۔[1]

معلوم ہوا کہ عورتوں کے لیے بھی زیارتِ قبور کے بعض ایسے مواقع موجود ہیں جنہیں شریعت نے استحسان اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے۔

باقی رہا حضرت صدیقہ اور حضرت سیدہ رضی اللہ عنہما کا روضۂ گنبدِ خضرا کی زیارت کرنا۔ سو یہ محض زیارتِ قبور نہیں، بلکہ اس دربار عالی وقار میں حاضری ہے۔ جہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہایت عظیم و لطیف حیاتِ کریمہ برزخیہ سے زندہ موجود ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت فاروقِ اعظمؓ اس روضۂ جنت میں فروکش ہوئے تو حضرت ام المومنین وہاں پردے میں حاضر ہونے لگیں۔ (رواہ احمد و اسنادہ صحیح)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق قبریں عبرت کی جگہ اور موعظۂ آخرت ہیں۔ یہ زینت اور آرائش کا محل نہیں۔ قبر اپنی معنوی حیثیت میں ایک فنا کا نشان ہے۔ اس کے برعکس تزئین بقاء کی ایک علامت ہے۔ فنا اور بقا ایک دوسرے کی ضد ہیں اور قبروں کو پختہ کرنا اجتماعِ ضدین کا ایک عنوان ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام میں قبروں کو پختہ کرنے کی اجازت نہیں۔ امام الائمہ حضرت امام محمدؒ ارشاد فرماتے ہیں:۔

ان النبی صلی اللہ علیه وسلم نهیٰ عن تربیع القبور وتجصیصها قال محمد به ناخذ و هو قول ابی حنیفةؒ۔[2]

ترجمہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو مربع کرنے اور انہیں پختہ بنانے سے منع کیا ہے یہی میری تحقیق ہے اور یہی امام ابو حنیفہؒ کا فیصلہ ہے۔

فقہ حنفی کی معتبر کتاب فتاویٰ قاضی خاں میں ہے:۔

ولا تجصص القبر فان النبی انه نهیٰ عن التجصیص والتقضیض وعن بناء فوق القبر۔[3]

ترجمہ۔ قبروں کو پختہ نہ کیا جائے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو پختہ بنانے انہیں سجانے اور اُن پر عمارت بنانے سے منع فرمایا ہے۔

فاضل حلبی کبیری شرح منیہ میں رقم طراز ہیں:۔

ویکره تجصیص القبر وتطیینه وبه قالت الائمة الثلاثة وعن ابی حنیفةؒ انه یکره ان یبنی علیه بناء۔[4]

ترجمہ۔ قبروں کو پختہ بنانا اور ان کی لپائی کرنا ہرگز جائز نہیں اور یہی ہمارے تینوں اماموں کا فیصلہ ہے حضرت امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ قبر پر کسی قسم کی عمارت بنانا جائز نہیں۔

[1] رد المحتار لابن عابدین الشامی جلد صفحہ [2] کتاب الآثار صفحہ ۹۶/۹۷ [3] فتاویٰ قاضی خاں جلد ۱ صفحہ ۹۲ [4] غنیۃ المستملی صفحہ ۵۹۹

علامہ شامی لکھتے ہیں :۔

اما البناء فلم ار من اختار جوازہ۔[1]

ترجمہ۔ قبر پہ عمارت بنانے کے متعلق میں نہیں جانتا کہ کسی نے اسے جائز کہا ہو۔

فتح القدیر شرح ہدایہ جلد ۴ صفحہ ۴۷ اور فتاوٰے عالمگیری جلد ۱ صفحہ ۱۶۷ میں بھی یہ مسئلہ اسی طرح مرقوم ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

باقی رہی یہ بات کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضۂ اطہر پر بھی تو عمارت موجود ہے۔ سو یہ امر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اور فقہائے کرام کے فیصلوں کے خلاف نہیں۔ کیونکہ جو بات ممنوع ہے وہ "بناء علی القبر" ہے اور جو امر ثابت ہے وہ "قبر فی البناء" ہے۔ "بناء علی القبر" "قبر فی البناء" میں بہت فرق ہے۔ سیدنا حضرت صدیق اکبرؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

ما دفن نبی قبط الا فی مکانہ الذی توفی فیہ۔[2]

ترجمہ۔ نبی صرف اسی جگہ دفن کیا جاتا ہے جہاں اس کی وفات ہوئی ہو۔

حضرت صدیق اکبرؓ نے اس حدیث سے اسی موقع پر استدلال کیا تھا جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دفن کرنے کا مسئلہ درپیش تھا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی ارشاد کی رو سے وہیں دفن ہوئے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وفاتِ شریفہ کا ورود ہوا۔ چونکہ وہاں پر پہلے سے عمارت موجود تھی اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا روضہ "قبر فی البناء" کا مصداق ہوا اور ظاہر ہے کہ اس میں اور "بناء علی القبر" میں بہت فرق ہے۔ بایں ہمہ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ مقابر مسلمین بالخصوص قبور صالحین کا احترام اپنے اپنے مراتب پر بہت ضروری ہے اور جس طریق سے ان کی عزت اور وقار پر کوئی حرف آتا ہو، اس سے بچنا ازبس لازم ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ تھا یا نہیں، یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں کہ اس پر نجاتِ ایمان یا ہدایت کا مدار ہو۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ ہو تو اس سے آپ کی شانِ عظمت میں کوئی فرق نہیں آجاتا اور اگر سایہ نہ ہو تو اس سے توحید و سنّت کے کسی ضابطے پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اگر ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آسمانی معراج اور شق القمر جیسے معجزات کو صحیح تسلیم کر سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ کے سایہ نہ ہونے کو خرقِ عادت کے طور پر تسلیم کر لینے میں ہمیں کوئی انقباض ہو۔ مدارِ تحقیق صرف یہ ہے کہ سایہ نہ ہونا

[1] ردالمحتار جلد ۱ صفحہ ۶۰۱ [2] مؤطا امام مالک صفحہ ۲۱۲

کسی حدیث یا روایت سے ثابت ہے یا نہ؟ وہ نفوسِ قدسیہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں حاضر و موجود تھے۔ وہ اس حیرت انگیز واقعہ کو روایت کرتے ہیں یا نہیں۔ اس لحاظ سے یہ خالص علمی تحقیق ہے۔ کوئی مسلکی موضوع نہیں جو قطعیات پہ اثر انداز ہو یا اس کا ضروریاتِ اہل سنّت سے کسی قسم کا تصادم ہو پھر یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ سایہ نہ ہونے کا موقف اختیار کرنے کے لیے اسے بطور معجزہ یا خرقِ عادت تسلیم کرنا چاہیئے نہ کہ بطورِ عادت اور طبیعت کیونکہ اسی صورت میں یہ معجزہ نہیں۔ بلکہ فطرت کا ایک طبعی انداز شمار ہوگا۔ پانی، بلور اور روشنی کا اگر سایہ نہیں تو ان اجسام کی فطرت اور طبیعت ہے معجزہ نہیں۔ معجزہ اسے کہتے ہیں جو اصل طبیعت اور عادت کے خلاف ہو۔ یہی وجہ ہے کہ معجزے کو خرقِ عادت کہا جاتا ہے۔ آگ کی طبیعت اور عادت ہے کہ جلائے۔ پس اگر یہ خرقِ عادت کے طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے گلزار بن جائے تو یہ یقیناً معجزہ ہوگا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہ ہونے کا موقف اسے حضورؐ کی طبیعت قرار دینے کی وجہ سے ہے یا بطورِ خرقِ عادت اسے ایک معجزے کی حیثیت میں تسلیم کیا جاتا ہے سو احقر کا موقف اس مسئلہ میں یہ ہے کہ اُسے بطورِ معجزہ تسلیم کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ بشرطیکہ امرِ واقع کسی معتبر روایت سے ثابت ہو۔

جہاں تک حدیث یا روایت کا تعلق ہے احقر کی نظر سے کوئی صحیح یا ضعیف حدیث اس مسئلہ میں نہیں گزری کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہ تھا۔ ہاں حکیم ترمذی کی کتاب نوادرالاصول میں ایک ضعیف روایت ملتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ دیکھا نہیں جاتا تھا۔ سو یہ امر دیگر ہے۔ "سایہ نہ ہونا" اور بات ہے اور سایہ نہ دیکھا جانا اور بات ہے۔ "سایہ نہ ہونا" سائے کی حقیقت اور سائے کے وجود کا انکار ہے اور سایہ دیکھا نہ جانے کے اور بھی کئی وجوہ ہو سکتے ہیں۔ مثلاً :۔

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تکریم میں آپ پہ بادل سایہ کئے رکھے اور آپ سورج کے محاذات میں ہی نہ آئیں کہ آپ کا سایہ پڑنے کا سوال پیدا ہو۔ اس شانِ اعزاز کا ثبوت بعض اور روایات سے ملتا ہے۔

(۲) آپ کا سایہ خرقِ عادت کے طور پر اس لیے دیکھا نہ جا سکے کہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ یکتائی ہر ممکن مثال سے بلند و بالا ہے اور رب العزت آپ کو اس طرح بے نظیر رکھے کہ آپ کا سایہ بھی کہیں دیکھا نہ جا سکے۔ کیونکہ سایہ بھی اپنے اصل کی نقل ہوتا ہے اور ؎

ایک سے جب دو ہوئے تو دو میں یکتائی میں

اس کا حاصل یہ ہے کہ حضور ختمی مرتبت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد کسی شخص کو آپ کے تعلق سے "ظلی نبی" کہلانے کی جرأت نہ ہو سکے۔

(۳) آپ ہر وقت اس طرح ملبوس رہتے ہوں کہ آپ کے کپڑوں کا سایہ تو پڑتا ہو لیکن آپ کے بدنِ اط[illegible] کا سایہ کبھی نہ دیکھا گیا ہو۔ جو سایہ عام طور پر نظر آتا ہے وہ کپڑوں کا ہی ہوتا ہے۔ اگر کسی بلورین وجود کو بھی یہ ا[illegible] لباس پہنا دیئے جائیں تو باوجودیکہ بلور کا صریح سایہ نہیں ہوتا۔ اس بلور ملبوس کا بھی سایہ نظر آنے لگے گ[illegible] صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح حیا اور وقار کے پیکر تھے کہ ہر وقت ملبوس رہنے کے سبب آپ کے بدنِ اطہر ک[illegible] یہ کبھی نہیں دیکھا گیا۔

(۴) آپ کا سایہ زمین پر اس لیے نہ پڑتا ہو کہ اس سائے کی بھی کہیں بے ادبی نہ ہو اور کسی پاس بی[illegible] یا کھڑے ہونے والوں کا پاؤں سایہ مبارک پر نہ آسکے۔ اس احتمال کے سدِباب کے لیے شانِ اعجاز یوں ظاہر ہوئی ک[illegible] کا سایہ کبھی دیکھا ہی نہیں گیا۔

بہرحال اس کے اور بھی کئی وجوہ ہو سکتے ہیں اور ان سب کا مدار "سایہ نہ ہونے پر" نہیں "[illegible] نہ دیکھا جانے پر" ہے۔ حکیم ترمذی کی مذکورہ سابقہ روایت کے الفاظ اصل یہ ہیں:۔

لم یکن یریٰ له ظل فی شمس ولا فی قمر ولا یریٰ اثر قضاء حاجة۔[1]

علامہ سیوطیؒ نے اس حدیث پر یہ باب باندھا ہے۔ "باب المعجزة فی لوله وغائطه صلی ال[illegible] علیه وسلم"۔ (خصائص کبریٰ جلد ۱ صلے مطبوعہ دائرہ المعارف)

اس روایت کا پہلا راوی عبدالرحمٰن بن قیس زعفرانی نہایت ضعیف اور جھوٹی قسم کا راوی ہے [illegible] علما نے اس پر وضع حدیث (حدیث گھڑنے) کا الزام بھی لگایا ہے۔ راوی عبدالملک بن عبدالولید بھی مجہول الح[illegible] ہے۔ سو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ حدیث احتجاج اور استناد کے لائق نہیں۔ ہاں اس روایت کو بالا[illegible] رکھ کر بعض بزرگوں کے بیانات کے پیشِ نظر اگر سایہ نہ ہونے کا موقف اختیار کرنے کی بجائے "سایہ دیکھا [illegible]" کا موقف اختیار کرلیا جائے اور وہ بھی بر سبیلِ معجزہ (نہ کہ بر سبیل طبیعت اور فطرت۔ تو احقر کے نزدیک قواعدِ [illegible] سے اس کا کوئی تصادم نہیں۔ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب نے حضرت مولانا جامی رح سے اس با[illegible] میں ایک عجیب نکتہ نقل کیا ہے۔ ؎

پیغمبر ما نداشت سایہ — تا شک بدل یقیں نیفتد
یعنی ہر کس کہ پیرو اوست — پیدا ست کہ بازمیں نیفتد[2]

واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ ۶ر مارچ ۱۹۶۴ء

---

[1] نوادر الاصول [2] فتاویٰ دارالعلوم دیوبند جلد ۸ صہ ۲۰۲ طبع قدیم دیوبند۔

سوال: اصحابِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سب سے پہلے بوجھ کن دلوں میں آیا تھا؟ وہ کون لوگ تھے جو صحابہؓ کے وقار دینوی کے نیچے دب کر رہ گئے؟ بغض صحابہؓ سب سے پہلے کن سینوں میں اترا اور پھر ان کا ظاہری انجام دنیا نے کیا دیکھا۔ اس کی تفصیل فرماویں؟

جواب: قرآن کریم کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سب سے پہلے بوجھ یہود کے دلوں پر اترا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی پیدا بھی نہ ہوئے تھے نہ اس وقت تک کوئی خلافتوں کی بحث چلی تھی۔ حضرت موسےٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے کہنے پر اللہ تعالیٰ کے حضور ایک دعا کی تھی:۔

واكتب لنا فی هٰذه الدّنيا حسنةً وفی الاٰخرة انا هُدنا اليك قال عذابی اصيب به من اشآء ورحمتی وسعت كل شیء فساكتبها للّذين يتقون ...... الّذين يتّبعون الرّسول النّبی الامّی الّذی يجدونه عندهم فی التوراة والانجيل۔ (پ ۹ اعراف آیت ۱۵۶)

ترجمہ: اور تو ہمیں اس دنیا میں بھی خوشحالی دے اور آخرت میں بھی۔ بیشک ہم تیری طرف چل نکلے ہیں۔ فرمایا میرا عذاب ہے جس پر چاہوں ڈالوں اور میری رحمت ہر چیز پر وسعت لے گئی۔ سو میں اسے انہی کے نام لکھوں گا جو تقوےٰ رکھتے ہوں..... اور یہ وہ لوگ ہوں گے جو اس رسول کی پیروی کریں گے جو نبی اُمّی کہلائے گا اور جس کی خبریں تورات اور انجیل میں لکھی آرہی ہیں۔

گذشتہ صحائف میں خبر چلی آرہی تھی کہ ایسا رسول دنیا میں پیدا ہوگا جس کے پیروؤں کو سعادتِ اُخروی کے ساتھ ساتھ وجاہتِ دنیوی بھی پوری شان سے ملے گی۔ تو قوم بنی اسرائیل نے چاہا کہ یہ دونوں سعادتیں ہمیں کیوں نہ مل جائیں۔ حضرت موسےٰ علیہ السلام نے ان کے لیے دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ملا۔ یہ تحصیل سعادتین تمہارے لیے نہیں۔ یہ صرف رسولِ اُمّی کے پیروؤں کو ملے گی۔ حضرت موسےٰ علیہ السلام تو اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر تھے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو بسر و چشم مانا لیکن یہودیوں کے دلوں میں اسی دن سے اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک کانٹا چبھ گیا، ایک بوجھ آگیا —— ہائے ہم نے جو مقام اپنے لیے مانگا وہ اس نبی اُمّی کے پیروؤں کو کیوں مل گیا اور ہم یونہی رہ گئے۔

یہ آپ کے سوال کے پہلے حصّے کا جواب ہے کہ اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سب سے پہلے بغض وعناد یہودیوں کے دلوں میں پیدا ہوا تھا۔ اب دوسرے حصّہ کا جواب ملاحظہ ہو:۔

صحابہؓ سے بغض رکھنے والوں کا انجام

وہ قوم جو اللہ تبارک و تعالیٰ سے یہ ارفع ترین مقام طلب کر رہی تھی جب پستی میں گری تو اس قدر گری کہ قعرِ ذلت میں گرتی ہی چلی گئی۔ ایسی ذلت ان کا مقدر بنی کہ ایک جانور کا جلوس نکالا۔ اپنے ہاتھوں سے گائے کے قد و جسم کا ایک جانور بنایا پھر اسے قوم کے زیورات پہنائے۔ بعد ازاں پوری قوم مل کر عقیدت سے اس کے آگے جھکی۔ قرآن کریم میں ہے :۔

واتخذ قوم موسیٰ من بعدہٖ من حلیّھم عجلاً جسداً لہٗ خوار۔ الم یروا انّہ لا یکلّمھم ولا یھدیھم سبیلاً۔ اتخذوہ وکانوا ظالمین۔ (پ ۹ الاعراف آیت ۱۴۸)

ترجمہ اور قوم موسیٰ نے ان کے پیچھے اپنے زیورات سے ایک بچھڑا کھڑا کر لیا۔ ایک بدن تھا جس میں گائے کی سی آواز تھی۔ کیا انہوں نے نہ دیکھا کہ وہ ان سے نہ کوئی بات کرتا ہے اور نہ انہیں کوئی راہ بتلا سکتا ہے۔ انہوں نے اسی کو اپنا معبود بنا لیا اور تھے وہ ظالم۔

شیخ الاسلام لکھتے ہیں :۔

یہاں ان کی سفاہت و حماقت پر متنبہ فرمایا ہے کہ ایک خود ساختہ ڈھانچہ میں سے گائے کی آواز سن لینے پر مفتون ہو گئے اور بچھڑے کو خدا سمجھ بیٹھے۔ حالانکہ اس کی بے معنی آواز میں نہ کلام و خطاب تھا نہ دینی و دنیوی راہنمائی اس سے ہوتی تھی۔ اس طرح کی صورت محض تو کسی چیز کو انسانیت کے درجہ تک بھی نہیں پہنچا سکتی۔ چہ جائیکہ خالق جلّ و علا کے مرتبہ پر پہنچا دے یہ کتنا بڑا ظلم اور بے موقع کام ہے کہ ایک معمولی جانور کی صورت کو خدا کہہ دیا جائے۔"

اس قوم کا بھی عجب حال ہے کہ نہ مانیں تو اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ مانیں۔ ان کی خلافتوں اور رفعتوں پر جلیں اور ماننے پر آئیں تو ایک جانور کا جلوس نکالیں۔ اس پر قوم کے زیورات نچھاور کریں۔ اُسے مولا کہہ کر اس سے مرادیں مانگیں اور اسے اپنا خدا قرار دیں۔ فرشتے بھی اس قوم کی ہلاک سامانیوں اور ذہنی بربادیوں پر حیران ہوں گے۔

اس قوم کے سربراہ کا نشان تھا کہ خاک شفا اٹھائے پھرتا تھا ــــ کہاں سے؟ ــــ روح الامین کے قدموں کے نشانات سے ــــ پھر اسے اس جانور پر نچھاور کیا گیا۔ جو خود ہی بنایا تھا ــــ سامری کے پیرو اس سے پہچانے جاتے ہیں کہ مٹی کی ٹکیاں ساتھ لیے پھرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کے سوا ہماری عبادت قبول

نہیں ہوگی۔ قرآن حکیم میں ہے :۔

قال بصرت بما لم یبصروا بہٖ فقبضت قبضۃً من اثر الرّسول فنبذتھا وکذٰلک سوّلت لی نفسی۔ (پ ۱۶ طٰہٰ آیت ۹۶)

ترجمہ۔ بولا میں نے دیکھ لیا جو اوروں نے نہ دیکھا۔ پھر بھر لی میں نے ایک مٹھی پاؤں کے نیچے سے اس بھیجے ہوئے کے پھر میں نے وہی ڈال دی اور یہی صلاح دی مجھ کو میرے جی نے۔

شیخ الاسلام رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں :۔

"سامری نے کہا مجھ کو ایک ایسی چیز نظر پڑی جو اوروں نے نہیں دیکھی۔ یعنی خدا کے بھیجے ہوئے فرشتہ (جبریل) کو گھوڑے پر دیکھا۔ شاید یہ اس وقت ہوا ہو جب بنی اسرائیل دریا میں گھسے اور پیچھے پیچھے فرعون کا لشکر گھسا۔ اس حالت میں جبریل دونوں جماعتوں کے درمیان کھڑے ہو گئے تاکہ ایک کو دوسرے سے ملنے نہ دے۔ بہرحال سامری نے کسی محسوس دلیل سے یا وجدان سے یا کسی قسم کے تعارف سابق کی بناء پر سمجھ لیا یہ جبریل ہیں ان کے پاؤں یا اُن کے گھوڑے کے پاؤں کے نیچے سے مٹھی بھر مٹی اُٹھالی۔ وہی اب سونے کے بچھڑے میں ڈال دی۔ کیونکہ اس کے جی میں یہ بات آئی کہ روح القدس کی خاک پا میں یقیناً کوئی خاص تاثیر ہوگی۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ سونا تھا کافروں کا مال لیا ہوا فریب سے۔ اس میں مٹی پڑی برکت کی حق اور باطل مل کر ایک کرشمہ بن گیا۔"

جب کسی قوم کی عقل ماری جائے تو پھر ایسا ہی ہوتا ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہو کر گائے کو پوجنے لگتا ہے، گھوڑے کی سالانہ پوجا کرتا ہے، کئی قومیں سانپ کی پرستش کرتی ہوئی دیکھی گئی ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بغض لے کر اُٹھے آپ نے ان کا انجام دیکھ لیا ہے، مٹی کی ٹکیاں اُٹھائے ہوئے کس طرح جانور کے گرد جبینِ عقیدت جھکائے جا رہے ہیں۔ یہ عمل پیغمبر کی نگاہ میں کیسا تھا۔ قرآن کریم سے معلوم کیجئے :۔

ولمّا رجع موسیٰ الیٰ قومہٖ غضبان اسفاً قال بئسما خلفتمونی من بعدی۔ (پ ۹ اعراف ۱۵۰)

ترجمہ۔ اور جب موسےٰ اپنے قوم میں واپس لوٹے غصہ میں بھرے ہوئے افسوسناک۔ کیا تم نے میری بُری جانشینی کی ہے۔

یعنی میرے بعد تم نے اس جانور کو مولا بنانے کا جو عمل کیا ہے تم نے بہت بُرا کیا ہے۔ اس حیوان عاجز کو متبرک اور مولا سمجھنا اور اس پر عقیدتیں قربان کرنا تمہارا یہ عمل درست نہیں۔

جانور کو مولا بنانے پر پیغمبر نے کیا سزا دی؟

پھر موسیٰ علیہ السلام نے بحکمِ ایزدی ان یہودیوں کو یہ سزا سنائی :-

انکم ظلمتم انفسکم باتخاذکم العجل فتوبوا الیٰ بارئکم فاقتلوا انفسکم ذٰلکم خیر لکم عند بارئکم۔ (پ البقرہ آیت ۵۴)

ترجمہ۔ تم نے نقصان کیا اپنا یہ بچھڑا بنا کر۔ سو اب توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف۔ اور مارو اپنے آپ کو۔ یہ بہتر ہے تمہارے لیے تمہارے خالق کے نزدیک۔

آیت ہذا میں بنی اسرائیل کو جانور کو مولا بنانے کی یہ سزا سنائی گئی کہ اپنے آپ کو مارو، اپنے آپ کو پیٹو، سینہ کوبی کرو، اپنے پر تلواریں برساؤ، اپنے ہاتھ اور اپنے خنجر سے اپنے سینے زخمی کرو۔ کیونکہ جانور کو مولا بنانے اور اس کا جلوس نکالنے کی یہی سزا ہے۔ وہ جانور گائے ہو یا گھوڑا سزا ایک ہی ہے ـــــ مقام غور ہے ایک انسان کی فطرت سلیمہ کبھی جانور کے آگے جھکنا پسند نہیں کرتی۔ عام انسان کے لیے بھی یہ کام انتہائی عجیب ہے۔ مذہب کے نام پر یہ کھیل کتنا گھناؤنا ہو گا۔ اللہ پاک نے اس کی سزا خوب تجویز کی کہ اب اپنے آپ کو مارو۔ تاکہ قیامت تک یہ لوگ اپنے آپ کو مارتے نظر آئیں۔ حق یہ ہے کہ اللہ کی ذاتِ اقدس کے علاوہ کسی جانور کے سامنے جھکنا انسان کی انتہائی خست ہے۔

شریعتِ موسوی اور شریعتِ محمدی میں فرق

یہ سزا جو موسیٰ علیہ السلام نے سنائی۔ یہ اُن کی شریعت کے موافق ہے۔ حضور خاتم النبیینؐ کی شریعت میں اپنے آپ کو مارنا جائز نہیں۔ قرآن کریم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہا گیا ہے :-

ولا یعصینک فی معروف۔ (پ۲۸ الممتحنہ آیت ۱۲)

ترجمہ۔ اے میرے پیغمبر یہ کسی بات میں تیری نافرمانی نہ کریں۔

وہ بات کیا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے تحت میں ارشاد فرمائی؟ سنیئے :-

لا تلطمن خداً ولا تخمشن وجھاً ولا تنتفن شعراً ولا تشققن جیباً ولا تسودن ثوباً۔[1]

ترجمہ۔ چہرے پر تھپڑ نہ مارو، نہ چہرہ چھیلو، نہ بال نوچو، نہ گریبان چاک کرو اور نہ سیاہ کپڑے پہنو۔

[1] فروع کافی جلد ۲ کتاب النکاح ص۲۲۸

سو اس شریعت میں اپنے آپ کو وہ سزا دینا جائز نہیں جو حضرت موسےٰ علیہ السلام نے یہود کے لیے تجویز کی تھی۔ افسوس کہ ان کے پیرو اب تک اس طریق ماتم کو اپنا قومی حق اور اپنے آپ کو مارنا اپنا مذہبی حق سمجھتے ہیں اور اس کے لیے باقاعدہ لائسنس حاصل کرتے ہیں۔

حاصل بحث یہ ہے کہ جن لوگوں نے دلوں میں اصحابِ رسولِ امیؐ کے بغض کو جگہ دی ہے۔ وہ عقل سے اس طرح پیدل ہوئے کہ جانور کو مولا قرار دے کر جبینِ عقیدت اس کے آگے جھکائی اور پھر بحکمِ نبوت اپنے آپ کو مارتے، اپنے منہ پر تھپڑ لگاتے اور سینہ کوبی کرنے کی سزا پائی اور اب تک خاک شفا اُٹھائے پھر رہے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سوال : یہودی ماضی میں ایک بڑی قوم رہے ہیں۔ یہ یعقوب علیہ السلام کی اولاد تھے۔ اب تک یہ اپنے آپ کو تورات کا وارث کہتے ہیں کیا انہیں اہلِ بیتِ رسالت کہا جا سکتا ہے؟ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس قوم کے عروج و زوال کی داستان پھیلی ہے۔ ضرورت ہے کہ آپ اس قوم کے مذہبی اور سماجی خدوخال کے نشانات بتلا دیں۔ تاکہ یہ قوم بآسانی پہچانی جا سکے۔ اگر یہ مسلمانوں کی صفوں میں گھُسیں تو بھی پہچانے جا سکیں؟

جواب : بنواسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ اس پہلو سے اگر انہیں اہلِ بیتِ نبوت کہا جائے تو ہمیں انکار نہیں لیکن قرآن کریم کی رو سے اہلِ بیت حضور پیغمبر اسلام کی ازواجِ مطہرات کو ہی کہا جائے گا۔ ہاں دیگر قوموں کے بالمقابل اپنے آلِ رسول ہونے کا عنوان ان میں بہت نمایاں رہا ہے۔ اولادِ آدم میں نسلی امتیاز پیدا کرنے کے مجرم یہی ہیں۔

(۱) نسلی تفوق کا دعوےٰ

ان کا نسلی تفوق کا یہ عقیدہ قرآن کریم میں مذکور ہے :-

نحن ابناء اللّٰہ و احبّاءہ۔ (پ۶ المائدہ آیت ۱۸)

ترجمہ۔ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے لاڈلے ہیں۔

مفتی احمد یار خاں صاحب گجراتی اس آیت پر لکھتے ہیں :-

"آج کل حبِ اہلِ بیت کے مدعی حضرات اور بعض جاہل فقیروں کا یہی عقیدہ ہے ایسا سمجھنا کفر ہے"

انہی بداعمالیوں کے بارے میں محض اس زعم میں کہ ہم پیغمبروں کی اولاد ہیں۔ انکا یہ عقیدہ تھا :-

لن تمسنا النار الا ایاماً معدودۃ۔ (پ۱ البقرہ آیت ۸۰)

ترجمہ۔ ہمیں آگ نہ چھوئے گی۔ ایسا ہُوا بھی تو چند گنتی کے دن۔

ابتدائے تاریخ میں ان کے جو قبائل ہندوستان آئے تو برہمن بن گئے اور باقی لوگوں کو نچلی قومیں قرار دیا۔ اسلام نسلی تفوق کی اجازت نہیں دیتا۔ قرآن کریم میں ہے:۔

یاایہا النّاس انّا خلقناکم من ذکرٍ و انثیٰ وجعلناکم شعوباً و قبائل لتعارفوا انّ اکرمکم عنداللہ اتقاکم۔ (پ۲۶ الحجرات آیت ۱۳)

ترجمہ۔ اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں شاخیں اور قبیلے کیا۔ تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو تم میں اللہ کے ہاں عزت والا وہی ہے جو پرہیزگار ہے۔

۲ ماتمی جلوس نکالنا

حضرت یعقوب علیہ السلام کی زندگی میں ہی اُنہوں نے اس کام کا آغاز کر دیا۔ انہوں نے اس اعلان کے ساتھ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو بھیڑیئے نے شہید کر دیا ہے رات کو ایک ماتمی جلوس نکالا اور روتے ہوئے حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس آئے۔

وجاءوا اباہم عشاءً یبکون۔۔۔۔ وجاءوا علیٰ قمیصہٖ بدمٍ کذب ط قال بل سوّلت لکم انفسکم امراً فصبرٌ جمیل۔ (پ۱۲ یوسف آیت ۱۸)

ترجمہ۔ اور وہ رات کو اکٹھے اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے آئے اور انہوں نے اُس کے کُرتے پر جھوٹا خون لگا رکھا تھا (حضرت) یعقوب نے کہا تمہارے دلوں نے یہ بات بنا رکھی ہے۔ سو اب صبر ہی بہتر ہے۔

یہ لوگ خود ہی حضرت یوسف کو ٹھکانے لگا کر آئے تھے لیکن کیسی چال چلے دنیا حیران ہے کس طرح قمیص پر لہو لگایا اور تعزیئے کے ساتھ چلے۔ حضرت یعقوب کو اس وقت یوسف علیہ السلام کا پتہ نہ تھا لیکن ماتمی جلوس کو دیکھتے ہی ان کی بصیرت نے کہا کہ یہ کوئی بنی بنائی بات ہے۔ سچے لوگوں کے لچھن ایسے نہیں ہوتے۔

۳ بارہ اماموں کے سائے

حضرت یعقوب علیہ السلام جب مصر آئے تو آپ کے بارہ بیٹوں سے بارہ قبائل چلے۔ ان بارہ قبائل کے بارہ سردار تھے۔ قرآن کریم میں ہے:۔

ولقد اخذ اللہ میثاق بنی اسرائیل و بعثنا منہم اثنی عشر نقیبا۔ (پ۶ المائدہ ع ۳)

ترجمہ۔ اور بے شک اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل سے عہد لیا اور ان بارہ سردار ہم نے مقرر کیئے۔

یہ اثنا عشری سلسلے کی ابتداء ہے۔ اگر یہ بارہ یکے بعد دیگرے ہوں تو ایک وقت میں ایک ہی امام ہوا۔ اور اگر یہ بارہ بیک وقت موجود ہوں تو پھر یہ بیشک اثنا عشری عقیدہ ہے۔

وقطّعنہم اثنتی عشرۃ اسباطاً امما۔ (پ۹ الاعراف ع ۲۰)

ترجمہ۔ اور جُدا جُدا کر دیا ہم نے ان کو بارہ دادوں کی اولاد بڑی بڑی جماعتیں۔

یہ بارہ کا عدد انہیں اتنا عزیز تھا کہ جب یہ یہودی اسلام کی صفوں میں گھسے تو ایک نبی کی امت بننے کی بجائے انہوں نے اثنا عشری کہلانا زیادہ پسند کیا۔

۴ اللہ کی کتابوں میں تحریف

یہودیوں نے اللہ کی کتاب میں بڑی بے دردی سے تحریف کی۔ ان کے دل اتنے سخت ہو چکے تھے کہ انہیں خدائی پکڑ کا بھی کوئی خوف لاحق نہ ہوا۔ قرآن کریم میں ہے:۔

فبما نقضہم میثاقہم لعنّاہم وجعلنا قلوبہم قاسیہ، یحرفون الکلم عن مواضعہٖ۔۔ ولا تزال تطلع علیٰ خائنۃ منہم الّا قلیلاً منہم۔ (پ۶ المائدہ)

ترجمہ۔ سو ان کے عہد توڑنے پر ہم نے انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا اور ان کے دل سخت کر دیئے۔ اب یہ پھیرتے ہیں اللہ کے کلام کو اس کے ٹھکانے سے۔

یکتبون الکتاب بایدیہم ثم یقولون ھٰذا من عند اللہ۔ (پ۱ البقرہ ع ۹)

ترجمہ۔ لکھتے ہیں کتاب میں اپنے ہاتھوں اور پھر کہہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔

جب یہ لوگ منافقانہ ادا میں اسلام کے دائرے میں آئے تو لگے ہاتھوں قرآن کریم پر برسے۔ اسے تحریف شدہ کہا۔ تاکہ کسی طرح اسے تورات سے تولا جا سکے۔ قرآن کے بارے میں ان کا عقیدہ کیا تھا۔ اُسے مُلّا محسن کاشانی (۱۰۷۵ھ) کی زبان سے سنیئے:۔

المستفاد من جمیع ھٰذہ الاخبار و غیرہا من طریق اہل البیت علیہم السلام ان القرآن الذی بین اظہرنا لیس بتمامہ کما انزل علی محمد صلی اللہ وسلم بل منہ ما ہو خلاف ما انزل اللہ و منہ ما ہو مغیر محرف وانہ قد حذف منہ اشیاء کثیرۃ۔[1]

ترجمہ۔ ان سب احادیث اور اہل بیت کی دیگر روایات سے یہی ثابت ہے کہ یہ قرآن جو

---

[1] تفسیر الصافی جلد ۱ صفحہ ۳۲

اس وقت ہمارے سامنے ہے یہ پورا نہیں ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا تھا بلکہ اس میں گیارہ ایسی باتیں بھی ہیں جو اللہ کے نازل کردہ کلام کے خلاف ہیں اور (۲) ایسی بھی ہیں جن میں تبدیلی کی گئی ہے اور وہ تحریف شدہ ہیں اور (۳) ان میں سے بہت سی چیزیں نکال بھی دی گئی ہیں۔

اس عقیدے کے بعد کیا بلی تھیلے سے باہر نہیں آ گئی۔ غور کیجئے یہودیوں نے کس طرح اپنے خیالات مسلمانوں میں لا داخل کئے ہیں۔

⑤ گائے کے قد کا جانور بنانا، اُسے مولا ٹھہرانا اور اس کا جلوس نکالنا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پہ گئے تو ان لوگوں نے سونے کے زیورات کا بچھڑا بنا کر اسے اپنا مولا ٹھہرایا۔ اس پہ قوم کے زیورات نچھاور کئے۔ اس سے مرادیں مانگیں، اس کی منتیں مانیں اور اس کی عبادت کرنے لگے۔ قرآن کریم میں ہے:-

واتخذ قوم موسیٰ من بعده من حلیهم عجلاً جسدًا له خوار۔ (پ۹ الاعراف آیت ۱۴۸)

ترجمہ۔ اور قوم موسیٰ نے ان کے بعد اپنے زیورات سے ایک بچھڑا کھڑا کر لیا۔ ایک بدن تھا جس میں گائے کی سی آواز تھی۔

قالوا لن نبرح علیه عاکفین حتی یرجع الینا موسیٰ۔ (پ۱۶ طٰہٰ ع ۵)

ترجمہ۔ انہوں نے کہا ہم برابر اسی (بچھڑے) پہ جھکے رہیں گے یہاں تک کہ موسیٰ ہماری طرف واپس آئیں۔

اس عقیدے پہ یہ اتنے پکے تھے کہ اسلام کی صفوں میں گھس کر بھی انہوں نے اس جلوس عزا کو اپنا دینی حق کہا اور برابر اس کی تزئین کرتے رہے۔

⑥ خاک شفا اٹھائے پھرنا اور اس میں زندگی کی روح جاننا

حضرت موسےٰ علیہ السلام واپس آئے تو آپ نے سامری سے پوچھا تو نے کیا شعبدہ کیا ہے؟ قرآن کریم میں ہے اس نے کہا:-

قال بصرت بما لم یبصروا به فقبضت قبضة من اثر الرسول۔ (پ۱۶ طٰہٰ ع ۵)

ترجمہ۔ میں نے دیکھ لیا جو اوروں نے نہ دیکھا۔ پھر بھر لی میں نے ایک مٹھی (روح الامین کے پاؤں کے نیچے سے۔ پھر میں نے اسے (اس بچھڑے میں) ڈال دیا۔

سونا تھا کافروں کا —— مال لیا ہوا فریب سے —— اس میں مٹی پڑی برکت کی ——
حق اور باطل مل کر ایک کرشمہ ہوا کہ جاندار کی طرح کی ایک آواز اس میں ہو گئی۔

معلوم ہوا کہ مٹی کو خاک شفا سمجھ کر اُٹھا لینا اور اس سے برکت لینا، اس میں زندگی کی روح سمجھنا یہ راہ حضرت موسیٰ کی نہیں سامری کی تھی۔

⑦ اظہار افسوس میں اپنے آپ کو مارنا

مُنہ پر تھپیڑ اور سینہ کوبی

مصیبت کے وقت ہر کوئی پریشان ہوتا ہے۔ لوگ بسا اوقات جزع فزع پر اُتر آتے ہیں، کپڑے پھاڑ لیتے ہیں اور صف ماتم بچھ جاتی ہے۔ اسلام ایسے وقت سینہ کوبی اور آہ و فغاں کی اجازت نہیں دیتا لیکن شریعت تورات میں مجرمین اپنے اُوپر یہ سزا ڈال سکتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب ان لوگوں کو مجرم ٹھہرایا جو گائے کا جلوس بنا کر اسے مولا مان رہے تھے۔ تو ان کی سزا یہی تجویز ہوئی کہ وہ اپنے آپ کو ماریں۔ قرآن کریم میں ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا:-

انکم ظلمتم انفسکم باتخاذکم العجل فتوبوا الیٰ بارئکم فاقتلوا انفسکم ذلکم خیر لکم۔

(پ۱ البقرہ آیت ۵۴)

ترجمہ۔ تم نے نقصان کیا اپنا یہ بچھڑا بنا کر۔ سو اب توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف۔ اور مارو اپنے آپ کو۔ یہی بہتر ہے تمہارے سامنے۔

⑧ حضرت ہارون علیہ السلام کا نام لینا اور ان پیروی نہ کرنا

جب موسیٰ علیہ السلام طور پر گئے تو حضرت ہارون ان کے جانشین تھے حضرت ہارون اُنہیں گئو سالہ پرستی سے برابر روکتے رہے۔ لیکن ان لوگوں نے ان کی ایک نہ مانی۔ یہ حضرت ہارون کی ظاہری خلافت کا اقرار اور ان کی اطاعت سے انکار تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا حضرت علی المرتضیٰ رضہ کو اپنا ہارون قرار دیا —— پھر کیا تھا جو یہودی سازش کر کے اسلام کی صفوں میں گھسے۔ انہوں نے اپنے آپ کو ہارونِ امت سیدنا حضرت علی المرتضیٰ رضہ کی پارٹی تو کہا لیکن یہ لوگ حضرت علی المرتضیٰ رضہ کے عقیدے اور مسلک سے اسی طرح دور رہے جس طرح سامری کے ماننے والے حضرت ہارون علیہ السلام سے عملاً دور تھے۔

⑨ القدس کی عقیدت اور خانہ کعبہ کی بے حرمتی

یہود کا قبلہ عبادت بیت المقدس تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ رب العزت نے کعبہ ابراہیمی پر لوٹایا اور اب یہ قبلہ نماز ٹھہرا۔ یہ کھلے بندوں یہود سے ذہنی تصادم تھا۔ پھر جب یہود کو خیبر سے نکال دیا گیا اور آہستہ آہستہ فلسطین کا رُخ کیا گیا تو یہ ہر طرح سے حضرت اسماعیلؑ، حضرت ہاجرہؑ اور حرم کعبہ کے خلاف پراپیگنڈے میں مصروف تھے۔ القدس کی عقیدت اور خانہ کعبہ کی بے حرمتی ان کا امتیازی نشان ٹھہرا۔

علامہ خمینی نے برسر اقتدار آنے کے بعد القدس کے حق میں تو بیسیوں بیان دیئے لیکن حرمین شریفین میں ہر سال ایرانیوں کے جلوس نکلوائے۔ جنہوں نے ان پاک شہروں میں سیاسی نعرے بھی لگائے قتل و قتال تک نوبت پہنچتی رہی۔ امن عامہ بھی تباہ ہوا اور حرمت کعبہ بُری طرح پامال ہوئی۔ افسوس کہ علامہ خمینی نے اب تک تقدیس حرمین پر کوئی بیان نہیں دیا۔ نہ اُن لوگوں کی مذمت کی جو وہاں سیاسی کھیل کھیلنا چاہتے ہیں اور سیاسی جلوس نکالتے ہیں۔

⑩ تقیہ کی دوطرفی پالیسی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو مدینہ کے گرد یہودیوں کی کئی بستیاں آباد تھیں۔ انہوں نے حضورؐ کو ہر ممکن طریق سے شہید کرنا چاہا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کیا اور آپ کو اُن کے حیلے اور مکر سے بچایا۔ پھر ان لوگوں نے ایک خفیہ تدبیر کی کہ دن کو حضورؐ کے پاس جا کر مسلمان ہو جایا کریں اور پچھلے پہر اسلام کا انکار کر کے واپس آجایا کریں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ کچھ کچے اور نئے مسلمان بھی بدگمان ہو کر صفِ اسلام سے باہر آجائیں گے۔

وقالت طائفة من اهل الكتاب آمنوا بالذى انزل على الذين آمنوا وجه النهار
واكفروا آخره لعلهم يرجعون۔ (پ۳ آل عمران ع ۷)

ترجمہ۔ اور کہا بعضے اہل کتاب نے مان لو جو کچھ اُترا ہے مسلمانوں پر دن چڑھے ـــ اور منکر ہو جاؤ آخر دن میں ـــ شاید وہ (بھی کچھ) پھر جاویں۔

اس آیت میں یہودیوں کی چالاکی اور خیانت ذکر کی جا رہی ہے کہ اپنے کچھ آدمی صبح کے وقت بظاہر مسلمان بن جائیں اور مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھیں اور شام کو یہ کہہ کر کہ ہم کو اپنے بڑے بڑے علماء سے تحقیق کرنے پر معلوم ہوا ہے کہ وہ نبی نہیں جن کی بشارت دی گئی تھی اور تجربہ سے ان کے حالات بھی اہل حق

کی طرح کے ثابت نہ ہوئے ـــ اسلام سے پھر جایا کریں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ بہت سے ضعیف الایمان ہماری یہ حرکت دیکھ کر اسلام سے پھر جائیں گے۔

دوطرفہ پالیسی کہ اندر سے کچھ اور اوپر سے کچھ اور اسے دین اور رضائے الٰہی کے لیے عمل میں لانا یہ یہودیوں کی میراث ہے بعض مسلمان کہلانے والوں نے اسے تقیہ کے عنوان سے آگے چلایا ہے۔ یہودیوں نے تو اسے محض جواز کے درجے میں لیا۔ مگر انہوں نے اسے عبادت اور عزیمت کے طور پر اختیار کیا۔ یہودیوں نے اسے اپنے عوام کے ذمے لگایا لیکن ان لوگوں نے اُسے ان کے ذمے لگایا۔ جنہیں انہوں نے مامور من اللہ کہا اور معصوم جانا۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ تقیہ کی اصل یہود سے قائم ہوئی ہے۔

سوال: حضور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو بتایا تم یہود و نصاریٰ کی راہ پر چلو گے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے بعد آپ کی امت میں بھی گمراہی پھیلے گی جس طرح یہود و نصاریٰ دو ملتیں اصل راہ سے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی راہ تھی بھٹک گئیں۔ یہ امتِ مسلمہ بھی اصل راہ چھوڑ دے گی۔ یہ خلافتوں میں پڑ کر اسلام کی روحانی قدروں کو کھو بیٹھیں گے۔ کیا ایسا ہونا ضروری ہے اور کیا ایسا ہو کر نہیں رہا؟ نیز بتائیں کہ اس امت میں یہود کی راہ پہ چلنے والے کون لوگ ہیں اور نصاریٰ کی راہ پہ چلنے والے کون؟ اور حضرت ابراہیمؑ کی ملت پر قائم رہنے والے کون ہیں؟

جواب: ہاں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بے شک ایسا فرمایا ہے۔ حضرت ابو واقد اللیثیؓ کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

لتركبن سنة من كان قبلكم[1]

ترجمہ۔ تم ضرور پہلوں کی راہ پر چلو گے۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں:۔

لياتين على امتى كما اتى على بنى اسرائيل حذو النعل بالنعل[2]

ترجمہ۔ میری امت پر وہ دن ضرور آئے گا جو بنی اسرائیل پر آیا۔ یہ بھی ان کے قدم بقدم چلیں گے۔

ان روایات سے یہ تو معلوم ہوا کہ اس امت میں بھی گمراہی پھیلے گی۔ لیکن یہ نہیں کہ پوری امت گمراہ ہو جائے گی۔ ایک طبقہ ضرور حق پر رہے گا۔ کیونکہ یہ آخری دین ہے۔ حضورؐ کے بعد کسی نئے نبی کی آمد نہیں۔ سو

---

[1] جامع ترمذی جلد ۲ ص۱۰۱ ہذا حدیث صحیح [2] مشکوٰۃ ص۳۰

ضرور تھا کہ پہلا دین اپنی اصلی شکل میں کسی نہ کسی حلقے میں قیامت تک محفوظ رہے۔ حضرت مغیرہؓ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

لن یزال قوم من امتی ظاہرین علی الناس حتی یاتیھم امر اللہ وھم ظاھرون۔[1]

ترجمہ: میری امت کا ایک طبقہ ہمیشہ حق پہ قائم رہے گا یہاں تک کہ قیامت آجائے اور وہ غالب ہی ہوں گے۔

پس یہ بات واضح ہوئی کہ ایک طبقہ اہلِ حق کا ہمیشہ موجود رہے گا جس کی وجہ سے امت میں گمراہی استقرار نہ پکڑ سکے گی۔ ضلالت کی آندھیاں، الحاد کے بادل، بے راہ روی کے طوفان، بے حیائی کے سیلاب آئیں گے لیکن طائفہ حق اس کی راہ میں سیسہ پلائی دیوار بن کر رہے گا۔ باطل کو حق پہ غالب نہیں آنے دے گا۔

آپ نے فرمایا کہ یہود و نصاریٰ دونوں ملتیں اصل راہ سے بھٹک گئیں۔ اس امتِ مسلمہ میں بھی ان کی راہ پہ لوگ چلیں گے۔ یہود و نصاریٰ دونوں قومیں اہلِ کتاب کہلاتی ہیں اور دونوں کافر ہیں۔ گو ہر ایک کے کفر کی راہ مختلف ہے۔ یہودیوں کا کفر عداوت کی راہ سے آیا ہے۔ انہوں نے حضرت مریم، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے خاصّانِ خدا کے ساتھ بغض و عداوت کی راہ اختیار کی اور کفران کا مقدر بنا۔ گویا ان کے مذہب کی بنیاد ہی نظامِ عداوت ٹھہرا۔ یہودیوں کی طرح نصاریٰ بھی کافر ہیں لیکن ان کے کفر کی بنیاد بے جا محبت ہے۔ انہوں نے حضرت مریم کو خدا کی بیوی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا سمجھا اور اس طرح بے جا محبت کی راہ سے کافر ہوئے۔ حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو درجہ الوہیت پر فائز کیا۔ اور اس طرح کافر بنے۔

بعینہٖ اسی طرح امت میں بھی دو طبقے اٹھے۔ ایک طبقہ جس نے خاصّانِ خدا کے ساتھ عداوت رکھی۔ یہاں یہ بات وضاحت طلب ہے کہ پہلے خاصّانِ خدا (یعنی انبیاء کرام) کے ساتھ عداوت رکھنے والے یہود تو گزر چکے تھے۔ اب اس امت میں خاصانِ خدا کون ہیں؟ جن کے خلاف یہاں عداوت کا بازار گرم ہوگا۔ کسی نبی نے تو پیدا ہونا نہیں۔ سو ان کا نشانہ انبیاء تو ہوں گے نہیں۔ کون ہوں گے؟ اس امت کے خاصانِ خدا اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اس امت کے ایک طبقہ نے یہودیوں کی راہ پہ چل کر انہی خاصانِ خدا حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ عداوت قائم کی، ان کو برا بھلا کہا، اُن پہ بہتان باندھے، ان پہ سبّ و شتم کیا۔ اس طبقہ میں کون لوگ داخل ہیں۔ ان کی ایک طویل فہرست ہے۔ کلینی سے لے کر خمینیؔ تک کس کس کا نام لیا جائے — حافظ ابن تیمیہؒ (۷۲۸ھ) بھی لکھتے ہیں کہ یہود اور شیعہ میں واضح مشابہت موجود ہے[2] —

---

[1] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۴۳ [2] منہاج السنۃ جلد ۱ صفحہ ۱۵

دوسرا طبقہ اس امت میں نصاریٰ کی راہ پہ چلا اور انبیاء اولیاء کی محبت میں کفر و شرک کی دلدل میں جا دھنسا۔ اس وقت ان کی تاریخ اور تعیین موضوعِ کلام نہیں۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسا فرمایا تھا، ویسا ہی ہو کر رہا۔ اور دونوں طبقے اس امت میں بھی بن کر رہے۔

یہود کی خصوصیات کیا کیا ہیں اور ان کے تاریخی خد و خال کیا ہیں۔ اُن پر توجہ فرمائیں:-

۱. نسلی تفوق کا دعوےٰ۔ ۲. ماتمی جلوس نکالنا۔ ۳. بارہ اماموں کے سائے۔ ۴. اللہ کی کتابوں میں تحریف۔ ۵. گائے کے قد کا جانور بنانا، اسے مولا ٹھہرانا اور اس کا جلوس نکالنا۔ ۶. خاک شفا اٹھائے پھرنا اور اس میں زندگی کی روح ماننا۔ ۷. اظہارِ تعزیت میں اپنے آپ کو مارنا، منہ پہ تھپڑ اور سینہ کوبی وغیرہ۔ ۸. حضرت ہارون کا نام لینا اور ان کی پیروی نہ کرنا۔ ۹. القدس کی عقیدت اور خانہ کعبہ کی بے حرمتی۔ ۱۰. تقیہ کی دوطرفہ پالیسی کہ اُوپر سے کچھ اور اندر سے کچھ۔

یہ دس باتیں کیا آپ کو اس امت کے بھٹکوں میں نظر نہیں آتیں؟ یہودیوں کی پیروی ان میں اتنی واضح ہے کہ محققین کہہ اٹھے ہیں کہ عبداللہ بن سبا کی اصل یہود سے تھی۔

جو مسلمان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ پر رہے وہ افراط و تفریط سے بچے ہوئے ہیں۔ نہ وہ یہود کی راہ پر چلے نہ نصاریٰ کی راہ پر۔ وہ صحیح ملتِ ابراہیمی پہ قائم ہیں:-

ان اولی الناس — بابراھیم للذین اتبعوہ۔ (پ ۳ آل عمران ع ۷)

ترجمہ: بے شک ابراہیم کے سب سے قریب وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس کی پیروی کی۔

ان حضرات اہلِ حق کی پہچان کوئی مشکل نہیں۔ دورِ اوّل میں خلفائے راشدینؓ اور حضرات صحابہ کرامؓ اہلِ حق تھے۔ پچھلے دور میں ہم نے حضرت امام ربّانی مجدد الف ثانیؒ، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے خاندان کو اور پھر حضرت شیخ الہندؒ کو اور ان کے اساتذہ و تلامذہ کو علمائے ربانیین اور ملتِ ابراہیمی کے قائمین میں سے پایا ہے اور یہی حضرات ہیں جو حدیث حضرت مغیرہؓ اور حدیث حضرت ثوبانؓ اور حدیث حضرت معاویہؓ کا مصداق ہیں۔

ہم نے دورِ اوّل اور دورِ آخر کی نشاندہی کر دی ہے۔ ان دو کے درمیان بارہ صدیوں کے اہلِ حق کی کڑیاں ہیں جن کی تفصیل اس مختصر جواب میں نہیں دی جا سکتی۔ یہودی پیشواؤں اور تبرّائی ملّاؤں کی نارِ انتقام کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ اعاذنا اللہ منہا۔

واللہ اعلم بالصواب

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: کیا یہ صحیح ہے کہ دینِ مسیح کو مسخ اور غت ربور کرنے میں یہود کا بڑا دخل ہے اور کیا یہ صحیح ہے کہ ہندوؤں کو ویدوں کی اصل تعلیم سے دور کرنے میں بھی یہودیوں کا ہی دخل ہے اور کیا یہ صحیح ہے کہ دینِ محمدی کو مسخ اور مجروح کرنے میں بھی یہودیوں کا ہی دخل ہے؟

جواب: آپ کے یہ تینوں استخراج conclusion صحیح ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ملتِ ابراہیمی پر تھے اور اسی پر رہے۔ ان کے دین میں دعوئے الوہیت اور عقیدہ کفارہ کا تصور تک نہ تھا۔ پطرس حواری بھی آپ کے اسی دین پر تھے۔ آپ کے آسمانوں پر جانے کے تقریباً ایک صدی بعد ایک یہودی جس کا نام ساؤل تھا، نے اچانک دعوئے کیا کہ اسے حضرت مسیح کسی روحانی صورت میں ملے ہیں اور آپ نے اسے اپنے دین میں داخل کیا ہے۔ عیسائی ہو کر یہ پال کہلایا۔ اسے ہی پولس Paul کہتے ہیں۔ اس نے عیسائی بن کر پہلے کے دینِ مسیح کو پورا بدل ڈالا۔ موجودہ عیسائیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم پہ نہیں سینٹ پال کی تحریف پر مبنی ہے۔

۲۔ اسرائیل کے کچھ قبائل ہندوستان آنکلے تو یہاں کی جاہل اقوام میں انہیں اپنے نسلی تفوق پر کام کرنے کا موقع مل گیا۔ بچھڑے کے پجاری یہاں بھی انہی ولالتوں سے چلے۔ ہندوؤں کی گائے پرستی انہی کی ایجاد ہے۔ یہ دوسرے لوگوں میں خود پنڈت بنے اور بنی نوعِ انسان میں ذات پات کی تقسیم کر دی۔ ۱۔ برہمن۔ ۲۔ کھتری۔ ۳۔ ویش۔ ۴۔ چنڈال۔ سرزمین کشمیر کو انہوں نے مرکز بنایا۔ اب تک وہاں پنڈت کے نام سے ایک نسل معروف ہے۔ ویدوں کی موجودہ تعلیمات میں ان پنڈتوں کا بڑا دخل ہے۔ پھر ہندوستان کے پنڈتوں میں ایک پنڈت دیانند اٹھا جس نے اس ہندو مذہب کے خلاف بغاوت کر کے اسے پھر سے ویدوں کے مطابق کرنے کی کوشش کی اور یہ لوگ آریہ کہلائے۔

۳۔ مسلمانوں میں خلیفہ سوم سیدنا حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے آخری دور میں عبداللہ بن سبا ایک یہودی اسلام کی صفوں میں داخل ہوا۔ ابتداء میں اس نے مسلمانوں میں سیاسی بے چینی پیدا کی اور پھر حضرت عثمانؓ کیخلاف ایک گروہ بنا کر کھڑا کر دیا۔ جب ایک راہ بن گئی تو پیچھے آنے والوں نے خلفائے ثلٰثہ کے خلاف ایک مذہبی محاذ قائم کر لیا۔ پھر دینِ اسلام کے ایک ایک موضوع پر بڑی بے دردی سے تحریف کے ہاتھ صاف کیے۔ توحید کے ساتھ عدل (خدا کو عدل کا پابند کرنا) رسالت کے ساتھ امامت (کہ حضور ختمی مرتبت کے بعد بھی آسمانی ماموریت جاری ہے) اور آخرت کے ساتھ رجعت (مرنے کے بعد ایک دفعہ پھر اس دنیا میں لوٹنا) کے عقیدے قائم کیے۔ اپنی کتابوں (تورات وغیرہ) میں تو یہ تحریف کر ہی چکے تھے۔ مسلمانوں میں آ کر یہ قرآن کی تحریف کے بھی مدعی بنے۔ محققین نے تسلیم کیا ہے کہ شیعیت کی اصل یہود سے ہے۔ یورپ کے محققین بھی

اس کی تائید کر چکے ہیں۔

۴۔ موجودہ دور کی عالمی بے چینی جو عالمی اقتصادی پالیسی پر مبنی ہے۔ اس کے پیچھے بھی یہودی کارفرما ہیں۔ امریکی استعمار انہی کے ہاتھ میں ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے بنک انہی کے ہیں۔ عالمی تجارت پر انہی کا قبضہ ہے۔ اس پورے استعماری نظام کے خلاف اشتراکی اقتصادی نظام ہے۔ اس کے بانی بھی یہی لوگ ہیں۔ کارل مارکس ایک یہودی تھا۔ جس نے دیکھا کہ دنیا استعماری نظام Imperialism سے بُری طرح زخمی ہے۔ اسے اندیشہ ہوا کہ دولِ یورپ کہیں اسلام کی طرف نہ جھک پڑیں۔ وہ خود ایک نیا اقتصادی نظام کمیونزم کے نام سے سامنے لے آیا۔ آج دنیا کی تمام بے چینی ان دو سپر طاقتوں کے باہمی تقابل، ان قوموں کے تجاذب مفادات اور ان کے بیرونی مقبوضات کے گرد گھوم رہی ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ فرمایا کرتے تھے کہ سمندر کی تہہ میں اگر کہیں دو مچھلیاں بھی لڑ رہی ہوں تو اُن کے پسِ پشت یقیناً یہود کا ہی ہاتھ ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب

سوال: کیا یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کے نظامِ خلافت کو کمزور اور برباد کرنے میں یہودیوں کا بنیادی کردار رہا ہے۔ بتلائیں کہ خلافتِ راشدہ میں پہلا رخنہ کس نے لگایا اور خلافتِ راشدہ کس کے زہر آلود خنجر کا شکار ہوئی؟ پھر بتائیں خلافت عباسیہ تو بنو ہاشم کی خلافت تھی۔ بنو امیّہ یا بنو مروان کی نہ تھی۔ اس کا خاتمہ کیسے ہوا۔ کیا اس میں بھی یہود کے کسی ایجنٹ کا دخل تھا؟

جواب: یہود اپنے دورِ عروج میں اقوامِ عالم کا مذہبی مرکز تھے۔ روحانی قیادت کا تاج انہی کے سر پہ تھا۔ جب اس قوم نے اس ذمہ داری کا حق ادا نہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دوسری نسل بنو اسماعیل کو عروج بخشا۔ بنو اسرائیل رقابت اور حسد کی آگ میں جلنے لگے۔ مگر ان سے کچھ بن نہ پڑتا تھا یہ سامنے آنے کی پوزیشن میں بھی نہ رہے تھے۔ ارضِ خیبر سے بھی نکالے جا چکے تھے۔ اور دوسری طرف قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں بنو اسماعیل (خلفائے راشدین) کے سامنے سرنگوں ہو چکی تھیں۔ روم و ایران پر اسلام کا جھنڈا لہرا رہا تھا اور تمام دوسری قومیں لرزہ براندام تھیں۔

انہیں مسلمانوں کے علیحدہ دین اور ان کے مختلف طورِ عبادت سے کد اور دشمنی نہ تھی۔ انہیں مسلمانوں کا سیاسی عروج کھائے جا رہا تھا۔ وہ مسلمانوں کی عبادت کے اتنے دشمن نہ تھے جتنے ان کی خلافت کے دشمن تھے۔ انہوں نے اب یہ تدبیر کی کہ مسلمانوں میں گھس کر ان کے نظامِ خلافت کو کمزور اور پھر برباد کیا جائے

ان کا ایک ایجنٹ عبداللہ بن سبا دعوے اسلام کے ساتھ اسلام کی صفوں میں داخل ہوا اور خلیفۂ راشد سیدنا حضرت عثمان ذوالنورینؓ کی خلافت کو کمزور کرنے کے لیے پہلے صوبائی گورنروں کے خلاف ایک مہم چلائی اور پھر حالات اس طرح ترتیب دیئے کہ نظام خلافت برباد ہو کر رہا اور سیدنا حضرت عثمانؓ گھر بیٹھے تلاوت کرتے شہید کر دیئے گئے۔

اب ان لوگوں نے یہ تدبیر کی کہ حکومت اسرائیل اپنے ہاتھ میں نہ لیں۔ بنو اسماعیل کو ہی آپس میں لڑایا جائے۔ انہوں نے اپنے پورے دباؤ سے حضرت علیؓ کو خلافت قبول کرنے پر مجبور کیا اور پھر جمل میں انہیں حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ سے لڑایا۔ اور پھر حضرت علیؓ کے ساتھیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے خوارج کا فتنہ کھڑا کر دیا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت خلافتِ راشدہ میں پہلا رخنہ تھا۔ پھر حضرت علیؓ کی شہادت ان لوگوں کی دوسری فتح تھی۔ عبدالرحمٰن بن ملجم شیعانِ علی میں سے تھا۔ مگر معلوم نہیں کس کی شہ پر حضرت علیؓ کے خلاف ہو گیا اس نے کئی دن تک اپنے خنجر کو زہر میں ڈبوئے رکھا اور پھر اس بدترین انسان نے اپنے وقت کے بہترین انسان کو شہید کیا۔ اس سانحہ سے شیعانِ علی کی تاریخ بدترین عنوان سے شروع ہوئی ؎

لیبك علی الاسلام من کان باکیا

بنو عباس کی حکومت بلاشبہ ایک ہاشمی حکومت تھی۔ خلافت بغداد انہی کی خلافت تھی۔ ہلاکو خاں کے حملے کے وقت عباسیوں کا وزیر ابن علقمی تھا۔ یہ کون تھا جو ہلاکو خاں سے مل گیا تھا اور خلافتِ بغداد بالکل تاراج ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ آپ تاریخ کے صفحات میں خود دیکھ لیں۔ یہ ایک یہودی تھا جو خلفائے ثلٰثہ پر تبرا کہتا ہوا داخلِ دائرہ اسلام ہوا تھا۔

نہج البلاغۃ میں ایسے کئی خطبے موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت علی المرتضیٰؓ خود خلافت پر نہ آئے تھے۔ انہیں مجبور کر کے اس مقام پر لایا گیا تھا۔

سوال: عبداللہ بن سبا کی جو شخصیت یہودیوں اور شیعوں میں قدرِ مشترک ہے یا اسے اصل و فرع کی نسبت کہیے۔ آپ کی یہ بات درست ہے کہ یہودی اور شیعہ عقائد و رسوم بہت ملتے جلتے ہیں۔ اب اس سے بھی مطلع فرمائیں کہ کیا شیعہ کی عیسائیوں سے بھی کوئی قدر مشترک ہے۔ اگر ہے تو اس کی بھی وضاحت فرمائیں اور ان کے ملتے جلتے نظریات بیان فرمائیں؟

جواب: عیسائی اس خدا سے اپنے آپ کو وابستہ نہ رکھ سکے جو نظر نہ آئے۔ اس میں انہیں قلبی تسکین نہ ملتی تھی اس کے لیے انہوں نے اسے بیٹے کی شکل میں اتارا اور مرئی کیا اور پھر اسے ہر طاقت اور قدرت میں صاحب اختیار

سمجھا۔ شیعوں نے بھی ایک فرد (امام) کو تشریعاً اور تکویناً صاحبِ اختیار قرار دیا۔ اصول کافی کے کتاب الحجۃ کو دیکھیں امام کو انہوں نے ہر طرح کے اختیارات کا استناد مہیا کیا ہے۔ عیسائیوں نے خدا میں انسانی اوصاف پیدا کیے۔ شیعوں نے انسان میں خدائی اوصاف اُتارے۔

ان مباحث کا حاصل یہ ہے کہ جس طرح یہودیوں نے مسلمانوں کی سیاسی عظمت مجروح کی۔ عبداللہ بن سبا نے خلافت کو تاراج کیا۔ عیسائیوں نے مسلمانوں کی اعتقادی زمین متزلزل کی اور اسلام کو ایسا استناد مہیا کیا کہ اس سے جملہ متوازی نظریات Comperative thought سمجھوتہ کر سکتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیعیت میں اسلام کا اصل چہرہ بالکل مسخ ہو کر رہ گیا۔ پروفیسر A.J. Arbery لکھتا ہے:۔

> شیعوں نے اسلام کے مستحکم قلعے میں ایک دروازہ کھول دیا۔ اس دروازے سے تمام لوگ آجا سکتے تھے اور کوئی فکری ممانعت کسی کی راہ میں حائل نہ تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت کم لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے[1]

موصوف کہنا چاہتے ہیں کہ اگر ہم شیعوں کی اس رعایت کا پورا فائدہ اُٹھاتے تو آج اصل اسلام کا وارث کوئی نہ ہوتا۔ جملہ دعویدارانِ اسلام شیعہ ہوتے۔ مگر افسوس کہ ہم نے اس موقعہ سے بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔

موصوف آگے چل کر عیسائی دنیا پر یہ ذمہ داری ڈالتے ہیں:۔

> ہماری ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ اپنے قول و فعل سے مسلمانوں کو یہ کہنے کا موقع نہ دیں کہ شیعیت نے جو دروازہ کھولا تھا۔ وہ دراصل دین (اسلام) کے قلعے کا ایک مورچہ ٹوٹ جانے کے مترادف تھا[2]

موصوف کہنا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو ہم یہ کہنے کا موقع نہ دیں کہ شیعہ اسلام کے مضبوط قلعے میں ایک خطرناک نقب لگا چکے ہیں۔ اگر مسلمان اس حقیقت کا احساس نہ کریں تو پھر اپنے مسیحی نظریات شیعہ کی معرفت بآسانی اسلام کی صفوں میں داخل کیئے جا سکتے ہیں۔

ان تفصیلات سے اس یقین سے چارہ نہیں رہتا کہ شیعیت اپنے ابتدائی اعتقادی مراحل میں عیسائیت سے خطرناک حد تک متاثر ہوئی ہے۔

سوال: یہود و نصاریٰ نے اسلام کے قلعے میں رخنہ ڈالا اور شیعیت کی بنیادیں مہیا کیں۔ یہ بات تو واضح ہو چکی ہے لیکن یہ بات واضح نہیں ہوئی کہ کیا ایران کے قدیمی نظریات نے بھی مسلمانوں کو اپنے سے متاثر کیا ہے؟ مطلع

---

[1] میراثِ ایران ص۱۵۷ انگریزی ص۲۴۰ اردو [2] ایضاً ص۱۵۸

ان کا ایک ایجنٹ عبداللہ بن سبا دعوئے اسلام کے ساتھ اسلام کی صفوں میں داخل ہوا اور خلیفہ راشد سیدنا حضرت عثمان ذوالنورینؓ کی خلافت کو کمزور کرنے کے لیے پہلے صوبائی گورنروں کے خلاف ایک مہم چلائی اور پھر حالات اس طرح ترتیب دیئے کہ نظام خلافت برباد ہو کر رہا اور سیدنا حضرت عثمانؓ گھر بیٹھے تلاوت کرتے شہید کر دیئے گئے۔

اب ان لوگوں نے یہ تدبیر کی کہ حکومت اسرائیل اپنے ہاتھ میں نہ لیں۔ بنو اسمٰعیل کو ہی آپس میں لڑایا جائے۔ انہوں نے اپنے پورے دباؤ سے حضرت علیؓ کو خلافت قبول کرنے پر مجبور کیا اور پھر جمل میں انہیں حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ سے لڑایا۔ اور پھر حضرت علیؓ کے ساتھیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے خوارج کا فتنہ کھڑا کر دیا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت خلافتِ راشدہ میں پہلا رخنہ تھا۔ پھر حضرت علیؓ کی شہادت ان لوگوں کی دوسری فتح تھی۔ عبدالرحمٰن بن ملجم شیعانِ علی میں سے تھا۔ مگر معلوم نہیں کس کی شہ پر حضرت علیؓ کے خلاف ہو گیا اس نے کئی دن تک اپنے خنجر کو زہر میں ڈبوئے رکھا اور پھر اس بدترین انسان نے اپنے وقت کے بہترین انسان کو شہید کیا۔ اس سانحہ سے شیعانِ علی کی تاریخ بدترین عنوان سے شروع ہوئی ؂

لیبك علی الاسلام من كان باکیا

بنو عباس کی حکومت بلاشبہ ایک ہاشمی حکومت تھی۔ خلافت بغداد انہی کی خلافت تھی۔ ہلاکو خاں کے حملے کے وقت عباسیوں کا وزیر ابن علقمی تھا۔ یہ کون تھا جو ہلاکو خاں سے مل گیا تھا اور خلافتِ بغداد بالکل تاراج ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ آپ تاریخ کے صفحات میں خود دیکھ لیں۔ یہ ایک یہودی تھا جو خلفائے ثلٰثہ پر تبرا کہتا ہوا داخلِ دائرہ اسلام ہوا تھا۔

نہج البلاغۃ میں ایسے کئی خطبے موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت علی المرتضیٰؓ خود خلافت پر نہ آئے تھے۔ انہیں مجبور کر کے اس مقام پر لایا گیا تھا۔

سوال: عبداللہ بن سبا کی جو شخصیت یہودیوں اور شیعوں میں قدرِ مشترک ہے یا اسے اصل و فرع کی نسبت کہہ لیجئے۔ آپ کی یہ بات درست ہے کہ یہودی اور شیعہ عقائد و رسوم بہت ملتے جلتے ہیں۔ اب اس سے بھی مطلع فرمائیں کہ کیا شیعہ کی عیسائیوں سے بھی کوئی قدرِ مشترک ہے۔ اگر ہے تو اس کی بھی وضاحت فرمائیں اور ان کے ملتے جلتے نظریات بیان فرمائیں؟

جواب: عیسائی اس خدا سے اپنے آپ کو وابستہ نہ رکھ سکے جو نظر نہ آئے۔ اس میں انہیں قلبی تسکین نہ ملتی تھی اس کے لیے انہوں نے اسے بیٹے کی شکل میں اتارا اور مرئی کیا اور پھر اسے ہر طاقت اور قدرت میں صاحبِ اختیار

سمجھا۔ شیعوں نے بھی ایک فرد (امام) کو تشریعاً اور تکویناً صاحبِ اختیار قرار دیا۔ اصول کافی کے کتاب الحجہ کو دیکھیں امام کو انہوں نے ہر طرح کے اختیارات کا استناد مہیا کیا ہے۔ عیسائیوں نے خدا میں انسانی اوصاف پیدا کیے۔ شیعوں نے انسان میں خدائی اوصاف اُتارے۔

ان مباحث کا ماحصل یہ ہے کہ جس طرح یہودیوں نے مسلمانوں کی سیاسی عظمت مجروح کی۔ عبداللہ بن سبا نے خلافت کو تاراج کیا۔ عیسائیوں نے مسلمانوں کی اعتقادی زمین متزلزل کی اور اسلام کو ایسا استناد مہیا کیا کہ اس سے جملہ متوازی نظریات Comperative thought سمجھوتہ کر سکتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیعیت میں اسلام کا اصل چہرہ بالکل مسخ ہو کر رہ گیا۔ پروفیسر A.J. Arbery لکھتا ہے:۔

شیعوں نے اسلام کے مستحکم قلعے میں ایک دروازہ کھول دیا۔ اس دروازے سے تمام لوگ آ جا سکتے تھے اور کوئی فکری ممانعت کسی کی راہ میں حائل نہ تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت کم لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔[1]

موصوف کہنا چاہتے ہیں کہ اگر ہم شیعوں کی اس رعایت کا پورا فائدہ اُٹھاتے تو آج اصل اسلام کا وارث کوئی نہ ہوتا۔ جملہ دعویدارانِ اسلام شیعہ ہوتے۔ مگر افسوس کہ ہم نے اس موقعہ سے بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔

موصوف آگے چل کر عیسائی دنیا پر یہ ذمہ داری ڈالتے ہیں:۔

ہماری ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ اپنے قول و فعل سے مسلمانوں کو یہ کہنے کا موقع نہ دیں کہ شیعیت نے جو دروازہ کھولا تھا۔ وہ دراصل دین (اسلام) کے قلعے کا ایک مورچہ ٹوٹ جانے کے مترادف تھا۔[2]

موصوف کہنا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو ہم یہ کہنے کا موقع نہ دیں کہ شیعہ اسلام کے مضبوط قلعے میں ایک خطرناک نقب لگا چکے ہیں۔ اگر مسلمان اس حقیقت کا احساس نہ کریں تو پھر اپنے مسیحی نظریات شیعہ کی معرفت بآسانی اسلام کی صفوں میں داخل کئے جا سکتے ہیں۔

ان تفصیلات سے اس یقین سے چارہ نہیں رہتا کہ شیعیت اپنے ابتدائی اعتقادی مراحل میں عیسائیت سے خطرناک حد تک متاثر ہوئی ہے۔

سوال: یہود و نصاریٰ نے اسلام کے قلعے میں رخنہ ڈالا اور شیعیت کی بنیادیں مہیا کیں۔ یہ بات تو واضح ہو چکی ہے لیکن یہ بات واضح نہیں ہوئی کہ کیا ایران کے قدیمی نظریات نے بھی مسلمانوں کو اپنے سے متاثر کیا ہے؟ مطلع

---

[1] میراثِ ایران ص۱۵۷ انگریزی ص۲۴۰ اردو [2] ایضاً ص۱۵۸

فرمائیں کہ شیعیت اپنے اعتقادی نقشے میں کہاں تک دین زرتشت اور مجوس ایران سے متأثر ہوئی ہے ؟

جواب : شیعیت ابتدائی مراحل میں محض ایک سیاسی گروہ بندی تھی۔ ابھی اس کی چھت پہ کفر کی کڑیاں نہ رکھی گئی تھیں۔ یہود و نصاریٰ اور مجوس ایران اور دیگر الحادی قوتیں شیعیت کے دروازے سے مسلمانوں کی صف میں کھڑی ہونے لگیں اور پھر ان حلقوں نے مسلمانوں میں اپنے فکری اثرات چھوڑے۔ یہ شیعیت کی مذہبی تاسیس تھی۔ ایک اچھا خاصا ملغوبہ تیار ہوتا گیا اور یہ واقعی وہ دروازہ تھا جس سے تمام لوگ آجا سکتے تھے۔ شیعیت اس راہ سے ایک مذہبی گروہ بنی ہے۔ ورنہ ابتداء میں شیعانِ علی میں سے ہونا کوئی کفری عنوان نہ تھا۔ یہ صرف ایک سیاسی گروہ تھا۔

ابوسعید عثمان بن سعید الدارمی کی تالیف کتاب الرد علی الجہمیہ ابھی ۱۹۶۰ء میں لیدن **Leydon** سے بڑی آب و تاب سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں امام دارمی لکھتے ہیں :-

انھم یستترون بالتشیع یجعلونہ تشیہاً لکلامھم وخطبھم وسلماً وذریعۃ لاصطیاد الضعفاء واھل الغفلۃ [1]

ترجمہ : یہ ملاحدہ شیعیت کے پردے میں اپنا کام کرتے۔ اپنی باتوں اور خطبوں میں اسی کا سہارا لیتے (اہلبیت کے نام سے اپنا کام چلاتے) اور اسی تشیع کو ضعیف الاعتقاد اور دین سے غفلت برتنے والے مسلمانوں کو شکار کرنے کے لیے سیڑھی اور ذریعہ بناتے ہیں۔

شیعیت کی مذہبی دلالتیں

تاریخی حیثیت سے یہ صحیح ہے کہ شیعانِ علی آغازِ کار میں عرب ہی تھے لیکن یہ ایک سیاسی گروہ بندی تھی شیعیت نے جب ایک مذہبی حیثیت اختیار کی۔

کیمرج کے مشہور مستشرق پروفیسر آربری **A.J. Arbery** نے میراثِ ایران پہ ایک نہایت قابل قدر کتاب مرتب کی ہے۔ جس کا اردو ترجمہ مجلس ترقیِ اردو (۲۔ کلب روڈ) لاہور نے ابھی ۱۹۶۲ء میں شائع کیا ہے۔ اس میں جی۔ ایم وکنز کے مضمون میں ہمارے اس موقف کی کافی تائید پائی جاتی ہے کہ عیسائیوں اور شیعوں میں کئی باتوں میں قدرِ مشترک موجود ہے۔ موصوف لکھتے ہیں :-

شیعوں نے مذہبِ قدیم کا تتبع کرتے ہوئے ایک فرد کو صاحبِ اختیار و اقتدار قرار دیا یعنی صاحب الشریعۃ۔ بالفاظِ دیگر بشر میں صفاتِ خداوندی دیکھیں اور عیسائیوں نے جو خدا میں

[1] کتاب الرد علی الجہمیۃ ص۹۹

اوصافِ انسانی پائے تھے ان کے اُلٹ بات پیدا کر دی۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ عیسویت میں ...... اور شیعی افکار میں کچھ مشابہت ہے یہ جو دعوے کیا گیا ہے کہ شیعوں کا امام پوپ **Pope** کے ہم پلہ ہے غلط ہے۔ صحیح یہ ہے کہ وہ نسطوریوں کے عیسیٰ کے مشابہ ہے[1]۔ فاضل موصوف آگے جا کر لکھتے ہیں :-

یہ سوال بھی موردِ بحث رہا ہے کہ ابتداء میں عیسائیوں نے کس حد تک بنیادی شیعی افکار کی تعمیر میں حصہ لیا ہے۔ مغرب کے علماء نے اس مسئلے سے تعرض کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں مسلکوں میں مشابہتیں موجود ہیں[2]۔

انسانی خون کی قربانی اور عقیدہ کفارہ

عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جسدِ عنصری نے اپنے پہ موت وارد کر کے ابن آدم کے گناہ دھوئے۔ ان کے ہاں یہ خون قربانی شمار ہوتا ہے۔ شیعہ تقریباتِ محرم میں جب چھریوں سے ماتم کرتے ہیں تو وہ بھی اس انسانی خون کو گناہوں کا کفارہ سمجھتے ہیں جو خدا کے حضور میں پیش کیا جاتا ہے۔

پھر حضرت حسینؓ کی جانی قربانی بھی ان کے ہاں شیعوں کے گناہوں کا کفارہ تھی۔ حضرت امام موسیٰ کاظم (ان کے ساتویں امام) کے نام سے ملا محمد بن یعقوب کلینی (۳۲۹ھ) نے یہ روایت پیش کی ہے :-

ان اللّٰہ عزوجل غضب علی الشیعۃ فخیّرنی نفسی اوھم فوقیھم اللّٰہ واللّٰہ بنفسی[3]

ترجمہ۔ بہ تحقیق اللہ کا شیعہ پہ غضب ہوا۔ اللہ نے پھر مجھے مختار کیا کہ ان کے گناہوں کے عوض میں مارا جاؤں یا وہ سب (تاکہ وہ گناہوں سے پاک ہو جائیں) مارے جائیں گے۔ پھر اللہ نے انہیں میری جان کے بدلے بچا لیا۔

ملا خلیل قزوینی (۱۰۷۵ھ) لکھتا ہے :-

اختیار کشتہ شدن خود کردم تا ایشاں کشتہ نشوند[4]

کیا یہ وہی عقیدہ نہیں کہ حضرت مسیح نے عیسائیوں کے گناہوں کو دھونے کے لیے پھانسی پائی تھی یہاں وہ ذبیحہ قربانی سیدنا حضرت حسینؓ کو بنایا گیا ہے۔

پروفیسر جی۔ ایم وکنز لکھتا ہے :-

یہ بات نہیں کہ تمام شیعہ بیک وقت ان تمام عقائد کے مقر تھے۔ البتہ وقتاً فوقتاً شیعوں نے

[1] میراثِ ایران ص۱۵۳ انگریزی [2] ایضاً ص۱۵۷ [3] اصول کافی جلد ص [4] الصافی کتاب الحجۃ جلد۳ ص۲۲۵ لکھنؤ

جن عقائد کا اظہار کیا ہے اگر انہیں مدون کیا جائے تو اُن پر یوحنا کی انجیل کے آخری الفاظ کا اطلاق ہو سکتا ہے۔[۱]

آسمانی کتابوں کے مخلوق ہونے کا عقیدہ

عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں تو خدائی صفات کا عقیدہ رکھا لیکن انجیل کو مخلوق اور کتاب متبدل جانا۔ شیعوں نے بھی اپنے اماموں میں خدائی صفات پائیں لیکن قرآن کریم کو انہوں نے بھی مخلوق قرار دیا۔ ان کے ہاں یہ محلِ حوادث ہے جس میں تبدیل و تحریف نے راہ پائی ہے۔ حق یہ ہے کہ اعتزال کا عنصر اپنے زوال کے بعد شیعیت میں جذب ہو گیا تھا[۲] اور معتزلہ کا قرآن کے مخلوق ہونے کا عقیدہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں رہے شیعہ تو ان کے افکار و نظریات عربی نہیں بیرونی عقائد Foreign Wisdom سے پوری طرح متاثر تھے۔ گویا یہ ایک نیا دین تھا۔ جو مسلمانوں سے نوّے فیصد ہٹ کر چلا۔ یہود کے بعد ان پر سب سے زیادہ اثر ساسانی عقیدہ نورین کا تھا۔ دین زرتشت میں ابتدائی طاقتیں دو تھیں۔ یزدان و اہرمن کو وہ خالقِ خیر اور خالقِ شر سمجھتے تھے۔ صفِ اسلام میں آکر انہوں نے خدا کو خیر کا خالق اور انسان کو شر کا خالق قرار دیا اور تقدیر کا سرے سے انکار کیا۔ یہ قدریہ کہلائے۔ یہ اس امّت کے مجوسی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

القدریہ مجوس ھٰذہ الامۃ ان مرضوا فلا تعودوھم و ان ماتوا فلا تشھدوھم۔[۳]

ترجمہ۔ قدری لوگ اس امت کے مجوس ہیں اگر یہ بیمار پڑیں تو ان کی بیمار پرسی پر نہ جاؤ مر جائیں تو ان کے جنازہ پر نہ جاؤ۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں حضورؐ نے یہ بھی فرمایا:۔

"یہ دجّالی شیعہ ہوں گے اور خدا کا حق ہے کہ وہ اُن کا حشر دجّال کے ساتھ کرے۔"[۴]

یہ لوگ ساسانیوں کے عقیدہ نورین کے ساتھ صفِ اسلام میں آئے۔ شیعیت کی یہ اعتقادی ابتداء تھی۔ شیعہ علماء نے اپنے ان نظریات کو بھرپور علمی قوت سے استناد مہیا کیا۔ یہاں تک کہ شیعہ مذہب مدون ہو گیا اور اسلام کے مضبوط قلعے میں ایک بہت بڑی نقب لگ گئی۔

مشہور مستشرق A.J. Arbery لکھتا ہے:۔

مفتوح قوم کے عوام پرانے عقائد کے گرویدہ رہے اور نئے دین کو ریاکارانہ قبول کیا یہی

[۱] میراث ایران ص۱۵۴ [۲] ایضاً ص۱۵۷ [۳] سنن ابی داؤد جلد ۲ ص۲۴۴ [۴] ایضاً

وجہ ہے کہ جب موقع آیا تو انہوں نے مل جل کر اپنے پرانے مذہب سے رجوع کیا اور اس رجعت کے لیے ایران کے لوگ رہنماؤں کی کمی محسوس نہیں کرتے تھے۔[۱]

حافظ ابو القاسم علی بن الحسن بن ہبۃ اللہ ابن عساکر الدمشقی (۵۷۱ھ) کی کتاب تبیین کذب المفتری فیما نسب الی الامام ابی الحسن الاشعری کے مقدمہ میں دیکھئے:۔

وکان عدۃ من احبار الیھود و رھبان النصاریٰ موابذۃ المجوس اظھروا الاسلام فی عھد الراشدین ثم اخذوا بعدھم فی بث ما عندھم من الاساطیر۔[۲]

ترجمہ کئی یہودی علماء، اور عیسائی درویش اور مجوسی موبد خلفائے راشدین کے دور میں بظاہر اسلام لائے۔ پھر انہوں نے یہاں اپنے عقائد پھیلانے شروع کر دیئے۔

پروفیسر A.J. Arbery لکھتا ہے:۔

یہ دعوے درست ہے کہ شیعیت کی مذہبی دلالتیں ایرانی ہیں۔ . . . شیعیت کے اہم ترین مذہبی پہلوؤں پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ شیعہ علماء اور فضلاء اس بات کی سعی کرتے رہے ہیں کہ پرانے ادیان نورین کی روح کو ملحوظ رکھ کر اسلام کو وہ اقتدار اور استناد مہیا کیا جائے کہ یہ بے خطا ہے۔[۳]

سو اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں میں شیعیت اور خوارج کی نشأۃ علم کے ہاتھوں نہیں سیاسی اندھیریوں میں ہوئی ہے۔ تبیین کذب المفتری کے مقدمہ کے یہ الفاظ سونے سے لکھنے کے لائق ہیں:۔

و من الجلی انہ لا دخل للعلم فی نشأۃ الخوارج والشیعۃ بل ولدتھما العاطفۃ السیاسۃ ثم اندس فیھما خصوم الدین من الزنادقۃ فتطورتا اطوارًا شائنۃ۔[۴]

ترجمہ اور یہ بات کھلی حقیقت ہے کہ خوارج اور شیعہ کی پیدائش میں علم کا کوئی دخل نہیں۔ یہ دونوں سیاسی آندھی کی پیداوار ہیں۔ پھر ان میں وہ لوگ بھی گھس آئے جو دین کے دشمن تھے زندیق ـــ اور پھر ان کی دشمنی کئی پیرایوں میں آئی۔

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ شیعہ علماء اسلام کے متوازی نظریات (یہود و نصاریٰ اور مجوس ایران کے نظریات) کے حق میں کام کرتے رہے ہیں اور وہ اسلام میں ان بیرونی نظریات Foreign Wisdom کے لیے شروع سے ایسی راہ ہموار کرتے آئے کہ عربوں کے مقابلہ میں ایک مستقل مذہب شیعیت کے نام سے راہ پا سکے۔

[۱] میراث ایران ص۸ انگریزی ص۱۱۷ اردو [۲] تبیین کذب المفتری ص۱۰ [۳] میراث ایران ص۱۵۳ انگریزی [۴] تبیین کذب المفتری ص۱۷

سوال: اس وقت عربوں اور اسرائیل میں سیاسی ہدف کیا ہے؟ کیا اس کے پیچھے ماضی کی تلخیاں بھی کارفرما ہیں۔ کیا موجودہ کشمکش انہی وقائع کا سیاسی انتقام نہیں۔ اس کشمکش میں عیسائی کن کے ساتھ ہیں؟

جواب: یہودی انتہائی کینہ پرور قوم ہیں بنو اسرائیل شروع سے بنو اسماعیل کے متوازی ہو کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرونِ وسطیٰ میں عربوں کو جو عروج بخشا۔ اس کے انتقام کی آگ ابھی تک اُن کے سینوں میں بھڑک رہی ہے قرآن کریم میں انہیں مسلمانوں کی دشمن ترین قوم بتلایا گیا ہے:۔

لتجدن اشد الناس عداوة للذین آمنوا الیہود والذین اشرکوا (پ۷ المائدہ)

ترجمہ: تم پاؤ گے یہودیوں کو اور مشرکین کو مسلمانوں کے سخت ترین دشمن۔
یہ صرف مسلمانوں کے دشمن ہی نہیں پوری انسانیت کے دشمن ہیں۔
آکسفورڈ کنسائز ڈکشنری میں یہودی کی یہ تعریف کی گئی ہے[1]۔

A Jew is one who is a cheat and who practices all tricks and viles

ترجمہ: یہودی دھوکے باز اور مکار کو کہتے ہیں جو کمینگی کی حد تک ہر طرح کے حربے استعمال کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی تھی کہ یہودیوں کو عرب میں نہ رہنے دینا ـــــ حضرت عمرؓ نے اس حکم پر عمل فرمایا اور انہیں خیبر سے نکالا ـــــ یہ لوگ مسلمانوں میں سب سے زیادہ حضرت عمرؓ کے خلاف ہیں۔ شیعہ چونکہ انہی سے نکلے ہیں۔ اس لیے شیعہ کی سب سے زیادہ بر بھی حضرت عمرؓ کے خلاف ہے۔

سوال: خلفائے راشدینؓ کتنے صحابہ ہیں۔ ان کی خلافت مطلق خلافت تھی یا خلافت علیٰ منہاج النبوۃ اور بارہ خلفاء کون کون ہوئے۔ کیا ان سب کی خلافت خلافتِ نبوت رہی ہے یا صرف چار کی خلافت خلافت نبوت کہلاتی ہے؟
۲۔ صحابہؓ صرف دس جنتی ہیں یا باقی صحابہ بھی جنتی ہیں۔ کیا باقی صحابہ کے جنتی ہونے کی بھی کوئی دلیل موجود ہے؟ اگر ہے تو صرف دس بزرگوں کو عشرہ مبشرہ کیوں کہا جاتا ہے۔ صحابہ میں جو اختلاف ہوئے انہیں کھولنا اچھا ہے یا ان سے صرف نظر کرنا اس باب میں اہل السنۃ والجماعت کا مسلک کیا ہے؟

جواب: خلفائے راشدینؓ چار ہیں۔ انہیں ائمہ اربعہ بھی کہتے ہیں۔ ان کی خلافت مطلق حکومت نہیں خلافت

---

[1] Oxford Concise Dictionary

نبوت تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جس پیشگوئی میں بارہ مضبوط حکمرانوں کی خبر دی گئی ہے وہ مطلق حکمران ہیں۔ جن میں اچھے بُرے اور دونوں طرح کے ہو سکتے ہیں۔ ہاں غیر مسلموں کے مقابلے میں وہ مضبوط حکومت کے مالک ہوں گے۔ ان بارہ میں پہلے چار کی حکومت خلافت علیٰ منہاج النبوۃ تھی۔ حضرت حسنؓ کی حکومت تو راشدہ تھی۔ لیکن غیر تامہ تھی۔ آپ اس سے دستبردار ہو گئے تھے۔ حضرت امیر معاویہؓ کی حکومت بے شک ایک مضبوط حکومت تھی۔ نظامِ عدل کتاب و سنت کے موافق تھا۔ مگر آپ کا عقدِ حکومت استخلافاً نہیں صلحاً وجود میں آیا تھا۔ آپ کے بعد پھر عبدالملک بن مروان ایک مضبوط حکمران بنا۔ یہ چھ پہلے مضبوط حکمران ہیں۔ عبدالملک کی اولاد سے پھر چھ مضبوط حکمران ہوئے ـــــ یہ صحیح نہیں کہ بارہ حکمرانوں کی اس روایت میں ہر ایک کی حکومت عدل و انصاف اور قرآن و سنت پر مبنی بتلائی گئی ہے۔ خلفاء راشدین ان چھ میں سے چار ہیں جو آیت استخلاف کا مصداق ہیں۔

ابوبکر باقلانی (۴۰۳ھ) اہل السنۃ والجماعت کے تعارف میں لکھتے ہیں:۔

یعرفون حق السلف الذین اختارھم اللہ سبحانہ لصحبۃ نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم ویاخذون بفضائلھم ویمسکون عما شجر بینھم صغیرھم وکبیرھم ویقدمون ابابکر ثم عمر ثم عثمان ثم علیاً رضوان اللہ علیھم ویقرون انھم الخلفاء الراشدون المھدیون افضل الناس کلھم بعد النبیؐ ویصدقون بالاحادیث التی جاءت عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم[1]

ترجمہ: اہل سنت والجماعت ان اسلاف کا حق پہچانتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے لیے پسند کیا ہوا تھا۔ ان کے فضائل سے وہ تمسک کرتے ہیں اور جو ان میں اختلافات چلے چھوٹوں میں یا بڑوں میں وہ ان اختلافات سے اپنے آپ کو دور رکھتے ہیں اور حضرت ابوبکرؓ کو سب سے مقدم سمجھتے ہیں پھر حضرت عمرؓ کو پھر حضرت عثمانؓ کو اور پھر حضرت علی رضوان اللہ علیہم کو اور اقرار کرتے ہیں کہ یہی خلفائے راشدین و مہدیین ہیں اور یہ سب لوگوں سے حضورؐ کے بعد افضل ہیں اور اہل سنت ان تمام احادیث کو سچ مانتے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم تک پہنچی ہیں۔

۲۔ صحابہؓ سب کے سب جنتی ہیں بشرطیکہ خاتمہ ایمان پر ہو۔ ایمان پر خاتمہ کس کس کا ہو گا۔ یہ بات اللہ کے علم میں ہے۔ ہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن جن صحابہ کو جنت کی بشارت دے دی یا معراج کی رات

---

[1] کتاب التمہید ص ۲۹۵

ان کے محلات جنت میں دیکھے وہ سب قطعی جنتی ہیں۔ وہ دس صحابہؓ جنہیں آپؐ نے ایک ہی مجلس میں جنتی ہونے کی بشارت دی عشرہ مبشرہ کہلاتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی متعدد صحابہؓ ہیں جن کے آپؐ نے جنتی ہونے کے نشان بتلائے۔ حضرت بلالؓ کے قدموں کی جنت میں آواز سنی۔

۳۔ صحابہؓ میں حق کا نشان یہی ائمہ اربعہ ہیں جنہیں خلفائے راشدین کہا جاتا ہے۔ جہاں صحابہ میں اختلاف ہوتے ان ابواب میں شرع کا تقاضا ہے کہ بحث نہ کی جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے سختی سے منع فرمایا ہے۔ حضورؐ کے حکم کے خلاف اختلافاتِ صحابہؓ پر بحث کرنا اور کسی کو برا بھلا کہنا کوئی تاریخ کی خدمت نہیں، شرعاً ایک بہت بڑا گناہ ہے۔

حافظ ابن عساکر الدمشقی (۵۷۱ھ) صحابہؓ کے بارے میں اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ ان الفاظ میں لکھتے ہیں:۔

وندین بحب السلف الذین اختارھم اللہ بصحبۃ نبیہ ونثنی علیھم بما اثنی اللہ علیھم ونتولاھم ونقول ان الامام بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر وان اللہ اعز بہ الدین واظھرہ علی المرتدین وقدمہ المسلمون للامامۃ کما قدمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم للصلوۃ ثم عمر بن الخطاب ثم عثمان نضر اللہ وجھہ قتلہ قاتلوہ ظلماً وعدواناً ثم علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فھؤلاء الائمۃ بعد رسول اللہ وخلافتھم خلافۃ النبوۃ ونشھد للعشرۃ بالجنۃ الذین شھد لھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالجنۃ ونتولی سائر اصحاب النبیؐ ونکف عما شجر بینھم وندین ان الائمۃ الاربعۃ راشدون مھدیون فضلاء لا یوازیھم فی الفضل غیرھم ونصدق بجمیع الروایات التی تثبتھا اھل النقل[1]

ترجمہ۔ ہم سلف کی محبت کا دین رکھتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی صحبت کے لیے چنا تھا اور ہم ان کی صفت و ثنا کرتے ہیں جیسے اللہ نے ان کی صفت و ثنا کی اور ہم ان سے تولا کا تعلق رکھتے ہیں (تبرا کا نہیں) اور ہم کہتے ہیں کہ حضورؐ کے بعد امام برحق حضرت ابوبکرؓ تھے اللہ نے ان کے ذریعہ دین کو غلبہ دیا اور انہیں مرتدین پر غالب کیا اور مسلمانوں نے انہیں اسی طرح خلافت میں آگے کیا جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نماز میں آگے کیا تھا۔ پھر امام برحق حضرت عمرؓ ہیں پھر حضرت عثمانؓ اللہ آپ کے چہرہ کو اور رونق بخشے۔ آپ کو آپ کے قاتلوں نے ظلم اور تعدی سے قتل کیا۔ پھر امام برحق حضرت علی بن ابی طالبؓ

---

[1] تبیین کذب المفتری صفحہ ۱۶۰، صفحہ ۱۶۱

ہیں۔ سو حضورؐ کے بعد یہی ائمہ ہیں اور ان کی حکومت خلافتِ نبوت تھی۔ اور ہم ان دس صحابہؓ کے لیے جنت کی شہادت دیتے ہیں جن کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی شہادت دی اور ہم سب صحابہؓ سے تولا (دوستی) کا تعلق رکھتے ہیں اور ان میں جو اختلافات چلے ان سے اپنے آپ کو (اپنی زبان اور قلم کو) روکتے ہیں اور ہم اللہ کے حضور اقرار کرتے ہیں کہ یہ ائمہ اربعہ ہی راشدون ہیں ہدایت یافتہ ہیں اور علم و فضل کا پیکر ہیں۔ کوئی بھی فضیلت میں ان کے برابر کا نہیں اور ہم ان تمام احادیث کو مانتے ہیں جنہیں محدثین نے ثابت مانا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب۔

سوال: مسلمانوں میں جو اختلاف چلے اور طرح طرح کے فرقے بنے۔ آپ نے تقریباً ان سب کے ساتھ مناظرے اور مباحثے کئے ہیں۔ اپنے تجربات کی روشنی میں بتلائیں کہ ان سب میں آپ نے جھوٹ بولنے والا کسے پایا۔ اگر کسی کو مسئلہ سمجھ میں نہ آئے یہ اور بات ہے لیکن جھوٹ بولنے والا تو بدنیت ہوتا ہے؟

جواب: حضرت علی المرتضیٰؓ کے شاگردوں میں شریک بن عبداللہ بن ابی تمر (ھ) معروف راوی ہے۔ شریک سے محمد بن سعید اصفہانی روایت کرتا ہے۔ آپ اپنا حاصلِ مطالعہ یہ بتاتے ہیں:۔

احمل العلم عن کل من لقیت الا الرافضۃ فانھم یضعون الحدیث ویتخذونہ دیناً[1]

ترجمہ۔ میں جس سے بھی ملا اس سے روایت لے لیتا ہوں سوائے رافضیوں کے کیونکہ یہ حدیثیں وضع کرتے ہیں اور اس وضعِ احادیث کو دینداری ٹھہراتے ہیں۔

اور یہ صرف شریک کی ہی رائے نہیں۔ حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:۔

ان العلماء کلھم متفقون علی ان الکذب فی الرافضۃ اظھر منہ فی سائر طوائف اھل القبلۃ[2]

ترجمہ۔ علماء سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ اہلِ قبلہ کے جتنے گروہ اور فرقے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ جھوٹ ان رافضیوں میں ہی پایا جاتا ہے۔

احقر اپنے تجربات اور مشاہدات کی رو سے حافظ ابن تیمیہؒ سے پوری طرح متفق ہے اور لوگ تو جھوٹ بولتے ہوں گے اسے گناہ سمجھ کر اور یہ بولتے ہیں اسے عبادت سمجھ کر۔

---

[1] منہاج السنۃ جلد ۱ صفحہ ۳۸ [2] ایضاً صفحہ ۴۲

سوال : اہل السنۃ والجماعۃ کے شیعہ سے اختلافات قطعی اور اصولی ہیں یا ظنی اور فروعی۔ شافعیہ سے اختلافات اصولی ہیں یا فروعی اور بریلویوں سے اختلافات کس درجے کے ہیں ؟

جواب : شیعہ اور معتزلہ سے ہمارے اختلافات قطعی اور اصولی ہیں۔ حافظ سبکیؒ (۷۷۱ھ) لکھتے ہیں :-

ان خطاء المعتزلی والرافضی قطعی والمسئلۃ قطعیۃ ۔[1]

ترجمہ۔ معتزلی اور رافضی کی (اعتقادی) غلطی قطعی درجے کی ہے۔ (جس میں دوسری رائے کا کوئی احتمال نہیں) اور مسئلہ زیر بحث قطعی درجے کا ہے۔

شافعیہ اور مالکیہ سے اختلاف فروعی اور سکولی ہے ان کا اپنا ہے۔ فرقہ اہلحدیث سے اختلاف ایسا نہیں جیسا شافعیہ سے ہے۔ شافعیہ اپنے طریقے کے برعکس طریقے کو بھی صحابہؓ کی ایک راہ عمل سمجھتے ہیں۔ اسے باطل نہیں کہتے لیکن اہلحدیث اپنے طریقے کے خلاف دوسرے طریقوں کو غلط سمجھتے ہیں گو وہ بعض صحابہؓ کا عمل ہی کیوں نہ ہو۔ اس اختلافِ مسلک میں جو لوگ صحابہؓ تک کو باطل پر کہہ دیں، اُن سے اہل سنت کا اختلاف، فروعی درجے کا نہیں اصولی درجے کا بن جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ شافعیہ مالکیہ اور حنابلہ حنفیہ کو کبھی باطل پر نہیں کہتے۔ اس جسارت پر (بعض صحابہؓ کو باطل پر کہنے سے) اہلحدیث شیعہ کے قریب ہو جاتے ہیں۔ ہاں جو حضرات یہ جرأت نہیں کرتے کہ اپنے سے اختلاف کرنے والوں کو وہ باطل پر کہیں ان سے اختلاف فروعی ہو سکتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ ہمارا شیعہ سے اختلاف اصولی درجے کا ہے، شوافع و حنابلہ سے سکولی درجے کا اور بریلوی دیوبندی اختلاف فضولی درجے کا ــــــ جس کے پس پشت ضد اور جہالت کے سوا کچھ نہ ملے گا۔

واللّٰہ اعلم وعلمہ اتم واحکم

سوال : جنگ جمل میں حضرت طلحہؓ و زبیرؓ یا حضرت علیؓ کیا جنگ کے ارادہ سے آئے تھے۔ اس موضوع پر کسی غیر جانبدار محاکمے کی ضرورت ہے۔ اہل سنت اور شیعہ کے علاوہ کیا کسی کی تحقیق مل سکتی ہے ؟

جواب : خیاط معتزلی سے تو آپ واقف ہوں گے۔ ان کی کتاب الانتصار میں دیکھ لیجیے :-

قد جاءت الاخبار عن الزبیر انہ لم رای الحرب یوم الجمل قال سبحان اللّٰہ ما ظننت ان فیما جئنا لہ یکون قتال وقد روی عن علی بن ابی طالب انہ قال

[1] طبقات شافعیہ جلد ۱ ص ۳۲

ارجو ان اکون انا وطلحۃ والزبیر من الذین قال اللّٰہ ونزعنا ما فی صدورہم من غل اخوانا علی سرر متقابلین قال فلو کان طلحۃ والزبیر خرجا علیہ وجاء ایحاربانہ ویریدان قتلہ لما قال فیہما ہذا القول۔[1]

ترجمہ۔ روایات میں آیا ہے کہ حضرت زبیرؓ نے جمل کے دن جب جنگ کے آثار دیکھے تو فرمایا، سبحان اللّٰہ میرا تو یہ خیال نہ تھا کہ ہم جس بات کے لیے آئے ہیں وہ لڑائی ہو گی ــــــ اور حضرت علیؓ سے بھی منقول ہے آپ نے کہا مجھے امید ہے میں اور طلحہؓ اور زبیرؓ ان لوگوں میں سے ہوں گے جن کے بارے میں خدا نے کہا ہے۔ ونزعنا ما فی صدورہم من غل (پ ۱۴ الحجر ع ۴) اور ہم نے ان کے سینوں سے سب بُوجھ کھینچ لیے۔) اگر طلحہؓ اور زبیرؓ نے حضرت علیؓ پر چڑھائی کی ہوتی اور آپ سے لڑنے آئے ہوتے اور ان دو کا آپ کو قتل کرنے کا قصد ہوتا تو حضرت علیؓ کبھی یہ بات نہ فرماتے۔

سو اس میں کوئی شک نہیں جنگ جمل اپنی ابتدائی وضع میں ایک مجلس مشاورت تھی جسے سبائیوں نے دونوں طرف گھس کر ایک جنگ کی شکل دے دی۔ حضرت طلحہ رضی اللّٰہ عنہ سے منقول ہے کہ آپ اختلاف کو شوریٰ میں حل کرنا چاہتے تھے۔ واللّٰہ اعلم بالصواب

خالد محمود عفا اللّٰہ عنہ

سوال : پندرہ روزہ "المنتظر" لاہور جو غالباً علامہ علی الحائری کے سابق مرکز سادات گنج وسن پورہ سے شائع ہوتا ہے۔ اس کی ۵ر فروری ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں ہفت روزہ "دعوت" پر بہت جرح کی گئی ہے۔ اور "دعوت" پر یہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ اس نے پنج تن کے مفہوم متعارف کو بدل ڈالا ہے۔ یہاں سرگودہا میں اس پر بہت لے دے ہو رہی ہے۔ مطلع کریں کہ آپ سے پہلے بھی کسی شخص نے پنج تن کی اصطلاح میں حضرات خلفائے راشدینؓ کو داخل کیا ہے یا یہ صرف مرکز تنظیم اہلسنت کی اختراع ہے ؟

راقم الحروف ان دنوں صاحب فراش ہے۔ انشاء اللّٰہ چند دنوں تک بصورت صحت لاہور حاضر ہو گا۔ لیکن اس سوال کا جواب "دعوت" کے آئندہ شمارے میں ضرور آجانا چاہیئے۔ یہاں کے بعض شیعہ بڑے دعویٰ سے کہہ رہے ہیں کہ علامہ خالد محمود صاحب سے پہلے کسی نے پنج تن میں حضرات خلفائے راشدینؓ کو شمار نہیں کیا ؟

سائل : ادریس احمد شبلی اندرون کوٹھی متصل خالقیہ ہائی سکول سرگودھا شہر

[1] کتاب الانتصار للخیاط ص ۵

جواب : یہ بات غلط ہے کہ پنج تن کی یہ اصطلاح صرف مرکز تنظیم کی ایجاد ہے۔ اہل سنت اور شیعہ حضرات میں جہاں کئی اور اصولی اختلافات ہیں وہاں اس اصطلاح کے مفہوم میں بھی تعبیری اختلاف ہے۔ اہلسنت کی اصطلاح میں پنج تن سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت صدیق اکبرؓ، حضرت عمر سیدنا فاروق اعظمؓ، حضرت عثمان ذو النورینؓ اور حضرت علی المرتضیٰؓ ہیں اور جن پانچ بزرگوں کے لیے شیعہ حضرات یہ اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ اہل سنت اس اعتبار سے صرف ان پانچ تن کو ہی بزرگ نہیں مانتے۔ بلکہ ان کے نزدیک بارہ کے بارہ امام ہی پاک اور بزرگ ہیں اور اس وجہ سے وہ ان پانچ حضرات کیلئے پنج تن کی تقیید نہیں کرتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ کے لیے پنج تن کی اصطلاح مرکز تنظیم کے قائم ہونے سے بہت پہلے بھی رائج تھی۔ امرتسر سے ۱۹۱۷ء میں "خلافت محمدیہ" نامی کتاب شائع ہوئی تھی۔ اس میں فاضل مؤلف رقمطراز ہیں:-

"شیعہ سنی میں پنج تن کی اصطلاح ہے۔ ان کے نزدیک پنج تن سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور حسنینؓ ہیں۔ ہمارے نزدیک پنج سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے اربعہ ہیں۔"[1]

علاوہ ازیں ہم ایک غیر جانبدار شہادت بھی اس دعوے کے اثبات میں پیش کرتے ہیں کہ حضرات خلفائے راشدینؓ عرفِ عام کے مطابق ہمیشہ پنج تن میں داخل اور شامل سمجھے گئے ہیں۔ رائے بہادر کنہیا لال کی مشہور کتاب "یادگار ہندی"، جو اپنی شہرت اور عظمت میں محتاجِ تعارف نہیں۔ اس میں خلفائے راشدینؓ کے تذکرے کے بعد لکھا ہے ؎

بایں پنج تن شد خلافت تمام　　　که از نام شاں یافت اسلام نام[2]

اس میں صریح طور پر پنج تن کا لفظ حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کے لیے استعمال ہے۔ ناحق بغض و عناد اور شر و الحاد کا کوئی علاج نہیں۔ ہفت روزہ "دعوت" کے ۱۷ر مئی ۱۹۶۲ء کے شمارے میں اس مسئلے پر سیر حاصل تبصرہ موجود ہے۔ مزید تفصیل کے لیے اس کی طرف مراجعت کی جائے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

کتبہٗ: خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال : حضور سرکارِ مدینہؐ نے فرمایا تھا "من کنت مولاہ فعلی مولاہ"، جس کا مولا میں ہوں علیؓ بھی اس کا مولا ہے۔ کیا یہ حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں موجود ہے۔ التماس ہے کہ ہفت روزہ "دعوت" میں اس کی تحقیق شائع کریں؟　　　سائل۔ مقصود احمد از چنیوٹ

---

[1] خلافت محمدیہ صہ ۲۹/۳۰ مطبع برقی امرتسر [2] یادگار ہندی صہ ۸۱

جواب : یہ روایت صحیح بخاری اور مسلم میں موجود نہیں۔ شیعہ حضرات محض پراپیگنڈے کے لیے اور اس روایت کے ضعف پر پردہ ڈالنے کے لیے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا نام لیتے ہیں۔ ورنہ حق یہ ہے کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہونا تو درکنار یہ روایت کسی اور کتاب میں بھی سندِ صحیح اور ثقہ راویوں سے مروی نہیں۔ رئیس المحدثین حافظ زیلعی (متوفی ۷۶۲ھ) اپنی مایۂ ناز کتاب نصب الرایہ میں بسم اللہ بالجہر کی بحث میں لکھتے ہیں:-

واحادیث الجهر وان كثرت رواتها لكنها كلها ضعيفة وكم من حديث كثرت رواته وتعددت طرقه وهو حديث ضعيف كحديث الطير وحديث الحاجم والمحجوم وحديث من كنت مولاه فعلي مولاه قد لا يزيد كثرة الطرق الا ضعفا۔[1]

یعنی نماز میں بسم اللہ جہر سے پڑھنے کی روایات اگرچہ بہت ہیں لیکن وہ سب کی سب ضعیف ہیں۔ اور یہ اسی طرح ہے جیسے کہ حدیث من کنت مولاہ فعلی مولاہ۔ بلکہ بعض اوقات کثرت طرق بجائے اس کے کہ نقصان ضعف کو جبر کرے اور پورا کر دے اس ضعف کو اور بڑھا دیتا ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ اس روایت کے متعلق لکھتے ہیں:-

فلا يصح من طريق الثقات اصلا۔[2]

یعنی یہ روایت ثقہ اور معتبر طریقے سے ہرگز ثابت نہیں۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

کتبہٗ: خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال : ہمارے چند دوستوں میں دو مولوی صاحبان کے متعلق اختلاف ہے۔ ایک صاحب نعتیہ کلام کی قوالی بھی سنتے ہیں، سر بھی ہلاتے ہیں اور صلوٰۃ و سلام بڑے پُر رونق انداز میں پڑھتے ہیں۔ یہاں پر یہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ یہ صاحب بڑے عاشقِ رسول ہیں۔ وعظ کہنے اور سلام پڑھنے کے لیے بڑی بڑی فیسیں اور نذرانے وصول کرتے ہیں۔ اُسے تاجدارِ مدینہؐ کی نیاز سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے مولوی صاحب بڑے خاموش طبع اور پرہیزگار قسم کے ہیں۔ عام دعوتوں میں بھی نہیں جاتے کہ مالِ حرام کا اندیشہ بہت ہے۔ وعظ پر اُجرت بھی نہیں لیتے۔ اور دیں بھی تو کہتے ہیں کہ غریبوں اور مسکینوں کو دینے میں زیادہ ثواب ہے۔ مگر ان کی مجلس میں کوئی رونق اور نغمہ و سرود کی کیفیت نہیں ہوتی۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور عقیدت میں کون آگے ہے۔ کچھ لوگ پہلے صاحب کو عاشقِ رسول کہتے ہیں اور کچھ حضرات دوسرے مولوی صاحب کو عاشقِ سنت بتلاتے ہیں۔ مطلع کریں کہ ان حالات میں اُن میں سے کون سے صاحب جذبۂ محبت میں آگے ہیں؟ محمد شریف لاہور

---

[1] نصب الرایہ جلد ۱ صہ ۳۶۰ مطبوعہ مصر [2] منہاج السنۃ جلد ۴ صہ ۸۶ مطبوعہ مصر

جواب: احساسِ محبت ایک دلی کیفیت، اور ایک جذبۂ قربت، کا نام ہے اور یہ ایک امر باطنی ہے۔ جس کی ظاہری نشاندہی بہت مشکل ہے۔ ہاں علمائے محققین اور علمائے عارفین نے "حب اور عشق مصطفےٰ" کا جو معیار بتلایا ہے اسے پیش کر دیا جاتا ہے۔ اس معیار پر آپ، خود دیکھ لیں کہ ہر دو حضرات میں سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبہ قربت پر کون فائز ہے۔ حضرت، علامہ سیدنا ملا علی قاری علیہ الرحمۃ ربہ الباری شرح عین العلم میں نقل فرماتے ہیں :-

علامة حب النبي حب السنّة و علامة حب السنة حب الاٰخرة و علامة حب الاٰخرة بغض الدنيا ان لا ياخذ منها الا زاداً يبلغهٗ الى العقبیٰ[1]

ترجمہ۔ حبِ رسول کی علامت یہ ہے کہ سنّت سے محبت ہو (یہ نہیں کہ بدعات کی رونق پر فریفتہ ہو) اور سنّت سے محبت کی علامت آخرت کی محبت ہے اور آخرت کی محبت کی علامت یہ ہے کہ دنیا سے بغض ہو اور بغضِ دنیا کی علامت یہ ہے کہ دنیا سے صرف اتنا کچھ ہی لے کہ اس کی آخرت تک پہنچنے کے لیے ضرورتیں پوری ہو سکیں (یہ نہیں کہ بڑی بڑی فیسیں لے کر دولت جمع کی جائے)۔

حضرت ملا علی قاریؒ اہلسنت کے پیشوا اور حنفیہ کرام کے مایۂ ناز مقتدا ہیں ان کے قبول کردہ اس فیصلے کے خلاف محبتِ رسول کا اور کوئی معیار مقرر کرنا ہرگز مناسب نہیں۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال

سوال: امام حسینؓ کے شمر ذی الجوشن کس سلسلہ سے ماموں ہیں۔ پوری وضاحت کی جائے؟

۲۔ شیعہ حضرات کے نزدیک چھ سال کے بچے کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے یا نہ؟

سائل۔ محمد فاروق عثمان علی صدیق از عباسی منزل تلہ گنگ

جواب: حضرت امام حسینؓ کی سوتیلی والدہ ام البنین بنت حزام (حضرت علی المرتضیٰؓ کی چوتھی بیوی تھیں) قبیلہ بنی کلاب میں سے تھیں۔ ان کا نکاح حضرت عقیلؓ کی تجویز سے ہوا تھا حضرت علیؓ نے عقیلؓ سے کہا تھا کہ :-

برائے من زنی خطبہ کن کہ برادرانش از شجعان عرب باشند۔[2]

یعنی میرے نکاح کے لیے کوئی ایسی عورت تجویز کرو جس کے بھائی عرب کے بڑے بہادروں میں سے ہوں۔ اس پر حضرت عقیلؓ نے یہ تجویز فرمائی تھی۔ شمر ملعون انہی میں سے تھا اور بنی کلاب میں سے تھا۔ انہی میں سے حضرت عباسؓ علمدار تھے جو حضرت حسینؓ کے بھائی اور حضرت علیؓ کے بیٹے تھے۔ شمر اس رشتہ کے

[1] شرح عین العلم جلد ۲ صفحہ ۲۷۵ طبع مصر [2] عمدۃ الطالب و منتخب التواریخ صفحہ ۱۲۱ ایران

تعلق سے اپنے بھانجوں کے لیے ابن زیاد سے امان بھی لکھوا لایا تھا جس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ بہرحال اس لحاظ سے یعنی سوتیلی والدہ حضرت ام البنین کے واسطہ سے شمر ذی الجوشن حضرت حسینؓ کا رشتہ میں ماموں تھا۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

۲۔ حضرت امام جعفر صادقؒ اپنے آبائے کرام سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:-

يورث الصبي و يصلى عليه اذا سقط من بطن امه فاستهل صارخاً و اذا لم يستهل صارخاً لم يورث و لم يصل عليه۔[1]

ترجمہ۔ وہ بچہ جو ماں کے پیٹ سے نکلے اور اس کی آواز سنائی دے جائے تو اس کے لیے وراثت بھی ثابت ہوگی اور اس کی نمازِ جنازہ بھی پڑھی جائے گی اور اگر اس نے اس دنیا میں سانس نہیں لیا تو نہ اس کے لیے وراثت ثابت ہوگی اور نہ اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی۔

حضرت علی المرتضیٰؓ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:-

يصلى عليه على كل حال الا ان يسقط غير تمام۔[2]

ترجمہ۔ ہر حال میں میت کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے ماسوائے اس کے کہ ولادت ہی ناتمام ہو۔

حضرت علی المرتضیٰؓ کے نواسے اور حضرت ام کلثومؓ کے بیٹے حضرت زیدؓ (جب کہ ماں بیٹے کا انتقال ایک ہی وقت میں ہوا تھا) کی نمازِ جنازہ اسی ضابطہ کے تحت والدہ کے جنازہ کے ساتھ اکٹھی پڑھی گئی تھی تحفۃ العوام میں جو یہ لکھا ہے کہ نمازِ جنازہ ہر بالغ میت پر واجب ہے اور اس بچے کی جو چھ برس کا ہو چکا ہو تو اس سے مراد غالباً درجہ وجوب ہے۔ یہ نہیں کہ اس سے چھوٹے بچے کی نمازِ جنازہ جائز ہی نہیں۔ تحفۃ العوام کا یہ فتوےٰ ویسے بھی نجف اشرف کے مجتہد ملا کاظم خراسانی کے فتویٰ کے صریح خلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

نمازِ میت ہر میت شیعہ اثنا عشری پر مطلقاً واجب ہے خواہ شہید ہو خواہ قصاص میں مارا گیا ہو یا خود اس نے اپنے آپ کو مار ڈالا ہو یا ختنہ نہ کیا گیا ہو یا ان کے علاوہ ارباب کبائر میں سے ہو، اسی طرح سنی پر واجب ہے خواہ تقیہ کی حالت میں ہو خواہ نہ ہو اور کفار پر نمازِ میت جائز نہیں، خواہ کافر اصلی ہو یا غیر اصلی اور جو مُردہ بلادِ اسلام میں پایا جائے وہ مسلمان کے حکم میں ہے۔ اسی طرح بچہ اور دیوانہ جو کہ مومن یا مومنہ سے پیدا ہوئے ہوں مسلمانوں کے حکم میں ہیں۔[3]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ تحفۃ العوام کے مجتہدین غلط اور تفرقہ انگیز راہ پر چل نکلے ہیں جنازہ ہر مسلمان

[1] تہذیب الاحکام جلد ۱ صفحہ ۲۱۴ [2] ایضاً [3] ذخیرۃ العباد فتاوےٰ مجتہد اعظم نجف اشرف صفحہ ۱۰۱

کا پڑھنا چاہیئے خواہ بچہ ہو یا بڑا۔ اس سے حضرت علیؓ کے ارشاد کی رُو سے صرف وہی بچہ مستثنیٰ ہے جو ماں کے پیٹ میں مر گیا ہے اور جس نے کہ اس دُنیا میں ایک بھی سانس نہ لیا ہو۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: ا۔ بخدمت جناب علامہ صاحب، السلام علیکم۔

آپ نے فقیر والی ضلع بہاول نگر میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اہلبیت کی محبت خاتمہ بالخیر کی ضمانت ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو شیعہ لوگ اصحاب کرام کو بُرا بھلا کہتے ہیں اور اہلبیت سے پُوری طرح محبت کرتے ہیں، کیا واقعی خاتمہ بالخیر سے مشرف ہوں گے؟ سائل: طالب حسین از جھنگ

جواب: مجھے یاد نہیں کہ میں نے فقیر والی میں کوئی ایسی بات کہی ہو۔ ہاں بہاول نگر میں ایک درس کے دوران میں کسی نے کچھ اس قسم کی بات پوچھی تھی:-

مہربانم! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اہلبیت سے پُوری طرح محبت کرتا ہو اور پھر وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو بُرا بھلا کہے۔ اہلبیت سے مخلصانہ محبت کا تقاضا ہی یہ ہے کہ ان تمام ذواتِ قدسیہ اور نفوس کریمہ سے بھی محبت ہو، جنہیں اہلبیتِ اطہار نے اپنا بزرگ، امام، دوست یا رفیق سمجھا۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ اہل بیت کی سچی محبت خاتمہ بالخیر کی ضمانت ہے۔ اگر کوئی بدعقیدہ بھی اہل بیت سے سچی محبت رکھے تو موت سے پہلے رب العزت اسے صحیح الاعتقاد بنا دیں گے۔

میرا نظریہ تو یہ ہے کہ اگر کوئی شیعہ اہل بیت سے سچی اور مخلصانہ محبّت رکھتا ہے تو اس کی موت اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک کہ وہ اہل سنّت والجماعت نہ ہو جائے اور ہر محبِ اہلبیت کو مرنے کے وقت اہلسنّت وجماعت کے عقیدے کو ہی تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ شیعہ حضرات کی اپنی معتبر اور معتمد کتاب جامع الاخبار فصل ۱۳۱ میں یہ حدیث موجود ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:-

من مات علیٰ حب اٰل محمد مات علی السنّۃ والجماعۃ۔[۱]

ترجمہ۔ جو شخص حضرات آلِ محمد کی محبت ساتھ لے کر مر جائے اس کی موت اہلسنّت والجماعت کے عقیدے پر ہی ہوتی ہے۔

حاصل اینکہ ایسے شخص کی روح قبض نہیں ہوتی جب تک کہ وہ عقیدہ اہلسنّت والجماعت کو قبول نہ کر لے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] جامع الاخبار فصل ۱۳۱ مطبوعہ نجف اشرف

سوال ۲: ا۔ کیا سیّدنا علی المرتضیٰؓ کی نماز قضا ہونے پر سورج لوٹ آیا تھا۔ آپ کی یہ کرامت کس کتاب میں درج ہے اور محدثین کے نزدیک اس کا کیا درجہ ہے؟

۲۔ کتاب مدارج النبوت کس کی تصنیف ہے۔ نیز تحریر فرمائیں کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا محدثین میں کیا درجہ ہے؟ سائل: (مولوی) محمد طاہر لودیانوی چک ۱۵۱ ج.ب ماموں ضلع جھنگ

جواب: سیدنا حضرت علی المرتضیٰؓ کی نماز قضا ہونے پر سورج کا لوٹ آنا اگر روایتاً صحیح بھی ہو تو یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے۔ حضرت علی المرتضیٰؓ کی کرامت نہیں۔ حافظ ابی بشر دولابیؒ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک حضرت علیؓ کی گود میں تھا اور وحی نازل ہونی شروع ہو گئی۔ اسی اثنا میں حضرت علیؓ کی نمازِ عصر قضا ہو گئی۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دُعا کی:-

اللّٰھم انک تعلم انہ کان فی حاجتک وحاجت رسولک فردّ علیہ الشمس۔

اس پر سورج پھر کچھ ظاہر ہوا اور حضرت علیؓ نے نماز ادا فرمالی۔ اس روایت سے ظاہر ہے کہ سُورج حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے واپس لوٹا۔ پس یہ حضورؐ کا معجزہ شمار ہو گا اسے حضرت علیؓ کی کرامت کہنا صحیح نہیں۔ قاضی عیاضؒ نے یہ روایت، امام طحاوی کی نقل سے پیش کی ہے جو مشکل الآثار میں موجود ہے۔ سیّدنا مُلّا علی قاریؒ نے شرح شفا میں اس کی تفصیل فرمائی ہے۔ یہ روایت قواعد محدثین کے مطابق صحیح نہیں اور اس کی کوئی ایسی سند نہیں ملتی جس میں وضاع وکذاب قسم کے راوی موجود نہ ہوں۔ مُلّا علی قاریؒ موضوعاتِ کبیر میں لکھتے ہیں:-

قال العلماء انہ حدیث موضوع ولم ترد الشمس لاحد وانما حبست لیوشع بن نون

کذا فی ریاض النضرہ۔[۱]

احقر کے نزدیک موضوع کی بجائے ضعیف کا حکم لگانا احتیاط کے قریب ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

۲۔ مدارج النبوت حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تصنیف ہے۔ اس کتاب کا درجہ معارج النبوت سے بہرحال اولیٰ اور اعلیٰ ہے۔ معارج النبوت احقر کے نزدیک پایۂ اعتبار سے ساقط ہے اور اس کا مصنف رفض باطن کا شکار ہے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ محدثین ہند میں نہایت ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ مشکوٰۃ کی عربی شرح "لمعات التنقیح"، اور فارسی شرح اشعۃ اللمعات آپ کی ہی تصنیفات ہیں۔ علاوہ ازیں "التبیان فی ادلۃ مذہب الامام ابی حنیفۃ النعمان"، آپ کی ایک اہم کتاب ہے۔ آپ حضرت شیخ عبدالوہاب المتقی اور حضرت امام مُلّا علی قاریؒ کے شاگرد تھے اور آپ کی وفات ۱۰۵۲ھ میں ہوئی۔

---

[۱] موضوعاتِ کبیر صـ۸۹ مطبع مجتبائی دہلی

آپ محدثین کے اس طبقے میں سے تھے جو راویوں کی جرح و تعدیل میں مشتغل ہونے کی نسبت احادیث کی شرح و تفصیل میں زیادہ منہمک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصنیفات میں راویوں کی تحقیق اور درجاتِ روایت کی تنقیح بہت کم پائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض علماء انہیں قبول روایت میں بہت متساہل اور فراخ دل شمار کرتے ہیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کہ ان کی شخصیت ان کے اندازِ تصنیف سے بہت ارفع و اعلیٰ اور بلند پایہ ہے۔ قبول روایت میں وہ نرم ہوں تو یہ امر دیگر ہے۔ لیکن اگر وہ کسی روایت پر باقاعدہ صحیح ہونے کا حکم لگائیں تو فنی اعتبار سے بلاشبہ لائق اعتماد ہے۔ ہاں تحقیق کے لیے ضروری ہے کہ محض ان کے نقل و قبول کو کافی نہ سمجھا جائے بلکہ اصول کی روشنی میں باقاعدہ حکم روایت دریافت کیا جائے اور راویوں کی پڑتال کر لی جائے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سید رضا حسین صاحب نے بہدوہی ضلع بنارس سے دریافت فرمایا ہے:

سوال: مسلمانوں کے جو بنیادی عقائد بتلائے گئے ہیں ان سے اور امنت باللہ وملئکتہ وکتبہ ورسلہ الخ اور کلمہ طیبہ وغیرہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہم کو عقیدہ توحید، عقیدہ رسالت، عقیدہ قیامت کی تعلیم دی گئی ہے۔ حشر میں ہم سے ان کے علاوہ اور کسی چیز کی پرسش نہیں ہوگی۔ قرآن مجید پر ہمارا ایمان ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ پھر کیا ضروری ہے کہ ہم حضرات خلفاء ثلاثہ کی تعریف و توصیف کے غلغلے بلند کر کے اپنے کو پریشانی و ملامت میں گرفتار کریں۔ جب ہم سے ان ہستیوں کے متعلق کچھ پرسش ہی نہیں ہوگی تو ہم اُن کے اچھا اور برا سمجھنے کے خواہ مخواہ مکلف کیوں بنیں؟

سید رضا حسین

جواب: معاف کیجئے گا ہمیں آپ کی تحریر اور نوعیت سوال دیکھ کر کچھ اور خیال دامن گیر ہو گیا ہے مگر چونکہ بظاہر تحقیق حق مقصود دکھائی دیتی ہے۔ اس لیے نیت پر بھی حملہ نہیں کیا جا سکتا۔

مگر مشکل یہ ہے کہ اتنے بڑے اور اہم مسئلہ کے اوپر ہمارے اس باب میں گنجائش کیسے ہوگی اور ہم اس کے اوپر مفصل طریقہ پر بحث کیسے کر سکیں گے بہر حال چند موٹی موٹی باتیں عرض کی جاتی ہیں:

حضرات خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو مومن بلکہ مومن کامل سمجھنا جزو ایمان اور مدار اسلام ہے۔ کوئی شخص اس وقت تک جب تک ان حضرات کو مسلمان نہ یقین کر لے نہ قرآن پر اس کا ایمان ہو سکتا ہے اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت اور آپ کی مقدس تعلیمات پر اس کے بغیر ایمان ہو سکتا ہے۔ ان حضرات کو اگر ہم اچھا نہ سمجھیں تو ان حضرات کا کچھ نہیں البتہ ہمارا ایمان خود خطرہ میں ہے۔

لفظی حیثیت سے آپ کا یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کہ قیامت کے دن ان حضرات کے متعلق ہم سے پرسش نہیں

ہوگی۔ مگر اصلیت منکشف ہو جانے کے بعد غور فرمائیے تو جب تک ہم ان حضرات کو مومن کامل اور ان کے اعمال جلیلہ کو واجب القبول والعمل خیال نہ کریں۔ نہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے عقیدہ پر ہمارا اکمل یقین ہو گا اور نہ قرآن مجید سے ہمارا کوئی تعلق باقی رہے گا۔ واقعات اور تاریخی معلومات و ذخائر سے قطع نظر کر کے ان حضرات کے اسلام کا انکار کرنے کے بعد نہ معلوم کتنی آیات قرآنیہ کو غلط ٹھہرانا پڑے گا اور نہ معلوم کتنے جلیل القدر ارشادات حضرت ختمی مرتبت مہمل ماننا پڑیں گے۔

درصورتیکہ نعوذ باللہ من ذلک یہ حضرات مومن کامل نہ یقین کئے جائیں۔ کون ہمیں اطمینان دلا سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں عموماً اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد سلطنت و خلافت اور حکومت مل جانے پر قرآن مجید اور عقائد اسلامیہ بے کم و کاست ہم تک پہنچے ہیں؟ یقیناً ایسی صورت میں ان چیزوں کا محفوظ رہ جانا بالکل بعید از عقل ہے۔

جب قرآن کریم ہی مشکوک و غلط ٹھہرا (العیاذ باللہ) تو پھر نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت باقی رہی اور نہ آپ کی تعلیمات۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جتنے صحابہ کرامؓ تھے بلا استثناء سب نے حضرات خلفائے ثلاثہ کو یکے بعد دیگرے اپنا پیشوا تسلیم کر کے ان کے ہاتھ پر برضا و رغبت بیعت کی تھی۔ اگر ان حضرات کو مومن کامل نہ سمجھا جاوے گا تو پھر تمام گروہ صحابہؓ پر حرف آتا ہے اور اگر کہیں اس پوری جماعت پر اس قسم کے لایعنی احتمالات قائم کر لیے گئے تو گویا جن ہاتھوں سے ہم کو قرآن ملا اور جن زبانوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی روایت ہم تک پہنچائی ہے اور جو اپنی چشم دید گواہی بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے نبوت کا دعوے فرمایا۔ فلاں فلاں معجزات دکھائے۔ یہ پاک تعلیمات ہم کو دیں۔ سب معرضِ خطر میں پڑ جائیں گی اور کسی چیز کا بھی اعتبار نہیں رہے گا۔

۲۔ حضرات خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مومن کامل ہونے کا انکار کر دینا بظاہر کچھ زیادہ دشوار امر نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن نظر غائر سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے انکار پر ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کرامؓ کی ہستیاں اور ان کا ایمان و اسلام معرضِ خطر میں پڑ جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں:

خلافت ایں بزرگواراں اصلی است از اصولِ دین تا وقتیکہ ایں اصل رامحکم نگیرند ہیچ مسئلہ از مسائل شرعیہ حاصل نشود۔

۳۔ قرآن مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جہاں دلائل نبوت بیان فرمائے گئے ہیں۔ وہاں ایک چیز بطور دلیل کے آپ کے شاگردوں کے کمالات بھی بیان کئے گئے ہیں اور جب یہ چیز مشکوک کر دی جائے گی۔

آن مجید کی یہ دلیل بالکل عبث اور مہمل ہو کر رہ جائے گی۔

۔ قرآن مجید میں بیسیوں جگہ ان حضرات کی تعریف کی گئی ہے ان کے کمالات بیان ہوئے ہیں ان کے اعمال
ں کو دستور اساسی قرار دیا گیا۔ ان کے مومن کامل ہونے کی شہادت دی گئی ہے۔ ان کی جاں نثاریوں اور
راستہ میں بڑی بڑی جاں فشانیوں کے واقعات کا اعتراف کر لیا گیا ہے۔
اگر ان حضرات کو مومن کامل نہ مانا جائے تو قرآن مجید کی یہ سب چیزیں غلط ہو جائیں گی جس کے دوسرے
ہو جائیں گے کہ قرآن کریم میں خلاف واقع باتوں کی بھرت لازم آئے گی۔
۔ ان حضرات کے مومن کامل نہ ماننے سے سارا مرکز ایمان خطرہ میں پڑ جاتا ہے جس کے بعد پھر نہ کوئی مسلمان
نا رہ سکتا اور کہلا سکتا ہے اور نہ درحقیقت اس کے ایمان و اسلام کو مستحکم کہہ سکتے ہیں۔
۔ ماسوا ان تمام احادیث و آیات کے بے کار ہو جانے کے جن کے قلوب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
شیدائی اور سچی محبت سے معمور ہیں۔ وہ تو ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس باغ کی
میں اپنی پوری عمر صرف کر دی اور جن پودوں کی سرسبزی و شادابی کے لیے ۲۳ سال تک آبیاری فرمائی۔ وہ
بے کار اور ایک لایعنی کوشش تھی۔ نہ آپ کی محبت کا ان پر اثر ہوا اور نہ ان میں ایمان و اسلام کی خوشبو
ونی، نہ انہوں نے اچھے کام کیے اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلے اور جو کچھ آنحضرت صلی
لیہ وسلم کے حسنات و کمالات تھے۔ وہ آپ کی وفات کے بعد آپ ہی کی وفات کے بعد آپ ہی کے ساتھ
ہو گئے۔ ان کا سلسلہ دراز نہ ہو سکا اور معلوم نہیں بات کہاں سے کہاں تک پہنچتی ہے۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ
ب باتوں کا لازم نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نہ ہم مسلمان کہے جا سکتے ہیں اور نہ ہمارے پاس اپنے اسلام کی کوئی دلیل
اور جو کچھ بھی ہے وہ مشکوک اور بالکل بے فروغ صرف ایک دعویٰ بلا دلیل ہے۔
۷۔ قرآن مجید نے نہ معلوم کتنی جگہ ان حضرات کی عجب دل کش اور دل نشین انداز میں تعریف فرمائی ہے۔
کے علاوہ ذرا باب الاحادیث پر غور فرمائیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خصوص صحابہؓ کے علاوہ دیگر
ہ کرامؓ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں۔ بس اس کو سن کر ڈرنا چاہیئے۔ اس سے زیادہ اور ہم کچھ نہیں کہنا
ہتے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

اللہ اللہ فی اصحابی لا تتخذوھم من بعدی غرضا من احبھم فبحبی احبھم
ومن ابغضھم فببغضی ابغضھم۔

یعنی میرے اصحاب سے محبت کرنا میری محبت کی وجہ سے ہے اور بغض رکھنا مجھ سے بغض رکھنے

کی وجہ سے ہے۔ یہ تو عام صحابہ کرامؓ کے متعلق تھا۔ باقی رہے خواص صحابہؓ تو ان کا کچھ اور ہی مقام تھا۔ حضرت ابوبکرؓ
صدیقؓ حضرت فاروق اعظمؓ کو اپنا وزیر فرمایا، ان کی اقتداء فرمانے کا حکم دیا، ان کے ساتھ وہ برتاؤ کیے جو ایک
دوست، ایک آقا، ایک بزرگ، ایک نبی اپنے متبع اور جگری دوست کے ساتھ کرتا ہے۔
۸۔ اکابر علمائے امت نے ان حضرات کے منکرین پر جو فتاویٰ دیئے ہیں مختصراً ان کو بھی ملاحظہ فرمائیے:۔
علامہ شامی اپنے مجموعہ رسائل میں فرماتے ہیں:۔

وفی التتارخانیہ ولو قال ابوبکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ لم یکن من الصحابۃ یکفر
لان اللہ تعالیٰ سماہ صاحبہ بقولہ اذ یقول لصاحبہ لا تحزن۔

یعنی اگر کسی شخص نے حضرت ابوبکرؓ کی صحابیت سے انکار کر دیا تو وہ کافر ہو گیا۔ اس لیے کہ خدا نے اُن کو
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صاحب کہا اور فرمایا ہے۔

اذ یقول لصاحبہ لا تحزن وفی الظھیریۃ ومن انکر امامۃ ابی بکر فھو کافر علی قول
بعضھم وقال بعضھم مبتدع والصحیح انہ کافر وکذا من انکر خلافۃ عمر بن خطاب۔

یعنی جس شخص نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی امامت و خلافت کا انکار کر دیا۔ اس کو بعض لوگ کافر کہتے ہیں
اور بعض لوگ بدعتی۔ اور اصح مذہب یہ ہے کہ وہ کافر ہے۔

وفی البزازیۃ ومن انکر خلافۃ ابی بکر رضی اللہ عنہ فھو کافر فی الصحیح
ومن انکر خلافۃ عمر رضی اللہ عنہ کافر فی الاصح۔

انہی علامہ شامی نے ابو محمد بن زید کی ایک روایت نقل کی ہے کہ جو شخص ابوبکر صدیقؓ، حضرت فاروق اعظمؓ
حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علی المرتضیٰؓ کے متعلق یہ عقیدہ رکھے کہ وہ کافر یا گمراہ تھے اس پر حکم قتل ہے۔ بہرحال
فقہاء کی رائے یہی ہے گو احوط متکلمین کا قول ہے۔
الغرض ان تمام مقدمات سے لازمی طور پر نتیجہ برآمد ہو جاتا ہے کہ بغیر حضرات خلفائے ثلاثہ کے مومن
کامل مانے ہوئے نہ صحابہ کرامؓ کا ایمان و اسلام ثابت ہوتا ہے اور نہ قرآن کے تحفظ کا یقین باقی رہتا ہے
نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت پر کوئی دلیل بیان کی جا سکتی ہے نہ آپ کے ساتھ کوئی مسلمان دعویٰ
محبت میں صادق القول کہا جا سکتا ہے۔ دین اسلام کی چھوٹی سے بات اور بڑے سے بڑا اہم مسئلہ انہی حضرات کی
ذات سے وابستہ ہے بظاہر میں ان ہستیوں کے متعلق قیامت میں پرسش معلوم نہیں ہوتی۔ مگر باطناً ان کے اسلام
کا انکار کر دینے سے ساری چیزوں کا انکار اور عبث ہونا لازم آجاتا ہے اس لیے ان چیزوں کی پرسش کے ذیل میں
ان ہستیوں کے متعلق پرسش بھی حاصل ہو جائے گی۔ نقلہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ ۱۷ مارچ ۶۴ء

سوال: اسلام میں روزے کی کیا حدود ہیں۔ اگر کوئی شخص دوپہر کو روزہ کھول لے اور کھانے کے بعد دوسرے روزے کی نیت کرے تو اس کے کتنے روزے شمار ہوں گے۔ ہمارے علاقے میں چھوٹے چھوٹے بچے اس طرح دن میں کئی روزے رکھتے ہیں۔ دعوت کے ذریعہ مطلع کریں کہ اس طرح کے روزے کن لوگوں کے نزدیک جائز ہیں؟

سائل، عبدالحمید فسٹ ائیر اسلامیہ کالج چنیوٹ

جواب: روزے کی ابتداء پو پھٹنے سے ہوتی ہے اور اس کی انتہا غروب آفتاب ہے۔ روزہ دار کے لیے پو پھٹنے سے لے کر سورج کے غروب ہونے تک کھانا پینا قطعاً حرام ہے۔ آپ نے جس صورت کے متعلق سوال کیا ہے اس میں دو روزے تو درکنار ایک روزہ بھی شمار نہیں ہوگا۔ روزے کی حدود میں کھانا پینا روزے کا اتمام نہیں، روزے کا توڑنا ہے۔ یہ جواب شریعتِ اسلام کی روشنی میں ہے۔ ہاں مرزائی حضرات کی شریعت جدا ہے اُن کے نزدیک ایک دن میں سات سات روزے رکھے جا سکتے ہیں۔ مرزا بشیر الدین محمود نے ۶ اپریل ۱۹۴۷ء کو قادیان میں ایک خطبے میں کہا تھا:-

میں نے جماعت کو ہدایت کی ہے کہ وہ ہر جمعرات کو سات نفلی روزے رکھے۔[1]

کیا پُرلطف روزے ہیں، روزے کے روزے اور بچوں کا کھیل۔ شریعت ہو تو ایسی ہو معاذ اللہ ثم معاذ اللہ

واللہ اعلم بالصواب۔

سوال: وہ لوگ جو اس وقت سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نئے نبی کے دنیا میں بھیجے جانے کے قائل ہوں اور بالفعل کسی ایسے شخص کو نبی اور رسول قرار دیں جو پیغمبر اسلام کے سینکڑوں سال بعد پیدا ہوا۔ تو سوال یہ ہے کہ ایسے لوگوں کا ذبح کیا ہوا جانور مسلمانوں کے لیے کھانا کیسا ہے؟ اور ان میں سے اگر کوئی شخص دوسرے مسلمان کے ساتھ گائے کی قربانی میں شریک ہو تو باقی چھ مسلمانوں کی قربانی شرعاً جائز سمجھی جائے گی یا نہیں؟ اس مسئلے کو تشریح کے ساتھ بیان کریں؟ سائل، عزیز احمد از نواب شاہ سندھ

جواب: مسئلہ کی تفصیل سے پہلے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ شریعت کی رُو سے ان منکرین ختم نبوت کا کیا حکم ہے؟ سو معلوم ہونا چاہیئے کہ ایسے تمام لوگ اکابر علمائے اسلام خصوصاً شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے متفقہ فیصلے کی رُو سے کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔ ان میں سے جو لوگ پہلے مسلمان تھے اور بعد میں وہ کسی نئی نبوت کے قائل ہوئے، شریعت اسلام انہیں مرتد قرار دیتی ہے اور جو عیسائیوں یا ہندوؤں سے اس نئے مسلک

---

[1] اخبار الفضل ربوہ ۱۱ مارچ ۱۹۴۷ء صد ۳ کالم ا

میں آئے جو ان کے ہاں ہی پیدا ہوئے وہ شریعت کی رُو سے زندیق ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ مرتد اور زندیق کی سزا شرع میں ایک ہے۔[1]

اگر کہا جائے کہ یہ حضرات اگرچہ دین کے بعض ضروری مسائل کا انکار کرتے ہیں لیکن جب کہ کلمہ پڑھتے ہیں اور اہل قبلہ میں سے ہیں تو مرتد کیسے ہو گئے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مسلمان ہونے کے لیے تو یہ ضروری ہے کہ جمیع امورِ دینیہ پر ایمان ہو۔ لیکن کافر ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ تمام امورِ دینیہ کا ہی انکار ہو بلکہ ضروریاتِ دین میں سے کسی ایک کا انکار کر دینے سے بھی انسان مرتد ہو جاتا ہے۔ موجبہ کلیہ کی نقیض سالبہ جزئیہ آتی ہے ایمان میں جمیع کی قید ہے اور کفر میں یہ قید نہیں۔ شامی میں مرتد کی تعریف یہ ہے:-

الراجع عن دین الاسلام ورکنها اجراء کلمة الکفر علی اللسان بعد الایمان۔[2]

ترجمہ: دین سے ہٹ جانے والا مُرتد ہے اور اس کی بنیاد مسلمان ہونے کے بعد کسی ایک کفریہ کلمہ کو اپنی زبان پہ لانا ہے۔

حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانہ میں کچھ لوگوں نے اسلام کے صرف ایک رکن (زکوٰۃ) کا انکار کیا تھا۔ نمازوں اور روزوں کو وہ بدستور مانتے تھے۔ مگر بایں ہمہ صحابہ کرامؓ نے انہیں مرتد قرار دیا ہے۔ امام بخاریؒ نے مانعین زکوٰۃ اور قتالِ ابی بکرؓ کے واقعہ پر مندرجہ ذیل باب باندھا ہے:-

باب قتل من ابی قبول الفرائض وما نسبوا الی الردة۔[3]

یہاں صریح طور پر ردت اور ارتداد کے الفاظ موجود ہیں۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:-

السلف قد سموا مانعی الزکوٰة مرتدین مع کونهم یصومون ویصلون۔[4]

ترجمہ: سلف نے زکوٰۃ روکنے والوں کا نام مرتد رکھا ہے۔ حالانکہ وہ روزے بھی رکھتے تھے۔ اور نمازیں بھی پڑھتے تھے۔

امام الائمہ امام محمدؒ جن پر فقہ حنفی کا مدار ہے:-

من انکر شیئاً من شرائع الاسلام فقد ابطل قول لا الٰه الا اللّٰه۔[5]

ترجمہ: جو شخص اسلام کی شرائع میں سے کسی ایک بات کا بھی انکار کرے اس نے اپنا کلمہ پڑھنے کو باطل کر لیا۔

امام ابن حزم علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں:-

وصح الاجماع ان کل من جحد شیئاً صح عندنا بالاجماع ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه

---

[1] مسوّی عربی شرح مؤطا جلد ۲ صد ۱۰۹ [2] شامی جلد ۳ صد ۲۹۱ مصر [3] صحیح بخاری جلد ۲ صد ۱۰۲۳ [4] فتاوی ابن تیمیہ جلد ۴ صد ۲۹۱ [5] سیر کبیر جلد ۴ صد ۲۶۵

وسلم اتى به فقد كفر وصح بالنص ان كل من استهزأ بالله تعالىٰ او بملك من الملائكة او بنبي من الانبياء او باية من القرآن او بفريضة من فرائض الدين فهي كلها آيات الله بعد بلوغ الحجة اليه فهو كافر ومن قال بنبي بعد النبي عليه الصلوٰة والصلوٰة او جحد شيئاً صح بان النبي صلى الله عليه وسلم قاله فهو كافر۔[1]

ترجمہ۔ اس بات پر اجماع درست ہو چکا ہے کہ جو شخص کسی ایسی بات کا انکار کرے جو اجماعی طور پر حضورؐ کی تعلیم ہو وہ کافر ہے اور یہ امر نص کے ساتھ ثابت ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ مذاق کرے یا اس کے فرشتے کے ساتھ یا قرآن پاک کی کسی آیت کے ساتھ یا نبیوں میں سے کسی نبی کے ساتھ یا دین کے فرائض میں سے کسی ایک فریضہ کے ساتھ استہزا کرے اس کے بعد کہ اس تک حجت شرع پہنچ چکی ہو تو وہ کافر ہو جاتا ہے۔ اور جو شخص سرورِ دو عالم کے بعد کسی اور نبی کے پیدا ہونے کا قائل ہو یا ایسی بات کا انکار کرے جو اس کے ہاں حضور کی تعلیم ہو تو وہ کافر ہے۔

ایسے لوگوں کا ہمارے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا انہیں اہل قبلہ میں داخل نہیں کر دیتا جب تک کہ تمام ضروریاتِ دین پر ایمان نہ لے آئیں۔ امام المتکلمین ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں،

اعلم ان المراد من اهل القبلة الذين اتفقوا على ما هو من ضروريات الدين۔[2]

ترجمہ۔ اہل قبلہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو ساری ضروریاتِ دین پر ایمان رکھتے ہیں۔

امام ابن حزمؒ ذرا تفصیل فرماتے ہیں۔

اهل القبلة فى اصطلاح المتكلمين من يصدق بضروريات الدين اى الامور التى علم ثبوتها فى الشرع واشتهر فمن انكر شيئاً من الضروريات كحدوث العالم وحشر الاجساد وعلم الله سبحانه بالجزئيات وفرضية الصلوٰة والصوم لم يكن من اهل القبله ولو كان مجاهداً بالطاعات۔[3]

ترجمہ۔ متکلمین اسلام کی اصطلاح میں اہل قبلہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو ساری ضروریاتِ دین کو سچا مانیں اور ضروریاتِ دین سے وہ امور مراد ہیں جن کا ثبوت شرع میں اس طرح ہو کہ انہیں اسلام میں شہرت کا درجہ حاصل ہو۔ پس جو کوئی ایسے ضروری مسئلوں سے انکار کرے جیسے دنیا کا حادث ہونا۔ قیامت کو تمام جسموں کا اکٹھا ہونا خدا تعالیٰ کے علم کا محیط ہونا، نمازوں اور

[1] کتاب الفصل جلد ۳ صفحہ ۲۵۵ [2] شرح فقہ اکبر صفحہ ۱۸۹ [3] الفصل جلد ۴ صفحہ ۵۴

روزوں کا فرض ہونا تو ایسے مسائل کا منکر اہل قبلہ میں سے نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ عبادات میں وہ کسی قدر مجاہد ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔

ولا نكفر احداً من اهل القبلة الا بما فيه نفى القادر المختار او عبادة غير الله او انكار المعاد والنبى وسائر ضروريات الدين۔[1]

اب دیکھنا چاہیئے کہ یہ منکرین ختم نبوت کسی ایسے امر کا انکار کرتے ہیں یا نہیں جس کے نہ ماننے کی وجہ سے انسان کافر ہو جاتا ہے۔ سو معلوم ہونا چاہیئے کہ ان میں تقریباً وہ تمام وجوہ موجود ہیں جو امام ابن حزمؒ کی تحریر میں موجود ہیں۔ لیکن ان سب میں نمایاں ختمِ نبوت کے اسلامی معنوں کا انکار ہے۔ ہمارا ان پر الزام ہے کہ تم خاتم النبیین کے بعد ایک نئے نبی کے قائل ہو وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ہاں ہم ایک نئے نبی کی پیدائش کے بے شک قائل ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ حضورؐ کے بعد کسی دوسرے شخص کو نبی ماننے والے کا حکم شرعاً کیا ہے؟ علامہ ابو شکور السالمی لکھتے ہیں:۔

ومن ادعى النبوة فى زماننا فانه يصير كافراً ومن طلب منه المعجزات فانه يصير كافراً لانه لا شك فى النص ويجب الاعتقاد بانه ما كان لاحد شركة فى النبوة لمحمدؐ بخلاف ما قالت الروافض ان علياً كان شريكاً لمحمدؐ وهذا منهم كفر۔[2]

ترجمہ۔ جو شخص اس زمانے میں نبوت کا دعوےٰ کرے یا اس سے معجزہ طلب کرے وہ کافر ہو جاتا ہے کیونکہ خاتم النبیین کی نص میں کوئی شک نہیں ہے اور اس بات پر ایمان لانا واجب ہے کہ حضورؐ کی نبوت میں آپ کا کوئی شریک نہیں ہے بخلاف شیعوں کے۔

شرح فقہ اکبر میں ہے:۔

دعوى النبوة بعد نبينا صلى الله عليه وسلم كفرٌ بالاجماع۔[3]

یعنی حضورؐ کے بعد نبوت کا دعوےٰ کرنا اجماعی طور پر کُفر ہے اجماع سے وہ اجماع مراد ہے جو صحابہ کرامؓ کا مسیلمہ کذاب کے بارے میں منعقد ہوا تھا۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ بانی دارالعلوم دیوبند ارشاد فرماتے ہیں:۔

اپنا دین و ایمان ہے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی اور نبی کے ہونے کا احتمال نہیں جو اس میں تامل کرے اس کو کافر سمجھتا ہوں۔[4]

اس بات کے واضح ہونے کے بعد ایسے حضرات قطعاً مسلمان نہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مرتد کے ذبیحہ

[1] العقیدۃ الحسنۃ صفحہ ۹ [2] التمہید صفحہ [3] شرح فقہ اکبر صفحہ ۲۰۱ [4] جوابات محذورات صفحہ ۱۰۳

کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے۔ در مختار میں ہے:۔

لاتحل ذبیحة غیر کتابیٍ من وثنیٍ و مجوسیٍ و مرتدٍ۔[1]

ترجمہ۔ کتابی کے سوا کسی بُت پرست، مجوسی، آتش پرست اور مرتد کا ذبیحہ مسلمان کے لیے حلال نہیں ہے۔

اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ ایسے لوگوں کا ذبح کیا ہوا جانور مسلمانوں کے لیے کھانا حرام قطعی ہے کیونکہ وہ مُردار کے حکم میں ہے۔ اُسے یا تو واپس کر دینا چاہیئے یا دفن کر دینا چاہیئے۔ حرام چیز کو عمداً جانوروں کو بھی کھلانا درست نہیں۔

وشرط کون الذابح مسلماً حلالاً خارج الحرم ان کان صید فصید الحرم لاتحله الزکوٰة فی الحرم مطلقاً او کتابیاً ذمیاً او حربیاً الا اذا سمع منه عند الذبح ذکر المسیح۔[2]

آپ نے جن منکرین ختم نبوت کے متعلق پوچھا ہے وہ کتابی کے ذیل میں بھی نہیں آسکتے۔ کیونکہ کتابی وہ ہے جو قرآن پاک سے پہلے کی کسی کتاب پر ایمان رکھتا ہو۔ قرآن پاک میں متعدد مقامات پر اوتوا الکتاب کے ساتھ من قبلکم موجود ہے۔ جو شخص قرآن پاک پر ایمان کا اظہار کرتا ہے تو اگر اس کا ایمان صحیح معنوں میں ہے تو وہ مسلمان ہے اور اگر صحیح معنوں میں نہیں تو کافر ہے کتابی نہیں ہو سکتا۔ کتابی یہود اور نصاریٰ ہی ہیں۔

شامی میں ہے:۔

الکتابی من یعتقد دیناً سماویاً ای منزلاً بکتاب کالیهود والنصاریٰ۔[3]

اسی طرح کلیات ابوالبقاء میں ہے:۔

الکافر ان کان متدیناً ببعض الادیان والکتب المنسوخة فهو الکتابی۔[4]

ترجمہ۔ کتابی اس کافر کو کہتے ہیں جو کسی پُرانے دین اور منسوخ کتاب پر ایمان رکھتا ہو۔

پس جب، کہ منکرین ختم نبوت کتابی کے ذیل میں بھی نہیں آسکتے تو ان کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے کسی طرح بھی حلال نہیں ہو سکتا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجوسیوں کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے صاف لفظوں میں حرام فرمایا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ عقائد کفریہ کا اثر ذبیحہ پر بھی ضرور پڑتا ہے۔ امام عبدالرزاقؒ اور امام ابن ابی شیبہؒ حضرت حسنؓ سے مرسلاً نقل کرتے ہیں کہ حضورؐ نے "ہجر" کے مجوسیوں کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا:۔

من لم یسلم ضربت علیه الجزیة غیر ناکحی نسائهم ولا آکلی ذبائحهم۔

ترجمہ۔ ان میں سے جو شخص مسلمان نہ ہو اس پر جزیہ لگایا جائے۔ ہاں ان کی عورتوں سے نکاح درست نہیں اور ان کا ذبح کیا ہوا جانور مسلمانوں کے لیے کھانا حلال نہیں۔

---

[1] شامی جلد ۵ صفحہ ۲۵۹ [2] ونحوہ فی البخاری جلد ۲ صفحہ ۸۲۸ [3] شامی صفحہ ۳۸۰ [4] کلیات صفحہ ۵۵۳

شیخ الاسلام ابن حجر عسقلانیؒ اس حدیث کے اسناد کو جید قرار دیتے ہیں۔ (الدرایہ صفحہ ۳۸)

سیدنا حضرت امام بخاریؒ اپنی کتاب خلق افعال عباد میں جو مسائل کلامیہ میں اہل علم کی بہت راہنمائی کرتی ہے۔ فرقہ جہمیہ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:۔

لا یسلم علیهم ولا یعادون ولا ینا کحون ولا تؤکل ذبائحهم۔

اس میں ایسے لوگوں کے ذبیحہ کے ناجائز ہونے پر صاف تصریح موجود ہے۔

نوٹ: یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ جو شخص اسلام سے اہل کتاب کے دین میں چلا جائے۔ تو باوجودیکہ وہ اہل کتاب کے دین میں ہے اسے حکم شرع میں کتابی نہیں کہا جائے گا۔ وہ مرتد کہلائے گا۔ کتابی وہ اسی صورت میں تھا کہ پہلے اسلام پر نہ ہوتا۔ پس ایسے شخص کا ذبیحہ کتابی کا ذبیحہ نہیں ہوگا۔ بلکہ اسے مرتد کا ذبیحہ کہا جائے جو مسلمان کے لیے حرام ہے پس ایسے حضرات کتابی بھی نہیں کہلا سکتے۔ کیونکہ وہ دین اسلام سے تاویلاً منحرف ہو کر اس نئے دین میں گئے ہیں۔

خلاصہ مافی الباب یہ ہے کہ جس طرح ذبح ہونے والے جانور کے لیے کچھ شرطیں ہیں کہ حرام جانور نہ ہو۔ جیسے کتا، بلی، بندر وغیرہ اور نیز یہ کہ حدود حرم میں نہ ہو۔ اسی طرح ذبح کرنے والے کے لیے بھی کچھ شرطیں ہیں کہ وہ مسلمان ہو اور یہ کہ عالت احرام میں نہ ہو۔ اس کے علاوہ صرف کتابی کا ذبیحہ جائز ہے۔ بشرطیکہ بوقت ذبح مسیح کا نام نہ لیا گیا ہو۔ جب تک ذبح کرنے والے میں ذبح کرنے کی شرطیں نہ پائی جائیں گی اس کا ذبح کیا ہوا جانور وہی حکم رکھتا ہے جو مُردار کے گوشت یا حرام جانور کے ذبیحہ کا ہے۔ پہلے معاملہ میں ذابح ہونے کی اور دوسرے معاملہ میں مذبوح ہونے کی اہلیت مفقود ہے۔ بنا بریں علیہ مرتد کے ذبیحہ میں اور ذبح کئے ہوئے حرام جانور میں حکماً کوئی فرق نہیں ہے۔ کھانا دونوں کا ایک مسلمان کے لیے حرام ہے۔

جس طرح مسلمان ان منکرین ختم نبوت کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے اور اسے بے جا تعصب یا منافرت پر محمول نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح انصاف یہ ہے کہ ان کے ذبیحہ کو بھی حرام سمجھا جائے اور اسے بے جا تعصب اور شر انگیزی پر محمول نہ کیا جائے۔ اگر وہ لوگ ہمارا ذبیحہ کھا لیتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہمیں اہل کتاب میں سے شمار کرتے ہیں اور ان کے نزدیک ہمارا دین دین سماوی ہے اور چونکہ ہمارے نزدیک وہ کتابی نہیں اور ان کا دین ہمارے دین سے پہلے کا نہیں بلکہ بعد کا ہے۔ اس لیے ہمارا اپنے عمل کو ان کے عمل پر قیاس کرنا درست نہیں ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب

قربانی کرنا ایک خالص اسلامی عبادت ہے۔ گائے کی قربانی میں جو سات افراد شریک ہیں ان کی اس مجموعی عبادت کے سارے شرکاء کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ ان میں سے اگر ایک بھی ختم نبوت کے اسلامی معنوں کا منکر ہو گا تو قربانی کسی کی ادا نہ ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ ۳، اپریل ۱۹۶۴ء

سوال ۱: حضورؐ کا دعائے ابراہیمی سے مبعوث ہونا نصِ قرآنی سے ثابت ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد میں رسول کے مبعوث ہونے کی دعا فرمائی تھی جس کا ثبوت قرآن پاک میں بیّن ہے۔ اسی طرح امت کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعا فرمائی تھی کہ میری اولاد میں ہی سے امام ہو۔ جس طرح حضورؐ کے بعد کوئی نبی نہیں، اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کی اولاد سے امامین حسنین کے بغیر کسی امام کا ہونا از روئے قرآن و شریعت ثابت نہیں لہٰذا امام اعظمؒ کا امام ماننا محض باطل ہے۔ آپ کی امامت عند الشریعت قرآن و حدیث سے ثابت نہیں۔ امام اعظم چونکہ دوسری قوم و نسل سے ہیں۔ اس واسطے ان کا امام ماننا غلط ہے۔ از روئے کتاب و سنّت اس پہ روشنی ڈالیں؟

سائل۔ محمد فضل الرحمٰن عفی عنہ

جواب: حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو منصبِ امامت عطا ہوا وہ مدارج نبوت کا ہی ایک درجہ علیا تھا۔ رب العزت نے نبوت کو مختلف درجے عطا کر رکھے ہیں۔ کبھی نبوت رسالت کی شان سے سرفراز ہوتی ہے اور کبھی یہ نبوت محضہ کے درجہ میں ہوتی ہے۔ کبھی نبوت کو امامت کا مقام ملتا ہے اور کبھی نبوت اس شانِ امامت کے بغیر جلوہ گر ہوتی ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو جو درجۂ امامت ملا وہ امامت فی النبوت کا مقام تھا۔ ایسی امامت جو نبوت کے بغیر ہو اس کی امامتِ ابراہیمی سے کوئی نسبت نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذریت کے لیے اس مرتبۂ امامت کی استدعا کی تھی اور اس کا ثبوت قرآن عزیز میں موجود ہے۔ لیکن اس سے مراد اسی امامت فی النبوت کے مرتبے کی طلب ہے۔ امامت بغیر نبوت کے منصب کی استدعا نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اسی دعا کا ثمرہ تھا کہ ان کی ذریت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام وغیرہم من الانبیاء اور بالآخر حضور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امامت فی النبوت کی شان سے فائز ہوئے۔ امامت فی النبوت بے شک حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں محصور ہے۔ لیکن امامت محضہ (جو بغیر نبوت کے ہو) ہرگز نسلِ ابراہیمی سے خاص نہیں۔ یہ منصب امامت ہر مردِ مومن کو مل سکتا ہے اور یہ کوئی آسمانی منصب نہیں۔ بلکہ ایک اکتسابی مرتبہ ہے۔ قرآن عزیز کی رُو سے ہر مردِ مومن اس مرتبے کا طلبگار اور اُمیدوار ہے۔ ہم سب یہ قرآنی دُعا بار بار پڑھتے ہیں:۔

واجعلنا للمتقين اماما۔ (پ۱۹ فرقان)

ترجمہ۔ اے اللہ! ہمیں پرہیزگار لوگوں کی امامت سے نواز۔

مشہور شیعہ مفسر علامہ علی بن ابراہیم قمی اس دلیل سے بہت پریشان ہیں۔ انہیں اس بات کا غم ہے کہ جس طرح "امامت نبوت" نسلِ ابراہیمی سے خاص ہے۔ امامت محضہ کیوں نسل ابراہیمی سے خاص نہیں۔ اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے علامہ قمی ہمارے اس استدلال کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ آیت شریفہ ہی تحریف کا شکار ہے ان

کے عقیدے میں یہ آیت اصل میں یوں تھی:۔

واجعل لنا من المتقين اماما۔[1]

ترجمہ۔ اے اللہ! پرہیزگار لوگوں کو ہمارا امام بنا۔

حضرت امام حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو جب ہم امام کہتے ہیں تو اس سے یہی اکتسابی امامت مراد ہے کوئی آسمانی مرتبۂ امامت ہرگز نہیں۔ آسمانی مرتبہ امامت حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر ختم ہے اور وہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مذکورہ بالا استدعا کے آخری مصداق ہیں۔ حضرات حسنینؓ کی امامت کا حضرت ابراہیمؑ کی اس دُعا سے کوئی تعلق اور رابطہ نہیں۔

ہم اہلسنت والجماعت جب حضرت امام اعظمؒ یا امام مالکؒ کو امام کہتے ہیں تو اس سے یہی اکتسابی مرتبہ امامت مراد ہوتا ہے جو ان حضرات کو علم و اجتہاد میں کمال استعداد اور ہمہ تن انہماک کی بدولت حاصل ہوا۔ حضرت امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ فن حدیث میں مرتبہ امامت پر فائز تھے اور امام ابوالحسن اشعریؒ اور ابوالمنصور ماتریدیؒ کو علم کلام میں شانِ امامت حاصل تھی۔ حاصل اینکہ حضرت امام حسنؓ ہوں یا حضرت حسینؓ امام اعظمؒ ہوں یا حضرت امام مالکؒ امام بخاریؒ ہوں یا مسلمؒ اور امام اشعریؒ ہو یا حضرت ماتریدیؒ سب کے سب امتِ محمدیہ کے روشن چراغ اور اپنے اپنے اکتساب و محنت پر اپنے اپنے درجہ میں شانِ امامت سے سرفراز تھے۔

ان حضرات قدسیہ میں آسمانی مرتبہ امامت جس سے مراد "امامت فی النبوت" کا مقام ہے۔ کسی بزرگ کو حاصل نہ تھا کیونکہ حضور اکرم خاتم النبیین ہیں۔ پس ان حضرات کی امامت کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت مطلوبہ سے کوئی واضح تعلق نہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ حضرت امام اعظمؒ کا دوسری نسل سے ہونا ان کی شانِ امامت سے ہرگز متصادم نہیں۔ بلکہ ان کے علم و ایمان کی بشارت کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک علیحدہ مستقل ارشاد موجود ہے۔ جو اُن کی امامت فی العلم کی ایک واضح شہادت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:۔

لوكان الدين عند الثريا لذهب به رجل من ابناء فارس حتى يتناوله۔[2]

ترجمہ۔ اگر ایمان ثریا ستاروں تک بھی دور چلا جائے تو فارسی نسل لوگوں میں ایک ایسا شخص ہوگا جو اسے وہاں سے بھی لے آئے گا۔

اس حدیث کی تشریح میں امام سیوطیؒ حنفی نہ ہونے کے باوجود فرماتے ہیں:۔

قد بشر صلى الله عليه وسلم بالامام ابي حنيفة في الحديث۔[3]

---

[1] تفسیر قمی ص۲۸ [2] صحیح مسلم جلد ۲ ص۳۱۲ [3] تبییض الصحیفہ ص۱۳

ترجمہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں حضرت امام ابی حنیفہؒ کے ہونے کی بشارت دی ہے۔

ان حقائق سے یہ حقیقت بالکل بے غبار ہو جاتی ہے کہ حضرت امام اعظمؒ کو امام مان لینا قرآن و حدیث کے خلاف بالکل نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: قرآن مجید میں ہے۔ محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینہم۔ یہ صحابہ کرامؓ کی شان کا بیان ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھی آپس میں رحیم اور کفار پر سخت تھے۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ کی آپس میں خانہ جنگی کیوں ہوئی۔ جب کہ اللہ تعالیٰ خود فرما رہے ہیں کہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔ نیز یہ آیت صرف خلفائے راشدینؓ کے حق میں نازل ہوئی ہے یا تمام صحابہ کرامؓ کے حق میں؟ بذریعہ "دعوت" تفصیل سے روشنی ڈال کر مطمئن فرمائیں؟

سائل۔ الٰہی بخش لیدر مرچنٹ کالا باغ

جواب: یہ آیت صرف خلفائے راشدینؓ کے لیے نہیں، بلکہ بہیئتِ مجموعی تمام جماعت صحابہؓ کی مدح و منقبت پر مشتمل ہے۔ اگر اس میں صحابہؓ کے کسی خاص طبقے کی تخصیص ہو سکتی ہے تو وہ اصحابِ بیعت الرضوان ہیں جن کا ذکر آغازِ سورت سے چلا آ رہا ہے۔ امت کے معاملات جب تک صحابہؓ کی جماعت کے سپرد رہے اسلامی معاشرہ بے شک اشداء علی الکفار رحماء بینہم کا مظہر بنا رہا۔ لیکن یہ حالت اسی دور تک رہی جب تک امتِ مسلمہ زیادہ تر صحابہؓ کی جماعت پر مشتمل تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفاتِ شریفہ کا زمانہ جوں جوں دور ہوتا گیا، امتِ مسلمہ میں صحابہؓ کی تعداد کم ہوتی گئی اور دوسرے مسلمان جو صحابی نہ تھے اکثریت بنتے چلے گئے۔ اب ایسے دور کے مسلمان اگر رحماء بینہم کا مظہر نہ رہیں۔ تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جماعتِ صحابہؓ اس صفت کی آئینہ دار نہیں رہی۔ بلکہ دیکھا جائے تو ایسے دور میں صحابہ کرامؓ کی مجموعی حیثیت یا تنظیم کسی محسوس صورت میں ملتی ہی نہیں وہ اگلے دور کے مسلمانوں میں اس طرح ملے جلے نظر آتے ہیں کہ اس دور کے فیصلے نہ جماعتِ صحابہؓ کے فیصلے سمجھے جا سکتے ہیں اور نہ اُن کو صحابہ کرامؓ کے اختلافات کہا جا سکتا ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کہ ان اختلافات نے صحابہؓ کے ناموں سے شہرت حاصل کی لیکن یہ اختلافات صحابہ کرام کی جماعت کا اختلاف نہیں کہلا سکتے کیونکہ اس وقت کی جماعتی زندگی غیر صحابہ کا غلبہ اور تسلط تھا۔ یہ آیت شریفہ بہیئتِ مجموعی تمام جماعتِ صحابہؓ کی مدح پر مشتمل ہے۔ صحابہؓ کے انفرادی تاثرات بالخصوص جب کہ ان کے ساتھ غیر صحابہ بھاری اکثریت سے شامل ہوں ان صفات کے پابند نہیں۔ الف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخواناً کا مصداق بھی وہی دور ہے جب کہ امتِ مسلمہ زیادہ تر جماعتِ صحابہؓ پر مشتمل تھی اور امت کے معاملات صحابہؓ کی جماعت کے ہی سپرد تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی المرتضیٰؓ کے دور میں جماعتِ صحابہؓ کی بجائے غیر صحابہ کا غلبہ تھا اور وہ بھی زیادہ تر وہی لوگ تھے جو سیدنا حضرت علی المرتضیٰؓ کے کہنے سننے میں نہ تھے ہمیں حضرت علی المرتضیٰؓ کے اس دور کے متعدد ایسے خطبے ملتے ہیں جن میں وہ اپنی مجبوری اور ان لوگوں کی سینہ زوری کے بہت شاکی نظر آتے ہیں حضرت علی المرتضیٰؓ خود فرماتے ہیں:۔

یملکوننا ولا نملکھم۔[1]

ترجمہ۔ یعنی یہ لوگ اپنا حکم ہم پر چلاتے ہیں اور ہماری نہیں سُنتے۔

ایسے لوگوں کی معیت اگر بعض صحابہؓ کو بعض دوسرے صحابہؓ سے بدگمان کئے رکھے اور یہ لوگ ہر وقت ایسے مواقع کی تاک میں رہیں اور باہمی معاملات میں اختلاف و انشقاق کے کانٹے بوتے رہیں۔ تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ حضرت علی المرتضیٰؓ اور حضرت ام المومنینؓ کے واقعاتِ جمل یا حضرت علی اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے تمام تر اختلافات و فساد نیت پر نہیں، صرف غلط فہمیوں پر مبنی تھے۔ بایں ہمہ ان حضرات میں رحماء بینہم کی جھلک پھر بھی کسی نہ کسی انداز میں موجود تھی۔ جنگِ جمل کے بعد حضرت علیؓ کا حضرت ام المومنینؓ سے حسنِ سلوک اور حضرت طلحہؓ کے ہاتھ کو اس لیے چومنا کہ اس ہاتھ نے جنگِ اُحد کے دن حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ڈھال کا کام دیا تھا۔ یہ تمام واقعات اس حقیقت کے شاہد ہیں۔

ثانیاً صحابہ کرامؓ کفار کے مقابلہ میں بے شک رحماء بینہم کی شان سے ممتاز تھے۔ قرآن عزیز اُن کی اس صفت کو اشداء علی الکفار کے ساتھ ملا کر بیان کرتا ہے۔ یعنی کفر کے مقابلے میں وہ بے شک ایک اور باہمی طور پر ایک دوسرے سے شفیق و رحیم ہیں۔ حضرت علی المرتضیٰؓ اور حضرت امیر معاویہؓ اپنے اختلافات کی پوری شدت کے وقت بھی اس صفت رحماء بینہم سے ممتاز تھے۔ یعنی کفر کے مقابلے میں اختلافات کے باوجود وہ ایک دوسرے سے شفیق و رحیم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب قیصر روم نے حضرت علیؓ کے خلاف حضرت امیر معاویہؓ کو امداد کی پیشکش کی تو آپ نے باہمی شدتِ اختلاف کے باوجود اسے یہ جواب دیا کہ تیری جو آنکھ علیؓ کے خلاف اُٹھے گی وہ نکال دی جائے گی اور جو ہاتھ اُٹھے گا وہ کاٹ دیا جائے گا۔

ان واقعات کی روشنی میں بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان بزرگوں کے اختلافات اشداء علی الکفار کی صفت سے متصف ہونے کے وقت رحماء بینہم کی شان سے پوری طرح سے ممتاز تھے۔

واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ

---

[1] نہج البلاغۃ جلد ۲ ص ۹۸

سوال ۲: گاؤں میں جمعہ کے جواز کے متعلق مفصل جواب تحریر فرمائیں؟
گاؤں نہ بہت بڑا ہے اور نہ بہت چھوٹا، تقریباً ۲۲۵ گھر آباد ہیں اور چار پانچ دکانیں بھی ہیں؟

سائل: عبدالعزیز خریدار دعوت، چک ۶۷۲/گ۔ب

جواب: اس گاؤں میں جمع پڑھنا صحیح نہیں۔ ہمارے نزدیک سیدنا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ چوتھے خلیفہ راشد اور جلیل القدر صحابی ہیں وہ ارشاد فرماتے ہیں:

لاجمعة ولاتشريق الافی مصر جامع۔

ترجمہ: جمعہ کی نماز اور عید کی نماز صرف شہر میں ہوسکتی ہے۔

اس حدیث کو ابن ابی شیبہ، عبدالرزاق اور ابوعبیدہ نے روایت کیا ہے۔ ابن حجر عسقلانیؒ درایہ میں لکھتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے۔ (درایہ ص۱۳۱) علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ خواہر زادہ نے مبسوط میں ذکر کیا ہے کہ امام ابو یوسفؒ نے اسے مرفوع املا کرایا تھا۔[1]

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ:

كان الناس ينتابون الجمعة من منازلهم والعوالی۔[2]

ترجمہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لوگ اپنے گھروں سے اور عوالی سے (مضافات کے گاؤں سے) باری باری جمعہ کے لیے آیا کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر سے باہر رہنے والوں پر جمعہ فرض نہیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو یا تو وہ اپنے ہاں جمعہ قائم کرتے یا سب کے سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ آکر جمعہ پڑھتے، باری باری جمعہ نہ پڑھتے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ گاؤں والوں پر جمعہ فرض نہ تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

یہ مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جو ائمہ ہدیٰ فقہاء اہلسنت میں مختلف فیہ ہیں۔ ہفت روزہ دعوت کا موضوع اصولی ہے۔ فروعی مسائل میں الجھنا ہمارے نزدیک مناسب نہیں۔

پس ہم اتنے ہی جواب پر اکتفا کرتے ہیں۔ مزید تفصیل مطلوب ہو تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "شرح اوثق العریٰ" یا اعلاء السنن جلد ہشتم کا مطالعہ کیجئے۔ محدث نیموی کا ایک مختصر اردو رسالہ بھی اس باب میں کافی و وافی ہے۔ ہم اس سے زیادہ اس فروعی مسئلے کو پھیلانا نہیں چاہتے۔ واللہ اعلم بالصواب

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

---

[1] دیکھئے بنایہ شرح ہدایہ للعلامہ عینی جلد ۱ ص۹۸۳ [2] صحیح بخاری جلد ۱ ص۱۲۳

سوال: اکثر واعظین یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کو جب یہ اطلاع ملی کہ جنگ احد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دانت مبارک شہید ہوگیا ہے تو انہوں نے رسول اللہ علیہ وسلم کے عشق میں اپنے تمام دانت توڑ ڈالے کتب معتبرہ سے اس کی تفصیل سے آگاہ فرمائیے آیا واقعہ صحیح ہے یا غلط؟ سائل: خان محمد چپل ساز کالاباغ

جواب: حضرت اویس قرنیؒ کا یہ عمل ایک غلبہ جذبات کا نتیجہ تھا جو اپنے خلوص اور محبت میں بے شک اپنی مثال آپ ہے۔ لیکن اسے کوئی قانونی یا تشریعی درجہ ہرگز حاصل نہیں غلبہ حال کے ایسے واقعات سے مسائل کا استنباط جائز نہیں ہوتا۔ حضرت اویس قرنیؒ کے اس عمل کے بالمقابل حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے کسی دانت پر کوئی ضرب نہیں لگائی۔ ان دونوں بزرگوں کے اختلاف عمل میں ہم اہل سنت سیدنا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے پیرو ہیں۔ حضرت اویس قرنیؒ غلبہ حال میں مجبور تھے۔ پس ان پر اعتراض جائز نہیں۔ ایسے مجبور شرعاً معذور تصور ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: ۲۷ر اپریل ۱۹۶۲ء کے "چٹان" میں سردار دیوان سنگھ مفتون کا ایک مضمون بعنوان "ناقابلِ فراموش" اور "اینٹی میشن کی حماقتیں" شائع ہوا ہے۔ سردار صاحب سکھوں کے ایک مذہبی ایڈیشنک کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس نے حضرت منصور کا واقعہ الٹ پلٹ کر پیش کرکے لوگوں سے نعرہ ہائے تحسین حاصل لئے۔ مگر جو لوگ حضرت منصور کے سولی پر چڑھتے ہوئے انا الحق کا نعرہ بلند کرنے کے تاریخی واقعہ سے واقف تھے وہ کیا خیال کرتے ہوں گے اور کیا کہتے ہوں گے اور کیا نہ کہتے ہوں گے؟

عرض یہ ہے کہ آپ اس واقعہ پر روشنی ڈالیں:

۱۔ حضرت منصور کون تھے۔ ۲۔ انا الحق کا نعرہ بلند کرنا۔ ۳۔ سولی پر چڑھانا۔ ۴۔ سولی پر کس نے چڑھایا اور کیوں۔ ۵۔ اور اس کے جواز و عدم جواز میں دیہاتی لوگ تو عجیب و غریب حکائتیں بیان کرتے ہیں۔

سائل: خیرالدین گوہیر چک ۲۲۲ رسول۔ خریدار "دعوت"

جواب: حضرت منصور کا واقعہ شعرائے تصوف کے کلام میں بہت ملتا ہے۔ شعراء کو اس سے بحث نہیں ہوتی کہ کوئی واقعہ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ نہیں۔ اگر کوئی واقعہ عوام میں مشہور اور لوگوں میں معروف ہو تو حضرات شعراء اس تار پر مضراب رکھ کر اپنی بات پیش کر دیتے ہیں۔ اور اپنے خیالات دوسروں کے ذہن میں اتار دیتے ہیں اُن کا مقصد حقائق واقعی کا اثبات و ابطال نہیں، محض ایک تاثر و شہرت سے استدلال ہوتا ہے جس کے سہارے وہ اپنے جذبات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ حضرت منصور کا واقعہ اسی انداز میں مولانا روم سے لے کر متوسط درجے

تک کے ہر شاعر نے پیش کیا ہے۔ صوفیائے کرام بھی اگر ایسے بعض واقعات کو کسی عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو اس کا منشاء اس کی شہرت اور ذات کی فنائیت ہے۔ ان واقعات کے ایک تاریخی حقیقت ہونے اور پھر ان سب امور کے سچا ہونے کا اثبات پیش نظر نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ حسین بن منصور الحلاج خلیفہ المقتدر عباسی کے عہد میں ایک ان پڑھ، مدبر اور بہت ہوشیار شخص تھا۔ اپنے شاگردوں کو عقیدہ حلول کی تعلیم دیتا تھا۔ حکام کے سامنے اپنے آپ کو شیعہ ظاہر کرتا تھا اور عوام کے سامنے اپنے آپ کو صوفی کہتا تھا۔ خلیفہ المقتدر کے وزیر ابوالحسن علی بن عیسیٰ نے اسے گرفتار کیا۔ اس کا دعوے تھا کہ وہ اپنے مریدوں میں موسیٰ، عیسیٰ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تحلیل کرتا ہے۔ ابن مسکویہ کا بیان ہے کہ اگرچہ گرفتاری کے بعد اس نے ان تمام واقعات کا انکار کیا تھا۔ لیکن ان سب امور کے ثبوت اپنی جگہ پوری طرح فراہم تھے۔ علامہ ذہبی نے بھی اسے ایک غلط کار شخصیت قرار دیا ہے۔ علامہ طبری اپنی تاریخ جلد سوم ص ۲۲۸۹ میں اور ابن مسکویہ کتاب العیون میں اسے ایک سیاسی شخصیت قرار دیتے ہیں جو تصوف کے پردہ میں مصروف سازش تھا۔ امام غزالیؒ نے مشکوٰۃ الانوار میں ص ۱۰۸ پر اس کا دفاع کیا ہے اور اس کے قابل اعتراض کلموں کی تاویل کی ہے۔ نفحات الانس اور تذکرۃ الاولیاء میں بھی اس کے تذکرے ملتے ہیں۔ حضرات صوفیائے کرام اور شعرائے کرام نے اس کی کافی تکریم و توجیہہ کی ہے۔ لیکن اس کے وجوہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ ۹۱۳ء میں الحاد کے جرم میں اس کی گرفتاری ہوئی اور ۹۲۱ء میں اسے قتل کیا گیا۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ

بخدمت جناب حضرت علامہ صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم

سمندری میں ۲۲ر اپریل کو دفتر بلدیہ سمندری کے چیئرمین کی زیر صدارت یوم اقبال منایا گیا جس میں چند مرزائی بھی مدعو تھے۔ میں نے اقبال اور ختم نبوت کے موضوع پر تاریخی روشنی ڈالی۔ جس پر مرزائی مبلغ نے اعتراض کیا کہ یہ واقعہ غلط ہے۔ میں نے بیان کیا تھا کہ کشمیر کمیٹی میں جب مرزا بشیر الدین محمود صدر تھے ڈاکٹر اقبال نے استعفیٰ دیا تھا اور انجمن حمایت اسلام میں جب ڈاکٹر اقبال صدر تھے تو انہوں نے مرزائی ارکان انجمن حمایت اسلام سے خارج کر دیے تھے۔ میں نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ ڈاکٹر اقبال نے مرزائیوں کو علیحدہ اقلیت قرار دینے پر بھی ایک بیان دیا تھا۔ مرزائی مبلغین نے ان سب امور کا انکار کیا ہے۔ اس لیے آپ ان موضوعات کے متعلق دعوت کے باب الاستفسارات میں تفصیلاً بیان فرمائیں بہت مشکور رہوں گا؟

محمد علی جانباز

جواب: یہ صحیح ہے کہ علامہ اقبالؒ جب انجمن حمایت اسلام لاہور کے صدر تھے تو ان کی تحریک اور عام مسلمانوں کی تائید سے انجمن حمایت اسلام نے ۱۹۳۶ء کے اوائل میں ایک قرارداد منظور کی تھی جس کی رو سے مرزائی انجمن حمایت اسلام کے ممبر نہیں ہو سکتے تھے۔ اور اس قرارداد کے مطابق اس وقت جتنے بھی مرزائی ممبر تھے۔ سب انجمن حمایت اسلام کی رکنیت سے خارج ہو گئے تھے۔ سمندری کے مرزائی مبلغ نے غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے ان حقائق پر پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ آپ اسے لاہور لا کر انجمن حمایت اسلام کا ریکارڈ دکھا سکتے ہیں۔ ایسے روشن حقائق کا انکار بہت موجب تعجب ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے ۱۹۳۶ء کے وسط میں پنجاب کے مختلف مقامات کا دورہ کیا تھا اور مرزائیوں کی ایک سیاسی انجمن نے اس دوران میں پنڈت جی کو ایک دعوت استقبالیہ بھی دی تھی۔ اس پر بعض حلقوں سے مرزائیوں پر کافی اعتراضات ہوئے اور مرزا بشیر الدین محمود خلیفہ قادیان نے اپنے خطبہ جمعہ میں ان اعتراضات کے جوابات دیئے تھے۔ ان جوابات کے ضمن میں مرزا بشیر الدین نے بیان کیا تھا کہ ڈاکٹر اقبال نے احمدیوں کو عام مسلمانوں سے علیحدہ اقلیت قرار دینے کی تحریک کی تھی اور پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کا رد کیا تھا۔ اس لیے ایسے شخص کا استقبال بالکل حق بجانب ہے۔ خلیفہ قادیان کا یہ خطبہ اخبار الفضل میں شائع بھی ہوا۔ الفاظ یہ ہیں:۔

> اگر پنڈت جواہر لال نہرو اعلان کر دیتے کہ احمدیت کو مٹانے کے لیے وہ اپنی تمام طاقت خرچ کر دیں گے جیسا کہ احرار نے کیا ہوا ہے تو اس قسم کا استقبال بے غیرتی ہوتا لیکن اس کے برخلاف یہ مثال موجود ہو کہ قریب کے زمانہ میں ہی پنڈت صاحب نے ڈاکٹر اقبال کے ان مضامین کا رد لکھا ہے جو انہوں نے احمدیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ قرار دیئے جانے کے لیے لکھے تھے اور نہایت عمدگی سے ثابت کیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا احمدیت پر اعتراض اور احمدیوں کو علیحدہ کرنے کا سوال بالکل نامعقول اور خود ان کے گذشتہ رویے کے خلاف ہے تو ایسے شخص کا جب کہ وہ صوبہ میں مہمان کی حیثیت سے آ رہا ہو ایک سیاسی انجمن کی طرف سے استقبال بہت اچھی بات ہے[1]

خط کشیدہ عبارت میں نہایت واضح اقرار ہے کہ مرزائیوں کو علیحدہ اقلیت قرار دینے کے محرک اول علامہ اقبالؒ ہی تھے۔ پس سمندری کے مرزائی مبلغ کا انکار حقیقت پر مبنی نہیں۔

۳۔ ڈاکٹر یعقوب بیگ انجمن حمایت اسلام کے ایک پرانے سرگرم کارکن تھے۔ وہ مرزائیوں کی لاہوری جماعت سے وابستہ تھے۔ علامہ اقبالؒ کی اسی مذکورہ بالا تحریک کی بنا پر وہ بھی انجمن حمایت اسلام کی رکنیت سے علیحدہ کر

[1] اخبار الفضل ۱۱ر جون ۱۹۳۶ء جلد ۲۳۔ شمارہ نمبر ۲۸۷ خطبہ جمعہ

دیئے گئے۔ اس لیے علامہ اقبال کی یہ تحریک لاہوری جماعت پر بھی بہت گراں تھی۔ انہی دنوں لاہوری جماعت کے امیر مولوی محمد علی صاحب کی طرف سے بھی اخبار پیغام صلح میں یہ بیان شائع ہوا تھا:۔

علامہ اقبال جیسے بلند پایہ انسان جسے آج سے چار برس پہلے ایک مسلمان کمیٹی کا صدر بنائیں، آج اسے کافر قرار دیں۔ مرزا محمود احمد صاحب کو کشمیر کمیٹی کا صدر بنانے میں سر محمد اقبال پیش پیش تھے اور جس جماعت کو سولہ سترہ سال بیشتر ٹھیٹھ اسلامی سیرت کا نمونہ بتائیں، آج اُسے کافروں کی جماعت قرار دیں۔ پس مناسب ہے کہ جو کچھ فتویٰ دیں وہ آج کی تحریرات پر دیں[1]

گو ہمیں اس سے اتفاق نہیں کہ مرزا بشیرالدین محمود کو کشمیر کمیٹی کا صدر بنانے کے محرک علامہ اقبال تھے۔ اس وقت اس سے بھی بحث نہیں کہ پھر علامہ اقبال نے اس کمیٹی سے آخر کیوں استعفیٰ دے دیا تھا۔ اس وقت ہمیں صرف یہ دکھانا ہے کہ قادیانی اور لاہوری دونوں جماعتوں کے بیان کے مطابق مرزائیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ اقلیت قرار دینے کے محرکِ اوّل علامہ اقبال مرحوم ہی تھے۔

ڈاکٹر یعقوب بیگ (لاہوری مرزائی) انجمن حمایتِ اسلام کے اس فیصلے کے پورے ایک ہفتہ بعد فوت ہو گئے تھے اور مرزائی اخبارات نے لکھا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی وفات اسی صدمہ سے ہوئی ہے کہ ملتِ اسلامیہ انہیں کس طرح پوری ملت سے کٹا ہوا سمجھتی ہے۔

پھر اخبار پیغام صلح کی اسی جلد کے شمارہ نمبر ۶ کی اشاعت میں یہاں تک مذکور ہے کہ ان دنوں اسمبلی کے ممبر یہ عہد کرتے پھرتے تھے کہ اسمبلی میں جا کر:۔

احمدیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ اقلیت منظور کرانے کی کوشش کروں گا۔[2]

علامہ اقبال کو اگر ایک وقت تک مرزائیوں کے تفصیلی نظریات کی اطلاع نہ ہو سکی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ علامہ اقبال کے اپنے نظریات میں کوئی کمزوری تھی۔ نہیں ان کا اپنا اعتقاد اس وقت بھی اتنا ہی پختہ تھا جتنا کہ وہ بعد میں ظاہر ہوا۔ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کا ایک مضمون ۱۹۱۴ء کی ابتداء میں "لمعات" شائع ہوا تھا۔ جسے اخبار الفضل نے بھی جلد ۱ کے شمارہ ۱۲۵ میں نقل کیا تھا:۔

وہ (ڈاکٹر اقبال) لکھتے ہیں کہ جو شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی ایسے نبی کے آنے کا قائل ہے جس کا انکار مستلزم کفر ہو وہ خارج از دائرہ اسلام ہے۔ اگر قادیانی جماعت کا بھی یہی عقیدہ ہے تو وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔[3]

رہا یہ مسئلہ کہ قادیانی فرقہ کے نزدیک مرزا غلام احمد کا انکار "مستلزم کفر" ہے یا نہیں۔ سو اس کے لیے

---

[1] اخبار پیغام صلح جلد ۲۴ شمارہ ۲۸ فروری ۱۹۳۶ء [2] پیغام صلح ۹ ستمبر ۱۹۳۶ء [3] الفضل ۱۱ اپریل ۱۹۱۴ء

اتنی بات یاد رکھیئے کہ علامہ اقبال مرحوم کے والد مرحوم پہلے مرزا غلام احمد قادیانی کے وابستگان میں سے تھے پھر جب وہ مرزائیت کی حقیقت سے واقف ہوئے تو انہوں نے ان کی جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس پر مرزا صاحب نے انہیں لکھا کہ آپ کا نام نہ صرف جماعت سے بلکہ اسلام سے ہی کاٹ دیا گیا ہے۔ اس واقعہ کا کچھ تذکرہ مرزا بشیرالدین کے بھائی مرزا بشیر احمد نے بھی سیرت المہدی کی تیسری جلد میں کیا ہے اور اس مسئلے کی بحث کہ مرزائیوں کے نزدیک مرزا غلام احمد کا انکار "مستلزم" کفر ہے یا نہیں۔ احقر کی کتاب عقیدۃ الامۃ فی معنی ختم النبوۃ میں نہایت مفصل طور پر موجود ہے۔ بہرحال اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ علامہ اقبالؒ کی اسلامی خدمات میں سے عقیدہ ختم نبوت کی خدمت ملت اسلامیہ پر ایک ایسا احسان ہے کہ اسے بیان کرنے کے بغیر یادِ اقبال کا کوئی حق ادا نہیں ہو سکتا۔ آپ کی (مولانا محمد علی صاحب) کی یہ ہمت لائق تحسین ہے کہ آپ نے سمندری کے اس جلسہ یوم اقبال میں علامہ اقبالؒ کی اس عظیم اسلامی خدمت کو تفصیل سے بیان کیا۔ رب العزت آپ کو جزائے خیر دے۔ والسلام

احقر خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: جمعہ کی نماز کے بعد کل کتنی سنتیں ہیں۔ کیا جمعہ کے بعد چار اور دو مسلسل سنتیں ہیں اور کیا بعد نماز جمعہ فقیہہ اعظم حضرت امام ابوحنیفہؒ کی فقہ کے مطابق چھ سنتیں پڑھنی جائز ہیں تفصیل سے روشنی ڈالیئے؟

سائل محمد اقبال قریشی مدرس بالا ارائیں ضلع بہاولنگر

جواب: جمعہ کی نماز کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قولی ارشاد کے مطابق چار سنتیں ہیں[1] اور عملاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جمعہ کے بعد دو سنتیں پڑھنا ثابت ہے۔ ان دونوں امور کی روشنی میں چار اور دو کو جمع کر لینا ہی بہتر ہے اور ایسا ہی سیدنا حضرت علی المرتضیٰؓ نے بھی فرمایا ہے:۔

من کان مصلیاً بعد الجمعۃ فلیصل ستاً۔[2]

ترجمہ: جو شخص جمعہ کی نماز کے بعد نماز پڑھنا چاہے اسے چاہیئے کہ چھ رکعتیں پڑھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی جمعہ کے بعد چھ رکعتیں پڑھا کرتے تھے دو پہلے اور چار بعد میں۔[3] حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت علقمہ بن قیسؒ، امام ابراہیم نخعیؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام محمدؒ اور حضرت اسحٰقؒ سے جمعہ کی نماز کے بعد چار رکعت سنت منقول ہیں۔ لیکن حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابوموسےٰؓ، حضرت عطاءؒ، امام سفیان ثوریؒ اور حضرت امام ابویوسفؒ سے نمازِ جمعہ کے بعد چھ رکعت سنت منقول ہے۔ امام ابویوسفؒ ان کی ترتیب میں چار رکعت کو مقدم کرتے ہیں۔ اور حضرت علیؓ اور حضرت ابن عمرؓ کے عمل میں دو رکعت پہلے اور چار رکعت بعد

---

[1] صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۲۸۸ [2] طحاوی جلد ۱ صفحہ ۹۹ [3] طحاوی

میں ملتیں[1]۔ ہر دو مسلک کے دلائل اعلاء السنن جلد ۷ صفحہ طبع قدیم میں مذکور ہیں۔ ہمارے اکابر کا عمل چھ رکعت کی سنیت پہ ہے۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں :-

فدل ان السنۃ بعد الجمعۃ ست رکعات[2]

ترجمہ: ہوا اس سے پتہ چلا کہ نمازِ جمعہ کے بعد چھ سنتیں ہیں۔ ۲+۴ یا ۴+۲

مزید تفصیل کے لیے بذل المجہود جلد ۲ صفحہ ۱۹۹ اور العرف الشذی صفحہ ۲۳ کا مطالعہ کیجئے۔

حاصل یہی ہے کہ جمعہ کی نمازِ فرض کے بعد چھ رکعت سنتیں ہیں، چار پہلے اور دو بعد میں، یا دو پہلے اور چار بعد میں۔ ہر دو ترتیبیں منقول ہیں۔ احقر کا عمل یہ ہے کہ فرض نماز کے بعد اگر جگہ تبدیل کرنے کا موقع مل جائے تو دو پہلے اور چار بعد میں پڑھتا ہوں اور سنت حضرت علی المرتضیٰؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی سنت کا امتثال ہوتا ہے اور جگہ تبدیل کرنے کا موقع نہ ملے تو پھر چار پہلے اور دو بعد میں پڑھتا ہوں تاکہ ایک ہی جگہ دو رکعت کی نماز دو دفعہ نہ پڑھی جائے۔ اس صورت میں امام ابو یوسفؒ کے فتوے پر عمل کر لیتا ہوں۔ یہ امر بھی پیشِ نظر رہے کہ حضرت امام ابو یوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ کا جب کبھی اپنے استاد حضرت امام اعظمؒ سے اختلاف ہوتا ہے تو اس میں ان حضرات کا مسلک مختار بھی دراصل حضرت امامؒ کی ہی ایک دوسری روایت میں منقول ہوتا ہے۔ پس ان کے فتویٰ پر عمل بھی دراصل حضرت امام کے فتوے پر ہی عمل ہے اور ایسے فروعی مسائل میں اختلاف کوئی مضر بھی نہیں۔ حضور رحمتِ مرتبت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت کا ایسا اختلاف ایک رحمت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سوال : کیا بیوی کی ماسی سے نکاح جائز ہے یا ناجائز۔ تفصیلاً آگاہ فرمائیں؟ سائل شوکت علی پردانہ فاروق گنج لاہور

جواب : یہ نکاح جائز ہے۔ حرمت کا کوئی سبب موجود نہیں (ہاں پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے اس کی خالہ سے نکاح جمع بین الاختین کے حکم میں ہے)۔ کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ ۲۹ مئی ۱۹۶۴ء

سوال : ہمارے ایک تنظیمی دوست جناب محمد منشا صاحب کا چک ۲۵۱ / 5.B ڈاک خانہ خاص براستہ گگو تحصیل پاکپتن سے ایک استفسار موصول ہوا جو امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے متعلق ہے۔ صاحبِ موصوف لکھتے ہیں کہ مولانا عبدالقادر صاحب حصاری اہلحدیث جو ابھی ابھی ان کے چک میں رہائش پذیر ہوئے وہ اس اختلاف کو بڑا ہوا دے رہے ہیں۔ وہاں کے اہلسنت مولوی علی محمد صاحب انہیں جواب دے رہے ہیں۔ پھر جناب منشا صاحب نے بعض روایات کی تحقیق طلب کی ہے اور حوالے مانگے ہیں۔ چونکہ اُن کا مکتوب گرامی بڑا طویل تھا۔ اس لیے بندہ

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے عینی شرح بخاری جلد ۳ صفحہ ۲۳۵ [2] فتح الملہم جلد ۲ صفحہ ۴۲۰

اسے خلاصہ کی صورت میں پیش کر رہا ہے۔ نور محمد انور منیجر "دعوت"

جواب : نہایت افسوس ہے کہ بعض اہل حدیث حضرات اس نازک دور میں جب کہ مخالفین اسلام کے درپے انہدام ہیں۔ ان فروعی مسائل کو ہوا دے رہے ہیں۔ ان مسائل میں اختلاف خود صحابہ کرامؓ کے وقت میں بھی موجود تھا۔ یہ فروعی اختلافات تعلیم و تدریس کی مسند پر مناسب ہیں۔ لیکن دعوت و ارشاد کے اصولی سٹیج ان فروعی اختلافات کی معرکہ آرائی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

ہفت روزہ "دعوت" مسلکِ اہل سنت کا اصولی ترجمان ہے۔ مقامِ سنت، ختمِ نبوت اور ناموسِ صحابہؓ جیسے اصولی موضوعات اس کا مرکزِ توجہ ہیں۔ فروعی اختلافات کی معرکہ آرائی نہ ہمارا موضوع ہے نہ ہم اُسے ملک و ملت کی کوئی خدمت سمجھتے ہیں۔ اس مسئلے میں صحابہ کرامؓ میں بھی کچھ اختلاف ضرور موجود تھا اور ہم صحابہؓ کے باہمی اختلافات میں ہر ایک طبقے کو اپنی جگہ پر حق سمجھتے ہیں۔ ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جیسے اکابر صحابہؓ تو یہ کہیں کہ سورۂ فاتحہ پڑھے بغیر نماز نہیں ہوتی "مگر امام کے پیچھے" اور یہ کہ امام کے پیچھے کسی طرح قرآن پڑھنا درست نہیں وغیرہ وغیرہ اور ہم یہ جسارت کریں کہ جو شخص امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھتا اس کی نماز نہیں ہوتی۔ کیا کسی صحابیؓ نے یہ کہا ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی۔ ایسی صریح نقل آپ کو کتب حدیث میں کہیں نہ ملے گی۔ اس کے برعکس یہ بات مل جائے گی کہ سورۂ فاتحہ پڑھے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ مگر یہ کہ کوئی امام کے پیچھے ہو[1]۔ صحابہؓ میں سے کسی کو باطل پر کہنا جائز نہیں۔ (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ)

اس سے تو اکابر صحابہؓ کا تخطیہ لازم آتا ہے اور صحابہ کرامؓ کی مخالفانہ تنقید بالکل حرام ہے۔ یہ ان نفوسِ قدسیہ کی تنقیصِ شان ہے۔ باقی جناب محمد منشا صاحب نے یا مولوی محمد علی صاحب نے اگر اس مسئلے کی پوری تحقیق کرنی ہو تو وہ حضرت مولانا محمد سرفراز خاں صاحب شیخ الحدیث نصرت العلوم گوجرانوالہ کی کتاب احسن الکلام کا مطالعہ فرمائیں۔ احقر کی کتاب مصباح الظلام فی عدم وجوب الفاتحہ خلف الامام بھی دیکھ لیں۔ اس میں میرے ان اختلافات کا ذکر ہے جو اہلحدیث کے نامور عالم مولانا محمد ابراہیم صاحب میر سیالکوٹی مرحوم کے ساتھ پیش آئے تھے۔ انشاء اللہ العزیز ان تالیفات سے مغالطے اور شبے کا پوری طرح ازالہ ہو جائے گا۔ ہفت روزہ دعوت کے لیے ان اختلافات کا مرکز بننا مناسب نہیں۔ خدا کرے کہ غیر مقلدین جو فروعی اختلافات کو اُچھالنا ہی دین و ملت کی بڑی خدمت سمجھتے ہیں حقیقتِ حال کا جائزہ لیں اور وقت کی نبض پہ ہاتھ رکھیں۔ صحیح یہی ہے کہ زمانے کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ ۵ جون ۱۹۶۴ء

---

[1] جامع ترمذی جلد ۱ صفحہ ۴۲

سوال ا: حضرت مولانا محمد رمضان صاحب خطیب جامع مسجد اکال گڑھ راولپنڈی کا مکتوب گرامی

بخدمت حضرت علامہ صاحب سرپرست ہفت روزہ دعوت لاہور

السلام علیکم

۲۹ مئی کے "دعوت" میں فاروق گنج کے شوکت علی صاحب کا یہ سوال درج ہے کہ کیا بیوی کی ماسی سے نکاح جائز ہے۔ آپ نے یہ جواب تحریر فرمایا ہے کہ ہاں جائز ہے حرمت کا کوئی سبب موجود نہیں۔ جواب درست ہے لیکن ذرا مجمل ہے۔ آپ ذرا تفصیل فرمادیں کہ اگر بیوی زندہ ہو اور نکاح میں موجود ہو تو کیا اس نکاح کے ہوتے ہوئے بھی اس کی خالہ سے نکاح جائز ہے؟ دعوت کی آئندہ اشاعت میں اس مسئلے کی وضاحت کر کے ممنون فرمائیں۔

الجواب: اگر بیوی زندہ اور موجود ہو تو اس کی خالہ سے نکاح کرنا "جمع بین الاختین" کو مستلزم ہے اس لیے یہ نکاح جائز نہیں۔ مذکورہ سابقہ سوال کی رُو سے نکاح صرف اسی صورت میں جائز تھا کہ حرمت کا کوئی سبب موجود نہ ہو اور یہاں "جمع بین الاختین" حرمت کا سبب موجود ہے۔ بیوی جس طرح اپنی سگی بہن کے ساتھ ایک نکاح میں جمع نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح بیوی کی خالہ، پھوپھی، بھانجی اور بھتیجی ہے سب بہن کے حکم میں ہیں اور ان میں سے کسی کو بھی بیوی کے ساتھ نکاح میں جمع نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں شیعہ کے ہاں پھوپھی بھتیجی ایک نکاح میں جمع ہو سکتی ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سوال ۲: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس باب میں کہ ایک شخص اپنی بیوی کو گھر میں چھوڑ کر بغرض تجارت یا کسی اور کام کے لیے صرف چند دنوں تک کہیں چلا گیا۔ مگر عرصہ گزر گیا کہ وہ واپس نہیں آیا۔ اب اس کے متعلق نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ مر گیا ہے نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ زندہ ہے۔ اب اس کی بیوی نکاح ثانی کے لیے کب تک انتظار کرے۔ بفرضِ محال کچھ عرصہ کے بعد نکاح ثانی کر لیا، نکاح ثانی سے اولاد حاصل ہونے کے کچھ عرصہ بعد اس کا پہلا خاوند واپس آگیا۔ اب یہ بیوی پہلے خاوند کی ہے یا دوسرے کی؟ نیز دوسرے خاوند سے پیدا شدہ اولاد جائز بالنکاح ہوگی یا جائز بالزنا؟ جب پہلا خاوند واپس آیا تو اس نے دوسرے خاوند سے اپنی بیوی کا مطالبہ کیا۔ دوسرا دینے سے انکاری ہوا۔ آیا پہلا خاوند دعوے دائر کر سکتا ہے یا نہیں۔ اگر کرے تو حکماً بیوی کسے ملے گی؟ سائل۔ محمد رمضان

جواب: فقہائے حنفیہ نے مفقود الخبر کی زوجہ کے متعلق حضرت امام مالک کے فیصلہ پر فتوےٰ دیا ہے:۔

قال فی البزازیہ الفتویٰ فی زماننا علیٰ مذہب مالک۔

اگر کوئی شخص لاپتہ ہو جائے اور اس کی موت وحیات کی کچھ خبر نہ ہو تو چار برس گزرنے پر اس عورت کی اس نکاح سے تفریق کرادی جائے۔ اگر قاضی شرع موجود ہو تو اس کے پاس تفریق کرانے کی درخواست گزاری جائے۔ ولزوجة المفقود الرفع الی القاضی۔

ترجمہ۔ مفقود کی بیوی کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ قاضی کے پاس مقدمہ لے جائے۔

اور اگر قاضی موجود نہ ہو تو مسلمانانِ محلہ یا شہر باہم مل کر ایک پنچائتی فیصلے سے ان میں تفریق کرادیں لیکن ان میں کوئی عالمِ دین بھی ضرور ہونا چاہیئے۔ اس تفریق کے بعد عورت عدتِ وفات کے چار ماہ اور دس دن پورے کرے۔ شامی میں ہے:۔

تعتدّ زوجة المفقود عدة الوفات بعد مضي اربع سنين۔

ترجمہ۔ مفقود کی بیوی چار سال گزرنے کے بعد عدتِ وفات پوری کرے گی۔

اس وفات کو پُورا کرنے کے بعد وہ کسی اور شخص سے نکاح کر سکتی ہے۔ اعلانِ تفریق اور اس کے بعد عدت کا شمار بہت سے فوائد وحکم پر مشتمل ہے۔

اس صورت کے باوجود اگر شوہر اوّل واپس آجائے تو یہ عورت اسی پہلے خاوند کو ملے گی۔ ان کا وہی نکاح باقی رہے گا، کسی نئے نکاح کی ضرورت نہیں۔ دوسرے شخص کا نکاح پہلے خاوند کے آتے ہی جاتا رہا۔ کسی مزید طلاق کی ضرورت نہیں۔ پہلے خاوند کے مفقود الخبر ہونے کے دور میں اس عورت اور مرد کے مابین جو ازدواجی تعلقات قائم رہے وہ زنا تصور نہ ہوں گے اور اس کی اولاد جائز اولاد قرار دی جائے گی اور وہ اسی دوسرے مرد کو ہی ملے گی۔ درمختار میں ہے:۔

غاب عن امراته فتزوجت باخر وولدت اولاداً ثم جاء الزوج الاول فالاولاد للثانی.

ترجمہ۔ وہ اپنی بیوی سے چھپا رہا یہاں تک کہ اس نے اور نکاح کر لیا اور اس کے بچے بھی ہوئے پھر پہلا خاوند آگیا تو دوسرے خاوند کی اولاد اسی دوسرے کی ہی شمار ہوگی۔

پہلے خاوند کے آنے کے بعد یہ دوسرا خاوند اگر اس عورت کی واپسی سے انکار کرتا ہے تو وہ مجرم ہے اور اس دوران میں وہ اس عورت سے ازدواجی تعلقات قائم رکھتا ہے تو اُسے زنا تصور کیا جائے گا اور اس دور کی اولاد جائز اولاد تصور نہیں ہوگی۔ ہاں اگر شوہر اوّل طلاق دے دے تو عدتِ مطلقہ شمار کرنے کے بعد اس کے دوسرے خاوند سے پھر نکاح درست ہو سکتا ہے۔ مگر نکاح کی ضرورت پھر نئے سرے سے ہوگی اور غیبوبیت اوّل کے دور کا یہ دوسرے خاوند کا پہلا نکاح قائم تصور نہیں ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال : مرزائی کمپنی کے ایجنٹ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مسیلمہ کذاب کے خلاف جو چڑھائی کی تھی وہ اس کی بغاوت کی بناء پر کی تھی، اس کے دعوئے نبوت کی بناء پر نہ تھی۔ اس کی تحقیق مقصود ہے کہ کس بناء پر وہ چڑھائی کی گئی تھی؟

سائل، ماسٹر محمد ابراہیم

جواب : حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مسیلمہ کذاب کے خلاف جو چڑھائی کی وہ بغاوت کی بناء پر نہ تھی، انکارِ ختمِ نبوت کی بناء پر تھی۔ مسیلمہ کے ایلچی ایک مرتبہ خود حضور ختمی مرتبت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے تھے اور اپنے مسیلمہ کذاب پر ایمان لانے کا اقرار کیا تھا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا:۔

لولا انّ الرسل لا تقتل لضربت اعناقکما۔[1]

ترجمہ۔ اگر ایلچیوں کا قتل کرنا خلافِ اصول نہ ہوتا تو میں تمہاری گردنیں اڑا دیتا۔

ان کا سرغنہ اور مسیلمہ کذاب کا مؤذن عبداللہ بن نواحہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفاتِ شریفہ کے مدتوں بعد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی عدالت میں پیش ہوا تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا:۔

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لولا انک رسول لضربت عنقک فانت الیوم لست برسول۔[2]

ترجمہ۔ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا تھا کہ تو اگر ایلچی نہ ہوتا تو تیری گردن اڑا دیتا۔ لیکن آج تو تو ایلچی نہیں ہے۔

پھر آپ نے امیر کوفہ قرظہ بن کعب کو حکم دیا اور انہوں نے اُسے بر سرِ عام قتل کر دیا۔ اس طرح وہ سالہا سال پہلے کا منشاء رسالت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ہاتھوں پر پورا ہوا۔

سنن دارمی کی ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے ان مرتدین کی مسجد کے بھی گرانے کا حکم دیا اور وہ نام نہاد مسجد منہدم کر دی گئی۔[3]

اب سوال یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے انہیں باغی سمجھا ہوا تھا یا مرتدین؟ اس کے لیے ہمیں ان کے بارے میں صراحت سے مرتدین کے الفاظ ملتے ہیں۔ صحیح بخاری کتاب الکفالہ میں ہے:۔

قال جریر والاشعث لعبد اللہ بن مسعود فی المرتدین استتبھم وکفّلھم فتابوا وکفلھم عشائرھم۔[4]

---

[1] سنن ابی داؤد جلد ۲ صفحہ ۳۸ [2] معجم طبرانی صفحہ ۲۹ [3] دیکھیئے جمع الفوائد من جامع الاصول و مجمع الزوائد جلد ا صفحہ ۲۸۴ طبع میرٹھ [4] صحیح بخاری جلد ا صفحہ ۳۰۶

ترجمہ۔ جریر اور اشعث نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی توجہ اس طرف منعطف کرائی کہ آپ ان مرتدین کو توبہ کی طرف بلائیں اور اُن کی کفالت کریں۔ پس وہ تائب ہو گئے اور آپ نے ان کے کنبوں کی کفالت فرمائی۔

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ جنہیں مرزائی حضرات اپنے وقت کا مجدد تسلیم کرتے ہیں لکھتے ہیں:۔

انّما قاتل بنی حنیفۃ لکونھم اٰمنوا بمسیلمۃ الکذاب واعتقدوا بنبوتہ۔[1]

ترجمہ۔ حضرت ابوبکرؓ نے بنی حنیفہ سے اس لیے جہاد کیا تھا کہ وہ مسیلمہ کذاب پر ایمان لائے ہوئے تھے اور اس کی نبوت کے قائل تھے۔

پس یہ خیال غلط ہے کہ حضرت صدیقِ اکبرؓ کی مذکورہ بالا چڑھائی بنی حنیفہ کی بغاوت کی بناء پر تھی۔ دعوئے نبوت کی بناء پر نہ تھی۔ حافظ ابن تیمیہؒ یہ بھی لکھتے ہیں:۔

فان الصدیق لم یقاتل احدًا علیٰ طاعتہ ولا الزم احدًا ببیعتہ۔[2]

ترجمہ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کسی شخص کے ساتھ اس کی بغاوت پر یا اپنی خلافت منوانے کے لیے جہاد نہیں کیا۔

اس سے پہلے حافظ ابن تیمیہؒ اس پر اجماع ان لفظوں میں نقل کر چکے ہیں:۔

فلم نعلم احدًا انکر قتال اھل الیمامۃ وان مسیلمۃ الکذاب ادعی النبوۃ وانّھم قاتلوہ علیٰ ذلک۔[3]

ترجمہ۔ آج تک کسی نے اس امر سے انکار نہیں کیا کہ حضرت ابوبکرؓ کا بنی حنیفہ سے جہاد مسیلمہ کذاب کے دعوئے نبوت کی بناء پر ہی تھا۔

پس مرزائی مبلغ کی مذکور فی السوال تاویل نہایت رکیک اور غلط ہے اور کسی حقیقت پر مبنی نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال : کیا سید مقتدی اور امتی امام بن سکتا ہے؟ یہ بھی بتائیں کہ حضرت علی المرتضیٰؓ کے علاوہ اور کسی بزرگ کی اولاد کو سید کیوں نہیں کہتے؟

سائل۔ سید عمران شاہ خریدار دعوت از مانسہرہ

جواب : سید اور امتی کے الفاظ کا اس طرح استعمال یہ صرف شیعہ ایجاد ہے۔ اہل علم کے ہاں اس کا کوئی وزن نہیں۔ ان لوگوں نے سید اور امتی کو بلا دلیل ایک متقابل اصطلاح بنا دیا ہے جو اصولاً غلط ہے۔ امت کا امتیاز نسبت پیغمبر سے ہے اس کے سارے ماننے والے خواہ وہ اس کی اولاد ہوں یا دوسرے عامۃ الناس سب اس

---

[1] منہاج السنۃ جلد ۲ صفحہ ۲۳ مطبوعہ مصر [2] ایضاً جلد ۲ صفحہ ۲۳۱ [3] ایضاً جلد ۲ صفحہ ۲۳۱

کی امت ہیں جس طرح امام ایک ہوتا ہے اور باقی سارے مقتدی۔ اسی طرح پیغمبر کے جتنے بھی ماننے والے ہوتے ہیں سب اس کے امتی ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان افراد میں سے اگر کوئی نبی بھی ہو تو اپنے اعلیٰ مرکز کی نسبت سے وہ بھی امتی شمار ہوگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت میں جس طرح اور افراد بنی اسرائیل داخل تھے۔ اسی طرح حضرت ہارون علیہ السلام بھی اپنے اعلیٰ مرکز کی نسبت سے باوجود نبی ہونے کے حضرت موسےٰ علیہ السلام کے امتی تھے۔ حضرت عیسےٰ علیہ السلام جب قربِ قیامت میں نزول فرمائیں گے تو وہ بھی باوجود نبی ہونے کے حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت میں داخل ہوں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے اس نسبت کے اعتبار سے امتی کا لفظ سلف کے کلام میں عام ملتا ہے۔ اس امت میں امتی نبی کا وجود عقیدہ ختم نبوت کے ہرگز منافی نہیں۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ اس کی نبوت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے کی ہو۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہے کہ سادات بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہیں اور ان کا امتی ہونا ان کے سید یا اہلبیت میں سے ہونے کے منافی نہیں، انہیں یہ دونوں امتیاز حاصل ہیں۔ نہایت افسوس ہے کہ بعض نادان دوستوں نے سید اور امتی کو خواہ مخواہ ایک متقابل اصطلاح بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے امور میں عوام کا کوئی اعتبار نہیں۔ سید بہرصورت امتی بھی ہیں۔

سید امتی مقتدی ہو اور غیر سید امتی امام تو نماز بالکل درست ہے۔ امامت غیر سید کرا سکتا ہے سید عام طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کو کہا جاتا ہے۔ اس صورت میں حضرت امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما سید ہیں اور ان کے والد ماجد حضرت علی المرتضیٰ رضؓ قریشی ہاشمی ہیں اور یہ امر متعدد روایات سے ثابت ہے کہ حضرات حسنینؓ حضرت علی المرتضیٰؓ کے پیچھے نمازیں پڑھتے رہے۔ علاوہ ازیں اگر سید کی امامت غیر سید نہ کرا سکتا تو حضرت علی المرتضیٰؓ ہاشمی حضرت صدیق اکبرؓ غیر ہاشمی کے پیچھے نماز کس طرح پڑھتے لیکن حضرت علیؓ حضرت صدیق اکبرؓ کے پیچھے نمازیں پڑھتے رہے[1] حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں حضرت علی المرتضیٰؓ جمعہ کی نماز حضرت فاروق اعظمؓ کی اقتداء میں ہی ادا فرماتے اور حضرات حسنینؓ رضی اللہ عنہما بھی وہیں ہوتے[2] اور تو اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بعض اوقات حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت صدیق اکبرؓ کی اقتداء میں نماز پڑھی۔ اب اگر سید کی امامت غیر سید کے لیے جائز نہ ہوئی تو سید الانبیاءؑ کبھی ان غیر سادات کے پیچھے نماز نہ پڑھتے۔ آپ کی یہ اقتداء محض جوازِ اقتداء کے لیے تھی۔

۲۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ صرف حضرت علی المرتضیٰؓ کی اولاد ہی سید ہے۔ ہر ہاشمی کو سید کہہ سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے عباسی خاندان کے لوگ بھی سید ہیں۔ نجف اشرف کے مجتہد ملا محمد کاظم الخراسانی کے فتاویٰ ذخیرۃ العباد میں ہے۔

---

[1] دیکھئے احتجاج طبرسی صفحہ ۶۰ مطبوعہ نجف اشرف [2] دیکھئے کشف الغمہ علی بن عیسیٰ اردبیلی۔

س: آیا سادات میں یہ شرط ہے کہ پیغمبر کے دادا حضرت ہاشم کی اولاد سے ہوں یا نہیں؟
ج: شرط ہے اگرچہ حضرت امیر المومنین علی بن طالب علیہ السلام کی اولاد سے نہ ہوں[1]
واللہ اعلم بالصواب۔ کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: کیا نکاح سے قبل لڑکا لڑکی کو دیکھ سکتا ہے۔ اس کی شرعی حیثیت بذریعہ "دعوت"، واضح فرمائیں؟

سائل۔ شوکت علی پیر آنہ فاروق گنج لاہور

جواب: ہاں دیکھ سکتا ہے۔ بشرطیکہ یہ دیکھنا نکاح کی پسندیدگی کے لیے ہو۔ اس دیکھنے کے بعد نکاح ہونے تک وہ لڑکی اجنبیہ ہی رہے گی۔ اور اسے اس نکاح کرنے والے لڑکے سے پردہ کرنا بہرحال واجب ہوگا۔ نکاح کے لیے پسند کرنے کی خاطر دیکھنا حدیث کی رو سے جائز ہے۔

سنن نسائی جلد ۲ باب اباحۃ النظر قبل التزویج میں ہے کہ ایک شخص نے ایک انصاری عورت سے نکاح کا ارادہ کیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

هل نظرت الیها[2] ترجمہ۔ کیا تُو نے اسے دیکھ بھی لیا ہے۔

اس نے کہا کہ نہیں۔ اس پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ وہ اسے دیکھ بھی لے۔ یہ حدیث غالباً صحیحین میں بھی ہے۔ ہاں یہ احتیاط کی جائے کہ دیکھنا منگنی سے پہلے ہو۔ منگنی کے بعد اگر انکار کر دیا جائے تو یہ زیادہ اذیت کا سبب ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سوال: ہمارے یہاں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ عید اور جمعہ کی نماز کے لیے شہر کی پابندی صحیح نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ۱۵ مئی کے "دعوت" میں علامہ صاحب نے حضرت علیؓ کی جو حدیث پیش کی ہے وہ صحیح نہیں۔ اس کی تحقیق سے آگاہ فرمائیں؟

سائل۔ خورشید احمد خریدار "دعوت" جہلم

جواب: عید اور جمعہ حنفیہ کے نزدیک شہر میں ہی ادا ہو سکتے ہیں۔ تاہم اس سے انکار نہیں کہ یہ مسئلہ ائمہ مجتہدین میں ایک اختلافی مسئلہ رہا ہے۔ فروعی مسائل کی چھان بین اور ائمہ کرام کے فقہی مسائل کی تردید و تائید "دعوت" کا موضوع نہیں۔ اس کا موضوع زیادہ تر اصولی مسائل ہیں۔ اسے ان فروعی اختلافات میں الجھانا اپنے ایک اصولی موقف کو کمزور کرنا ہے۔ ۱۵ مئی کے پرچہ میں جو حدیث پیش کی گئی تھی۔ وہ دوسروں کی تردید کے لیے نہیں محض اپنا مسلک بیان کرنے کے لیے تھی۔ حضرت علیؓ نے بیان فرمایا ہے کہ عید اور جمعہ شہر کے سوا کہیں جائز نہیں ——— یہ حدیث صحیح

---

[1] ذخیرۃ العباد صفحہ ۲۱۱ [2] سنن نسائی جلد ۲ صفحہ ۶۰

ہے اور حضرت علی المرتضیٰؓ سے قابلِ اعتماد ذرائع سے منقول ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ شافعی المذہب ہونے کے باوجود تصریح فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔[1]

ہاں اس کے مرفوع ہونے میں کلام ہے۔ اس روایت کے حضرت علی المرتضیٰؓ سے منقول ہونے میں کلام نہیں۔ یہ اثر قواعد کے بالکل مطابق بالکل صحیح اور لائق اعتماد ہے —— اظہارِ حقیقت کے لیے ہم نے یہ چند حوالے پیش کر دیئے ہیں۔ آئندہ ہم اس بحث کو جاری رکھنا نہیں چاہتے۔ مزید تفصیل کے لیے آپ احسن القریٰ اور دوسرے دینی جرائد کی طرف رجوع فرمائیں۔ واللہ اعلم بالصواب

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ ۱۹ر جون ۱۹۶۴ء

۱۔ امہات المؤمنینؓ کے اسمائے گرامی مع مختصر حالاتِ زندگی تحریر فرمائیں۔ اگر سب حالات نہ دے سکیں تو بعض زیادہ مشہور ازواج مطہراتؓ کے ہی حالات تحریر کر دیں۔ نیز یہ بھی تحریر فرمائیں کہ حضور پُرنور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کے اسمائے گرامی مع نام والدہ کیا کیا تھے؟

۲۔ مشہور روایت ہے کہ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بادشاہ کو خواب میں مل کر یہ بتایا تھا کہ فلاں حلیہ کے دو شخص (یہودی) سُرنگ لگا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ مبارک کو قبر سے نکال لے جانا چاہتے ہیں۔ استفسار کرنے والے مجھ سے پُوچھ رہے ہیں کہ یہ روایت کہاں ہے۔ براہِ نوازش پُوری روایت مع اسناد پیش فرمائیں؟

سائل۔ اختر داصفی گوجرانوالہ

الجواب: امہات المؤمنین رضوان اللہ علیہن اجمعین کے اسماء گرامی:۔

① حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا
② حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا
③ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا
④ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا
⑤ حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا
⑥ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا
⑦ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا
⑧ حضرت جویریہ بنت الحارث رضی اللہ عنہا
⑨ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا
⑩ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا
⑪ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا

[1] دیکھئے درایہ ص۱۳۱ اسناد صحیح، عینی شرح بخاری جلد۳ ص۲۶۴، بنایہ شرح ہدایہ جلد۱ ص۹۸۴ میں اسے امام ابو یوسف سے مرفوع بھی نقل کیا گیا ہے اور اسی طرح حافظ جصاص رازی احکام القرآن جلد۳ ص۴۴۵ پر اسے مرفوعاً نقل کرتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے پہلا نکاح حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے ہوا۔ حضورؐ کی عمر اس وقت پچیس سال کی تھی اور حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس سال کی تھی۔[1] اس نکاح کا خطبہ ابوطالب نے پڑھا تھا۔ اس وقت تک حضورؐ کی بعثت نہ ہوئی تھی۔ یعنی آپ نے ابھی تک نبوت کا اعلان نہ فرمایا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت نکاح خواں کے اسلام لانے کا کوئی سوال نہ تھا۔ حضرت خدیجہؓ پہلے دو یا تین شوہروں سے بیوہ ہو چکی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کا چوتھا نکاح تھا۔ پہلے خاوند ابوہالہ سے ایک لڑکا۔ دوسرے خاوند عتیق سے ایک لڑکی تھی (جس کا نام ہند تھا) اور تیسرے خاوند صیفی سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے ہاں دو لڑکے حضرت قاسمؓ اور حضرت عبداللہؓ (ان کا لقب طاہر وطیب تھا) پیدا ہوئے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے نکاح سے آپ کے ہاں چار لڑکیاں زینب، رقیہ، ام کلثوم اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہن پیدا ہوئیں۔ شیخ صدوق حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث مبارکہ نقل کرتے ہیں:۔

عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال ولد لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من خدیجۃ القاسم والطاہر وھو عبد اللہ و ام کلثوم ورقیۃ وزینب وفاطمۃ وتزوج علی بن ابی طالب علیہ السلام فاطمۃ وتزوج ابو العاص بن الربیع وھو رجل من بنی امیۃ زینب وتزوج عثمان بن عفان ام کلثوم فماتت ولم یدخل بہا فلما ساروا الی بدر زوجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رقیہ وولد لرسول اللہ ابراھیم من ماریہ القبطیہ وھی ام ابراھیم ام ولد۔

ترجمہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بطن سے قاسمؓ، طاہرؓ، ام کلثومؓ، رقیہؓ، زینبؓ اور فاطمہؓ پیدا ہوئے۔ حضرت فاطمہؓ کا نکاح حضرت علیؓ سے ہوا۔ حضرت زینبؓ کا ابوالعاصؓ سے اور حضرت ام کلثومؓ کا حضرت عثمانؓ سے، ان کا انتقال ہوا تو جنگِ بدر کے دنوں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رقیہؓ بھی حضرت عثمانؓ کے نکاح میں دے دیں۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے ابراہیمؓ بھی پیدا ہوئے۔

پھر حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی نقل فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

ان خدیجۃ رحمہا اللہ ولدت منی طاہراً وولدت منی القاسم وفاطمۃ ورقیہ وام کلثوم وزینب۔[1]

[1] خصائل شیخ صدوق جلد۲ ص۱۲۸ مطبوعہ طہران

ترجمہ: خدیجہ پر خدا رحم کرے جس سے میرے ہاں طاہرؓ، قاسمؓ، فاطمہؓ، رقیہؓ، ام کلثومؓ اور زینبؓ پیدا ہوئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام اولاد ماسوائے حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے (جو حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھے) حضرت خدیجہؓ کے بطن سے ہوئی۔[1]

حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے قرب الاسناد میں بسندِ معتبر منقول ہے کہ:۔

از برائے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم از خدیجہؓ متولد شدند۔ طاہرؓ و قاسمؓ و فاطمہؓ و ام کلثومؓ و رقیہؓ و زینبؓ۔[2]

(۱) حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا

آپ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نکاح میں ۲۴ سال کے قریب رہیں۔ بعثت کے آٹھ سال بعد ہجرت سے تین برس پہلے ۶۵ سال کی عمر میں آپ نے انتقال فرمایا۔ آپ کی زندگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی اور نکاح نہیں فرمایا۔

(۲) حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دوسری بیوی ہیں۔ ۱۰ نبوی میں آپ کے والد زمعہ نے چار سو درہم مہر پر آپ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح پڑھا۔[3]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آخر عہدِ خلافت میں آپ کا انتقال ہوا۔ علامہ ابن عبدالبر نے الاستیعاب میں اس کی تصریح کی ہے۔

(۳) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک زوجہ ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور خاوند کو نہیں دیکھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دینِ قیم آئندہ امت تک روایۃً اور درایۃً نقل کرنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بیوی حضرت صدیقہؓ کی ہمسر نہیں۔ امام بخاری نے آپ کے نکاح کو باب تزویج الصغار من الکبار میں نقل کیا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ اس بات میں بھی تمام امہات المومنینؓ سے ممتاز ہیں کہ آپ کی برأت اور تطہیر کی قرآن پاک نے نص فرمائی اور مسلسل کئی آیات آپ کی پاکیزگی میں نازل ہوئیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ اس باب میں بھی تمام ازواجِ مطہرات سے ممتاز ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے آخری ایام (اور کئی بیویوں کے ہوتے ہوئے) حضرت صدیقہؓ کے حجرے میں ہی بسر کئے اور یہ شان بھی حضرت عائشہؓ کے حجرے کو ہی حاصل ہے

---

[1] دیکھئے طبقات ابن سعد جلد ۸ صفحہ ۸ [2] حیات القلوب باقر مجلسی جلد ۲ صفحہ ۵۸۸ ایران صفحہ ۷۱۸ لکھنؤ [3] دیکھئے زرقانی جلد ۳ صفحہ ۲۶۱

کہ وہ گنبدِ خضرا سے مشرف ہوا۔

جب بعض عجمیوں کی سازش نے آپ کو حضرت علی المرتضیٰؓ سے جنگِ جمل میں لڑا دیا تو حضرت علی المرتضیٰؓ نے اس کے بعد اعلان فرمایا:۔

ولہا بعد حرمتہا الاولیٰ۔[1]

ترجمہ: آج کے بعد بھی ان کا وہی احترام کیا جائے جو اس سے پہلے انہیں حاصل تھا۔

اتنے اہم واقعہ کے بعد احترامِ سابق کا بحال رہنا اسی صورت میں صحیح ہو سکتا ہے کہ حضرت ام المومنینؓ کا ارادہ خروج کا نہ ہو اور آپ جنگ کے لیے نہ نکلی ہوں۔

حضرت علی المرتضیٰؓ کے اس ارشاد نے واضح کر دیا کہ جنگِ جمل کی بناء پر حضرت عائشہ صدیقہؓ کی شان میں ہرگز کوئی فرق ہرگز نہ آنے دیا جائے۔ وہ ابتداءً یہاں صرف مصالحت کے لیے آئی تھیں۔

آپ نے ۱۷ رمضان ۵۸ھ سہ شنبہ کی رات انتقال فرمایا۔ آپ کی وصیت تھی کہ مجھے جنت البقیع میں دفن کیا جائے۔[2]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے آپ کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، عبداللہ بن محمد بن عبدالرحمٰنؓ اور عبداللہ بن عبدالرحمٰنؓ نے آپ کو قبر میں اُتارا۔

عبید بن عمیرؓ سے کسی شخص نے پوچھا کہ حضرت عائشہؓ کی وفات سے کس کس کو صدمہ ہوا۔ آپ نے فرمایا جس جس کی وہ ماں تھیں اس کو ان کی وفات کا غم ہوا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۴) حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

آپ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں۔ پہلا نکاح حضرت خنیس بن حذافہؓ سے ہوا جو جنگِ بدر میں شہید ہوئے۔ ان کے بعد ۳ھ میں ان کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا۔[3]

حضرت عائشہ صدیقہؓ ان کی نسبت فرماتی ہیں کہ حفصہؓ اپنے باپ کی بیٹی ہیں۔ جیسے راسخ الارادہ اپنی بات میں حضرت عمرؓ ہیں اسی طرح حفصہؓ اپنی ہر بات میں پختہ ہیں۔

ان کی وفات اس زمانے میں ہوئی جن دنوں حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی صلح ہو رہی تھی۔ یہ واقعہ ۴۱ھ کے قریب کا ہے۔[4]

ابن سعد کے بیان کے مطابق آپ کی وفات ۴۵ھ میں ہوئی اور یہی روایت زیادہ لائقِ اعتماد ہے۔[5]

---

[1] نہج البلاغۃ جلد ۲ صفحہ ۱۳ مصر [2] طبقات ابن سعد جلد ۸ صفحہ ۵۲ [3] بخاری جلد ۲ صفحہ ۷۲۹ [4] دیکھئے اسد الغابہ صفحہ ۴۲۱ [5] دیکھئے طبقات ابن سعد جلد ۸ صفحہ ۶۰

⑤ حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

یہ پہلے حضرت عبداللہ بن جحش رضؓ کے نکاح میں تھیں جو جنگِ اُحد میں شہید ہوئے۔ پھر اسی سال اُن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح فرمایا لیکن اس کے دو تین ماہ بعد ہی حضرت زینبؓ کا انتقال ہو گیا۔[۱]
آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور بقیع میں دفن فرمایا۔[۲]

⑥ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا

آپ پہلے حضرت ابو سلمہؓ کے نکاح میں تھیں۔ یہ خاوند اور بیوی ان چند خوش قسمت لوگوں میں سے تھے جنہوں نے آغازِ بعثت میں اسلام قبول فرمایا۔ دونوں نے حبشہ کی طرف ہجرت بھی کی اور پھر مدینہ منورہ کی ہجرت سے بھی مشرف ہوئے۔ بعض مجبوریوں کے تحت حضرت ام سلمہؓ کی ہجرت ابو سلمہؓ کی ہجرت سے ایک سال متاخر ہے۔ آپؓ نے اس دوران میں بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ آپ اکثر کہا کرتی تھیں :-

میں نہیں جانتی کہ اہل بیت میں سے کسی نے وہ مصیبتیں اٹھائی ہوں جو اسلام کی خاطر ابو سلمہؓ کے خاندان کو جھیلنی پڑیں۔[۲]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ازواجِ مطہرات قرآنی ارشاد کے پیشِ نظر اپنے آپ کو ہمیشہ اہلبیت میں سے سمجھتی تھیں۔ ابو سلمہؓ نے ۴ھ جمادی الآخر میں انتقال کیا اور ان کے بعد اُن کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا۔ زرقانی لکھتے ہیں کہ ان کا نام برہ تھا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زینب رکھا۔ مگر ان کی شہرت کنیت ام سلمہؓ سے ہوئی۔

حضرت عائشہؓ کے بعد ان کے علمی اور فقہی ذوق کی تمام اہل علم شہادت دیتے ہیں۔ علامہ ابن قیم لکھتے ہیں کہ حضرت ام سلمہؓ کے فتاویٰ جمع کئے جائیں تو ایک رسالہ تیار ہو سکتا ہے۔[۴]
اُن کی وفات ۸۴ سال کی عمر میں ۶۳ھ میں ہوئی۔ آپ کی نمازِ جنازہ بھی حضرت ابو ہریرہؓ نے پڑھائی۔

⑦ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ

آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔[۵]
آپ ان سابقین اولین میں داخل تھیں جو پہلے دور میں اسلام لائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہجرت کی تو آپ بھی ہجرت کر کے مدینہ پہنچیں۔[۶]
پہلے اُن کا نکاح حضرت زید بن حارثہؓ سے ہوا تھا۔ اُن کے بعد یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نکاح

---

۱ دیکھئے استیعاب ص۷۵۳ ۲ طبقات جلد ۸ ص۸۲ ۳ دیکھئے اسد الغابہ ص۵۸۹ ۴ اعلام الموقعین جلد ۱ ص۱۳
۵ طبقات جلد ۸ ص۱۰۱ ۶ اسد الغابہ جلد ۵ ص۴۶۳

میں آئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات شریفہ کے بعد آپ کی ازواج میں سے سب سے پہلے ان کی وفات ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور بقیع میں انہیں دفن کیا گیا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کو ان کی وفات کا بہت صدمہ تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواجِ مطہراتؓ کے صرف انہی مختصر حالات پر اکتفا کی جاتی ہے ان مختصر کالموں میں مزید گنجائش نہیں۔

۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ اطہر کو روضہ مبارکہ سے نکالنے کی ناپاک مسیحی سازش کا بیان راقم الحروف کی کتاب مقامِ حیات میں موجود ہے اس میں دیکھ لیں۔ اجسادِ شیخین کو نکالنے کی رافضی سازش کا بیان سمنانی کی کتاب الاستنصار میں موجود ہے۔ ہر دو سازشوں کی ناکامی گنبدِ خضرا کی زندہ کرامت اور اس کے تینوں مکینوں صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین کا ایک تکوینی اعزاز و اکرام ہے۔ ان تاریخی واقعات کی تفصیل کے لیے یہ مختصر کالم کافی نہیں ہیں۔
واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہٗ: خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال : مرزا غلام احمد کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ سلطنتِ برطانیہ کا خیر خواہ اور انگریزوں کا ایجنٹ تھا۔ مگر اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائیوں کی تردید میں وہ بہت پیش پیش تھا۔ اگر وہ واقعی ان عیسائی قوموں کا نمک خوار تھا تو وہ پھر عیسائیوں کی تردید میں اس قدر کام کیوں کرتا رہا۔ اس کا جواب ہفت روزہ دعوت میں دیں؟

جواب : سلسلہ مرزائیت کے سربراہ اور قادیانیوں اور لاہوریوں ہر دو طبقوں کے پیشوا مرزا غلام احمد قادیانی خود اس تناقض سے پردہ اُٹھا چکے ہیں۔ ان کی اپنی تحریر سے زیادہ اور کوئی بیان اس مسئلہ کی وضاحت نہیں کر سکتا۔ مرزا صاحب آنجہانی ۱۸۹۹ء کی ایک تحریر میں عیسائی پادریوں کی سخت تحریروں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

مجھے ایسی کتابوں اور اخباروں کے پڑھنے سے دل میں یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ مبادا مسلمانوں کے دلوں پر جو ایک جوش رکھنے والی قوم ہے۔ ان کلمات کا کوئی سخت اشتعال دینے والا اثر پیدا ہو تب میں نے ان جوشوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اپنی صحیح اور پاک نیت سے یہی مناسب سمجھا کہ اس عام جوش کے دبانے کے لیے حکمتِ عملی یہی ہے کہ ان تحریرات کا کسی قدر سختی سے جواب دیا جائے تاکہ سریع الغضب انسانوں کے جوش فرو ہو جائیں اور ملک میں کوئی بے امنی پیدا نہ ہو۔ تب میں نے بمقابل ایسی کتابوں کے جن میں کمال سختی سے بدگمانی کی گئی تھی۔ چند ایسی کتابیں لکھیں جن میں

کسی قدر بالمقابل سختی تھی۔ کیونکہ میرے کانشنس نے مجھے قطعی طور پر مجھے فتویٰ دیا کہ اسلام میں جو
بہت سے وحشیانہ جوش والے آدمی موجود ہیں۔ ان کے غیظ و غضب کی آگ بجھانے کے لیے یہ
طریق کافی ہو گا۔ کیونکہ عوض معاوضہ کے بعد کوئی گلہ باقی نہیں رہتا۔ سو یہ میری پیش بینی کی تدبیر صحیح
نکلی اور ان کتابوں کا یہ اثر ہوا کہ ہزار ہا مسلمان جو پادری عماد الدین وغیرہ لوگوں کی تیز اور گندی
تحریروں سے اشتعال میں آچکے تھے۔ ایک دفعہ ان کے اشتعال فرو ہو گئے۔ کیونکہ انسان کی یہ
عادت ہے کہ جب سخت الفاظ کے مقابل اس کا عوض دیکھ لیتا ہے تو اس کا وہ جوش نہیں رہتا
بایں ہمہ میری تحریر پادریوں کے بالمقابل بہت نرم تھی۔ گویا کچھ بھی نسبت نہ تھی۔ ہماری محسن
گورنمنٹ خوب سمجھتی ہے کہ مسلمان سے یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اگر کوئی پادری ہمارے نبی صلی اللہ
علیہ وسلم کو گالی دے تو ایک مسلمان اس کے عوض میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گالی دے۔ کیونکہ
مسلمانوں کے دلوں میں دودھ کے ساتھ ہی یہ اثر پہنچایا گیا ہے کہ وہ جیسا کہ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم
سے محبت رکھتے ہیں ایسا ہی وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے محبت رکھتے ہیں۔ سو کسی مسلمان کا یہ
حوصلہ ہی نہیں کہ تیز زبانی کو اس حد تک پہنچائے جس حد تک ایک متعصب عیسائی پہنچا سکتا ہے
اور مسلمانوں میں یہ ایک عمدہ سیرت ہے جو فخر کرنے کے لائق ہے کہ وہ تمام نبیوں کو جو آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہو چکے ہیں ایک عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور حضرت مسیح علیہ السلام
سے بعض وجوہ سے ایک خاص محبت رکھتے ہیں جس کی تفصیل کے لیے اس جگہ موقع نہیں سو مجھ
سے پادریوں کے مقابل جو کچھ وقوع میں آیا یہی ہے کہ حکمت عملی سے بعض وحشی مسلمانوں کو خوش
کیا گیا اور میں دعوے سے کہتا ہوں کہ میں تمام مسلمانوں میں سے اوّل درجہ کا خیر خواہ گورنمنٹ
انگریزی کا ہوں۔ کیونکہ مجھے تین باتوں نے خیر خواہی میں اوّل درجہ پر بنا دیا ہے۔ ۱۔ اوّل والد مرحوم
کے اثر نے۔ ۲۔ دوم اس گورنمنٹ کے احسانوں نے۔ ۳۔ تیسرے خدا تعالیٰ کے الہام نے۔ اب میں اس
گورنمنٹ محسنہ کے زیر سایہ ہر طرح سے خوش ہوں[1]

اس تحریر سے یہ بات نہایت واضح ہے کہ قادیانیوں کا مسیحی تبلیغات کا مقابلہ کرنا اسلام کی خیر خواہی
کے لیے ہرگز نہ تھا۔ عیسائی قوتوں کو ہر ممکن اضمحلال اور کمزوری سے بچانے کے لیے یہ ان کا ایک حکیمانہ طریق کار تھا
اسلام کی خیر خواہی اگر کچھ بھی ان کے دلوں میں موجود ہوتی تو یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت جامعہ اور رسالت
جاریہ کے بعد کسی قسم کی نبوت کے ملنے کے ہرگز قائل نہ ہوتے اور ان کا مرکز عقیدت مدینہ منورہ کی بجائے کسی صورت

[1] دیکھئے تبلیغ رسالت جلد ۸ ص۵۱ ص۵۳ مطبوعہ قادیان

میں قادیان قرار نہ پاتا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انگریز کا خود کاشتہ پودا خود عیسائیوں کے ہی خلاف کام کرنے لگے۔
یہ جو کچھ دکھائی دے رہا ہے یہ فقط ظاہر ہے حقیقت وہی ہے جسے مرزا صاحب آنجہانی خود سپردِ قلم کر چکے ہیں اس
پر تعجب نہ کیا جائے کہ انہوں نے اپنا راز خود کیسے کھول دیا ـــــ یہ انگریزوں کو مطمئن کرنے کے لیے ضروری
تھا۔ مرزا غلام احمد نے اسے صرف ایک اشتہار میں لکھا تھا کتاب میں نہیں۔ یہ اس کے پیروؤں نے کیا کہ اس کے
تمام اشتہارات کتابی شکل میں جمع کر دیئے۔ واللہ اعلم بالصواب

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ ۲۲ جون ۶۴ء

سوال: مکرمی و محترمی علامہ صاحب سلام مسنون۔
جنوری کا ماہنامہ "روحانیت" نظر سے گزرا۔ ایک مضمون بعنوان معراج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ص۳۵
نظر سے گزرا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی مندرجہ ذیل عبارت جو تفسیر ترجمان القرآن سے اخذ شدہ تھی پڑھی۔ واقعہ اسریٰ
کی نوعیت کیا تھی؟ یہ عالم بیداری میں پیش آیا یا عالم خواب میں؟ صرف روح پر طاری ہوا یا جسم بھی اس میں
شریک تھا؟ اس بارے میں صحابہ کرامؓ کا اختلاف ہے۔ اکثر صحابہؓ و تابعین اس طرف گئے ہیں کہ روح اور جسم
دونوں پر طاری ہوا۔ لیکن حضرت عائشہؓ، حذیفہؓ بن الیمان، حسن بصریؒ، معاویہؓ وغیرہم سے مروی ہے کہ یہ ایک روحانی
معاملہ تھا۔ یہ روایت پڑھ کر میں ورطۂ حیرت میں پڑ گیا۔ کیا یہ روایت صحیح ہے؟ یہ تو ایک مسلمہ امر ہے کہ معراج النبی
جسمانی تھا اور یہ امر قرآن کریم کی متعدد آیات اور بے شمار احادیث سے ثابت ہے مگر پھر حضرت عائشہؓ کی یہ روایت
سمجھ میں نہیں آتی۔ آپ سے گزارش ہے کہ ہفت روزہ "دعوت" کے اگلے شمارے میں اس کا مکمل جواب شائع کریں
کہ آیا حضرت عائشہ کی یہ روایت مستند ہے یا صرف ویسے ہی نقل کی گئی ہے اور اگر صحیح ہے تو پھر تو پھر احمدی فرقہ بھی اپنے
دعوے معراج روحانی میں حق بجانب ہو سکتا ہے۔ صحاح ستہ کی کتابوں میں اس کی کوئی سند ہے یا نہیں؟ مکمل جواب
سے آگاہ فرما کر ممنون فرمائیں۔ فقط والسلام ـــــ نیاز مند محمد ذاکر جوہر کوارڈرینگل ہوسٹل گورنمنٹ کالج لاہور

جواب: ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے معراج جسمانی کا انکار کسی صحیح سند سے ثابت نہیں۔ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم جب سیر معراج سے مشرف ہوئے تو اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے
نکاح نہیں ہوا تھا۔ حضرت صدیقہؓ کی نسبت سے اس باب میں جو حدیث پیش کی جاتی ہے اسے حافظ ابن کثیرؒ اپنی
تفسیر اور تاریخ دونوں میں نقل کرتے ہیں[1] اس روایت کا مرکزی راوی محمد بن اسحاق ہے جو ضعیف ہے بعض ائمہ حدیث
نے اسے کذاب اور دجال تک کہا ہے۔ اس کی پوری تحقیق احقر کی کتاب "مصباح الظلام فی عدم وجوب الفاتحہ

[1] دیکھئے تفسیر ابن کثیر جلد ۵ ص۱۴۲ و البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص۱۱۴

خلف الامام" میں موجود ہے۔

اس روایت میں محمد بن اسحٰق سے اُوپر کا راوی بھی مجہول ہے۔ محمد بن اسحٰق اسے حدثنی بعض آل ابی بکر کہہ کر پیش کرتے ہیں۔ خطیب بغدادی لکھتے ہیں:۔

محمد بن اسحاق مجہول راویوں سے غلط روایتیں نقل کرتا تھا۔[1]

علامہ زرقانی نے اس روایت کی سند میں انقطاع کا دعوے کیا ہے۔ ابن دحیہؒ تنویر میں اسے موضوع تک کہہ گئے ہیں۔ بہرحال اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ یہ حدیث ہرگز صحیح نہیں۔ قاضی عیاضؒ بھی اسے شفا میں ضعیف قرار دیتے ہیں۔[2]

یہ امر بھی پیشِ نظر ہے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا اس باب میں یہ اختلاف کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معراج کی رات دیدار باری تعالیٰ سے مشرف ہوئے تھے یا نہیں محدثین میں بہت مشہور ہے لیکن یہ اختلاف اس حقیقت کی خود منہ بولتی شہادت ہے کہ حضرت صدیقہؓ کو معراجِ جسمانی سے ہرگز ہرگز انکار نہ تھا ورنہ اس اختلاف کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت امیر معاویہؓ سے بھی معراجِ جسمانی کا انکار ہرگز ثابت نہیں۔ بے شک معراجِ نبوی کے وقت وہ مشرف باسلام نہ تھے لیکن یہ صحیح نہیں کہ وہ واقعہ معراج کو محض ایک روحانی مشاہدہ کہتے تھے۔ حضرت امیر معاویہؓ کی طرف جو روایت منسوب ہے اس کا راوی بھی محمد بن اسحاق ہے جس کا حال ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ اس پر شیعہ ہونے کا بھی الزام تھا۔ پس ایک شیعہ کی روایت حضرت امیر معاویہؓ کے متعلق کس طرح قابلِ اعتماد ہوسکتی ہے۔ محمد بن اسحاق اس روایت کو یعقوب بن عتبہ بن المغیرہ سے روایت کرتے ہیں اور وہ اسے حضرت امیر معاویہؓ سے نقل کرتے ہیں۔ یعقوب اور حضرت امیر معاویہؓ کے مابین انقطاع ہے۔ یعقوب نے ۱۲۸ھ میں وفات پائی تھی اور ان کی ملاقات صحابہ کرامؓ میں سے حضرت سائب بن یزیدؓ کے سوا اور کسی سے ثابت نہیں۔[3] علاوہ ازیں اس روایت کے الفاظ بھی کئی معانی کو محتمل ہیں۔ ان میں معراج جسمانی کے انکار کی ہرگز صراحت نہیں۔

حضرت امام حسنؓ سے بھی معراجِ جسمانی کا انکار ہرگز ثابت نہیں۔ قاضی عیاضؒ نے شفا میں جمہور کا مذہب پیش کرتے ہوئے جن اکابر کے اسمائے گرامی بطور شہادت پیش کئے ہیں۔ ان میں حضرت امام حسن بصریؒ کا اسمِ گرامی بھی موجود ہے۔[4] علیٰ ہذا القیاس حضرت حذیفہؓ سے بھی اس سیرِ معراج کے رُوحانی ہونے کی روایت قابلِ اعتماد راویوں سے منقول نہیں۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

---

[1] تاریخ بغدادی ص۲۲۷ [2] دیکھئے شفا ص۸۹ [3] دیکھئے تہذیب، جلد ۱۱ ص۳۹۲ [4] دیکھئے شفا ص۸۶

سوال: ہمارے علاقہ کے ایک جلیل القدر عالم لکھتے ہیں کہ ہفت روزہ دعوت کے فاروق اعظمؓ نمبر میں مسند امام احمد کی یہ روایت منقول ہے کہ حضور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری ایام میں قلم دوات حضرت عمرؓ سے نہیں بلکہ حضرت علی المرتضیٰؓ سے طلب کیا تھا۔ فاضل موصوف لکھتے ہیں کہ یہ حدیث مسند امام احمد میں مجھے نہیں ملی ہفت روزہ دعوت میں یہ حدیث مسند امام احمد جلد ۲ ص۸۴ مطبوعہ مصر کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے اور اس صفحہ پر انہیں یہ حدیث نہیں ملی۔ باب الاستفسارات میں اس کی تحقیق مطلوب ہے؟ حافظ عبدالرشید ارشد از میاں چنوں

جواب: فاروق اعظمؓ نمبر کا باب الاستفسارات لکھتے وقت مسند امام احمد کا جو نسخہ میرے سامنے تھا وہ مسند امام احمد کی طبع جدید ہے۔ جو فقہی انداز کی نئی تبویب سے اہل مصر نے فاضل محمد احمد شاکر کے حواشی کے ساتھ شائع کی ہے۔ مسند امام احمد کے ہاں اس مبوب نسخے میں یہ روایت واقعی جلد ۲ ص۸۴ پر موجود ہے۔ جو پرانا نسخہ منتخب کنز العمال کے حاشیہ کے ساتھ مصر سے شائع ہوا تھا۔ اس میں حدیث مذکور الصدر روایات علیؓ میں اس طرح منقول ہے:۔

حدثنا عبد اللہ حدثنا ابی حدثنا بکر بن عیسیٰ الراسبی حدثنا عمر بن الفضل عن نعیم بن یزید عن علیؓ بن ابی طالب قال امرنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اٰتیہ بطبق یکتب فیہ مالا تضل امتہ من بعدہ قال فخشیت ان تفوتنی نفسہ قال قلت انی احفظ واعی قال اوصی بالصلوٰۃ والزکوٰۃ وما ملکت ایمانکم۔[1]

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں آپ کی خدمت میں کاغذ پیش کروں جس میں آپ ایسی وصیت لکھ دیں کہ آپ کی امت آپ کے بعد گمراہ نہ ہوسکے۔ حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ مجھے اندیشہ پیدا ہوا کہ حضورؐ کہیں میری عدم موجودگی میں ہی وفات نہ پاجائیں، اس لیے میں (کاغذ نہ لینے گیا اور) عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں زبانی یاد رکھوں گا آپ فرمادیں۔ اس پر آپ نے فرمایا: میں نماز اور زکوٰۃ کی وصیت کرتا ہوتا ہوں اور یہ کہ غلاموں کے حقوق پورے کرتے رہنا۔ واللہ اعلم بالصواب کتبہ: خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: دہلی کے محدثین کا فقہی مسلک کیا تھا بعض احباب کہتے ہیں کہ یہ حضرات اہلحدیث مسلک کے تھے۔ مطلع کریں کہ یہ بزرگ حنفی اور مقلد تھے یا بالکل غیر مقلد اہلحدیث تھے؟ سائل، محمد اسلم گڑھ مہاراجہ ضلع جھنگ

جواب: حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ، حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور

---

[1] مسند امام احمد طبع قدیم جلد ۱ ص۹۰ مصر

یہ سب حضرات محدثین دہلی اہلسنت عقائد کے پابند اور حنفی مسلک پر پوری طرح کاربند تھے۔ اہلحدیث ہونے کا معنی اگر فن حدیث میں اشتغال ہے جیسا کہ اہل تفسیر بھی ایک اصطلاح ہے تو یہ حضرات بے شک اہل حدیث تھے۔ حدیث پڑھنا پڑھانا ان کی زندگی کا موضوع تھا اور اگر اہل حدیث سے مراد غیر مقلد ہونا ہے تو یہ بزرگ اہل حدیث نہیں۔ فقہ حنفی پر کاربند تھے۔ ان کا حنفی ہونا "رسالہ الیانع الجنی من اسانید الشیخ عبد الغنی" میں اس طرح مذکور ہے :۔

قلت ومن لطائف هذا الاسناد انه اجتمع فی اوّله اربعة اٰخرهم ابو عبد العزیز اشترکوا فی اربع خصال وذٰلك انهم دهلویّون سکنیً وانهم عمریون صلبیةً وانهم صوفیة اصحاب الزهد والورع وانهم حنفیّون علی مذهب النعمان ابی حنیفة وصاحبیه[1]

ترجمہ۔ اس اسناد کے لطائف میں سے ہے کہ اس کے شروع میں چار بزرگ (جن کے آخر میں شاہ ولی اللہؒ ہیں) ہیں جو چار وصفوں میں مشترک ہیں چاروں سکونت میں دہلوی ہیں نسب میں فاروقی ہیں زہد و پرہیزگاری میں ارباب تصوف میں سے ہیں اور مسلک کے لحاظ سے حنفی ہیں امام ابو حنیفہ اور ان کے دو شاگردوں کے طریقے پر ہیں۔

مولانا اسماعیل شہیدؒ کے رفیق علم شیخ التفسیر حضرت مولانا عبد الحی دہلویؒ آپ کے ساتھ ایک ساتھ رہے۔ مولانا عبد الحیؒ کا مسلک بھی ملاحظہ کیجئے، آپ لکھتے ہیں :۔

قیاس را معتقدام و در قیاسات و اجتہادات مقلد مذہب حنفی ام[2]

ترجمہ۔ قیاس کا میں قائل ہوں اور اجتہادی اور فروعی مسائل میں میں فقہ حنفی کا مقلد ہوں۔

مولانا اسماعیل شہیدؒ اور مولانا عبد الحیؒ کے شیخ حضرت سید احمد شہیدؒ تھے آپ اپنے مسلک کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

مذہب ایں فقیر اباً عن جدٍ حنفی است و بالفعل ہم جمیع اقوال و افعال ایں ضعیف بر قوانین اصول حنفیہ و آئین ایشاں منطبق است[3]

ترجمہ۔ اس فقیر کا مذہب باپ دادا سے حنفی چلا آتا ہے اور عملاً بھی اس بندہ ضعیف کے تمام قول و فعل اصول حنفیہ اور ان کے طریق استخراج کے مطابق ہیں۔

اعمال میں ان چار مذہبوں کی متابعت جو اہل اسلام میں رائج ہیں بہت عمدہ ہے[4]

ہاں حدیث صحیح اور صریح مل جائے اور اس کے منسوخ ہونے کا بھی احتمال نہ ہو تو اس پر عمل کرے۔

---

[1] الیانع الجنی ص۱۰۱ بحاشیہ کشف الاسرار طبع ۱۳۴۹ھ [2] الصوارق الالہیہ ص۲۶ طبع ۱۲۸۷ھ [3] مکاتیب سید احمد شہید ص۱۱۹ [4] صراط مستقیم ص۳۶

سوال: ۱۔ بعض لوگ جو اپنے آپ کو نئی روشنی کا سمجھتے ہیں۔ اکثر کہتے ہیں کہ قرآن پاک حقائق اور صداقتوں کا مجموعہ ہے اس کی کسی زبان سے تخصیص نہ ہونی چاہیئے۔ اسے نماز میں ایسی زبان میں پڑھنا جسے نمازی جانتا ہی نہ ہو خود تعلیمات قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن شریف میں ہے :۔

لا تقربوا الصلوٰة وانتم سکارٰی حتی تعلموا ما تقولون۔ (پ۵ النساء ع۷)

ترجمہ۔ تم نماز کے قریب نشے کی حالت میں نہ جاؤ بلکہ اس وقت جاؤ جب تمہیں علم ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔

۲۔ نیز یہ بھی بتائیں کہ قرآن پاک کا ترجمہ کرنے کی کس کس شخص کو اجازت ہے۔ کیا محض لغت عربی کے سہارے ترجمہ کرنا جائز ہے؟

سائل غلام مصطفیٰ فاروق گنج لاہور

جواب: قرآن کی اصل زبان عربی ہے اور قرآنیت کے لیے عربیت لازم ہے۔ ارشاد نبوت ہے کہ نماز قرآن کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ پس اردو میں یا کسی غیر عربی زبان میں نماز پڑھنا کسی طرح درست نہیں۔ قرآن کو عربی سے بے نیاز کرنا اس قسم کی تمام عبارتیں روح اسلام سے بے خبری کی دلیل ہیں۔

امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد القرطبی التذکار فی افضل الاذکار میں لکھتے ہیں :۔

امر عمر بن الخطاب ان لا یقرئ القراٰن الا عالم بالعربیّة۔

ترجمہ۔ حضرت عمرؓ نے حکم دے رکھا تھا کہ قرآن کو کوئی شخص جو عربی زبان کا عالم نہ ہو ہرگز نہ پڑھائے۔

جہاں تک آیت پیش کردہ کا تعلق ہے اس کے متعلق معلوم رہے کہ یہاں علم کا اجمالی درجہ مطلوب ہے قرأت کا پورا اور تفصیلی درجہ ہرگز مطلوب نہیں۔ اگر کسی نمازی کو اتنا معلوم ہے کہ وہ سبحانك اللّٰھم پڑھ رہا ہے۔ التحیات اس کی زبان سے نکل رہا ہے یا وہ قل ھو اللہ کی قرأت کر رہا ہے تو علم کے اس اجمالی درجے سے اس نشے کی نفی ہو جاتی ہے جس کے ہوتے ہوئے اس کو نماز کے قریب آنا منع تھا۔ اگر کسی کو اس درجے میں علم ہو وہ کیا کہہ رہا ہے اور اس کی زبان سے کیا نکل رہا ہے۔ تو وہ پورا مکلف ہے کہ نماز پڑھے اور اس سے ہرگز کنارہ کش نہ رہے۔ ترجمہ آتا ہو تو یہ بڑی سعادت ہے۔ لیکن ترجمے کو اس آیت کی رو سے ضروری قرار دینا یہ آیت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے جو لوگ بے ہوشی اور نشے میں ادھر ادھر کی لایعنی باتیں کرتے ہیں۔ وہ ان باتوں کی زبان سے جاہل نہیں ہوتے بیہوشی کی بنا پر محض ان الفاظ کے تعینات اور ان کی مرادات سے غافل ہوتے ہیں۔ جہاں تک قرآن پاک کے ترجمے کا تعلق ہے حقیقت یہ ہے کہ اصل عربی کو قائم رکھتے ہوئے قرآن پاک کا ترجمہ کرنا بالکل جائز ہے اور علماء اسلام نے ہر وقت اور ہر ملک کے تقاضے کے مطابق قرآن عزیز کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا ہے۔ اگر کسی عالم نے کسی زمانے میں ترجمہ قرآن کی مخالفت کی ہے تو اس کا منشاء صرف یہ تھا کہ قرآن کریم کو عربی سے علیحدہ کر کے صرف دوسری زبان میں لے جانے

ہاں ترجمہ کرنے کے لیے چند شرطیں ہیں:۔

۱۔ مترجم دونوں زبانوں میں مہارت رکھتا ہو۔ خصوصاً جس زبان سے ترجمہ کرنا ہے اس پر پورا عبور ہونا لازمی ہے۔ اس کی لغات، اسلوب، محاورات، ادب اور گرامر پر پوری نظر ہونی چاہیئے۔

۲۔ جس عبارت کا ترجمہ کرنا ہے اگر اس میں کئی معانی کا احتمال ہے تو ترجمہ میں خاص ایک معنی کو نہ لینا چاہیئے بلکہ اس کے لیے دوسری زبان کے بھی ایسے ہی الفاظ اختیار کرنے چاہییں جن میں خود اصل کی طرح جملہ معانی کا احتمال ہو۔

۳۔ اصل کلام میں اگر ایسی قیود موجود ہوں جو تخصیص و تعمیم یا اطلاق و تقید سے متعلق ہیں تو دوسری زبان میں بھی ویسی ہی قیود لگانی چاہئیں۔ کنایات و استعارات کو صراحت اور حقیقت میں لانے کی بجائے دوسری زبان میں بھی کنایات اور استعارات کی صورت میں ہی لانا چاہیئے۔

۴۔ علمی اور مرکزی کتابوں کے ترجموں میں دوسری زبانوں کے کسی ایک علاقے کے محاورات کی پابندی نہیں ہونی چاہیئے۔ انہیں دوسری زبان کے ایسے انداز میں ترجمہ کیا جائے جو زیادہ سے زیادہ آبادی کے لیے سمجھنے کا موجب ہو۔

۵۔ ترجمے کو اصل سے بڑھنے نہ دے۔ اپنی کسی خاص غرض کے لیے پہلے ترجموں میں تصرف کرنا یا بین القوسین جملے ساتھ لگانا ترجمہ پر ایک اضافہ ہے۔ یہ ترجمہ کے عام اصُولی تقاضوں کا بیان تھا۔ قرآن کریم کے ترجمہ کے لیے حضرت شیخ ابو محمد عبدالحق دہلوی نے کچھ اور شرطیں بھی بیان کی ہیں:۔

۱۔ مترجم بدمذہب اور بے قید نہ ہو۔ جس طرح تفسیر میں متدین ہونے کی شرط ہے۔ اسی طرح ترجمہ میں بھی غیر متدین کے فاسد اور غلط خیالات کی آمیزش سے اس کا ترجمہ قابلِ اعتماد نہیں رہ سکتا۔

۲۔ علومِ مذکورہ جو تفسیر کے لیے ضروری ہیں (مترجم کے لیے) بھی ان میں ماہر ہونا ضروری ہے۔ خصوصاً علم قراءت صرف و نحو، علم ادب، معانی و بیان، فقہ و حدیث اور کلام کا ضرور فاضل ہو۔ واللہ اعلم بالصواب

سوال: سیاہ لباس پہننا جائز ہے یا نہیں؟ ماتم کے لیے سیاہ لباس پہننا کیسا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے کہ یزید نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کا حکم نہیں دیا تھا۔ اگر ایسا ہو تو پھر تو یزید بالکل بے قصور رہا؟

سائل۔ محمد فاروق عثمان علی۔ تلہ گنگ

جواب: سیاہ لباس پہننا جائز نہیں۔ صرف موزے، عمامہ اور کمبل اس سے مستثنیٰ ہیں وہ سیاہ لیے جاسکتے ہیں عورتوں کا سیاہ برقعہ کمبل کے حکم میں ہوگا۔

حضرت امام جعفر صادق رضؓ ارشاد فرماتے ہیں:۔

انہ لباس اھل النار[1]

ترجمہ۔ یہ جہنمیوں کا لباس ہے۔

ماتم کے لیے بھی سیاہ لباس پہننے کی ممانعت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کے الفاظ "ولا یعصینك فی معروف" کی تفسیر کرتے ہوئے بیان فرمایا:۔

لا تلطمن خدًا ولا تخمشن وجھًا ولا تنتفن شعرًا ولا تشققن جیبًا ولا تسودن ثوبًا[2]

ترجمہ۔ چہرے پر تھپڑ نہ مارو، نہ چہرہ چھیلو، نہ بال نوچو، نہ گریبان چاک کرو اور نہ سیاہ کپڑے پہنو۔

ملّا باقر مجلسی حیات القلوب میں اس حدیث کا ترجمہ یوں لکھتے ہیں:۔

درمصیبت ہا طپانچہ بر رُوے خود مزنید و روئے خود را مخراشید و موئے خود را مکنید و گریبانِ خود را چاک مکنید و جامہ خود را سیاہ مکنید[3]

خط کشیدہ فقرے سوال زیر بحث کا بڑا واضح جواب ہیں۔

۲۔ یہ صحیح ہے کہ یزید نے حضرت حسینؓ کے قتل کا حکم نہیں دیا تھا۔ یہ ظلم و ستم ابن زیاد اور شمر نے روا رکھا تھا۔ لیکن یہ بھی صحیح نہیں کہ یزید اس میں بالکل بے قصور تھا۔ رعیت میں جو ظلم و ستم، قتل و نہب اور لوٹ مار وجود میں آئے اس کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے اور ہر حکومت اپنی رعایا کے مظلوم ہونے کے متعلق خدا تعالیٰ کے ہاں جوابدہ ہوگی۔ ارشادِ نبوت ہے۔ کلکم مسئول عن رعیته۔

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ ۳، جولائی ۶۴ء

سوال: اکثر جگہ دیکھا گیا ہے کہ جنازہ کے ساتھ جنازہ کے آگے ایک ٹوکرے میں حسبِ توفیق گندم اور نمک کے تین چار وزنی ڈھیلے لے جاتے ہیں جب جنازہ پڑھ لیا جاتا ہے تو یہ گندم اور نمک وغیرہ مولوی صاحب کو جو جنازہ پڑھائیں دے دیا جاتا ہے۔ کیا یہ شرعاً جائز ہے اور اس کا کہیں حکم بھی آیا ہے؟

سائل۔ انوار واصفی لاہور

جواب: یہ سب امور علمی مسائل میں سے نہیں محض شکمی مسائل میں سے ہیں۔ ان اعمال کا وجود اس ہیئت میں سلف صالحین میں ہرگز نہ تھا۔ دیواروں کو بے بنیاد محض تاویلات کے ذریعے کھڑا نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے تمام اعمال محض ایجادِ بندہ ہیں جن کی شرعاً کوئی حقیقت نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

سوال: میں آپ کے ہفت روزہ "دعوت" کا مطالعہ باقاعدہ کرتا ہوں۔ ۲۹ مئی ۶۴ء کے شمارہ میں محمد اقبال قریشی صاحب کے سوال کا جواب دیتے ہوئے آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ میرا عمل یہ ہے کہ جمعہ کی فرض نماز کے بعد اگر

---

[1] فروع کافی جلد ۲ باب لبس السواد ص ۲۴ [2] فروع کافی جلد ۲ کتاب النکاح ص ۲۲۸ [3] حیات القلوب جلد ۲ ص ۶۴ ایران

جگہ تبدیل کرنے کا موقعہ مل جائے تو پہلے دو رکعت سنت اور پھر چار رکعت اور اگر جگہ تبدیل کرنے کا موقعہ نہ ملے تو پہلے چار رکعت اور پھر دو رکعت. تاکہ ایک ہی جگہ پہ دو رکعت کی نماز دو دفعہ نہ پڑھی جائے. آپ اس مسئلہ کو ذرا تفصیل سے بیان فرمایئے کہ ایک ہی جگہ پہ دو رکعت کی نماز دو دفعہ پڑھنے سے کیا حکم لاگو ہوتا ہے. میں نے بارہا ایک ہی جگہ دو دو رکعت کی نماز ادا کی ہے. کیا میری وہ نماز ہو گئی ہے یا اس میں شبہ ہے؟ غلام مرتضیٰ فاروقی جھنگ صدر

جواب: مسئلہ زیر بحث کی تفصیل سے پہلے ان دو امور کو پیش نظر رکھیئے :۔

۱۔ فقہ اسلام کی رو سے ایک نماز کو دوسری نماز کے ساتھ اس طرح ملا کر پڑھنا کہ ہر دو نمازوں (مثلاً فرض نماز اور اس کے بعد نماز سنت) کے مابین کلام کرنے یا جگہ تبدیل کرنے کی نوبت نہ آئے صحیح نہیں اور جب اس ترک فصل سے ہر دو نمازیں ایک نماز کا ہی اشتباہ پیدا کرنے لگیں. کہ گویا دو رکعت نہیں چار رکعتی نماز پڑھی جا رہی ہے تو پھر یہ طریق اور بالکل نامناسب ہو جاتا ہے.

رب العزت نے صحابہ کرامؓ کو آسمانِ ہدایت کے ستارے بنایا ہے. مجموعی ہدایت کے ساتھ ساتھ مختلف صحابہ کرامؓ مختلف مسائل کی وضاحت میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں. سنن و سیر کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ رب العزت نے تقریباً ہر صحابی کو کسی نہ کسی مسئلے کی وضاحت میں ایک مرکزی شان سے نوازا ہے. سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بھی ان بزرگوں میں سے ہیں جو چند مسائلِ شریعت میں ایک مرکزی حیثیت کے راوی ہیں. مسئلہ زیر بحث بھی حضرت امیر معاویہؓ کی روایت سے ہی شرف یاب ہے.

حضرت سائب بن یزیدؓ کو ایک دفعہ حضرت امیر معاویہؓ کے ساتھ جمعہ پڑھنے کا اتفاق ہوا. حضرت سائبؓ نے فرض سے سلام پھیرتے ہی وہیں سنتیں شروع کر دیں. حضرت امیر معاویہؓ جب گھر تشریف لے گئے تو کسی شخص کو بھیج کر حضرت سائب بن یزیدؓ کو بلایا اور فرمایا :۔

لا تعد لما صنعت اذا صلیت الجمعہ فلا تصلها بصلوٰة حتی تكلم او تخرج فان نبی صلی اللہ علیہ وسلم امر بذلك ان لا تصل صلوٰة بصلوٰة حتی يتكلم او يخرج.

ترجمہ. ایسا پھر نہ کرنا جب جمعہ کی نماز پڑھو تو اسے دوسری نماز کے ساتھ کلام یا جگہ کی تبدیلی کے فصل کے بغیر ہرگز نہ ملاؤ. کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی حکم دیا ہے کہ کوئی نماز دوسری نماز کے ساتھ کلام یا جگہ کی تبدیلی کے فصل کے بغیر ہرگز نہ ملائی جائے.

یہ واقعہ اور مسئلہ اتنا اہم تھا کہ حضرت نافع بن جبیرؓ نے عمرو بن عطاءؒ کو خاص اس کے لیے حضرت سائبؓ کے پاس بھیجا تھا کہ وہ اس باب میں حضرت میں حضرت امیر معاویہؓ سے حاصل کی گئی ہدایت کو آ کے روایت فرمائیں :۔

مسئلے کی تفصیل اور وضاحت تو حضرت امیر معاویہؓ سے ہی منقول ہے. لیکن اس طریق کا عمل حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بھی مروی ہے. ابن جریج کہتے ہیں کہ :۔

اخبرنی عطاء انه رای ابن عمر يصلی بعد الجمعة فيماز عن مصلاه الذی صلی فيه الجمعه قليلاً غير كثير فيركع ركعتين [1]

ترجمہ. عطاء کہتے ہیں میں نے حضرت ابن عمرؓ کو جمعہ کے بعد اس طرح نماز پڑھتے دیکھا ہے. کہ آپ کہ اس جگہ سے جہاں فرض پڑھے ہوں ذرا ہٹ کر دو سنتیں پڑھتے تھے.

اگر جگہ تبدیل کرنے کا موقعہ نہ ملے تو پھر چار رکعت سنت پہلے پڑھنا اس لیے مناسب ہے، کہ اس میں چھ رکعتی نماز کا کوئی ابہام واقع نہیں ہوتا. کیونکہ عام طور پر نمازیں دو دو رکعت اور چار چار رکعت ہی پڑھی جاتی ہیں اور دو رکعت کو مقدم کرنے سے یہ ابہام پیدا ہونے کا امکان ہے کہ نمازی کہیں چار رکعت نماز ہی تو نہیں پڑھ رہا. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو ایک دفعہ صبح کی نماز اور سنت ایک ہی جگہ پہ پڑھتے ہوئے دیکھا. تو آپؐ نے فرمایا :۔

اتصلی الصبح اربعاً [2] ترجمہ. کیا تم چار رکعت نماز پڑھ رہے ہو.

اس سے معلوم ہوا کہ اس طریق اشتباہ سے بچتے ہوئے ہر دو نمازوں میں جگہ کی تبدیلی یا کلام کا فصل کر لینا چاہیئے. اس کے خلاف اگر عمل ہو تو نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟

سو معلوم رہے کہ نماز بالاتفاق صحیح ہے. حضرت امیر معاویہؓ نے اس مسئلے کی جو وضاحت فرمائی ہے وہ استحبابی ہے اور اس کا خلاف صرف کراہت تنزیہی ہے. نماز ہو جانے میں کوئی کلام نہیں.

حضرت مولانا سید انور شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں :۔

ثم الارجح عندی فی البعدية ان يقدم الشفع علی الاربع كما ثبت عن ابن عمرؓ [3]

ترجمہ. میرے نزدیک راجح یہی ہے کہ (جمعہ کے بعد کی) دو چار سنتوں سے پہلی پڑھی جائیں جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ثابت ہے. واللہ اعلم بالصواب

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: ایک صاحب جو دعوت کا مطالعہ بڑے شوق سے کیا کرتے ہیں کہتے ہیں کہ حضرت امام حسینؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کی بیعت نہیں کی تھی صرف حضرت امام حسنؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کے حق میں دست برداری کر دی؛

---

[1] ابو داؤد ص ۱۶۱ [2] مسلم ص ۲۴۴ [3] فیض الباری جلد ۲ ص ۲۴۵

تھی اور بس!

۱۔ کیا حضرت امام حسنؓ سے واقعی صرف دست برداری ثابت ہے یا باقاعدہ اصولی بیعت بالرضا ہوئی ہے اور بعد مصالحت حضرت امیر معاویہؓ کے یہ تعلقات ان حضرات کے ساتھ بحسن وخوبی رہے یا کشیدہ اور رنجش آمیز رہے؟

۲۔ کیا حضرت امام حسینؓ نے بالرضا بیعت حضرت امیر معاویہؓ سے کی تھی یا گوشہ نشین رہے تھے؟

۳۔ کیا امامینؓ حضرت امیر معاویہؓ سے وظیفہ لیتے رہے اور دیگر امور دینیہ اور دنیویہ میں بھی ان سے صلاح ومشورے کرتے رہے۔ ان کے اس قسم کے روابط جناب امیر معاویہؓ سے ثابت ہیں یا نہیں؟

سائل۔ رائے لطیف احمد بواسطہ مولانا محکم الدین جھنگ صدر

جواب: حضرت امام حسنؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کی مصالحت صرف یہی نہ تھی کہ سیدنا حضرت حسنؓ حضرت امیر معاویہؓ کے حق میں دست بردار ہوگئے تھے۔ بلکہ حضرت امام حسنؓ نے حضرت امیرؓ کی باقاعدہ بیعت کی تھی۔ رجال کشی، بحار الانوار اور حبیب السیر وغیرہ کتب معتبرہ میں صراحت کے ساتھ بیعت کے الفاظ موجود ہیں۔ اس موقع پر جو شرائط فریقین میں طے پائی تھیں وہ بھی کتابوں میں بصراحت موجود ہیں۔ جو بیعت مجبوری کی حالت میں ہوتی ہے اس میں کسی قسم کی شرائط کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ شرائط کا طے ہونا ہی اس امر کی کھلی شہادت ہے کہ یہ بیعت بالرضا تھی۔ اس میں جبر واکراہ کا کوئی دخل نہ تھا۔ حضرت امیر معاویہؓ نے اپنے آخری وقت میں یزید کو جو وصیت فرمائی (اُسے ملا باقر مجلسی نے اپنی کتاب جلاء العیون میں نقل کیا ہے) اس میں حضرت امیر معاویہؓ فرماتے ہیں کہ:۔

وہ تعلقات جو میں نے اب تک ان حضرات اہلبیت کے ساتھ محکم اور استوار رکھے ہیں،
انہیں ہرگز قطع نہ کرنا[1]

یہ الفاظ اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ ان حضرات کے تعلقات حضرت امیرؓ کے ساتھ آخر وقت تک سازگار اور خوشگوار رہے۔ یہ صحیح ہے کہ حضرت امام حسینؓ بھی ہر بات میں حضرت امام حسنؓ کے ساتھ برابر شامل رہے اور انہوں نے بھی اپنے بھائی کے ساتھ حضرت امیر معاویہؓ کی باقاعدہ بیعت کی تھی۔ اس امر کی تصریح کتب امامیہ میں واضح موجود ہے۔

یہ بھی صحیح ہے کہ امامین کریمین (حضرت امام حسنؓ اور حسینؓ) ہر دو حضرات سیدنا حضرت امیر معاویہؓ سے باقاعدہ وظیفہ وصول فرماتے رہے۔ ان بزرگوں کا اس وظیفے کو قبول کرنا اور مسلسل کرتے رہنا اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ ان حضرات کے تعلقات حضرت امیر معاویہؓ سے پوری طرح سازگار تھے اور باہمی مصالحت پوری طرح قائم تھی۔

کتبہ خالد محمود عفا اللہ عنہ ۲۴ر جولائی ۶۴ء

---

[1] جلاء العیون ص ۴۸۸

سوال: سیرت کے جلسوں میں یہ بات عام طور پر سُنی جاتی ہے کہ جناب پیغمبر اسلامؐ بعثت سے پہلے بھی اتنے اعلیٰ اخلاق رکھتے تھے کہ جب آپ نے دعوائے نبوت فرمایا تو وہی اخلاقی بلندیاں آپ کے دعوائے نبوت کی دلیل بن گئیں۔ بذریعہ "دعوت" مطلع فرمائیں کہ اس ماحول میں ان دنوں کیا کوئی اور شخص بھی ایسا تھا جو اخلاقی بلندیوں میں معروف تھا اور جس کی رفاقت حضورؐ کے مشن کے لیے ممد ومعاون بن سکتی تھی؟ سعید الرحمان از سرگودھا

جواب: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو فضائل اخلاق کا پیکر اور صدق ودیانت اور عفت وعدالت کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ آپ کے اخلاق عالیہ نے بعثت سے پہلے ہی ان لوگوں کو اپنے بہت قریب کر دیا تھا جو مزاج اور اخلاق میں آپ سے طبعی مناسبت رکھتے تھے۔

اس حقیقت سے کوئی صاحب بصیرت انکار نہیں کر سکتا کہ بعثت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اپنے گھر کی چار دیواری سے باہر صرف ایک ہی خاص دوست تھے اور وہ سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے۔ وہ آپ کے سفر وحضر کے ساتھی اور مصاحب تھے۔ جب حضورؐ کی عمر شریف بیس سال کے قریب تھی تو آپ نے حضرت ابوبکرؓ کی معیت میں شام کا دوسرا سفر کیا تھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دنوں ان دونوں عظیم ہستیوں میں وجہ اقتراب اور موضوع ارتفاق کیا تھا؟ آغاز وحی تو اس کے مدتوں بعد ہوا۔ اس وقت ان دونوں ہستیوں میں فضائل اخلاق ہی وہ مشترک سرچشمہ تھے جنہوں نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے بہت قریب کر رکھا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جس طرح حضورؐ کے اعلان نبوت کے ساتھ ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ ایک دلیل بن کر سامنے آگئے۔ اور کوئی مؤرخ اور سیرت نگار ان کے ذکر کے بغیر آگے نہیں چل سکتا۔ اسی طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ایمان لانے کے ذکر میں ہر سیرت نویس اور تذکرہ نگار، حضرت صدیق اکبرؓ کی سابقہ دوستی کا ذکر کرنے پر مجبور ہے۔ حضرت علامہ شیخ محمد خضری مصری "نور الیقین فی سیرت سید المرسلین" میں لکھتے ہیں:۔

آپ کے گھر کے لوگوں کے سوا جس نے سب سے پہلے آپ کی آواز کو قبول کیا وہ ابوبکرؓ بن ابی قحافہ بن عامر بن کعب بن سعد بن مرہ تیمی قریشی تھے جو قبل نبوت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوست تھے[1]

مولانا شبلی مرحوم اپنی مشہور کتاب "سیرت النبی" میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آغاز میں دعوت اور اسلام اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی شخصیت کا نقشہ ان لفظوں میں کھینچتے ہیں:۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فرض نبوت ادا کرنا چاہا تو سخت مشکلیں پیش نظر تھیں۔ اگر

---

[1] نور الیقین ص ۲۸

آپ کا فرض اسی قدر ہوتا کہ مسیح علیہ السلام کی طرح صرف دعوتِ تبلیغ پر اکتفا کریں یا حضرت کلیمؑ کی طرح اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکل جائیں تو مشکل نہ تھی لیکن خاتم انبیاء کا کام خود سلامت رہ کر عرب اور نہ صرف عرب بلکہ تمام عالم کو فروغِ اسلام سے منور کردینا تھا۔ اس لیے نہایت تدبیر اور تدریج سے کام کرنا پڑا۔

سب سے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ یہ پُرخطر راز پہلے کس کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس غرض کے لیے صرف وہ لوگ انتخاب کیے جا سکتے تھے جو فیضیابِ صحبت رہ چکے تھے جن کو آپ کے اخلاق و آداب کے ایک ایک حرکات و سکنات کا تجربہ ہو چکا تھا۔ جو پہلے تجربوں کی بناء پر آپ کے صدق دعوے کا قطعی فیصلہ کر سکتے تھے یہ لوگ حضرت خدیجہؓ آپ کی حرم محترم تھیں، حضرت علیؓ تھے جو آپ کی آغوش میں پلے تھے، حضرت زیدؓ تھے جو آپ کے آزاد کردہ غلام اور بندہ خاص تھے، حضرت ابوبکرؓ تھے جو برسوں سے فیضیابِ خدمت تھے۔ سب سے پہلے آپ نے حضرت خدیجہؓ کو یہ پیغام سُنایا۔ وہ سنتے ہی پہلی مومن تھیں۔ پھر اور بزرگوں کی باری آئی اور یہ سب ہمہ تن اعتقاد تھے۔

حضرت ابوبکرؓ دولت مند ماہر انساب اور صاحب الرّائے فیاض تھے۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ جب وہ ایمان لائے تو اُن کے پاس چالیس ہزار درہم تھے۔ غرض ان اوصاف کی وجہ سے مکہ میں ان کا خاص اثر تھا اور معززین شہر ان سے ہر بات میں مشورہ لیتے تھے۔ اربابِ روایت کا بیان ہے کہ کبار صحابہ میں سے حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت سعد بن وقاصؓ فاتح ایران اور حضرت طلحہؓ سب اُن ہی کی ترغیب اور ہدایت سے اسلام لائے۔ ان کی وجہ سے یہ چرچا چپکے چپکے اور لوگوں میں بھی پھیلا اور مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔

مشہور مستشرق سر ولیم میور اپنی کتاب Muhammad and Islam محمڈ اینڈ اسلام میں لکھتے ہیں:۔

> جو لوگ اوّل اوّل ایمان لائے وہ اکثر جوان ہی تھے۔ مگر اُن میں سے ایک شخص ابوبکرؓ نامی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جانی یار اور آپ سے عمر میں تین سال چھوٹا تھا۔ پختہ عمر کا تھا۔ یہ شخص نہایت سنجیدہ، نرم مزاج، صاحب تدبیر اور بڑا لائق تھا۔ ابوبکرؓ کی قسمت ازل سے پیغمبر صاحب کے ساتھ ہی بڑی تھی اور زندگی کے تمام تغیرات میں اخیر تک آپ کی قوت کا مضبوط ستون بنا رہا اور ان کی بیٹی عائشہؓ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی تھیں۔ کہتی ہیں کہ مجھے وہ وقت یاد نہیں جب میرے ماں باپ مسلمان نہ تھے اور نہ یہ یاد ہے کہ کب پیغمبر صاحب صبح و شام دو وقت ہمارے گھر نہ آتے تھے اور خود پیغمبر صاحب ہی فرمایا کرتے تھے کہ میں نے جس کسی کو اسلام کی طرف دعوت دی ہے ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں

کہ ابتداء میں اس نے کچھ دیر اور تردد نہ کیا ہو سوائے ابوبکرؓ کے کہ جب میں نے اُس پر اسلام پیش کیا تو اس نے قبول کرنے میں مطلقاً کوئی تردد نہیں کیا۔ ابوبکرؓ اس وقت بہت اقبالمند اور خوشحال تاجر تھا اور اپنا مال مسلمان غلاموں کے خریدنے اور آزاد کرنے میں خرچ کرتا تھا جو اپنے کافر مالکوں سے بوجہ مسلمان ہو جانے کے ستائے جاتے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ کے ایمان لانے کے اثنائے ذکر میں ان کی شخصیت کے متعلق ایسے شاندار ریمارک تقریباً ہر سیرت نویس اور اسلامی تاریخ لکھنے والے نے تحریر کیے ہیں۔ اس کی جامع وجہ یہ ہے کہ آغاز کار میں اشاعتِ اسلام اور دعوت الی اللہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مال و جان سے رفیقِ حال میں ان کی خدمات سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔ توضیح اس کی یوں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے اصل مقصود الٰہی تبلیغِ حق اور دعوت الی اللہ ہے اور یہ اُمر سوائے مال و جان کو وقفِ خدمت کر دینے اور پیش آمدہ مزاحمتوں کا مقابلہ نہایت صبر و استقامت سے کرنے کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ پس دیکھنا چاہیئے کہ آغاز کار میں اس خدمت کے لائق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کون ہو سکتا ہے؟

(۱) حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا

بے شک سب سے پہلے ایمان لائیں اور اپنا سارا مال آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سپرد کر دیا لیکن وہ آپ کی زوجہ محترمہ تھیں۔ آپ کے زیرِ اثر تھیں۔ بیوی کا اپنے نیک خاوند سے ایسا سلوک کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ لیکن وہ عورت ذات تھیں۔ تبلیغ و دعوت میں اپنی ذات سے آپ کے ساتھ نہیں ہو سکتی تھیں۔

(۲) حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ

بے شک یہ بھی شروع ہی میں ایمان لائے لیکن ابھی چھ یا دس سال کے نابالغ بچے تھے۔ تکالیفِ شرعیہ کے مکلف نہ تھے۔ بچپن کی وجہ سے اُن صنادید قوم پر کوئی اثر نہیں رکھتے تھے جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو واسطہ پڑنے والا تھا۔ جن کا دستور و آئین یہ تھا کہ نابالغ بھائیوں کو جو گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر میدان میں نہ نکل سکیں وراثتِ پدری میں سے حصہ نہیں دیتے تھے۔ کئی سال کے بعد حضرت علی المرتضیٰؓ جوان ہو کر جو خدمات بجا لائے وہ سب قابلِ قدر ہیں۔ لیکن یہاں ابتدائے کار کا ذکر ہے۔ علاوہ اس کے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ تربیت ہیں اور ساری عمر اسی طرح رہے۔ ان کی خدمات بھی تعجب ناک نہیں۔

(۳) حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ

آپ بھی شروع ہی میں نعمتِ اسلام سے مشرف ہوئے۔ لیکن وہ قوم کے لحاظ سے غیر قریشی ہیں۔ غلام آزاد کردہ ہیں۔ مغرور و متکبر اور مالدار قریشیوں کے سامنے ان کی کوئی وقعت نہیں۔ ان کی جو کچھ بھی پوچھ گچھ ہوئی ہے

وہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ہے۔ پھر یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پروردہ ہیں۔ انعمت علیہ (پ۲۲ احزاب) حضور کا ان پر اثر ہے۔ ان کی جان نثاری اور وفاداری بھی قابلِ قدر ہے لیکن موجب تعجب نہیں۔

(۴) حضرت امّ ایمن رضی اللہ عنہا

یہ بھی شروع ہی میں نورِ ایمان سے منور ہوئیں لیکن آپ کی موروثی کنیزک ہیں۔ عورت زاد ہیں۔ ابوجہل وعتبہ اور امیہ و ولید جیسے سرکش ومتمول قریشیوں کے مقابلہ میں کیا کر سکتی ہیں۔

(۵) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

ان کے بھی پہلے ہی دن ایمان لے آنے میں کسی کو کلام نہیں۔ نسب میں قریشیوں کے ہم ذات ہیں۔ مال میں ان کے ہم سنگ ہیں۔ مروت واحسان اور اخلاق وطہارت میں ان سے بڑھ کر ہیں۔ اپنے پرائے سب کی نظر میں معزز ومقبول ہیں۔ مساکین ومظلومین کی امداد میں مشہور رہیں۔

علاوہ بریں سابقاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ممنون وزیرِ اثر بھی نہیں ہیں۔ سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاقی حالات کے علم اور صدق ووفا اور ایثار وجاں نثاری کے جذبات سے لبریز ہونے کے اور کوئی وجہ درمیان میں نہیں ہے۔ پھر یہ کہ خدا تعالیٰ کی حکمت بین توفیق وسازگاری سے خدمتِ اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کے لیے عملی طور پر ہمہ وقت خدمت میں غلامانہ کمربستہ ہیں۔ ایک ہاتھ میں مال وعیال اور دوسرے میں جان رکھ کر قربان کرنے کے لیے سب کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا ہے اور یہ میرا اور تمہارا کی تمیز اُٹھا دی ہے اور لطف یہ ہے کہ اس مال سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سوائے اس کے کہ آپ اسے دینِ خدا کے لیے قبول فرمالیں کوئی واسطہ وتعلق نہیں اور اس بات کی قدر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پاک میں بھی بیش از بیش ہے۔ چنانچہ آپ حضرت عمرؓ کی ایک بات پر بصیغۂ جمع سب کو خطاب کر کے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی سابقیتِ اسلام اور مالی وجانی خدمات کا ذکر کر کے فرماتے ہیں:۔

ان اللہ بعثنی الیکم فقلتم کذبت وقال ابوبکر صدق وواسانی بنفسہ ومالہ فہل انتم تارکوالی صاحبی[1]

یعنی بے شک خدا تعالیٰ نے تم سب کی طرف سے مبعوث کیا (سو شروع دعوت میں) تم نے کہا کہ آپ نے (معاذ اللہ) جھوٹا دعوے کیا لیکن ابوبکرؓ نے کہا کہ آپ نے سچ کہا تو کیا تم میری خاطر میرے رفیق کا پیچھا چھوڑ دو گے کہ نہیں (یعنی چھوڑ دو)۔ نیز فرمایا:۔

مانفعنی مال احد قط مانفعنی مال ابی بکر[2] الحدیث

---

[1] رواہ الترمذی جلد ص [2] رواہ النسائی جلد ص جامع ترمذی جلد ۲ ص۲۰۸ لکھنؤ

یعنی مجھے دین کی خدمت میں کسی کے مال نے ایسا فائدہ نہیں دیا جیسا فائدہ ابوبکرؓ کے مال نے دیا۔ نیز فرمایا:۔

رحم اللہ ابا بکر زوجنی ابنتہ وحملنی الیٰ دار الھجرۃ واعتق بلالاً من مالہ وما نفعنی مال فی الاسلام مانفعنی مال ابی بکر[1]

یعنی ابوبکرؓ پر خدا کی رحمت ہو اس نے اپنی (صغیرہ) بیٹی مجھے بیاہ دی اور مجھے سوار کر کے دارِ ہجرت (مدینہ شریف) میں لے گیا اور اس نے میرے (عاشق صادق) بلالؓ کو اپنے ذاتی مال سے خرید کر آزاد کیا اور مجھے (خدمت) اسلام میں کسی کے مال نے اتنا نفع نہیں دیا جتنا ابوبکرؓ کے مال نے دیا۔

بس یہی خصوصیات وامتیازات ان کے احق بالخلافہ ہونے کے نشان ہیں اور اسی نگاہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو امیر حج اور اپنی وفات شریف والی بیماری میں اپنی بجائے امامِ نماز مقرر کیا؟

سیرت المصطفیٰ میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے۔ ان حالات سے پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں عظیم شخصیتوں میں اگر طبعی مناسبت نہ ہوتی اور دونوں بزرگوں کا مزاج ایک دوسرے کے ہم رنگ نہ ہوتا تو زمانہ قبل از اسلام، بعد از اسلام، قبل از ہجرت بلکہ بعد الوفات تک یہ رفاقتِ عظمیٰ اور خلتِ خاصہ اس شان سے ہمیشہ جلوہ گر نہ رہتیں۔

واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

کتبہٗ: خالد محمود عفا اللہ عنہ ۲۱ جولائی ۶۴ء

سوال: قرآن پاک کی آیات اس کے اپنے دعوے کے مطابق دو قسم کی ہیں محکمات اور متشابہات۔ انہی اختلاف سے امت میں تمام مختلف فرقے پیدا ہوئے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رب العزت نے سارے قرآن کو ہی محکمات کی صورت میں کیوں نہ اتارا۔ آیات متشابہات نے بہت سی اختلافات کی راہیں کھول رکھی ہیں۔ اگر کل آیات ہی محکمات ہوتیں تو امت کسی اختلاف کا شکار نہ ہوتی۔ آیات کی اس تقسیم میں آخر کون سی حکمت ملحوظ تھی۔ نیز یہ بھی بیان فرمائیں کہ علم تفسیر کی ضرورت کیا ہے۔ قرآن کریم کے ترجمے کو دیکھ لینا کیوں کافی نہیں؟ سائل: عبدالحفیظ از کوہاٹ

جواب: قرآن عزیز بہترین انسانی زندگی کا آخری نصاب اور ایک جامع ضابطہ حیات ہے۔ جب تک یہ دنیا آباد ہے کائنات اس کی شدید محتاج ہے۔ جب اس میں ہر ضرورت کا حل اور ہر طلب کا جواب ہے تو ظاہر ہے کہ یہ معدود آیات اور محدود جزئیات ان تمام ضروریات کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ پس لازمی طور پر ان مواقع میں جہاں قرآنی ہدایت ایک واضح جزئی کی شکل میں موجود نہیں، ہم قرآن عزیز کی عمومی ہدایت اور بیان سنت کی طرف رجوع کریں گے۔ اس صورت میں غیر منصوص کو منصوص کی طرف یا مجمل کو مفصل کی طرف لوٹانا ضروری ہو گا اور یہی اندازِ اجتہاد ہے جس سے قرآن پاک کے ایک مکمل ضابطۂ حیات ہونے کا دعوے قائم ہوتا ہے۔ اجتہاد واستدلال کے

---

[1] رواہ النسائی ص

اس طریق کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو قرآنی ہدایت حالاتِ پیش افتادہ میں نہایت محدود ہو کر رہ جائے گی۔

خدا کی حکمت ہماری اس اساسی ضرورت کی طرف متوجہ ہوئی اور قرآن عزیز اپنے پہلے اظہار میں ہی محکمات و متشابہات میں تقسیم ہو گیا تاکہ متشابہات کو محکمات کی طرف لوٹانے میں علمی تیقظ بصیرت اور قوت اجتہاد پیدا ہو اور امت کی مذکورہ بالا بنیادی ضرورت کی راہیں ابتداء ہی سے ہموار ہو جائیں۔ وہ علمائے ربانی جو ان دونوں قسموں کا اپنے اپنے درجہ میں حق ادا کریں اور ہر دو قسم کی آیات پر پختہ ایمان رکھیں۔ ایسے ہی اولوالالباب کا ذکر و شعور مسائل پیش افتادہ کو حل کر سکتا ہے اور یہی لوگ حقیقت میں راسخین فی العلم ہیں۔

والراسخون فی العلم یقولون اٰمنا بہ کلٌ من عند ربنا وما یذکر الا اولوا الالباب۔[1]

اگر اس منقولی اجتہاد (متشابہات کو محکمات کی طرف یا مجملات کو مفصلات کی طرف لوٹانا) کے متعلق سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کی ضرورت کیا تھی۔ آیات سب محکمات ہونی چاہیئے تھیں۔ تو کیا تفکر و تدبر کے معقول اجتہاد کے متعلق بھی یہ سوال بعینہٖ پیدا نہیں ہوتا کہ قرآن پاک اپنی ہر بات میں اتنا واضح اور صاف آخر کیوں نہیں کہ فکر و تدبر کی بھی کوئی ضرورت اصلاً درپیش نہ ہو۔ افسوس اس بات کا ہے کہ منقولات میں غور و فکر تو قابلِ اعتناء نہیں سمجھا جاتا اور جو فکر و تدبر ان سے پورا بے نیاز ہو اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ حالانکہ غور و فکر صرف وہی معتبر ہے جو بیان سنت کی روشنی میں ہو۔

خلاصہ اینکہ: قرآن عزیز کی آیات کچھ محکمات ہیں، کچھ متشابہات، کچھ عام ہیں جہاں احکام عمومی شان رکھتے ہیں اور کچھ خاص، جو کسی خاص واقع یا جزئیہ پر مشتمل ہیں۔ اسی طرح بعض آیات مجمل ہیں کہ صرف وصف عنوانی کا بیان ہے اور بعض مفصل کہ ان میں طریقِ عمل کا پورا نقشہ بھی موجود ہے۔ اسی طرح ناسخ اور منسوخ کو بھی ایک مستقل موضوع کے ساتھ زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ پھر عام آیات بھی بعض ایسی ہیں کہ ان سے بعض مخصوص افراد مستثنیٰ ہیں اور کچھ اپنے عموم پر اپنی پوری مجموعی شان سے باقی ہیں۔ آیاتِ قصص کی شان اور ہے اور آیاتِ احکام کا انداز اور ہے۔ پس ایک ایسے علم سے چارہ نہیں جو ان تمام تفہیمات اور باہمی فرق کے بیان میں فہمِ قرآن کی شان پیدا کرے۔ یہی علم "علم تفسیر" کہلاتا ہے اور انہیں تفسیری اصولوں کی روشنی میں علم تفسیر کے مدون اور مرتب ذخیروں سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں علم تفسیر کی ضرورت بکمال ہویدا ہے۔

ملحوظ رہے کہ سلف کے اختلافات اور موجودہ اختلافات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ سلف کے اختلافات ایسے ہرگز نہ تھے کہ تطبیق اور اتفاق کی کوئی صورت ہی پیدا نہ ہو۔ اس کے لیے آپ مندرجہ ذیل اصولی بات کو پیشِ نظر رکھیں:-

---

[1] پ ۳ آل عمران آیت ۷

تفسیر سلف میں اختلاف کی نوعیت اور موارد نزول میں اختلاف کی حقیقت

ہمارے زمانے کے بعض وہ لوگ جو سلف صالحین کی تفسیر سے مستغنی اور نصوص قرآنیہ میں الحاد کی راہ چلنے کے عادی ہیں یہ پراپیگنڈہ عام کرتے ہیں کہ سلف صالحین کے تفسیری ذخائر آپس میں بہت مختلف ہیں۔ ان پر اعتماد کیسے کیا جائے۔

جواباً گذارش ہے کہ یہ دعوے حقیقت کے مطابق نہیں۔ سلف صالحین کا تفسیر میں بہت کم اختلاف ہے۔ قرآن کا بیان جو الاعتبار و التاویل کے درجہ میں ہو اس میں تو بے شک بہت سے عنوان مختلف ہیں لیکن جہاں تک تفسیر کا تعلق ہے اس میں سلف کا اختلاف بہت کم ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:-

سلف صالحین کے مابین تفسیر میں اختلاف کم ہوا ہے۔ احکام میں تفسیر سے زیادہ اختلاف ہے اور تفسیر میں بھی جو اختلاف صحیح طور پر ان سے مروی ہے وہ تنوع کا ہے نہ کہ تضاد کا۔[1]

مثال کے طور پر "صراطِ مستقیم" کو لیجیئے۔ بعض سلف کہتے ہیں کہ اس سے مراد قرآن ہے اور بعض دوسرے بزرگوں کا قول ہے کہ صراطِ مستقیم اسلام ہے ——— صراطِ مستقیم کی یہ دونوں تفسیریں ظاہر میں مختلف معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن حقیقت میں مختلف نہیں۔ بلکہ متفق ہیں اور ایک ہیں۔ دینِ اسلام اتباعِ قرآن ہی کا دوسرا نام ہے۔ اسی طرح صراطِ مستقیم کی تفسیر سنت و جماعت کے طریقے سے بھی کی گئی ہے۔ اسے خدا اور رسول کی اطاعت کے نام سے بھی پیش کیا گیا ہے۔ مگر یہ سب لفظ ایک ہی ذات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ان معنوں میں کوئی اختلاف نہیں ہر ایک نے کسی ایک صفت کو بیان کر دیا ہے۔ قالہ الحافظ رحمہ اللہ انا اعطینٰک الکوثر میں بعض بزرگوں نے کوثر سے مراد قرآن کریم لیا ہے جو شانِ جامعیت اور کثرت کا حامل ہے اور بعض روایات کی رو سے یہ جنت کا ایک حوض ہے جس سے پینے والا پھر کبھی پیاسا نہیں ہوگا۔ ان میں بھی کوئی حقیقی اختلاف نہیں۔ قرآن کی معنویت آخرت میں جو صورتِ محسوسہ اختیار کرے گی وہ جنت کا ایک حوض ہوگا جس سے وہی سعادت مند سیراب ہوں گے جو اس دنیا میں اس حوض سے جرعہ نوشی کرتے رہے ہوں گے یعنی قرآن کی دولت سے مستفید و مستفیض ہوتے رہیں گے یہاں محض تنوع کا اختلاف ہے تضاد کا نہیں۔

ان مثالوں پر غور کرنے سے تفسیر قرآنی کے دوسرے اختلافاتِ سلف بھی بہت حد تک سمٹتے نظر آئیں گے اور حقیقت میں سلف میں تفسیری اختلاف بہت کم ہوا ہے اور وہ اختلاف بھی زیادہ تر تضاد کا اختلاف نہیں محض تنوع کا اختلاف ہے۔ ایسے اختلافات کو

---

[1] رسالہ اصول تفسیر حافظ ابن تیمیہؒ

اُچھال کر سلف کے تفسیری سرمائے سے بدگمان کرنا ان لوگوں کا کام ہے جنہیں قسامِ ازل نے علم و فہم کا کوئی حصہ نہیں دیا اور وہ شاہراہِ سلف میں شک کے کانٹے بچھا کر اپنے مخصوص الحادِ ذہنی کے لیے راہیں ہموار کرنا چاہتے ہیں۔

حافظ ابن تیمیہ اس قسم کے اختلاف کی مثال میں اس آیت کو پیش کرتے ہیں :-

ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا فمنھم ظالم لنفسہ ومنھم مقتصد ومنھم سابق بالخیرات۔ (پ۲۲ فاطر ع۴ آیت ۳۲)

ترجمہ۔ پھر ہم نے کتاب کا وارث انہیں بنایا جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے چن لیا تھا پھر اُن میں ایسے بھی ہوئے جو ظالم لنفسہ تھے اور ایسے بھی تھے جو مقتصد تھے (میانہ رو تھے) اور ایسے بھی ہوئے جو نیکیوں میں آگے بڑھ گئے سابق بالخیرات ہوئے۔

اب ایک مفسر کہتا ہے کہ سابق سے مراد وہ ہے جو اوّل وقت نماز پڑھتا ہے، مقتصد وہ ہے جو دورانِ وقت نماز پڑھتا ہے اور ظالم لنفسہ وہ ہے جو نمازِ عصر میں یہاں تک تاخیر کر دیتا ہے کہ دھوپ زرد پڑ جائے۔ دوسرا مفسر کہتا ہے کہ صدقہ دینے والا شخص جو واجبات کے ساتھ مستحبات بھی بجا لائے وہ سابق بالخیرات کا مصداق ہے۔ سود کھانے والا یا زکوٰۃ روک لینے والا ظالم لنفسہ ہے اور مقتصد وہ ہے جو فرض ادا کرتا ہے اور سود نہیں کھاتا۔

اب دیکھیے کہ دونوں مفسر آیت کے عموم میں سے ایک ایک نوع کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ ان کا مقصود باہمی اختلاف نہیں۔ بلکہ یہ سمجھانا ہے کہ آیت کے مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے۔ حسنات و طاعات یا ارتکاب محرمات وغیرہ میں سے کسی ایک نوع کا تذکرہ کر دینا محض تنوع کا اختلاف ہے تضاد کا نہیں۔ آیت کریمہ اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ تمام متعلقہ جزئیات و انواع کو شامل ہے۔

مواردِ نزول میں اختلاف کی حقیقت

سلف کے تفسیری سرمایہ سے بدگمانی کرنے والے یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ ایک ہی آیت کے متعلق ایک مفسر سببِ نزول کوئی بیان کرتا ہے اور دوسرا اُس کے شانِ نزول میں کچھ اور کہتا ہے۔ اب ہم کس پر یقین کریں اور کس کا اعتبار کریں۔

جواباً گذارش ہے کہ اس غلط فہمی کا منشاء اسبابِ نزول کے متعلق متقدمین کی اصطلاح اور اُن کی روش کو نہ پہچاننا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس باب میں متقدمین اور متاخرین کی اصطلاح مختلف ہے۔ اس اصول سے انحراف نہیں کیا جا سکتا کہ ہر دور کے علمی سرمائے کو سمجھنے کے لیے اسی دور کی اصطلاح اور روش کو پیش نظر رکھنا

ضروری ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ؒ ارشاد فرماتے ہیں :-

والذی یظھر من استقراء کلام الصحابۃ والتابعین انھم لا یستعملون نزلت فی کذا لبعض قصۃ کانت فی زمنہ صلی اللہ علیہ وسلم وھی سبب نزول الآیۃ بل ربما یذکرون بعض ما صدقت علیہ الآیۃ مما کان فیہ فی زمنہ صلی اللہ علیہ وسلم او بعدہ صلی اللہ علیہ وسلم ویقولون نزلت فی کذا او یلزم ھناک انطباق جمیع القیود بل یکفی انطباق اصل الحکم وقد یقدرون حادثۃ تحققت فی تلک الایام المبارکۃ واستنبط صلی اللہ علیہ وسلم حکمھا من آیتہ وتلاھا فی ذٰلک الباب ویقولون نزلت فی کذا۔[۱]

ترجمہ۔ صحابہ اور تابعین کے بیانات کے استقرار کرنے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ نزلت فی کذا (یہ آیت اس باب میں نازل ہوئی) کے الفاظ محض اس واقعہ کے لیے ذکر نہیں کرتے تھے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ پیش آیا اور نزول آیت کا سبب بنا بلکہ وہ بسا اوقات ان مواقع میں بھی یہ الفاظ بول دیتے تھے جن پر کہ وہ آیت (اپنی دلالت کے اعتبار سے) صادق آ رہی ہو۔ ایسے مواقع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوں یا آپؐ کے بعد کے صحابہؓ و تابعین۔ ایسے تمام موقعوں پر بھی نزلت فی کذا کے الفاظ بولتے تھے ان مواقع میں تمام قیود کا انطباق ضروری نہ تھا صرف اصل حکم کا انطباق کافی سمجھا جاتا تھا اور پھر ایسا ہوتا تھا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی واقعہ پیش آیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس خاص موقعہ کا حکم کسی آیت سے استنباط فرمایا (گو وہ آیت بہت پہلے سے نازل شدہ ہو) اور اس آیت کو تلاوت فرمایا تو صحابہؓ ایسے مواقع کے لیے بھی نزلت فی کذا کے الفاظ بول دیتے تھے (گو وہ موقع اصل سبب نزول نہ ہو صرف آیۃ کے معنی و مفہوم کا مصداق ہو)۔

حافظ ابن تیمیہ ؒ لکھتے ہیں :-

"جب سلف ؒ کہتے ہیں کہ یہ آیت فلاں معاملے میں نازل ہوئی تو ان کی غرض کبھی یہ ہوتی ہے کہ آیت کا سببِ نزول یہ ہے اور کبھی مقصد یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ وہ معاملہ اسی آیت کے حکم میں داخل ہے اگرچہ خود وہ معاملہ سببِ نزول نہ بھی ہو"

---

[۱] الفوز الکبیر ص۲۴

پھر یہ بھی یاد رہے کہ سلف میں سے ایک شخص جب کہتا ہے کہ آیت اس بارے میں نازل ہوئی ہے اور دوسرا شخص کسی اور بارے میں نزول بتاتا ہے تو اس سے لازم نہیں ہوتا کہ دونوں میں اختلاف ہے، جب کہ آیت کے مفہوم میں دونوں قول داخل ہوں۔ اسی طرح جب ایک صحابی ایک سببِ نزول بتاتا ہے اور دوسرا صحابی دوسرا سبب بیان کرتا ہے تو اُسے بھی اختلاف پر محمول نہیں کرنا چاہیئے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ ۷، اگست ۱۹۶۴ء

سوال : بوسہ دینا قبرِ اولیاء کرام کو اور طواف کرنا گردِ قبر کے اور انہیں تعظیماً سجدہ کرنا شریعت میں جائز ہے یا نہیں؟

سائل : ریاض احمد از سیالکوٹ

جواب : اولیاء کرام و دیگر صلحاء عظام کی قبور کو بوسہ دینا، ان کا طواف کرنا اور انہیں تعظیماً سجدہ کرنا یہ سب نصاریٰ کی عادات ہیں۔ ہرگز ہرگز جائز نہیں۔ فقہاء نے انہیں حرام لکھا ہے:

کما قال حجۃ الاسلام الغزالی رحمۃ اللہ علیہ فی احیاء العلوم المستحب فی زیارۃ القبور ان یقف مستدبر القبلۃ مستقبلاً لوجہ المیت وان یسلم ولا یمسح القبر ولا یمسّہ ولا یقبلہ فان ذٰلک من عادات النصاریٰ۔

اور ملا علی قاری اپنی کتاب شرح مناسک میں باب زیارتِ مزار پُرانوار رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آداب میں تحریر فرماتے ہیں:

لا یطوف ای ولا ید ور حول البقعۃ الشریفۃ لان الطّواف من مختصات الکعبۃ المنیفۃ فیحرم حول قبور الانبیاء والاولیاء ولا عبرۃ بما یفعلہ العامۃ الجہلۃ ولو کانوا فی صورۃ المشائخ والعلماء ولا ینحنی ولا تقبّل الارض فانہ ای کل واحد بدعۃ ای غیر مستحسنہ فتکون مکروھۃ واما السجدۃ فلاشک انہا حرام۔

حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے بھی اشعۃ اللمعات فی کتاب الجنائز فی باب زیارۃ القبور میں بھی ایسا ہی لکھا ہے:

طریقہ زیارت قبور ایں ست کہ رو بجانب قبر و پشت جانب قبلہ روئے میت باشد وسلام دہد و مسح نکند قبر را بدست و بوسہ ندہد او را و منحنی نشود و روئے بخاک نہ مالد کہ ایں عادت نصاریٰ ست۔

یعنی طریقہ زیارت کا یہ ہے کہ منہ بجانب قبر کے ہو اور پشت بجانب قبلہ مقابل روئے میت کے کھڑا ہو کر سلام پڑھے اور مسح نہ کرے قبر کو اور خم نہ کرے پشت کو اور بوسہ نہ دے کہ یہ مسیحی عادت ہے۔

ایسا ہی مالا بد منہ میں قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی تحریر فرماتے ہیں:

سجدہ کردن بسوئے قبور انبیاء و اولیاء و طواف گرد قبور کردن و دعا از انہا خواستن و نذر ہائے آنہا قبول کردن حرام است بلکہ چیزے آنہا بکفر می رساند۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم بر آنہا لعنت گفتہ و از انہا منع فرمودہ و گفتہ کہ قبر مرا بُت نکنید کما قال صلی اللہ علیہ وسلم لا تجعلوا قبری وثناً یعبد۔

حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ فتاوے عزیزی میں فرماتے ہیں کہ:

طواف کرنا صالحین اور اولیاء کی قبر کا بلاشبہ بدعت ہے۔ اس واسطے کہ بُت پرستوں کی بہت مشابہت ہے۔ وہ بُتوں کے گرداگرد یہ عمل کرتے تھے۔

حضرت شیخ محمد عبد الحق صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ماثبت بالسنۃ میں ذکر زیارت روضہ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آداب میں فرماتے ہیں:

ثم یاتی القبر الشریف ویقف عند راسہٖ مستقبلاً ویکون مستدبر القبلۃ ولا یضع یدہٗ علیٰ جدارہ للقبلۃ ولا یقبلہا فان ذٰلک وامثالہ من صنع الجاھلین ولیس من سیرۃ السلف الصالحین بل یدنو علیٰ قدر ثلاثۃ اذرع او اربعۃ ثم یصلی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وعلی الصدیق والفاروق رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

یعنی جب جاوے مسجد نبوی میں تو آوے قبر شریف کے پاس اور کھڑا ہو سر مبارک کے پاس پشت کرے قبلہ کی طرف اور نہ رکھے ہاتھ کو اوپر دیوار روضہ پاک کے اور نہ بوسہ دیوے اس کو پس یہ فعل اور مثل اس کے طریقۂ جاہلین سے ہیں نہ تھا یہ طریقہ سلف صالحین کا بلکہ تین یا چار گز کے فاصلہ پر کھڑا ہو کر درود اور سلام پڑھے۔

پس جب کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف کے واسطے دیوار کو بوسہ دینے کی ممانعت ہے اور اسے طریقۂ جاہلین سے فرماتے ہیں پس اوروں کے واسطے کب جائز ہو سکتا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

پس مولانا مرحوم جو ایک باعمل تھے وہ بھی طواف قبور و سجدہ وغیرہ کو بدعت و حرام فرماتے تھے اور علامہ ابراہیم حلبی کبیری شرح منیہ میں بعد نقل اقوال قبر پر ہاتھ رکھنے اور بوسہ قبر کے متعلق لکھتے ہیں:

لا شك انه بدعة لا سنة فيه ولا اثر عن صحابي ولا عن امام ممن يعتمد عليه فيه
ولم يعهد الاستلام في السنة الا للحجر الاسود والركن اليماني انتهى.

اور فاضل طحطاوی حواشی مراقی الفلاح میں رقم فرماتے ہیں:-

ولا يمسح القبر ولا يقبله ولا يمسه فان ذلك من عادة النصارى كذا في شرح الشرعة انتهى.

اور زین الحلم شرح عین العلم میں ہے:-

ولا يمس اى القبر ولا الشباك ولا يسجد فورد النهي عن مثل ذلك بقبره عليه السلام فكيف
بقبور سائر الانام ولا يقبل فانه زيادة على المس فهو اولى بالنهي انتهى.

علامہ عینی بنایہ شرح ہدایہ میں افادہ فرماتے ہیں:-

قال الفقهاء الخراسانيون لا يمسح القبر ولا يقبله ولا يمسه فان كل ذلك من عادة
النصارى قال معاذ مكروه قبيح وقال الزعفراني لا يمس القبر بيده ولا يقبله

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ذیل آداب زیارت قبر شریف نبوی صلی اللہ علیہ وسلم
کے جذب القلوب میں فرماتے ہیں:-

واز آنچہ در وسع و امکان بود در ظاہر و باطن از خضوع و وقار و ذلت و انکسار ذرہ نا مرعی
نگذارد و غیر آنکہ از سجود و تمریغ وجہ بہ تراب و استلام و تقبیل شباک شریف و امثال آں آنکہ
در شرع رخصت نکردہ اند در نظر ظاہر بیناں از قبیل آداب نماند اجتناب کند بلکہ بہ یقین داند
کہ حقیقت ادب در رعایت اتباع و امتثال امر آنحضرت ست و ہرچہ نہ ازیں باب ست
توہم باطل است.

طحطاوی حواشی درمختار میں ہے:-

قال ابن الملقن في شرح العمدة لا يشرع التقبيل الا للحجر الاسود والمصحف وايدي
الصالحين من العلماء وغيرهم وللقادمين من سفر بشرط ان لا يكون امراة محرمه و
لوجوه الموتى الصالحين ومنطق بعلم اوحكمة ينتفع بها وكل ذلك قد ثبت في الاحاديث
الصحيحة فعل السلف فاما تقبيل الاحجار والقبور والجدران والستور وايدي الظلمة
والفسقة واستلام ذلك جميعه فلا يجوز ولو كانت الاحجار للكعبة او القبر الشريف او
ستورهما او صخرة بيت المقدس فان التقبيل والاستلام ونحوهما تعظيم والتعظيم خاص
بالله تعالى لا يجوز الا فيما اذن فيه اه شلبي وظاهر اقراره وكلام ابن الملقن ان

مذهبنا لا يابى ذلك انتهى.

فتاوے عالمگیریہ میں ہے:-

ولا يمسح القبر ولا يقبله فان ذلك من عادة النصارى ولا بأس بتقبيل قبر
والديه كذا في الغرائب انتهى.

شیخ عبدالحق محدث دہلوی مدارج النبوت میں تحریر فرماتے ہیں:-

بوسہ دادن قبر را و سجدہ کردن آنرا و کلہ نہادن حرام و ممنوع است و در بوسہ دادن قبر والدین
روایۃ فقہی نقل مے کند و صحیح آنست کہ لا یجوز است.

حضرت مولانا عبدالحی صاحب مرحوم حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے ملتزم القبر دیکھے جانے
اور مروان کے روکنے کی روایۃ کے بعد فرماتے ہیں:-

مخفی نہ رہے کہ بعض قاصرین اس حدیث اور قصہ زیارت حضرت فاطمہؓ سے استناد کرکے کہتے
ہیں کہ بوسہ دینا قبر کا اور چھونا واسطے برکت کے اور مل لینا قبر کے ساتھ خصوصاً قبور اولیاء اللہ
کے ساتھ درست ہے اور یہ استناد ان کا غلط ہے۔ کیونکہ ان حضرات سے یہ امور حالت
وجد اور بے اختیاری میں صادر ہوئے ایسی صورت میں فاعل ان امور کا معذور ہے.
اس سے جواز ان امور کا حالت اختیار میں ثابت نہیں ہوتا اور اسی واسطے اور صحابہؓ سے
ایسے امور مروی نہیں ہیں. بلکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نہی مروی ہے اور محققین حنفیہ
اور شافعیہ اور مالکیہ و حنبلیہ تصریح کرتے ہیں کہ اس طرح کے امور مکروہ و بدعت ہیں. کسی
قبر کے ساتھ خواہ قبر رسول ہو یا قبر ولی یا قبر مرشد ہو یا قبر والدین ہو، یہ عمل ہرگز ہرگز نہ چاہیئے.
تفصیل اس کی در منظم وغیرہ میں مبسوط ہے. انتہیٰ

شرح شفا ملا علی القاری میں ہے:-

ولا يمس القبر وكذا جدار رقيه وشبكة حجرة عليه السلام بيده ولا يضمه لعدم
وروده عن الصحابة الكرام ولانه اقرب الى مقام الادب ولان ذلك من عادة
النصارى على مانقله الغزالي. انتهى.

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی تفسیر فتح العزیز میں انواع اتخاذ انداد کے تحت لکھتے ہیں:-

بعضے از ایشاں با صور ہیاکل و قبور و معابد و مساکن و مجالس آنہا افعالے کہ برائے مسجد و کعبہ
و خدا باید کرد بعمل مے آرند مانند سر بر زمین نہادن و گرد اگرد گشتن و دست بستہ بصورت

استقبال قبلہ در نماز استادن حالانکہ ایں محبت ایشاں متقاضائے ایمان ۔۔۔۔ برائے خدائیت تا نزد خدا معید افتد دور رضا مندی او بکار افتد۔ انتہٰی۔

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ طواف اور سجدہ کرنا اور بوسہ دینا شباک شریف سرورِ عالم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بقول صحیح و محقق ممنوع و خلاف ادب و اتباع ہے اور جب کہ روضہ مطہرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ان امور کا ارتکاب ممنوع و حرام ہے۔ پس دوسرے کی قبر کے ساتھ کیونکر یہ افعال جائز و مشروع ہو سکتے ہیں۔ یہی قول صحیح و محقق ہے۔ اس کے خلاف کسی کا قول اگر ہو تو وہ قابلِ التفات و عمل و توجہ نہیں ہو سکتا۔ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب اور دوسرے اکابر مسلک کا یہی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ ۲۸ر اگست ۱۹۷۴ء

سوال : شیعہ فقہ اور ان کے ارکانِ عقیدہ کب سے شروع ہوئے۔ نیز یہ بھی بتلائیں کہ جو لوگ نماز جیسے فرائض میں تو لاپرواہی کریں اور تسبیح پر تسبیح گھماتے پھریں یا چند مجالسِ ذکر منعقد کرلنے کو دین کا سارا کام سمجھ لیں۔ ان کے اس تسبیح کرنے کا کیا مسئلہ ہے؟ ملک صاحب خان صوبہ دار میجر۔ تلہ گنگ ضلع کیمبلپور۔ خریداری نمبر ۱۵۰۶

جواب : ہمارے بلاد میں شیعہ سے مراد عموماً اثنا عشری شیعہ لیے جاتے ہیں۔ اس لیے اغلب ہے کہ آپ کے سوال میں بھی یہی لوگ مراد ہوں گے۔ سو یاد رکھیئے کہ ان حضرات کے اعتقاد میں بارہ اماموں کی امامت کا نام بنام اقرار کرنا جزوِ ایمان ہے اور اسی نسبت سے یہ اثنا عشری کہلاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس عقیدے کا قیام اور اس دینی خلا کا استقرار بارہویں امام کی پیدائش کے بعد ہی کے کسی وقت سے تجویز کیا جا سکتا ہے۔ حضرت امام مہدی کی پیدائش علامہ کلینی اور شیخ مفید کے بیان کے مطابق ۲۵۵ھ میں ہوئی۔ پس اثنا عشری عقیدے کا یہ تفصیلی استقرار تیسری صدی ہجری کے آخر یا چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں ہی تجویز ہو سکتا ہے۔ اہل سنت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی شخصیت کو مامور من اللہ مبعوث للخلق مدار حلال و حرام اور جزو ایمان نہیں مانتے۔ اس لیے جس طرح سُنّی عقائد حضور ختمی مرتبت سے شروع ہوتے ہیں۔ اسی طرح شیعہ عقائد اپنے ظاہر کے اعتبار سے تقریباً چوتھی صدی ہجری سے آغاز پاتے ہیں۔ مامور من اللہ کے ظہور کے بعد ہی اس کے اوامر و نواہی نافذ ہو سکتے ہیں اور مامور کی تشریف آوری سے پہلے اس کے اوامر و نواہی کا اقرار تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔ اہل سنت کے عقیدے کے مطابق اسلام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی پر ہی مکمل ہوا۔ لیکن اثنا عشری عقائد کے مطابق اس کی تکمیل ۲۵۵ھ کے بعد کسی وقت میں ہوئی۔ یہ اپنے اپنے نظریات ہیں اور شیعہ سنّی اختلافات ہیں۔ جن میں زیادہ الجھنا مناسب نہیں ہے۔

اثنا عشری عقائد کی موجودہ صورت تو حضرات ائمہ طاہرین کے وقت بھی نہ تھی بلکہ ان سے بھی کافی وقت بعد کی ہے۔ وہ حضرات جو ان ائمہ کرام کے گرد و پیش رہتے تھے۔ وہ ہرگز انہیں مامور من اللہ اور معصوم نہیں سمجھتے تھے اور ان کا حضور کی ختم نبوت پر پورا پختہ اعتقاد تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی آسمانی رہنما کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان لوگوں کے وہی عقیدے تھے جو اہلِ سنت حضرات کے ہیں۔

ملا باقر مجلسی حق الیقین میں لکھتے ہیں:۔

از احادیث ظاہر مے شود کہ جمعے از راویاں کہ در اعصار ائمہ بودہ اند از شیعاں اعتقاد بعصمت ایشاں نداشتہ اند۔ بلکہ ایشاں را از علمائے نیکو کار میدانستہ اند چنانکہ از رجال کشی ظاہر می شود و مع ذٰلک ائمہ حکم بایمان بلکہ عدالت ایشاں مے کردہ اند[1]

ترجمہ۔ احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ائمہ کرام کے اپنے زمانوں کے شیعہ راویوں کی جمعیت اُن ائمہ کے معصوم ہونے کا عقیدہ نہ رکھتی تھی اور انہیں علمائے نیکو کار ہی سمجھا جاتا تھا جیسا کہ رجال کشی سے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن ان عقائد کے باوجود یہ ائمہ اطہار ان لوگوں کو نہ صرف مومن سمجھتے تھے بلکہ انہیں شاہد عدل بھی قرار دیتے تھے۔

ان تصریحات سے پتہ چلتا ہے کہ اثنا عشری عقائد ان ائمہ اطہار کے بھی کافی عرصہ بعد وجود میں آئے ہیں ائمہ کرام کے اپنے زمانے تک جمیع مسلمانوں کا بلا امتیاز مسلک یہی اعتقاد تھا کہ ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اس کرۂ ارضی کو کسی مامور من اللہ کی ضرورت نہیں اور یہ ائمہ حضرات سب سنی المذہب تھے۔

شیعہ مذہب کا جو خاکہ اب ہمیں کتابی شکل میں ملتا ہے وہ زیادہ تر سولہویں صدی عیسوی کے قریبی زمانے کا ہے۔ صفویوں نے اسے باقاعدہ مذہب کی شکل دی اور اسی زمانے میں اس کی کتابوں کا شیوع عام ہوا لیکن اس حقیقت میں کوئی کلام نہیں کہ شیعہ مذہب کا یہ خاکہ ائمہ اطہار اور ان کے خدام کے نظریات و عقائد سے بالکل اسی طرح مختلف تھا جس طرح کہ موجودہ زمانہ کا شیعہ مذہب، شیعہ مذہب کے کتابی خاکے سے کلیتہً مختلف ہے شیعہ مذہب کی موجودہ رسوم عزا اس صورت میں ان کے کتابی خاکوں میں بھی کہیں نہیں ملتیں۔ لیکن ہمارے بلاد کے اثنا عشری حضرات انہیں اپنے مسلک کے شعائر سے ایک درجہ کم نہیں سمجھتے اور اثنا عشری رسوم کی یہ تاریخ انیسویں صدی عیسوی سے پہلے کہیں مذہب شمار نہیں ہوتی تھی۔

ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اثنا عشری عقائد نے کسی دور میں بھی ایک واضح نظام مذہب کی صورت اختیار نہیں کی اور تاریخ کے ہر بدلتے موڑ پر ان نظریات نے ایک نئی شکل اختیار کی ہے۔ پس اس امر کا کوئی قطعی

---

[1] حق الیقین صہ ۳۲۸ لکھنؤ صہ ۵۵۰ ایران

فیصلہ نہیں ہو سکتا کہ شیعہ نظریات و عقائد ہیں کیا اور یہ کب سے شروع ہوئے؟

ہمارے نزدیک اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ شیعہ حضرات کے لیے کسی فوت شدہ مجتہد کی تقلید پر قائم رہنا جائز نہیں یہ لوگ ہر دور میں کسی نہ کسی زندہ مجتہد سے وابستہ رہے ہیں۔ ان کے ہاں فوت شدہ عالم کا فتوے خواہ وہ کتنا ہی بڑا مجتہد کیوں نہ ہو۔ اس کی وفات کے بعد حجت اور سند نہیں رہتا۔ اذا مات المفتی مات الفتویٰ پر وہ ہمیشہ عمل پیرا رہتے ہیں۔ ذخیرہ العباد وغیرہ میں اس کی پوری تصریح موجود ہے۔ یہ حالات اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ ان کا مذہب ہمیشہ سے تغیر پذیر رہا ہے۔ پس حتمی طور پر یہ کہنا کہ یہ مذہب کس دور میں قائم ہوا مشکل ہے اور حقیقت میں یہ مذہب ہے ہی نہیں۔ حضورؐ کی امت کے خلاف ایک سیاسی تحریک ہے۔

اس تذبذب کی ایک اور وجہ بھی ہے وہ یہ کہ شیعہ علماء کے فتوے ہمیشہ دو احتمالوں کے محتمل رہے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ فتوے "بناء بر حقیقت" ہو اور دوسرا یہ احتمال کہ "بناء بر تقیہ" ہو۔ پھر حقیقت اور تقیے کے یہ فیصلے بھی زیادہ تر زبانی اور صدری طور پر ہی آگے منتقل ہوتے رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں کوئی شخص حتمی طور پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ شیعہ مذہب کیا ہے۔ یا یہ کہ اس کی تدوین و ترتیب کے متعلق کوئی واضح خدوخال پیش کیے جا سکیں۔

یہ تمام تفصیل اثنا عشری مذہب کے صرف مثبت پہلوؤں کے متعلق تھی کہ یہ کبھی بھی کسی قطعی اور حتمی صورت میں واضح نہیں ہو سکے۔ باقی رہے شیعہ نظریات کے منفی پہلو جن سے مراد صحابہ کرامؓ اور ان کی خدمات مثل عقد خلافت اور جمع قرآن وغیرہ کے خلاف بیزاری کے خیالات پھیلانا ہے۔ سو ان کی تاریخ اس مسلک کے مثبت پہلوؤں سے کچھ پہلے کی ہے اور صحابہ کرامؓ کے خلاف منافرت کی مہم کا آغاز عبداللہ بن سبا ایک سابق یہودی نے کیا تھا۔

وجہ اس کی یہ تھی کہ باغِ فدک ابتداءً یہود کی ملکیت میں تھا جسے رب العزت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بطریق فئے لوٹا دیا تھا اور یہود اس صدمے کو آسانی سے برداشت نہ کر سکتے تھے۔ ابن شہر آشوب حضرت امام جعفر صادقؓ سے فدک کے متعلق نقل کرتا ہے:-

هذا كان في ايدي اليهود بعد موت ابي هاله فافاء الله على رسوله بلا
خيل ولا ركاب [1]

ابن سبا یہودی اسی جذبۂ انتقام سے صف اسلام میں داخل ہوا۔ لیکن یہ وہ وقت تھا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گنبدِ خضریٰ میں تشریف لے جا چکے تھے اور یہ حضرت عثمان ذوالنورینؓ کا عہدِ خلافت تھا۔ اسی زمانے کے آخر میں اس مسلک کے منفی نقوش اُبھرنے شروع ہوئے، باغِ فدک کی بحثیں پیدا ہوئیں اور انہی اختلافات

[1] مناقب ابن شہر آشوب جلد ۲ ص ۴۵

نے ایک وقت پر جا کر ایک فرقے کا روپ دھار لیا۔ ان عقائد کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا اجتماع زیادہ تر صفوی عہد کا رہینِ احسان ہے اور تقریباً یہی عہد تھا جس میں اُن کے تمام کتابی ذخیرے تیار ہوئے یا ظہور میں آئے۔ ان لوگوں کا امتیازی وصف یہ تھا کہ یہ اپنے نظریات کا پرچار ہمیشہ باغِ فدک کی بحث سے کرتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ

۲۔ جو لوگ نماز جیسے فرائض میں کوتاہی کریں اور تسبیح پہ تسبیح گھماتے رہیں۔ اُن کے ثانی الذکر عمل میں برکت تقریباً مفقود ہو گی اور اس ذکر سے روح میں بالیدگی اور پاکیزگی پیدا ہونا بہت مشکل ہے۔ لیکن اصلاح کا یہ طریق نہیں کہ آپ اسے تسبیح سے روکیں۔ بلکہ اسے ترکِ نماز پر ملامت کی جائے۔ برائی کو نیکی سے بدلنا چاہیے نہ کہ ایک برائی کے لیے دوسری نیکی کو ترک دیا جائے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ایک اہم کام نہ کرنے سے باقی دوسرے چھوٹے نیک کام بھی بسا اوقات بے روح ہو جاتے ہیں لیکن طریقِ اصلاح وہی ہے جو ہم نے عرض کیا۔ ہاں چھوٹی نیکی اگر کسی اہم فریضے سے روکنے کا موجب بنے تو وہ نیکی نیکی نہیں رہتی واجب الترک برائی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ کسی امر کا سبب اس امر کے حکم میں داخل ہوتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: جو لوگ صحابہ کرامؓ کی تنقیص کرتے ہیں ان روافضِ زمانہ کو کیا مسلمان سمجھنا چاہیے یا یہ لوگ اسلام سے بالکل دُور ہیں؟

سائل غلام فرید۔ ڈیرہ اسماعیل خاں

جواب: حضرت امام احمدؒ اہل بیت کی سند سے روایت کرتے ہیں:-

عن ابراهيم بن حسن بن حسين بن علي بن ابي طالبؓ عن ابيه عن جده قال قال عليؓ بن ابي طالب قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يظهر في اخر الزمان قوم يسمون الرافضة يرفضون الاسلام [1]

ترجمہ: حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ آخر زمانہ میں ایک قوم ظاہر ہو گی جنہیں رافضی کہا جائے گا وہ لوگ اسلام کو بالکل چھوڑ چکے ہوں گے۔

حضرت علی المرتضیٰؓ کی یہ روایت آپ کے سوال کا نہایت واضح جواب ہے۔ ان لوگوں کو مسلمان سمجھنا خود اسلام کی توہین ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ ۲۵ ستمبر ۶۴ء

[1] مسند امام احمد جلد ۱ ص ۱۰۳ مصر طبع قدیم

سوال: مکرمی ومحترمی جناب علامہ صاحب قبلہ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ نے رحیم یار خاں مجلس کے دوران فرمایا تھا کہ مرزا غلام احمد نے اپنی عمر کے متعلق جو الہام شائع کیا تھا وہ اُمر واقع کی روشنی میں بالکل غلط نکلا۔ قادیانی اس کا انکار کرتے ہیں اور حوالہ مانگتے ہیں براہ کرم مجھے اس کے مفصل حوالہ جات سے مطلع کریں ممکن ہے اس سے کچھ لوگوں کے عقائد درست ہو جائیں؟

سائل: عبدالخالق رحیم یار خاں

جواب: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ!

مرزا صاحب نے جولائی ۱۸۸۶ء میں یہ پیش گوئی کی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے مخاطب کرکے فرمایا ہے:۔

یأتی علیك زمان مختلف بارواح مختلفه و تری نسلاً بعیداً و لنحیینك حیوٰۃً طیبة ثمانین حولاً او قریبًا من ذٰلك.

خط کشیدہ عبارت کا ترجمہ یہ ہے:۔

"اور ہم تجھے ضرور ایک پاکیزہ زندگی عطا فرمائیں گے اسی سال یا اس کے قریب قریب"

مرزا صاحب نے اپنی اس پیشگوئی کا اشتہار شائع کیا تھا اور پھر اس الہام کو اپنی کتاب ازالہ اوہام حصہ دوم میں بھی نقل فرمایا۔ مرزا صاحب اسے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

اب جس قدر میں نے بطور نمونہ کے پیشگوئیاں بیان کی ہیں۔ درحقیقت میرے صدق یا کذب کے آزمانے کے لیے یہی کافی ہے[1]

اس تصریح سے یہ امر واضح ہے کہ اسی سال عمر ہونے کی یہ پیشگوئی مرزا صاحب کے صدق یا کذب کو جانچنے کے لیے کافی ہے۔ ہاں مرزا صاحب نے اس پیشگوئی کو "او قریبًا من ذٰلك" یعنی یا اس کے قریب قریب کے الفاظ سے جس طرح گول کیا ہے۔ اب ہم اس کی بھی تحدید کیے دیتے ہیں کہ اس سے مراد کیا تھی۔

مرزا صاحب حقیقۃ الوحی میں اپنا یہ الہام پیش کرتے ہیں:۔

اطال اللہ بقاءك اسی یا اس پر پانچ چار زیادہ یا پانچ چار کم[2]

پھر مرزا صاحب نے احتیاطاً اس کی اور توسیع کی خود لکھتے ہیں:۔

خدا نے صریح لفظوں میں مجھے اطلاع دی تھی کہ تیری عمر ۸۰ برس ہوگی اور یا یہ کہ پانچ چھ سال زیادہ یا پانچ چھ سال کم[3]

---

[1] ازالہ اوہام حصہ دوم ص۳۱۸ طبع دوم قادیان [2] حقیقۃ الوحی ص۹۶ مطبع قادیان [3] براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۹۷ ضمیمہ

ان تصریحات کی روشنی میں مرزا صاحب کی عمر کم از کم ۷۴ سال اور زیادہ سے زیادہ ۸۶ سال ہونی چاہیے تھی۔ مگر افسوس کہ مرزا صاحب ان تمام پیشگوئیوں کو غلط ثابت کرتے ہوئے ۱۳۲۶ھ میں تقریبًا ۶۶ سال کی عمر میں فوت ہو گئے اور وہ پیشگوئی جسے انہوں نے خود اپنے صدق و کذب کا معیار ٹھہرایا تھا انہیں بکسر کاذب ٹھہرا گئی۔

مرزا صاحب کی عمر پر پہلا استدلال

مرزا صاحب لکھتے ہیں:۔

جب میری عمر چالیس برس تک پہنچی تو خدا تعالیٰ نے اپنے الہام اور کلام سے مجھے مشرف کیا اور یہ عجیب اتفاق ہوا کہ میری عمر کے چالیس برس پورے ہونے پر صدی کا سر بھی آ پہنچا۔ تب خدا تعالیٰ نے الہام کے ذریعہ سے میرے پر ظاہر کیا کہ تو اس صدی کا مجدد اور صلیبی فتنوں کا چارہ گر ہے[1]

"غلام احمد قادیانی" اپنے حروف کے اعداد سے اشارہ کر رہا ہے یعنی ۱۳۰۰ کا عدد جو اس نام سے نکلتا ہے وہ بتلا رہا ہے کہ تیرھویں صدی کے ختم ہونے پر یہی مجدد آیا جس کا نام تیرہ سو کا عدد پورا کر رہا ہے[2]

مرزا صاحب کی مندرجہ بالا تحریروں سے یہ دو باتیں ثابت ہیں:۔

(۱) مرزا صاحب تیرہویں صدی کے ختم ہونے پر مجدد مبعوث ہوئے

(۲) اس وقت مرزا صاحب کی عمر پورے چالیس برس کی تھی۔

مرزا صاحب کی وفات بالاتفاق ۱۳۲۶ھ میں ہوئی ہے۔ چودھویں صدی کے یہ چھبیس (۲۶) سال چالیس میں جمع کیے جائیں تو آپ کی کل عمر ۶۶ سال کے قریب بنتی ہے۔

مرزا صاحب کی عمر پر دوسرا استدلال

خدا تعالیٰ نے ایک کشف کے ذریعہ سے اطلاع دی ہے کہ سورۃ العصر کے اعداد سے بحساب ابجد معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک عصر تک جو عہد نبوۃ ہے یعنی تئیس برس کا تمام و کمال زمانہ یہ کل مدت گذشتہ زمانہ کے ساتھ ملا کر ۴۷۳۹ برس ابتدائے دنیا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روز وفات تک قمری حساب سے ہیں[3]

---

[1] تریاق القلوب ضمیمہ ۲ ص۶۸ طبع اول ص۱۳۶ طبع سوم [2] تریاق القلوب ص۱۶ طبع اول [3] تحفہ گولڑویہ ص۹۴ طبع اول

اس کا حاصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے وقت دنیا کی عمر ۴۷۳۹ سے گیارہ برس کم یعنی ۴۷۲۸ برس تھی۔ مرزا صاحب کی وفات ۱۳۲۶ھ میں ہوئی۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کی وفات کے وقت دُنیا کی عمر ۴۷۲۸ + ۱۳۲۶ = ۶۰۵۴ برس کے قریب تھی۔ اب مرزا صاحب کی پیدائش کا وقت ان کے اپنے بیان کی رُو سے ملاحظہ کیجئے:۔

اس حساب سے میری پیدائش اس وقت ہوئی جب چھ ہزار میں سے گیارہ برس رہتے تھے۔[1]

چھ ہزار سے گیارہ نکال دیں تو باقی ۵۹۸۹ رہ جاتے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ مرزا صاحب کی پیدائش ۵۹۸۹ کے آغاز یا ۵۹۸۸ کے آخر میں کسی وقت ہوئی۔

خلاصہ اینکہ مرزا صاحب کی پیدائش اس وقت ہوئی جب دُنیا کی پیدائش پر تقریباً ۵۹۸۸ سال گزر چکے تھے اور وفات اس وقت ہوئی جب دنیا کی عمر ۶۰۵۴ برس کے قریب تھی۔ اس مدت سے ۵۹۸۸ نکال دینے سے باقی ۶۶ سال ہی رہ جاتے ہیں۔ مرزا صاحب کی عمر کا یہ تعین ان کے دعوؤں اور الہامات پر مبنی ہے۔ ان کی بعثت اگر تیرھویں صدی کے ختم پر چودھویں صدی کے آغاز سے پہلے ایک دو سال پہلے تجویز کی جائے تو زیادہ سے زیادہ اس عمر کا تصور ۶۷ یا حد ۶۸ سال ہو سکے گا۔ اس سے زیادہ کسی صورت میں ممکن نہیں۔ مشہور انگریز سرلیپل گریفن نے "پنجاب چیفس" Punjab Chiefs کے نام سے پنجاب کے زمینداروں کی ایک اہم تاریخ مرتب کی تھی۔ اس کی دوسری جلد میں مرزا صاحب کے خاندان کا بھی تذکرہ ہے۔ مؤرخ موصوف اس میں لکھتے ہیں:۔

غلام احمد جو غلام مرتضیٰ کا چھوٹا بیٹا تھا مسلمانوں کے ایک مشہور مذہبی فرقہ احمدیہ کا بانی ہوا۔ یہ شخص ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوا۔[2]

مرزا صاحب کی وفات انگریزی حساب سے ۱۹۰۸ء کے اوائل میں واقع ہوئی۔ ۱۸۳۹ء میں پیدائش ہو تو ۱۹۰۷ء کے اختتام تک مرزا صاحب کی عمر ۶۸ سال بنتی ہے۔ قادیانی سلسلے کے خلیفہ اول جناب حکیم نور الدین صاحب بھی اپنی کتاب "نور الدین" میں (جو مرزا صاحب کی زندگی میں ہی لکھی گئی تھی اور ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی) مرزا صاحب کی تاریخ پیدائش ان الفاظ میں لکھی ہے:۔

سنہ پیدائش حضرت صاحب مسیح موعود و مہدی مسعود ۱۸۳۹ء[3]

الہامات پر مبنی عمر ۶۶ سال ہو یا تاریخی واقعات پر مبنی ۶۸ سال ہو ہر دو اعداد عمر مرزا غلام احمد کے اس الہام کو غلط ثابت کرنے کے لیے کہ ان کی عمر کم از کم ۷۴ سال ہوگی اور زیادہ سے زیادہ ۸۶ سال کی ہوگی۔ کافی ووافی ہیں۔

---

[1] حاشیہ تحفہ گولڑویہ صفحہ ۹۵ [2] پنجاب چیفس جلد ۲ صفحہ ۶۶ [3] نور الدین صفحہ ۱۷۰ مطبع ضیاء الاسلام قادیان

اب ہم مرزا صاحب کی اس عبارت کو پھر پیش کرتے ہیں جو انہوں نے اسی سال کی عمر کی پیشگوئی تحریر فرمانے کے متصل بعد لکھی ہے:۔

اب جس قدر میں نے بطور نمونہ کے پیشگوئیاں بیان کی ہیں در حقیقت میرے صدق یا کذب کے آزمانے کے لیے یہی کافی ہے۔[1]

نہایت افسوس کا مقام ہے کہ قادیانیوں نے مرزا صاحب کی خلافِ الہام وفات سے سبق لینے کی بجائے آپ کے واقعاتِ عمر میں ہی رد و بدل کرنا شروع کر دیا۔ وفات کی تاریخ تو وہ نہ بدل سکتے تھے۔ ناچار انہوں نے تاریخ پیدائش میں اختلاف کرنا شروع کر دیا۔ تاکہ کسی نہ کسی بہانے واقعات کو پیشگوئی پر منطبق کیا جا سکے۔

یاد رہے کہ مرزا صاحب کی زندگی میں ان کی پیدائش کبھی زیرِ اختلاف نہیں آئی۔ ہم نے مرزائیوں کو بارہا چیلنج دیا ہے کہ مرزا صاحب کی تاریخ پیدائش کا کوئی اختلاف وہ مرزا صاحب کی زندگی کے واقعات سے پیش کریں اور بتائیں کہ کبھی ان کے حینِ حیات بھی اس موضوع میں کوئی اختلاف رونما ہوا ہو۔ اگر یہ اختلافات سب مرزا صاحب کی وفات کے بعد ہی اٹھے ہیں تو کیا یہ خود اس امر کا ثبوت نہیں کہ اس کا واحد سبب مرزا صاحب کی وہ الہامی پیشگوئی ہے جس پر مرزا صاحب کی مدتِ حیات کسی طرح منطبق نہ اُتر سکی۔ مرزا بشیر الدین محمود نے سیرتِ مسیح موعود کے نام سے ایک مختصر رسالہ لکھا تھا۔ جو اب پانچویں بار ربوہ کے مرکز جدید سے شائع ہوا ہے اس میں جماعت کے خلیفہ نے سر لیپل گریفن کی کتاب "پنجاب چیفس" سے مرزا صاحب کا سنہ پیدائش نقل کرنے میں کھلم کھلا تحریف اور خیانت کی ہے۔ مرزا محمود اس رسالہ کے صفحہ ۵ پر اسے یوں نقل کرتے ہیں:۔

غلام احمد جو غلام مرتضیٰ کا چھوٹا بیٹا تھا مسلمانوں کے ایک مشہور مذہبی فرقہ احمدیہ کا بانی ہوا یہ شخص ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوا۔[2]

قارئین دعوت مطلع رہیں کہ اصل کتاب میں ۱۸۳۶ء نہیں بلکہ ۱۸۳۹ء ہے۔ یہ تحریف مرزا صاحب کی عمر کو محض لمبا کرنے کے لیے عمل میں لائی گئی ہے تاکہ اسے کچھ تو پیشگوئی کے قریب لایا جا سکے لیکن افسوس کہ اس پر بھی مرزا صاحب آنجہانی کی پیشگوئی واقعات کا ساتھ نہیں دے سکی۔

مرزائی حضرات سے دوسرا سوال

(۱) اپنے قدیم تحریری ذخائر سے یہ ثابت کریں کہ مرزا صاحب کی تاریخ پیدائش کے متعلق اختلاف

---

[1] ازالہ اوہام صفحہ ۱۸۳ طبع دوم [2] سیرت مسیح موعود صفحہ ۵ مصنفہ مرزا بشیر الدین محمود

کبھی ان کی زندگی میں بھی اُٹھا ہو۔

(۴) ——— مرزا محمود نے پنجاب چیفس کے حوالے سے مرزا صاحب کا سنہ پیدائش نقل کرنے میں تحریف اور خیانت نہیں کی؟

نقل کو اصل کے مطابق ثابت کر کے خلیفہ صاحب سے بد دیانتی کے اس داغ کو دور کریں۔

الحاصل مرزا صاحب کی عمر ٦٦ اور ٦٧ سال کے قریب ہی بنتی ہے اور کسی صورت میں بھی ۷۴ سال ثابت نہیں ہوتی۔ مرزا صاحب اپنی خلافِ الہام وفات سے اپنے دعووں کی پوری طرح تکذیب کر چکے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہٗ: خالد محمود عفا اللہ عنہ ۲ر اکتوبر ۶۴ء

سوال: مکرمی ومحترمی جناب علامہ خالد محمود صاحب

السلام علیکم: ایک صاحب نے یہاں وما ارسلنٰک الّا رحمۃ للعالمین پر تقریر فرمائی۔ مولانا احمد سعید کاظمی نے فرمایا کہ آپ (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دونوں جہان کے لیے رحمت ہیں۔ اور اب میں اس آیت کے مقدمہ کے ذریعہ آپ کو چار باتیں سمجھاتا ہوں:۔

(۱) رحم بھی ہو گا جب کہ آپ ہر اس چیز کی فریاد سُنیں گے جس کے لیے آپ رحمت ہیں۔ پس یہ بات واضح ہوئی کہ آپ سمندروں کی گہرائیوں اور آسمان کی بلندیوں غرض ہر جگہ سے ہر ایک کی فریاد ہر وقت سُنتے ہیں۔

(۲) اسی طرح رحم کرنا بھی وہی سکتا ہے جس کے حلقۂ اختیار میں کچھ ہو۔ اور اگر کسی کے اختیار میں کوئی بات نہیں تو وہ فریادی پہ رحم کیا کرے گا۔ اب یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ وہ ہماری ہر چیز کے جان ومال کے بھی مالک ہیں۔

(۳) اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس بات کا علم نہ ہو کہ فریادی فریاد کہاں کر رہا ہے تو وہ رحم کس پہ کریں گے۔ پس یہ بات بھی واضح ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر قسم کا علم ہے۔

(۴) اور فریادی کے لیے رحم کرنے کے واسطے حضورؐ کے پاس اگر کچھ نہ ہوا تو وہ رحم کیسے کریں گے۔ اور کس چیز سے کریں گے۔ پس حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کی رُو سے سب خزانوں کے مالک بھی ہیں۔ چونکہ ہمیں آیت مقدسہ میں کوئی شک نہیں۔ اس لیے یہ چاروں باتیں ہمیں ماننی پڑیں گی۔

اب آپ سے گذارش یہ ہے کہ آپ بذریعہ "دعوت" یہ بتلائیں کہ مولانا نے جو تفسیر فرمائی ہے، کہاں تک درست ہے؟

سائل: محمد امین۔ امین کلاتھ ہاؤس۔ پاکپتن بازار منٹگمری

جواب: اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس شرف اور شان سے نوازا ہے۔ لیکن ترکیب کلام کے لحاظ سے آیت وما ارسلنٰک الّا رحمۃ للعالمین میں رحمۃ کے منصوب ہونے میں دو احتمال ہیں۔

پہلا احتمال یہ ہے کہ رحمت مصدر اللہ تعالیٰ کے فعل ارسال کا مفعول لہٗ ہو۔ اس ترکیب سے آیت میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ ہمارا آپ کو رسول بنانا تمام جہانوں پر رحمت کرنے کے لیے ہے۔ اندریں صورت رحمت کرنا اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اور حاصل کلام یہ ہے کہ:۔

ہم نے آپ کو رسول اس لیے بنایا ہے کہ ہم تمام جہانوں پہ رحمت کریں۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ رحمت فعل ارسال کے مفعول کٓ ضمیر خطاب کا حال ہو۔ اس صورت میں مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنایا ہے اور آپ تمام جہانوں کے لیے رحمت ہیں۔

دونوں پہلوؤں سے کوئی سا معنی لیا جائے۔ آیت کا یہ ترجمہ کسی نے نہیں کیا ہے کہ ہم نے آپ کو اس لیے بھیجا ہے کہ آپ تمام جہانوں پر رحمت کرتے رہیں،" آپ رحمت کرنے کے لیے نہیں بلکہ آپ تو خود رحمت ہیں یا رحمت والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعہ تمام کائنات پر رحم فرمایا اور آپ کے ذریعہ اپنی مخلوق کو اپنا راستہ دکھایا۔ آپ کی شانِ رحمت سب کے لیے ہے اور آپ رحمتِ خداوندی کا سبب ہیں، اور اس کے حصولِ رضا کا ایک ذریعہ ہیں۔ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتّبعونی یحببکم اللہ اس بات کی قوی شہادت ہے۔ آپ نے مولوی صاحب مذکور کی جو تقریر نقل کی ہے وہ اہلسنّت تفاسیر میں کہیں موجود نہیں تفسیر بالرای ہے اور صحیح نہیں۔

(۱) ——— رحم تبھی ہو گا کہ آپ ہر اس چیز کی فریاد سُنیں جو آپ سے فریاد کرے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس کا طریق یہ ہے کہ رحم کا طالب خود آپ کے پاس حاضر ہو اور آپ حسبِ توفیقِ ایزدی اسباب کے مطابق رحم فرمائیں۔ فریاد سُن لینے سے یہ کیسے لازم آیا کہ رحم کے طالب تو اپنی اپنی جگہ رہیں اور آپ وہیں سے سب کی فریاد سنتے رہیں۔ کسی بزرگ ہستی کے دوسروں پر رحم فرمانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ رحم کے طلب گاروں کی فریاد ان کے اپنے اپنے مسکنوں سے سُنیں گے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

تمام امت کو ارشاد فرمایا :-

ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء۔[1]

ترجمہ۔ تم زمین والوں پر رحم کرو تم پر آسمان والا رحم فرمائے گا۔

اس حدیث میں تمام امت کو تمام زمین والوں پر رحم کرنے کا حکم ہوا۔ اب اگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ تمام امت تمام اہلِ زمین سمندر کی مچھلیوں، ریت کے ذرّوں اور فضا کے پرندوں کی فریاد ان چیزوں کی اپنی اپنی جگہ سے سُن رہی ہے تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ رحم تبھی ہو سکتا ہے کہ ہر دور دراز کی فریاد ان کی اپنی اپنی جگہ سے سُنی جائے۔ ہاں اس زمینی مخلوق میں سے جس کا بھی پالا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی امتی سے پڑے تو اس امتی کا فرض ہے کہ حضورؐ کی تعمیل ارشاد میں وہ ہر اس فریادی پر رحم کرے۔ حضورؐ فرماتے ہیں۔ لیس منا من لم یرحم صغیرنا ولم یعرف شرف کبیرنا۔ تو کیا اس سے کوئی شخص یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ حضورؐ کے امتی تمام چھوٹے بچوں کے ان کے اپنی اپنی جگہ رہتے ہوئے ان سب پر رحم کرنے کے مکلف ہوں۔ یاد رکھیے اسباب عادی میں سے ہے کہ رحم کا طالب اور فریاد کنندہ حسبِ ضرورت رحم کنندہ کے پاس آئے۔ اور وہ حسبِ توفیقِ ایزدی خدا کے دیئے ہوئے اسباب کے ماتحت اس کی فریاد سُنے۔

(۲) ——— "رحم وہی کر سکتے ہیں جس کے حلقۂ اختیار میں کچھ ہو" یہ صحیح ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب تمام امت کو حکم فرمایا۔ ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء تو اس سے مراد یہی ہے۔ کہ ہر فردِ امت کو جو جو اختیارات حاصل ہیں اور جن جن اسباب تک رسائی ہے ان کے مطابق وہ دوسروں پر رحم کرے۔ لیکن اس رحم کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ رحم کرنے والے کو تمام اور ہر طرح کے اختیارات حاصل ہوں۔ بعض نیک دل امیر لوگ بازار میں چلتے چلتے کئی غریب لوگوں پر رحم کر جاتے ہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کو ان غریبوں پر جملہ اختیارات حاصل ہوں اور ان کا تمام نفع و نقصان ان امیروں کے قبضہ میں ہو۔ بہر حال اصول مذکورہ سے وہ نتیجہ ہرگز نہیں نکلتا جو آپ کے ہاں تقریر کرنے والے مولوی صاحب نے نکالا ہے۔

(۳) اور (۴) ——— میں بھی مولوی صاحب اس غلط فہمی کا شکار ہیں۔ تمام صحابہ کرامؓ آپس میں رحماء بینھم ایک دوسرے پر رحم کرنے والے تھے۔ حالانکہ ان میں کوئی صحابی (جو بنص قرآن تمام دوسرے صحابہؓ پر رحم کرنے والا تھا اور رحماء بینھم کی عمومی شان پر فائز تھا۔ دوسرے تمام صحابہ کے ذاتی حالات، اندرونی واقعات اور ان کی زندگیوں کی تمام تر جزئیات سے پورا واقف ہرگز نہ تھا اور نہ رحم کنندہ صحابی دوسرے تمام صحابہ کے پاس ہر وقت اور ہر جگہ حاضر و ناظر تھا۔ پس یہ بات ہرگز صحیح نہیں کہ رحم کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ رحم

[1] ترمذی جلد ۲ صفحہ ۱۴

کیئے جانے والے کے پاس ہر ہر وقت اور ہر ہر جگہ حاضر رہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ ارشادِ نبوت کی رو سے "ارحم امتی بامتی ابوبکر" کی شان سے مشرف اور حضور کی تمام امت پر سب سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں تو اگر رحم کنندہ کے لیے جمیع متعلقین اور متعلقات کا علم اور ان میں سے ہر ایک کے پاس حاضر و ناظر ہونا ضروری ہو تو یہ ماننا پڑے گا کہ حضرت صدیق اکبرؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک ایک امتی کے پاس حاضر و ناظر ہوں اور ان میں ہر ایک کی زندگی کی تمام تر جزئیات آپ کو مستحضر اور معلوم ہوں۔ حالانکہ اس بات کا کوئی قائل نہیں پس جو بات محال کو مستلزم ہو وہ کبھی درست نہیں ہوتی۔

ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ نے جن مولوی صاحب کی تقریر کا حوالہ دیا ہے وہ تفسیر قرآن میں تفسیر بالرائے کے مرتکب ہیں۔ مسائل کا اختلاف علیحدہ ہے لیکن اپنے من گھڑت خیالات اور خود ساختہ عقائد کو خواہ مخواہ قرآن کے ذمہ لگانا یہ ظلم بالائے ظلم ہے۔

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ ۹ اکتوبر ۱۹۶۴ء

سوال : حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت مشہور واقعہ قرطاس کی حقیقت کیا ہے اور اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر جو اعتراض کئے جاتے ہیں ان کی تفصیل اور تحقیق کیا ہے ؟ سائل محمد شریف اختر۔ نواں کوٹ لاہور

جواب : حضور کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی آخری بیماری میں وفات سے چار روز قبل پنج شنبہ کے دن اپنے اصحاب سے فرمایا کہ قرطاس یعنی کاغذ لاؤ۔ میں ایک تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ حضورؐ کو اس وقت بیماری کی تکلیف زیادہ ہے۔ لہٰذا آپ کو تکلیف نہ دینی چاہیئے اور ضروری احکام کے لیے کتاب اللہ کافی ہے اور بعض نامعلوم الاسم لوگوں کی یہ رائے ہوئی کہ لکھ لینا چاہیئے۔ اس اثنا میں کسی نے "جس کا نام کسی روایت میں مذکور نہیں" کہا اھجر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استفھموہ یعنی کیا آپ کی جُدائی کا وقت آگیا ہے۔ آپ سے پوچھ تو سہی، پھر اس وقت نہ حضورؐ نے اس تحریر کے لکھوانے کا قطعی حکم دیا اور نہ اس کے بعد کسی اور وقت میں اس کے متعلق امر فرمایا۔ حالانکہ چار روز تک اس کے بعد دُنیا میں تشریف فرما رہے۔

واقعہ قرطاس صرف اتنا ہی منقول ہے جو اوپر بیان ہوا۔ مگر بعض لوگوں نے بڑی بے باکی سے حضرت عمرؓ پر تین اعتراض کئے ہیں :-

۱۔ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق کہا کہ یہ شخص ہذیان بکتا ہے (نعوذ باللہ من ذلک) ہجر کے معنی ہذیان بکنے کے لیتے ہیں اور اسے حضرت عمرؓ کا مقولہ قرار دیتے ہیں۔

۲- ایسی ضروری تحریر جس کے بعد قیامت تک گمراہی کا اندیشہ نہ رہتا، حضرت عمرؓ نے نہ لکھنے دی۔
۳- حضرت عمرؓ نے حسبنا کتاب اللہ فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کی ضرورت نہیں۔

اعتراض اوّل کا جواب

① لفظ ہجر عمر رضی اللہ عنہ کا قول نہیں۔ کتب اہل سنت میں کوئی ایک صحیح روایت بھی اس افتراء کے ثبوت میں نہیں مل سکتی۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ "فتح الباری" میں لکھتے ہیں کہ کسی روایت میں یہ نہیں کہ یہ لفظ حضرت عمرؓ کا مقولہ ہے۔ شاہ عبد العزیزؒ نے بھی تحفہ اثنا عشریہ میں یہی لکھا ہے، شیعہ علماء بھی جنہیں تجسس و عیب جوئی کی خاص مشق ہوتی ہے، درجنوں کے درجنوں کئی سو برس سے ایسی روایت کی تلاش میں ہیں مگر مطالبات کے باوجود آج تک کوئی حدیثی روایت نہیں پیش کر سکے۔ پس اگر کسی عالم اہل حق نے اسے مقولہ عمرؓ تسلیم کرلیا ہو۔ تو انہیں دھوکہ ہوا جس کی وجہ یہ ہے کہ بعض مخالفین نے اپنی انشاء پردازیوں کو کچھ اس طرح شہرت دی اور عوام میں اس قدر پھیلایا کہ اس عام شہرت سے بعض خواص مغالطہ میں آگئے جس کی بہت سی نظائر موجود ہیں۔ مثلاً امام مالک کے مذہب میں متعہ کا جواز اس قدر مشہور کیا گیا کہ صاحب ہدایہ جیسے محقق دھوکہ کھا گئے۔ کسی بڑے سے بڑے عالم کا دھوکہ میں آجانا کچھ مستبعد نہیں۔ اسی وجہ سے ہم نے کہا ہے کہ کوئی معتبر روایت بسند صحیح اس میں وارد نہیں اور ہر شخص کا بلا سند کوئی بات کہہ دینا روایت معلق نہیں ہو سکتا۔ معلق اسے کہتے ہیں کہ کوئی محدث روایت کرتے وقت کسی چیز کو بلا ذکر سند کے بیان کرے پھر ہر روایت معلق کا صحیح ہونا بھی غلط ہے، ورنہ پھر سند تو ایک بیکار شئے ہو جائے گی۔

مولانا عبد الحی صاحبؒ ظفر الامانی فرماتے ہیں:-

تلك الاخبار لا يعتبر بها ما لم يعلم سندها و مخرجها الى ان قال المرسل انما هو ما ارسله راوی الحديث و ترك الواسطة بينه و بين النبی صلی الله عليه وسلم لا مجرد قول كل من قال قال رسول الله صلی الله عليه وسلم والا لزم ان يكون قول العوام والسوقة قال رسول الله صلی الله عليه وسلم كذا مرسلا و الوجه فيه ان الارسال والانقطاع ونحو ذلك من صفات الاسناد و تضعيف الحديث به بواسطته فحيث الاسناد فلا ارسال ولا انقطاع لا اتصال وانما هو مجرد نقل اعتمادا على غيره[1]

② ہجر کے معنی محض ہذیان کے نہیں بلکہ یہ لفظ جدائی کے معنی میں بھی آتا ہے۔ قال تعالیٰ واهجرهم هجراً جميلاً[2]

[1] ظفر الامانی ص۱۸۹ [2] پ۲۹ المزمل آیت

یہ معنی علماء لغت، و شراحِ حدیث بھی لکھتے ہیں۔

فتح الباری میں ہے:-

ويحتمل ان يكون قوله اهجر فعلا ماضيا اى اهجر بفتح اوله اسكون الجيم والمفعول محذوف اى الحياة وذكره بلفظ الماضی مبالغة لما رای من علامات الموت[1]

اور علامہ محمد طاہر گجراتی مجمع البحار (جو خاص حدیث کی لغت ہے) میں فرماتے ہیں:-

ويحتمل ان يكون معناه هجركم رسول الله صلی الله عليه وسلم من الهجر ضد الوصل[2]

بلکہ تحقیق یہ ہے کہ اس لفظ کے اصل معنی جدا ہونے کے ہی ہیں۔ ہذیان کے معنی میں بھی اسی مناسبت سے آتا ہے کہ اس میں عقل سے جدائی ہوتی ہے اور یہی معنی زیادہ مشہور متبادر ہیں۔ اردو میں بھی ہجر بمقابلہ وصل بولا جاتا ہے اور حدیث قرطاس میں یہی معنی چسپاں ہوتے ہیں۔ ہذیان کے معنی وہاں دو وجہ سے نہیں بنتے۔

(الف) ہذیان کا شبہ اس بات پر ہوتا ہے جو خلافِ عقل ہو۔ ایک پیغمبر اپنے آخری وقت میں فرماتے ہیں کہ کاغذ لاؤ میں ایک ضروری ہدایت نامہ لکھ دوں، اس میں کون سی بات خلافِ عقل ہے جسے ہذیان کہا جا سکے۔

(ب) روایت میں ہجر کے بعد استفہموا کا لفظ آیا ہے۔ یعنی آپ سے پوچھو اگر ہجر بمعنی ہذیان لیا جائے تو استفہموا سے ربط بالکل غلط ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جسے ہذیان ہو گیا ہے اب اس سے پوچھنا بالکل خلافِ عقل ہے۔ اب دیکھئے جدائی کے معنی کس خوبی سے بنتے ہیں۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حالتِ مرض میں ہدایت نامہ لکھوانے کو فرمایا تو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے قلوب پر ایک بجلی سی گرگئی کہ شاید قیامت کی گھڑی آگئی۔ ؎

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

کیونکہ ایسی تحریر آخری وقت میں لکھوائی جاتی ہے۔ لہٰذا انہوں نے کہا۔ اهجر استفهموا یعنی کیا حضرت جدا ہو رہے ہیں۔ آپ سے پوچھو تو یہ لفظ ہجر جس نے کہا کمال محبت اور جذب عشق میں کہا۔ مگر جن کے قلوب درد محبت سے ناآشنا ہیں وہ اس کی کیا قدر کر سکتے ہیں۔ ؎

چو دل بمہر نگارے نہ بستۂ اے مہ — تراز سوز درون و نیاز ما چہ خبر

(ج) بفرض محال اگر یہ لفظ بمعنی ہذیان ہی ہو تو یہ ہمزۂ استفہام کے ساتھ ہے اور استفہام انکاری

[1] فتح الباری جلد ۸ ص۱۰۱ [2] مجمع البحار جلد ۲ ص۴۷۵

ہے ممکن ہے کہ یہ قول اس جماعت کا ہو جو تحریر لکھوانے کی مؤید تھی۔ اس نے اپنی رائے کو تقویت دینے کے لیے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں توقف کیوں کرتے ہو۔ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معاذ اللہ ہذیان ہو گیا ہے؟ یعنی ہذیان نہیں ہوا۔ یہ مطلب بھی شراح حدیث نے بیان کیا ہے۔ بخاری میں یہ روایت سات جگہ پر ہے۔ کتاب الجہاد کے سوا باقی چھ مواضع میں یہ لفظ ہمزۂ استفہام کے ساتھ ہے، اور بخاری کے علاوہ دوسری کتب میں بھی ہمزہ موجود ہے پس اگر ایک روایت میں ہمزہ نہ ہو تو حرج نہیں۔ ایک ہی واقعہ کی متعدد اسانید میں اگر ایک لفظ کسی روایت میں ہو اور کسی میں نہ ہو تو یقیناً یہی سمجھا جائے گا کہ جس میں نہیں ہے اس میں راوی سے چھوٹ گیا ہے۔ اسی لیے حافظؒ فتح الباری جلد ۸ ص۱۰۱ میں فرماتے ہیں۔ الواجح فیہ اثبات الھمزۃ۔ علاوہ ازیں بلا اداۃ استفہام کے بھی استفہام ہوتا ہے۔ ان تینوں جوابوں کا خلاصہ یہ ہوا کہ اول تو لفظ ہجر حضرت عمرؓ کا مقولہ نہیں۔ دوسرے بالفرض اسے تسلیم بھی کر لیا جائے تو ہجر بمعنی ہذیان نہیں، بلکہ جدائی کے معنی میں ہے، جو خاص محبت کا کلمہ ہے نہ کہ گستاخی کا تیسرے بالفرض ہجر بمعنی ہذیان ہو تو ہمزہ استفہام کے ساتھ ہے اور استفہام انکاری ہے۔ اب ارباب عقل غور کریں کہ اس اعتراض میں کیا جان باقی رہ گئی۔ جب تک یہ لوگ ان تین باتوں کا جواب نہ دے دیں۔ یعنی کسی روایت میں اس کا مقولہ مقولۂ عمرؓ ہونا دکھائیں۔ پھر یہ ثابت کریں کہ ہجر کے معنی سوائے ہذیان اور کچھ نہیں ہیں۔ یا یہاں سوائے ہذیان کے اور معنی چسپاں نہیں ہوتے۔ ان کی بات میں کوئی وزن نہیں۔ ان تمام الواب میں ان حضرات کا دامن خالی ہے۔ ان کے ذمہ ہے کہ یہ ثابت کریں کہ یہ لفظ ہمزۂ استفہام کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ اس کے بغیر اس اعتراض کا نام لینا بہت بے اصولی بات ہے۔

اعتراض ثانی کا جواب

اس کے جواب سے قبل چند امور غور طلب ہیں:۔

(۱) ——— الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناً بالاتفاق اس قصۂ قرطاس سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔ پس اب سوال یہ ہے کہ اگر کوئی ایسی ضروری تحریر باقی تھی تو اس سے پہلے دین ہرگز کامل نہیں ہو سکتا تھا اور یہ آیت معاذ اللہ غلط ثابت ہوتی ہے۔

(۲) ——— قصۂ قرطاس پنج شنبہ کے روز واقع ہوا اور حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات دوشنبہ کو ہوئی تو چار روز تک حضورؐ اس قصہ کے بعد اس عالم میں تشریف فرما رہے۔ پس اگر کوئی ایسی ضروری تحریر باقی ہوتی تو آپؐ کو اس کے لکھوانے کا کافی موقع ملا تھا اس کے باوجود آپ نے نہ لکھوائی۔ یہ ایک بہت بڑا اور سخت الزام حضورؐ پر عائد ہو گا۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ حضرت عمرؓ کے منع کرنے سے یا ان کے خوف سے نہ لکھوانا کوئی مسلمان

باور نہیں کر سکتا کیونکہ ایسے حال میں کسی اور کے خوف سے تقیہ کرنا نبوت کو زیبا نہیں۔ کیونکہ اسی طرح کسی کے خوف سے اگر انبیاء تبلیغ سے رک جائیں تو دین سے امان اٹھ جائے گا اور نبوت ایک بازیچۂ اطفال ہو جائے گی۔ خیال کیجئے جب کفار نے آپ سے کہا کہ اگر آپ کو سلطنت کی خواہش یا کسی حسین عورت کی طلب ہے تو تمام عرب سے حسین عورت آپ کو لا دیتے ہیں مگر ہمارے معبودوں کو برا مت کہو۔ کفار کے بائیکاٹ کے وقت حضرت ابوطالب نے آپ کو پیغام پہنچایا اور سمجھایا کہ اے بھتیجے تو اس تبلیغ سے باز آ جا، میں اکیلا سارے عرب کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تو آپ نے فرمایا کہ اے چچا! اگر میرے ایک ہاتھ میں آفتاب اور دوسرے میں چاند بھی رکھ دیا جائے تب بھی اس کلمۂ حق سے ہرگز نہ رکوں گا۔ غرضیکہ جس وقت آپ تمام عرب سے دین کی خاطر برسر پیکار تھے۔ اس وقت تو آپ نے ضروریات دین کو نہیں چھوڑا تو اب ایسی اہم چیز کو کیسے چھوڑ سکتے تھے؟ پھر ان پانچ دن میں دن کو یا رات کو کسی وقت تو حضرت عمرؓ اٹھ کر گئے ہوں گے اس وقت آپ لکھوا دیتے۔

(۳) ——— اتنی ضروری تحریر کو اگر حضرت عمرؓ نے منع کیا تھا تو حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہؓ کا فرض تھا کہ لکھواتے مگر کسی نے بھی اس طرف توجہ نہ کی، پس حضرت عمرؓ سے زیادہ الزام حضرت علیؓ پر ہو گا۔ اس لیے کہ بزعم مخالفین انہیں حضورؐ کا تقرب سب سے زیادہ تھا۔ نیز ایسا اہم حکم عموماً گھر والوں کو ہوتا ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ کو ہی یہ حکم دیا گیا ہو گا جس کی انہوں نے تعمیل نہیں کی۔ مزید برین مسند احمد کی روایت میں تصریح موجود ہے کہ یہ خطاب صرف حضرت علیؓ کو ہی تھا۔

(۴) ——— اتنا بڑا واقعہ اور تمام طبقۂ صحابہؓ میں سے کوئی متنفس سوائے ابن عباسؓ اس کی روایت نہیں کرتا۔ پھر ابن عباسؓ کے سینکڑوں شاگردوں میں سے صرف ان کے بیٹے عبید اللہؓ اور سعید بن جبیرؓ اس کے ناقل ہیں اور کوئی اسے روایت نہیں کرتا۔

ان امور پر غور کرنے کے بعد عقل سلیم دو امور میں سے ایک کے تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

(۱) یا تو قصہ ہی سرے سے غلط ہے دین کامل ہو چکا تھا۔ اور ہرگز کوئی ایسی ضروری تحریر باقی نہ تھی اور ہرگز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت قرآنیہ کے خلاف کسی تحریر کے لکھوانے کا ارادہ ظاہر نہیں فرمایا تھا۔ یہ قصہ محض بے بنیاد اور اعدائے دین کا خانہ زاد ہے اور محض اس لیے گھڑا گیا کہ آیت قرآنیہ الیوم اکملت لکم دینکم الخ کی تکذیب ہو سکے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی تبلیغ رسالت میں کوتاہی کرنے کا الزام قائم ہو اور سارا دین مشکوک ہو جائے۔ مگر امام بخاریؒ جیسے محدثین کی تخریج اس نظریہ کی تردید کرتی ہے۔

(۲) یا پھر حضور کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے محض اپنے صحابہؓ کا امتحان لینے کے لیے فرمایا تھا کہ قلم و دوات اور کاغذ لاؤ۔ تاکہ میں ایک ایسی ضروری و مفید تحریر لکھوا دوں کہ اس کے بعد کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ درحقیقت نہ کوئی

ایسی ضروری تحریر باقی تھی اور نہ واقع میں آپ کا ارادہ تھا۔ محض امتحان مقصود تھا کہ یہ لوگ ایمان میں کہاں تک راسخ القدم ہیں۔ اگر کہیں خدانخواستہ اکابر صحابہؓ اس تحریر کے لکھوانے پر مستعد ہو جاتے تو حضرت کو بڑا رنج ہوتا اور فوراً فرماتے کہ آیت الیوم اکملت لکم دینکم کے بعد اب بھی تم کسی تحریر کے منتظر ہو اور دین کو کامل نہیں سمجھتے۔ مگر الحمدللہ صحابہ کرامؓ اس امتحان میں بدرجۂ اعلیٰ کامیاب ہوئے اور اس کامیابی میں نمایاں کردار حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے چند نامعلوم الاسم لوگوں نے لکھوانے کی تائید کی قوی احتمال ہے کہ یہ حضرات جدید الاسلام ہوں گے صحابہؓ میں کوئی ممتاز شخصیت یہ قول کہتی تو ان کا نام ضرور روایت میں مذکور ہوتا۔ کما ھو ظاھر من داب المحدثین پس ان جدید الاسلام لوگوں کا اختلاف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہ آیا جس کا اظہار "قوموا عنی" کے الفاظ سے فرمایا۔ حضورؐ کا یہ ارشاد بطریق امتحان تھا۔ اس پر دو زبردست دلیلیں موجود ہیں:۔

① جب کہ آیت الیوم اکملت لکم دینکم الخ اکمال دین اور اتمام نعمت کی خبر دے چکی تھی تو ناممکن تھا کہ حضورؐ اس کے بعد کسی ایسی تحریر کی حاجت ظاہر فرما کر دین کو ناقص اور نعمت خداوندی کو ناتمام قرار دیتے۔

② آپ نے جو صفت قرطاس والی تحریر کی بیان فرمائی ہے۔ اسی صفت کی دو چیزیں جب آپ امت کے ہاتھ میں دے چکے تھے (جن کا ذکر حدیث ثقلین میں گزر چکا ہے) تو اب اس تحریر کی کیا حاجت تھی؟ اس کی ضرورت اس وقت ہو سکتی تھی جب ان دونوں چیزوں میں یہ صفت نہ ہو۔ لہذا ناممکن ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حدیث کے خلاف ایسی بات فرمائیں۔

علامہ ابن تیمیہؒ وغیرہ کا یہ خیال ہے کہ اس موقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے لیے خلافت نامہ لکھوانا چاہتے تھے اور صحیحین کی اس روایت کو اپنے اس خیال پر قرینہ بتاتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اس آخری مرض میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اپنے والد اور بھائی کو بلواؤ تاکہ میں ابوبکرؓ کے لیے تحریر لکھ دوں۔ تاکہ لوگ میرے بعد اختلاف نہ کریں، اس کے بعد آپ نے فرمایا۔ اچھا رہنے دو۔ یابی اللہ والمؤمنون الا لابی بکر ام پس آپ کو وحی سے مطمئن کر دیا گیا تھا۔ اس لیے اس ارادہ کو ترک فرما دیا۔ اگر بالفرض تسلیم بھی کر لیا جائے کہ مطمئن ہو جانے کے بعد بھی آپ خلافت صدیقؓ لکھوانا چاہتے تھے۔ تاکہ لوگ اختلاف نہ کریں تو بعد میں آپ کا سکوت حضرت عمرؓ کی موافقت میں تھا۔ جس میں راز یہ تھا کہ انتخاب خلیفہ کا زریں اصول "تفویض الی اہل الحل والعقد" قائم کر جائیں اور ولی عہدی کی رسم جاہلیت کا تصور اسلام میں باقی نہ رہے۔ کئی مواقع پر آپ نے وحی الٰہی کے بعد حضرت عمرؓ سے موافقت کی یہ وحی الٰہی سے موافقت تھی اسے مخالفین بھی تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ ان کی نہایت معتبر کتاب فلک النجات ص۲۲۶ جلد اول پر بھی یہ الفاظ موجود ہیں:۔

واما سکوته علیه السلام بعد التنازع فما کان من عنده بل کان بوحی۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

پس حضرت عمرؓ کا یہ اختلاف اگر بالہام اللہ تعالیٰ اختلافِ نظر تھا (کما وقع فی مواضع شتی) تو اس کا مناقب میں شمار ہونا بدیہی ہے اور اگر شدتِ مرض اور آپ کی تکلیف کے مدِنظر یہ اختلاف حضرت عمرؓ نے کیا تو اس کی نوعیت بعینہٖ صلح حدیبیہ کے موقع پر لفظ رسول اللہ مٹانے سے حضرت علیؓ کے انکار جیسی ہوگی جسے یہ لوگ مناقب حضرت علیؓ میں شمار کرتے ہیں۔

اعتراض ثالث کا جواب

یہ تو بعینہٖ وہ قول ہے جس کو خود حضور کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حجۃ الوداع میں اس سے تین ماہ بیشتر لاکھوں کے مجمع میں فرما چکے تھے۔ لن تضلوا ما تمسکتم به حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے "حسبنا کتاب اللہ" کہنے کا اگر یہی مطلب ہے تو قرآن میں ہے "حسبنا اللہ" پس اس کا مطلب بھی یہ ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کافی ہیں، رسول کی ضرورت نہیں۔ فہذا ھو جوابنا۔ وراجع له احسن الفتاویٰ من ص۱۴۳/۱۴۹ نقله۔

پھر قرآن کریم میں ہے۔ یبین اللہ لکم ان تضلوا۔ (پ۶ النساء آیت ۱۷۶) اللہ تعالیٰ تمہارے لیے بیان کر رہے ہیں کہ کہیں تم گمراہ نہ ہو جاؤ ــــــ سو گمراہی سے بچنے کی ضمانت قرآن کریم سے دی جا رہی ہے۔ اب کیا یہ ہو سکتا ہے کہ قرآن پاک کی اس ضمانت کو کافی نہ سمجھا جائے حسبنا کتاب اللہ میں اسی طرف اشارہ تھا۔ کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ

مکرم و محترم قابل احترام جناب علامہ خالد محمود صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ:۔ گذارش ہے کہ مندرجہ ذیل سوالوں کے مدلل جواب دے کر ہماری رہنمائی فرمائیں اور عند اللہ ماجور ہوں، امید ہے کہ آپ جواب با صواب سے مستفید فرما کر مشکور فرمائیں گے۔

سوال ۱: بخاری شریف، ترمذی شریف، صحیح مسلم شریف، مشکوٰۃ شریف، سنن ابو داؤد میں مذکور ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بعد ۱۲ خلیفے ہوں گے اور تمام کے تمام قریش سے ہوں گے۔ برائے مہربانی ان کے اسمائے گرامی سے مطلع فرما کر مشکور فرمائیں؟

سوال ۲: بخاری شریف میں مذکور ہے کہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ باغی گروہ کے ہاتھوں سے شہید ہوں گے۔ حضرت عمار بن یاسرؓ حضرت امیر معاویہؓ کی فوج کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ اس حدیث کی رو سے حضرت امیر معاویہؓ کیا ہوئے؟ کیا ان پر باغی کا لفظ آ سکتا ہے؟

سوال ۳ : کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد تھے اور ولی الامر بھی تھے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ولی الامر اور خلیفہ راشد کے ساتھ جنگ کرنے والوں کے متعلق کیا رائے قائم کرنی چاہیئے؟

سائلان : صوفی غلام حسین مسلک اہلحدیث، حکیم نذیر علی نور فارسی شیعہ ۱۲
شیخ محمد طفیل اخباری مسلک اہلحدیث، سید غلام عباس شیعہ کاسونکی

الجواب : آپ نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے پہلے اس کا مفہوم ذہن نشین کرلیں۔ اس کے بعد ان کے ناموں کا تعین کریں۔ جب تک مراد حدیث واضح نہ ہو جائے۔ اس وقت تک ان بارہ افراد کی نشاندہی نہیں ہو سکتی۔ احقر اس روایت کے متعلق پہلے کچھ بنیادی امور عرض کرتا ہے۔

۱۔ آں حضرتؐ کے اس ارشاد میں کہ میرے بعد بارہ[۱۲] خلیفے ہوں گے۔ خلافت علیٰ منہاج النبوت کے حاملین مراد نہیں، بلکہ یہاں خلفاء سے مراد مطلق امراء ہیں جن میں سے اچھے بھی ہو سکتے ہیں اور بُرے بھی ہو سکتے ہیں یہ صرف ایسے بارہ حکام اور امراء کی خبر دی جا رہی ہے جن کی حکومت تمام قلمرو اسلامیہ میں مسلم ہو گی اور ان بارہ حکام تک کل مسلمانوں کا جھنڈا ایک ہو گا، کہیں دو حکومتیں نہ ہوں گی۔

صحیح بخاری میں خلیفہ کی بجائے امیر (بمعنی حاکم) کے الفاظ ہیں۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
یکون اثنا عشر امیرا۔[۱]

اسی طرح ترمذی میں یہ الفاظ ملتے ہیں:۔ یکون من بعدی اثنا عشر امیرا۔[۲]

ان روایات سے یہ امر واضح ہے کہ ان بارہ عدد امراء کی خبر خلافت نبوت کا بیان نہیں اور انہیں خلیفہ کہنا صرف حکومت کے لحاظ سے ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کے طور پر ہرگز نہیں۔ حقیقی خلافت اور مجازی خلافت ہر دو کے حاملین اس مطلق خلافت میں جمع ہو سکتے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ان بارہ افراد میں وہ حضرات قطعاً داخل نہیں جو کبھی فائز حکومت نہیں ہوئے۔ جیسے حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت امام حسینؓ، حضرت امام اعظمؒ، حضرت امام مالکؒ، حضرت امام باقرؒ، حضرت امام جعفر صادقؒ، حضرت امام بخاریؒ، حضرت امام موسیٰ کاظمؒ، حضرت امام غزالی رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین جو شخص ان بزرگوں میں سے کسی کو بھی اس بارہ کی گنتی میں شامل کرتا ہے وہ مراد حدیث سے بالکل بے خبر ہے۔ ان بارہ افراد کے لیے صریحاً امیر (بمعنی حاکم) کے الفاظ موجود ہیں غیر حاکم اس صف میں نہیں آسکتا۔

۲۔ ان بارہ حضرات کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی امارت اور حکومت پر پوری امت کا اتفاق ہو، یہ امر دیگر ہے کہ یہ اتفاق بوقت حکومت ہو یا بعد الحکومت لیکن ان بارہ حاکموں کی حکومت پر تمام

---

[۱] جامع بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۰۷۲ [۲] جامع ترمذی جلد ۲ صفحہ ۱۱۳

مسلمانوں کا اتفاق ضروری ہے۔ یہ بارہ حکام وہی ہو سکتے ہیں جن کے دور میں تمام مسلمانوں کا جھنڈا ایک ہو۔ سنن ابی داؤد میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان بارہ کی علامت یہ بیان فرمائی کہ ان میں سے ہر ایک کی حکومت پر پوری امت کا اتفاق ہو گا۔

کلھم تجتمع علیہ الامۃ۔[۱] ترجمہ۔ ان میں سے ہر ایک پر امت متفق ہو گی

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ خلفاء بنی عباس میں سے کوئی حاکم اس حدیث کا مصداق نہیں بن سکتا کیونکہ عباسی خلافت کے وقت میں مسلمانوں کے جھنڈے دو تھے۔ اس وقت سپین میں خلفائے بنوامیہ بالکل خود مختار حکمران تھے۔ اور دونوں حکومتیں اپنی اپنی جگہ بالکل مستقل اور آزاد تھیں۔ پس اس دور کو کلھم تجتمع علیہ الامۃ کا مصداق ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ عصر حاضر کے حکمران بھی اس روایت کے ماتحت نہیں آتے۔ کیونکہ ان دنوں بھی روئے زمین کے تمام مسلمان کسی ایک جھنڈے تلے نہیں۔ بلکہ متعدد مستقل اور آزاد خود مختار حکومتوں میں منقسم ہیں۔ یہاں صرف تین اشکال باقی ہیں:۔

(۱) حضرت علی المرتضیٰؓ ان بارہ افراد میں کیسے شامل ہو سکتے ہیں جب کہ ان کے دور خلافت میں مسلمانوں کے جھنڈے دو تھے۔ ایک طرف حضرت علیؓ تھے اور دوسری طرف حضرت امیر معاویہؓ۔

جواباً گذارش ہے کہ اس وقت بھی خلافت کا جھنڈا صرف ایک تھا اور خلیفہ صرف حضرت علیؓ ہی تھے۔ عقد خلافت کے وقت وہ کل قلمرو اسلامی کے لیے ہی چنے گئے ملکی تقسیم بعد میں ہوئی۔ ان کے مقابلہ میں حضرت امیر معاویہؓ خلافت کے مدعی ہرگز نہ تھے بلکہ ان کی حیثیت خلیفہ برحق حضرت عثمانؓ کے مقرر کردہ گورنر کی تھی اور وہ اپنی اسی حیثیت پر باقی تھے۔ جب تک کہ نئے خلیفہ انہیں شہادت عثمانؓ کے جملہ شبہات سے مطمئن نہ کر دیں۔ ابن تیمیہؒ نے منہاج السنۃ میں حضرت امیر معاویہؓ کے اس موقف کی خود حضرت امیر معاویہؓ سے بھی تصریح نقل کی ہے۔ پس جب اس عبوری دور میں وہ ایک مستقل خلافت کے مدعی نہ تھے۔ تو یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ اس وقت خلافتی جھنڈے دو تھے۔ خلیفہ برحق حضرت علی مرتضیٰؓ ہی تھے اور حضرت امیر معاویہؓ عبوری طور پر ایک اجتہادی انداز عمل میں سے اس چوتھی خلافت کے تسلیم کرنے سے رُکے ہوئے تھے۔ پھر حضرت امام حسنؓ کے حضرت امیر معاویہؓ کی بیعت کرنے کے بعد یہ اختلافات بھی ختم ہو گئے اور جمہور اہلسنت نے حضرت علی المرتضیٰؓ کی سابقہ حکومت کے برحق ہونے پر اجماع کر لیا اور اس طرح یہ چوتھی خلافت بھی کلھم تجتمع علیہ الامۃ کے ماتحت آگئی اور یہ اجماع عام ہے کہ وقت حکومت ہو یا بعد الحکومت بہرحال حکومت مجمع علیہ ہونی چاہیئے اور وہ تھی۔

(۲) حضرت امیر معاویہؓ حضرت علی المرتضیٰؓ سے اختلاف کرتے ہوئے ان بارہ حکام کی فہرست میں کیسے شامل

---

[۱] سنن ابی داؤد جلد ۲ صفحہ ۵۸۸

ہو سکتے ہیں؟ جواباً گذارش ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ ان بارہ میں صرف اس وقت سے معدود شمار ہوتے ہیں جب حضرت امام حسنؓ نے اپنی حکومت بھی ان کے سپرد کر دی تھی اور اس وقت تمام مسلمانوں کا جھنڈا ایک تھا۔ اس دور میں حضرت معاویہؓ کلھم تجتمع علیہ الامۃ کا یقینی مصداق تھے۔

(۳) حضرت امیر معاویہؓ کا بیٹا یزید جس کے مقابل حضرت عبداللہ بن زبیرؓ خود مختار اور مستقل حکومت کے مدعی تھے ان بارہ میں شمار ہو گا یا نہیں؟ جواباً گذارش ہے کہ جمہور اہلسنت کے نزدیک یزید اس بارہ کی فہرست میں شامل نہیں۔ ملا علی قاریؒ نے فقہ اکبر میں اسے ان بارہ میں شمار کیا تھا۔ مگر حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب قرۃ العینین میں اس نظریہ کی تردید فرمائی۔ وہ فرماتے ہیں کہ یزید کی حکومت کو استقرار حاصل نہیں ہوا۔ اس لیے اسے ان بارہ افراد میں شامل نہیں کرنا چاہیے۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:۔

ویزید بن معاویہ خود ازیں میاں ساقط است بجہت عدم استقرار و مدت معتد بہا و سوء سیرت او واللہ اعلم۔[1]

احقر کی رائے ہے کہ مروان بن حکم کی حکومت بھی اس فہرست میں شامل نہیں۔ بلکہ اس وقت میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی حکومت ہی اولیٰ تھی۔ یہی حضرت امام مالکؒ کی رائے ہے اور یہی محدث ابن جوزی کا فیصلہ ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

اب ہم ان بنیادی امور میں سے تیسری بنیادی بات عرض کرتے ہیں جس کے سمجھنے پر حدیث مذکور العدد کی صحیح تفہیم موقوف ہے۔

۳۔ یہ حدیث کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بارہ ایسے امراء ہوں گے جن کے ہوتے ہوتے تمام مسلمانوں کا جھنڈا ایک ہو گا۔ اس روایت کے کسی طریق میں ان بارہ خلیفوں کی کوئی دینی مدح و ثنا منقول نہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہیں فرمایا کہ وہ سب کے سب نیک ہوں گے یا یہ کہ ان کی خلافت منہاج نبوت پر قائم ہو گی۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں:۔

لم یرو الحدیث لمدحھم والثناء علیھم بالدین وعلی ھذا فاطلاق اسم الخلافۃ فی ھذا الحدیث بالمعنی المجازی واما حدیث الخلافۃ من بعدی ثلاثون ــــ فالمراد خلافۃ النبوۃ۔[2]

ترجمہ۔ یہ حدیث ان بارہ کی مدح اور ان کی دینداری کی تعریف میں وارد نہیں پس ان کی حکومت پر خلافت کا نام ایک مجازی تعبیر ہے ہاں اس حدیث میں کہ خلافت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تیس سال تک رہے گی وہاں بے شک خلافت علیٰ منہاج النبوت ہے۔

---

[1] قرۃ العینین صفحہ ۱۹۸ مطبع مجتبائی دہلی [2] فتح الباری جلد ۱۳ صفحہ ۱۸۰

یہ بے شک صحیح ہے کہ بارہ امراء کی اس روایت میں "لا یزال ھذا الدین عزیزاً" کہ یہ دین ان بارہ امراء کے زمانے تک ضرور غالب رہے گا کے الفاظ ضرور وارد ہیں لیکن اس غلبے سے مراد "دین کا داخلی غلبہ" نہیں کہ ان کے زمانے میں لوگ بڑے نیک اور دیندار قسم کے ہوں گے۔ بلکہ یہاں غلبے سے مراد "دین کا خارجی غلبہ" ہے کہ کوئی غیر مسلم بیرونی طاقت مسلمانوں پر حملہ آور نہ ہو سکے گی۔ کسی بیرونی سلطنت کو اسلامی سلطنت کی طرف منہ کرنے کی جرأت نہ ہو گی اور رقبہ اسلام ہر مخالف سلطنت کے لیے ایک "ارض منیع" ہو گا۔ یہ ایک ایسا محفوظ علاقہ ہو گا جس کی طرف رُخ کرنے کی ہر غیر مسلم طاقت کو رکاوٹ ہو گی۔

عزیز کے یہ معنی کہ دین کا صرف خارجی غلبہ مراد ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

لایزال ھذا الدین عزیزاً منیعاً الی اثنی عشر خلیفۃ۔[1]

ترجمہ۔ یہ دین بارہ حکمرانوں تک ایسا غالب رہے گا کہ باہر سے کوئی طاقت اس پر حملہ آور نہ ہو سکے گی۔

علاوہ ازیں یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ یہاں عزیز ہونا دین کی حالت کا بیان ہے۔ ان بارہ امراء کی صفت نہیں۔ یعنی اگر ان بارہ حکام میں سے اگر بعض ظالم اور غلط کار بھی ہوں مگر عوامی سطح پر دین غالب رہے تو ایسا بسا اوقات ہوا ہے کہ رب العزت فساق و فجار سے بھی دین کی خدمت لے لیتے ہیں۔

۴۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان امراء کے بارے میں خبر دی "کلھم من قریش"، کہ وہ سب کے سب قریش میں سے ہوں گے۔ اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بارہ احکام قریش کی کسی ایک ہی شاخ سے ہرگز نہ ہوں گے۔ ورنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس شاخ کا نام لیتے۔ جیسے کلھم من بنی ھاشم یا کلھم من بنی امیہ مقسم بعید کا ذکر ہرگز نہ فرماتے۔ کیونکہ قریش کی یہ شاخیں اس وقت بھی خاندان اور قبائل کے امتیاز میں بڑی معروف تھیں۔ پس جب آپ نے ان میں سے کسی کا نام نہیں لیا تو معلوم ہوا کہ یہ بارہ امراء جس مشہور مقسم میں سب سے پہلے جمع ہوں گے وہ قریش ہوتا ہے۔ آگے یہ بارہ حضرات قریش کی مختلف شاخوں میں منقسم ہو جائیں گے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی المرتضیٰؓ کی خاندانی وحدت کو بنو اسماعیل کے عنوان بیان کرنا بلاغت کے خلاف ہے۔ ان کا تعارف بنو ہاشم کے ساتھ صحیح رہے گا یہی ان کا مقسم قریب ہے۔ بلکہ انہیں بنی عبدالمطلب کہنا اور زیادہ مناسب ہو گا۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت صدیق اکبرؓ، حضرت عثمان غنیؓ، اور حضرت علیؓ کو جب ایک عنوان میں بیان کرنا ہو تو مقسم قریب قریش ہو گا جہاں یہ سب حضرات ایک خاندان میں جمع ہو جاتے ہیں۔

---

[1] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۱۹ اس میں لفظ منیع غور طلب ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے ـــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان بارہؓ خلفاء یا امراء کا خاندانی تعارف کلھم من قریش کے الفاظ سے کرایا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرات قریش کی کسی ایک ہی شاخ سے نہ ہوں گے۔ ورنہ "مقسم قریب" کا نام لیا جاتا مقسم قریب کی شہرت کے باوجود انہیں "مقسم بعید" سے ہرگز بیان نہ کیا جاتا۔ صاحب جوامع الکلم سے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

۵۔ اس حدیث کا مصداق کون سے بارہ افراد ہیں؟

مہلب کہتے ہیں "لم الق احداً یقطع فی ھذا الحدیث" کہ میں اب تک کسی ایسے شخص کو نہیں ملا جو اس حدیث کا مصداق معین کرنے میں کسی قطعیت پہ ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ:۔

① ان بارہ میں سے کچھ ہو چکے ہیں اور بعض ابھی ہونے والے ہیں۔ یہ بارہ کی گنتی ابھی تک پوری نہیں ہوئی۔ بعض کہتے ہیں ② کہ اس حدیث کی مراد یہ ہے کہ اس وقت تک اسلام کا غلبہ رہے گا جب تک مسلمان حکومتوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ بارہ تک ہو گی یعنی مسلمانوں کے بیک وقت بارہ حکمران ہوں گے۔ بعض کہتے ہیں ③ یہ بارہ حضرات وہ ہوں گے جو امام مہدی کی وفات کے بعد ولایت سنبھالیں گے، کتاب دانیال میں ہے کہ امام مہدی کی وفات کے بعد پانچ افراد ان کے بڑے بیٹے کی نسل سے، پھر پانچ چھوٹے لڑکے کی اولاد میں سے فائز حکومت ہوں گے ان پانچ کے بعد پھر بڑے لڑکے کی نسل میں سے ایک شخص والیٔ خلافت ہو گا اور اس کے بعد اس کا بیٹا اس کا جانشین ہو گا۔ بہرحال محدثین نے حدیث زیر بحث میں مختلف احتمالات ذکر کئے ہیں۔ پیشِ نظر رہے کہ اس حدیث کا مصداق معین کرنے میں بے شک ابہام ہے۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اس کا مصداق وہ بارہ حضرات ہرگز نہیں جنہیں اثنا عشری حضرات ائمہ معصومین سمجھتے ہیں۔ اولاً کہ ان میں سے نو حضرات ایک لمحے کے لیے بھی برسرِ حکومت نہیں آئے اور حدیث کی مراد ایسے بارہ افراد ہیں جو امراء و حکام ہوں گے۔ ثانیاً ان نو حضرات کی امارت کبھی بھی امت میں مسلّم اور مجمع علیہ نہیں ہوئی اور حدیث کا مصداق وہ ہیں جو کلھم تجتمع علیہ الامۃ کے امتیاز سے موصوف ہوں۔ ثالثاً اس حدیث کا مصداق اگر یہ بارہ ائمہ ہوتے تو انہیں مقسم قریب کے عنوان سے کلھم من بنی ھاشم کہا جاتا کلھم من قریش کے عنوان سے قریش کی مختلف شاخوں کا مقسم قریب ہرگز قرار نہ دیا جاتا۔ رابعاً ائمہ محدثین نے جہاں اس حدیث کے مختلف محامل بیان کئے ہیں وہاں اس توجیہ کا کوئی محدث اور شارح ذکر نہیں کرتا۔

ان پانچ تمہیدی امور کی وضاحت کے بعد آپ کے سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:۔

① ــــ راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدیث مذکور میں جن بارہ حکمرانوں کی خبر دی گئی ہے۔ وہ یہ حضرات ہیں:۔

① حضرت صدیق اکبرؓ ② حضرت فاروق اعظمؓ ③ حضرت عثمان ذوالنورینؓ ④ حضرت علی المرتضیٰؓ ⑤ حضرت امیر معاویہؓ ⑥ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ ⑦ عبدالملک ⑧ ولید ⑨ سلیمان ⑩ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ⑪ ہشام بن عبدالملک ⑫ ولید بن یزید بن عبدالملک ھذا ما عندی واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

② ــــ حضرت عمارؓ کو قتل کرنے والے بے شک طائفہ باغیہ ہوں گے لیکن حضرت امیر معاویہؓ اس کے ماتحت نہیں آتے اس لیے کہ باغی اسے کہتے ہیں جو کسی حکومت کو تسلیم کرنے کے بعد اس کے خلاف ہو جائے۔ اور جو شروع سے ہی مخالف ہو اس پہ باغی کا لفظ پورا منطبق نہیں اترتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ کے لشکر میں کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو پہلے حضرت علیؓ کے ساتھ تھے اور پھر وہ حضرت امیر معاویہؓ کی جماعت میں شامل ہو گئے ہوں ہاں یہ صحیح ہے کہ حضرت عمارؓ کے قتل کرنے والے اس حدیث کی رو سے طائفہ باغیہ ہیں۔ لیکن جب تک ان قاتلوں کی نشاندہی نہ ہو جائے۔ ہم اس حدیث کو حضرت امیر معاویہؓ کے پورے لشکر پہ منطبق نہیں کر سکتے۔ اور حضرت معاویہؓ تو اپنی وفات کے وقت مسلمانوں کے بالاتفاق حکمران تھے مختلف فیہ شخصیت نہ تھے وہ باغی کیسے ہو سکتے ہیں۔

③ ــــ خلیفہ برحق بے شک حضرت علی المرتضیٰؓ تھے۔ لیکن اس وقت تک حضرت علیؓ کی خلافت پہ تمام عالم اسلام کا اجماع نہ ہوا تھا۔ اہلسنت کا اس خلافت پہ کلی اجماع ایام خلافت کے بعد حضرت امام حسنؓ کی صلح کے بعد منعقد ہوا۔ اس کے بعد جو حضرت علی المرتضیٰؓ کی خلافت کے خلاف ہو وہ بے شک گمراہ ہے۔ لیکن ان ایام اختلاف میں جب دونوں طرف صحابہ کرامؓ کے متعدد افراد ہوں ہم خطائے اجتہادی کے کسی بھی مرتکب کو کسی طرح موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔ بلکہ مجتہد مخطی بھی ارشادِ نبوت کی رو سے مثاب و ماجور ہوتا ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

کتبہ: خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: گذارش یہ ہے کہ حدیث شریف کی کس مستند کتاب میں عرض اعمال کی روایت آئی ہے۔ اس کتاب کا نام کیا ہے۔ صفحہ، سند، صحابی کا نام اور حدیث شریف (خواہ مرفوع ہو یا موقوف) اس کے اصل الفاظ مبارک کیا ہیں تحریر فرمایئے؟

دوسری عرض یہ ہے کہ صحیح بخاری شریف کتاب التفسیر جلد ۲ ص۶۲۵ پر حضرت ابن عباسؓ سے ایک مرفوع روایت یوں آئی ہے عن ابن عباسؓ قال خطب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا ایھا الناس انکم محشورون الی اللہ حفاۃ عراۃ غرلاً ثم قال کما بدأنا اول خلق نعیدہ وعداً علینا انا کنا فاعلین الی اخر الآیۃ ثم قال الا وان اول الخلائق یکسی یوم القیامۃ ابراھیم الا وانہ یجاء برجال من امتی فیوخذ بھم ذات الشمال فاقول رب اصحابی فیقال انک لا تدری ما احدثوا بعدک فاقول کما قال العبد الصالح

وكنت عليهم شهيدًا ما دمت فيهم فلما توفيتني كنت انت الرقيب عليهم فقال ان هؤلاء لم يزالوا مرتدين على اعقابهم منذ فارقتهم.

اگر حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ساری امت کے اعمال پیش ہوتے ہیں تو قیامت کے دن یہ کیوں کہا جائے گا۔ انك لا تدری ما احدثوا بعدك ان دونوں صورتوں میں تطبیق کی صورت کیا ہے ؟

جواب : اس وقت ان خصوصیات کے ساتھ تو حدیث نہیں ملی۔ البتہ نفسِ مقصود پر ایک حدیث ضرور دلالت کر رہی ہے اس کو نقل کرتا ہوں :-

فی الجزء التاسع لمجمع الزوائد ومنبع الفوائد باب ما يحصل لامة من استغفاره بعد وفاته صلى الله عليه وسلم عن البزار ورجال الصحيح عن عبد الله ابن مسعودؓ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم تعرض على اعمالكم فما رأيت من خير حمدت الله عليه وما رأيت من شر استغفرت الله لكم او مختصرًا.

۲۔ عرضِ اعمال نام و نشان سے ہوتا ہے نہ کہ معرفت و حضور سے اور چہروں کی پہچان سے ۔۔۔ اور قیامت میں ان لوگوں کی صورتیں نظر آئیں گی جو عرضِ اعمال میں ہرگز سامنے نہ تھیں۔ پس اس موقع محشر میں ان کی شکلیں نظر آنے سے یہ امر لازم نہیں آتا کہ ان صورت والوں کے کیا کیا اعمال تھے۔ اس لیے ان میں کوئی تعارض نہیں۔ پس تطبیق کی ضرورت پیدا نہیں ہوتی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ ۲۷ نومبر ۶۴ء

سوال : محترم و مکرم جناب علامہ صاحب

السلام علیکم۔ یہاں جامعہ محمدیہ سرگودھا کے بعض شیعہ طلبہ عام مسلمانوں میں حدیثِ ثقلین کا بہت پراپیگنڈہ کر رہے ہیں۔ انہوں نے حوالے عام لوگوں میں پھیلا رکھے ہیں ان وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اہل سنت کی بڑی معتبر کتاب نسائی میں حضور پُر نور فرماتے ہیں " انی تارك فيكم الثقلين " میں تم میں دو بڑی چیزیں چھوڑ چلا ہوں۔ قرآن اور اپنے اہلبیت۔ میں نے نسائی شریف میں اس کو بہت تلاش کیا ہے مگر کہیں نہیں ملی۔ امام نسائی کا ایک چھوٹا سا رسالہ الخصائص کے نام سے مصر میں چھپا ہے اس میں یہ حدیث ملی ہے مگر سند کا پتہ نہیں چلتا۔ اس کی تحقیق چاہیئے ؟

۲۔ اس قسم کی ایک حدیث مسلم شریف جلد ۲ صفحہ ۲۷۹ سے بھی پیش کرتے ہیں۔ اس میں بھی ایک چیز تشریح طلب ہے۔ وہ یہ کہ اسے روایت کرنے سے پہلے حضرت زید بن ارقمؓ فرماتے ہیں :-

یا ابن اخی واللہ لقد کبرت سنی وقدم عهدی ونسيت بعض الذی كنت اعی

من رسول الله صلى الله عليه وسلم فما حدثتكم فاقبلوه وما لا فلا تكلفونيه ثم قال قام رسول الله صلى الله عليه وسلم خطيبا بماء يدعى خما بين مكة والمدينة فحمد الله واثنى عليه ..... الحديث.

جناب زید کہتے ہیں اے میرے بھتیجے بخدا میری عمر بڑی ہو گئی ہے میرا وقت قریب آیا ہوا ہے اور میں کچھ وہ بات بھول گیا ہوں جسے میں پہلے یاد رکھتا تھا۔ اب تو یہی ہے کہ جتنی بات میں بیان کروں اسے لے لو۔ اور علاوہ اس کے متعلق مجھے کوئی تکلیف نہ دو۔

آپ تشریح سے بتائیں کہ اسی روایت میں وہ کون سا مقام ہے جہاں حضرت زید بن ارقمؓ مضمون کا کوئی حصہ بھول رہے ہیں ؟

۳۔ اسی قسم کی ایک روایت مشکل الآثار طحاوی کی دوسری جلد کے صفحہ ۳۰۷ پر بھی ملتی ہے۔ اس کے ایک راوی یزید بن کثیر کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ اسماء الرجال کی کسی کتاب سے اس کا پتہ چاہیئے۔ اس روایت میں یہ الفاظ ہیں :-

انی قد ترکت فیکم ما ان اخذتم لن تضلوا بعدی کتاب الله بایدیکم و اهل بیتی ص ۳۰۷

سائل۔ ادریس احمد شبلی مقیم کوٹھی ۱۲ نزد خالقیہ اسلامیہ سکول سرگودھا ۲۳ نومبر ۶۴ء

جواب : قرآن پاک میں مدارِ نجات اور لائق تمسک کتاب اللہ اور سنتِ رسولِ خدا ہی ہیں اور یہ مضمون قرآن کے متعدد مقامات میں پھیلا ہوا ہے۔ دیکھئے پ ۳ آل عمران ع ۴، پ ۴ آل عمران ع ۱۴، پ ۶ المائدہ ع ۱۲، پ ۹ انفال ع ۱، پ ۹ انفال ع ۱، پ ۹ انفال ع ۲، پ ۱۰ انفال ع ۴، پ ۱۸ نور ع ۲، پ ۱۸ نور ع ۷، پ ۲۲ احزاب ع ۴، پ ۲۶ محمد ع ۴، پ ۲۸ مجادلہ ع ۲، تغابن ع ۲ وغیرہا۔ (من المقامات)

اور قرآن پاک کے اس مضمون کے مطابق ثقلین کی روایت یہ ہے :-

قال مالك انه بلغه ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال ترکت فیکم امرين لن تضلوا ما تمسکتم بهما کتاب الله و سنة نبيه[1]

ابن عبد البر مالکیؒ لکھتے ہیں :-

هذا حديث محفوظ مشهور عن النبی صلی الله علیه وسلم عند اهل العلم شهرة يكاد يستغنى بها عن الاسناد وقد ذكرناه مسندًا فی کتاب التمهيد[2]

سنن دار قطنی صفحہ ۵۲۹، مستدرک حاکم جلد ۱ صفحہ ۹۳، سنن کبریٰ امام بیہقی جلد ۱۰ صفحہ ۱۱۴ اور کنز العمال وغیرہا من الکتب میں بھی یہ حدیث موجود ہے اس کا مضمون قرآن کریم سے اس طرح منطبق ہے کہ اس کے اسناد و رواۃ

---

[1] موطا امام مالک صفحہ ۳۶۳ باب النہی عن القول فی القدر [2] تجرید التمہید لابن عبد البر صفحہ ۲۵۱ طبع مصر

کے لیے کسی تجسس کی ضرورت نہیں۔ اب آپ کے سوالات کے جوابات پیشِ خدمت ہیں :۔

۱۔ امام نسائیؒ نے یہ روایت اپنی اس سنن میں جو صحاح ستہ میں داخل ہے روایت نہیں کی کیونکہ اس میں امام نسائیؒ نے اپنے نزدیک صحت کا التزام کیا تھا اور یہ روایت ضعیف ہونے کی بناء پر اس میں درج ہونے کے لائق نہ تھی۔ خصائص سیدنا علیؓ میں جو سند مذکور ہے اس میں کتابت کی غلطی سے احمد بن المثنیٰ چھپ گیا ہے اس کی بجائے صحیح محمد بن المثنیٰ ہے اور یحییٰ بن حماد کی بجائے یحییٰ بن معاذ غلطی سے چھپ گیا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے البدایہ والنہایہ میں اس حدیث کو امام نسائیؒ کی سنن کبریٰ سے مع اسناد کے نقل کیا ہے۔ اس میں سند یہی ہے :۔

عن محمد بن المثنیٰ عن یحییٰ بن حماد عن ابی معاویہ عن الاعمش...... الخ[1]

سو اس کی روشنی میں خصائص سیدنا علیؓ کے اسناد کو درست کر لیا جائے۔ یہ ابو معاویہ ایک نہایت غالی بزرگ تھے اور یہ غلو شیعیت تھا۔

حافظ ذہبی لکھتے ہیں :۔

وقد اشتہر عنہ الغلو غلو التشیع۔[2]

اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ ابو معاویہ کی کنیت سے شیعہ حضرات کو ناراض نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ کنیت خود اُن کے گھر کی ایجاد ہے۔

۲۔ حضرت زید بن ارقمؓ انا تارک فیکم ثقلین اولہما کتاب اللہ بیان کرنے کے بعد ثقلین کا دوسرا فرد جسے ثانیہما سے بیان کرنا تھا۔ بوجہ کبر سنی بھول گئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس حدیث ثقلین کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر میں امت کو اپنے اہلبیت کی طرف سے بھی متوجہ فرمایا تھا۔ مگر ثقل ثانی کے الفاظ (جو دوسری احادیث کے بیان کی رو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ تھے) معرض نسیان میں آنے کے باعث یوں گمان ہونے لگا کہ گویا ثقلین قرآن کریم اور اہلبیت کرام تھے۔ نہایت تعجب ہے کہ جب حضرت زید بن ارقمؓ خود اپنے بڑھاپے کے باعث حدیث کے بعض پہلوؤں کے بھول لینے کا ذکر فرماتے ہیں تو لوگوں نے حدیث مذکور میں ثقلین سے مراد قرآن کریم اور اہلبیت کیسے لے لیے؟ یاد رکھیئے ثقلین کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہیں۔ اور یہی دو افراد واجب التمسک ہیں۔ یہی مضمون قرآن کریم سے ثابت ہے اور یہی مضمون ثقلین دوسری حدیث میں وارد ہے۔ اہلبیت کرام اپنی جگہ لائق محبت اور محل احسان ہیں۔ مگر تمسک اور محبت میں بڑا اصولی اختلاف ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

۳۔ مشکل الآثار امام طحاویؒ کی روایت بھی سنداً ضعیف ہے۔ اس میں یزید بن کثیر کے نام میں ناقلین

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۵ صفحہ ۲۰۹ [2] میزان الاعتدال جلد ۲ صفحہ ۲۸۲

کی طرف سے قلب واقع ہو گیا ہے۔ صحیح نام کثیر بن زید معلوم ہوتا ہے۔ مسند اسحٰق بن راہویہ میں عمر بن علی کا شاگرد کثیر بن زید ہے اور مشکل الآثار کی سند میں یزید بن کثیر کو بھی محمد بن علی کا شاگرد ہی بتلایا گیا ہے اہل علم حضرات کی خدمت میں گذارش ہے کہ وہ مسند اسحٰق بن راہویہ کی روایت کی روشنی میں مشکل الآثار کی سند کی تصحیح فرمالیں۔ یہ کثیر بن زید ضعیف ہے۔ امام نسائیؒ نے کتاب الضعفاء والمتروکین میں اس پر جرح کی ہے۔

حاصل اینکہ ثقلین کے اس دوسرے مفہوم اور خلافِ قرآن مدلول کی کوئی روایت اسناداً صحیح اور جرح سے محفوظ نہیں ملتی۔ واللہ اعلم وعلمہٗ اتم واحکم۔

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ ۲۵ دسمبر ۶۴ء

سوال : جناب علی علیہ السلام خانہ کعبہ میں پیدا ہوئے تھے۔ مولودِ کعبہ ہونے میں کیا کوئی دوسرا شخص حضرت علی کے ساتھ شامل نہیں؟ تشریح سے بتائیں کہ آپ کی یہ خصوصیت کہاں تک صحیح ہے؟ مقصود احمد چنیوٹ

جواب : اس میں اختلاف ہے کہ حضرت علی المرتضیٰؓ خانہ کعبہ میں پیدا ہوئے یا نہ؟ لیکن یہ بالکل صحیح نہیں کہ یہ فضیلت کسی اور صحابیؓ کو حاصل نہیں۔ آنحضرتؐ کے صحابی حضرت حکیم بن حزامؓ جو حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے تھے وہ بھی خانہ کعبہ میں پیدا ہوتے تھے۔ صاحب مشکوٰۃ "اکمال فی اسماء الرجال" میں لکھتے ہیں :۔

ولد فی الکعبۃ قبل الفیل بثلث عشرۃ سنۃ وکان من اشراف قریش۔[1]

ترجمہ۔ حکیم بن حزام واقعہ فیل سے تیرہ برس پہلے خانہ کعبہ میں پیدا ہوئے آپ قریش کے بڑے آدمیوں میں سے تھے۔

اور بھی کئی حضرات گزرے ہیں جن کی ولادت خانہ کعبہ میں ہوئی مگر یہ تفصیل کا موقع نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ البتہ حضرت علیؓ کے وہاں پیدا ہونے کا محققین نے انکار کیا ہے۔

سوال : رمضان کے آخری جمعہ میں جو لوگ قضا عمری کی نماز پڑھتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ نماز عمر کی تمام نمازوں کو پورا کر دیتی ہے اس کی تحقیق درکار ہے؟ حافظ محمد لطیف لاہور

جواب : قضا عمری کی روایت نہایہ شرح ہدایہ میں منقول ہے مگر تحقیق کی رو سے یہ موضوع اور من گھڑت ہے سیدنا ملا علی قاری اس روایت کے متعلق لکھتے ہیں :۔

باطل قطعاً لانہ مناقض للاجماع علیٰ ان شیئاً من العبادات لایقوم مقام فائتۃ سنوات۔[2]

ترجمہ۔ یہ روایت قطعی طور پر باطل ہے اور اس اجماعی مسئلے سے بھی متصادم ہے کہ کوئی عبادت

---

[1] اکمال فی اسماء الرجال صفحہ ۵۹۱ [2] موضوعات کبیر صفحہ ۴۷

سالہا سال کی فوت شدہ نمازوں کے قائم مقام نہیں ہو سکتی۔

سوال: ہمارے علاقے میں ایک مبتدع مولوی صاحب نے کہا ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام کے اس سوال پر کہ قیامت کب واقع ہو گی حضورؐ کا ماالمسئول عنہا باعلم من السائل فرمانا کہ مسئول اس باب میں سائل سے زیادہ علم نہیں رکھتا — اس کا مطلب یہ ہے کہ مسئول اور سائل دونوں وقتِ قیامت کا علم رکھتے ہیں مسئول سائل سے زیادہ اسے نہیں جانتا۔ اس کا معنی کیا واقعی یہ ہے؟

سائل۔ محمود احمد کچا گیٹ شرقپور۔

جواب: مولوی صاحب مذکور نے جو معنی کیا ہے وہ غلط ہے اور سلف صالحین کے خلاف ہے قیامت واقع ہونے کے وقت کا تفصیلی علم ربّ العزت کے سوا اور کسی کو نہیں اور یہ ان علوم مستاثرہ سے ہے جو مغیبات خمسہ کہلاتے ہیں حافظ ابن کثیرؒ ما المسئول عنہا باعلم من السائل کا معنی یہ بیان کرتے ہیں :-

تساوی فی العجز عن درك ذٰلك علم المسئول والسائل۔[1]

ترجمہ۔ اس وقت کو پا لینے سے عاجز رہنے میں مسئول اور سائل دونوں کا علم برابر ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں :-

من و تو ہر دو برابریم در نادانستن آں بلکہ ہر سائل و مسئول ہمیں حال دارد۔[2]

علامہ عینی شرح بخاری جلد ۱ صفحہ ۲۹۰ میں قسطلانی جلد ۱ صفحہ ۱۱۵ (مطبوعہ ہند) میں شیخ الاسلام زکریا تحفۃ الباری شرح صحیح بخاری صفحہ ۲۸ میں امام نووی شرح صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۲۸ میں اور حافظ عسقلانی فتح الباری صفحہ ۲۳ میں یہ سب محدثین ان الفاظ کو نفی علم پر محمول کرتے ہیں۔ ان الفاظ کو اثباتِ علم کا لباس پہنانا ایک بڑی زیادتی ہے۔

سیدنا ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں :-

وقد جاھر بالکذب بعض من یدعی فی زماننا العلم وھو متشبع بما لم یعط ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یعلم متٰی تقوم الساعۃ قیل لہ فقد قال فی حدیث جبریل ماالمسئول عنہا باعلم من السائل فحرّفہ عن موضعہ وقال معناہ انا و انت نعلمہا وھٰذا من اعظم الجھل واقبح التحریف۔[3]

ترجمہ۔ جس شخص نے یہ کہا ہے کہ حضور اکرمؐ کو وقتِ قیامت کا پورا علم تھا اس نے ایک کھلا جھوٹ بولا ہے جب اسے حدیث جبریل سنائی گئی تو اس نے اس کی تحریف کرتے ہوئے یہ معنی کئے کہ میں اور تو دونوں وقتِ قیامت کا علم رکھتے ہیں یہ معنی بہت بڑی جہالت اور ایک بڑی ذلیل تحریف ہیں۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۱ صفحہ ۲۲۹ [2] اشعۃ اللمعات جلد ۱ صفحہ ۴۲ [3] موضوعات کبیر صفحہ ۹۹

علاوہ ازیں اس جملے کا ایک اور استعمال بھی کتب حدیث میں موجود ہے۔ ابن حبان اپنی صحیح میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک یہودی عالم نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔ ای البقاع خیر — کہ زمین کا کون سا ٹکڑا اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے اچھا ہے۔ آپ وحی کے انتظار میں رہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام آئے تو آپ نے ان سے پوچھا۔ اس پر حضرت جبریل نے عرض کی :-

ماالمسئول عنہا باعلم من السائل ولکن اسأل ربی تبارك وتعالٰی۔[1]

ترجمہ۔ مسئول اس باب میں سائل سے زیادہ نہیں جانتا۔ ہاں میں اپنے پروردگار سے پوچھوں گا۔

حضرت جبریل علیہ السلام نے پھر اللہ تعالیٰ سے علم پا کر اطلاع دی "خیر البقاع مسجدھا" کہ بہترین قطعہائے زمین مساجد ہیں۔ اس روایت میں یہ جملہ واضح طور پر نفی علم کا معنی دے رہا ہے اور یہاں کسی شخص کو جرأت نہیں کہ اسے فریقین کے اثباتِ علم پر محمول کرے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سوال: تفسیر ابن کثیر سورۂ آل عمران میں حضور نبی علیہ السلام کی حدیث سند سے مذکور ہے۔ آپ نے فرمایا۔ ان عیسٰی لم یمت وانہ راجع الیکم قبل یوم القیٰمۃ۔ کہ حضرت عیسٰی فوت نہیں ہوئے اور وہ قیامت سے پہلے ضرور واپس آئیں گے۔ مرزائی کہتے ہیں کہ اس حدیث کو امام حسن بصری حضور علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں حالانکہ حسن بصری نے حضورؐ کا زمانہ نہیں پایا۔ جب تک اس درمیانے راوی کا پتہ نہ چلے اس کا اعتبار نہیں۔ اس کا جواب درکار ہے؟

سائل۔ بشیر حسین چمن چنیوٹ

جواب: یہ ٹھیک ہے حضرت امام حسن بصری نے حضور اکرم کا دنیوی زمانہ نہیں پایا۔ آپ حضرت عمرؓ کے آخر زمانہ خلافت میں پیدا ہوئے تھے لیکن اس سے حدیث ناقابل اعتبار نہیں ٹھہرتی۔ ایسی روایات مرسل کہلاتی ہیں اور امام اعظمؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک حدیث مرسل حجت ہے۔ پھر حضرت حسن بصریؒ کی مرسلات جو ثقہ راویوں سے مروی ہوں وہ تو صحاح کے حکم میں ہیں۔ امام علی بن المدینی کہتے ہیں :-

مرسلات الحسن اذا رواھا عنہ الثقات صحاح۔[2]

ترجمہ۔ حسن بصری کی مرسلات جب اسے ثقہ راوی نقل کریں تو یہ صحاح کے حکم میں ہیں۔

حافظ مزی تہذیب الکمال میں ابونعیم کے طریق سے نقل کرتے ہیں کہ ایک دفعہ یہی سوال حضرت امام حسن بصریؒ سے پوچھا گیا۔ آپ نے فرمایا :-

کل شیٔ قلتہ فیہ ھو عن علی غیر انی فی زمان لا استطیع ان اذکر علیا۔

---

[1] مشکوٰۃ صفحہ ۷۱ [2] موضوعات کبیر صفحہ ۲۵

ترجمہ۔ ہر وہ روایت جو میں نے اسی طرح سے پیش کی ہے وہ حضرت علیؓ سے مروی ہے
لیکن میں ایسے زمانے (حجاج کے زمانے) میں ہوں کہ حضرت علیؓ کا کھلم کھلا نام نہیں لے سکتا۔

امام بخاریؒ تاریخ میں سلیمان بن سالم قرشی کے ترجمے میں اور حافظ عسقلانیؒ تہذیب میں ابوزرعہ کے طریق سے حضرت حسن بصریؒ اور حضرت علی المرتضیٰؓ کا باہمی ملنا جلنا بیان کرتے ہیں۔[1]

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: مطلع فرماویں کہ اُلو روتا کیوں رہتا ہے اور لوگوں سے دور ویرانوں میں زندگی کیوں گزارتا ہے۔ اس کے مذہب سے مطلع کریں؟

سائل: شبیر احمد سنت نگر لاہور

جواب: حضرت امام جعفر صادقؒ اور حضرت علی بن موسیٰ رضاؒ سے بسند معتبر منقول ہے کہ پہلے زمانوں میں الو گھروں سے مانوس ہوا کرتا تھا اور کھانا کھاتے لوگوں کے قریب آکر بیٹھ جاتا تھا لیکن حضرت امام حسینؓ کے شہید ہونے کے بعد اس نے جنگلوں کی راہ لے لی۔ اب اس کا رونا حضرت امام حسینؓ کے غم میں ہے:۔

پس روز ہا از حزن و اندوہ بر مصیبت آنحضرت آزردہ مے باشد و آب و دانہ نے خورد چوں شب مے شود نوحہ و نالہ بر حسینؓ مے کند۔[2]

ترجمہ۔ الو اپنے دن حضرت امام حسینؓ کے غم میں روزے سے گزارتا ہے اور دن کو دانہ پانی نہیں کھاتا۔ جب رات ہوتی ہے تو وہ حضرت حسینؓ کے ماتم میں نوحہ خوانی کرتا ہے۔

اب آپ یہ خود معلوم کرلیں کہ اس کا مذہب کیا ہے ہم کہیں گے تو شکایت ہوگی۔

اہل سنت کے نزدیک جانور اور پرندے غیر مکلف مخلوق ہیں ان کے فرقے اور مذاہب نہیں۔ الو اگر روتا ہے تو یہ اس کی طبیعت اور فطرت ہے۔ اسے شہدائے کربلا کا ماتم ہرگز نہیں کہہ سکتے۔ اس کا مذہب کیا ہے اسے اس کے بیٹے جانیں۔

مولانا احمد رضا خاں کے ایک بیان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی جانوروں کے مذہب کے قائل تھے۔ فرماتے ہیں:۔

میں نے بندر کو قیام کرتے دیکھا ہیں اپنے پرانے مکان میں جس میں میرے منجھلے بھائی مرحوم رہا کرتے تھے مجلس میلاد پڑھ رہا تھا۔ ایک بندر سامنے دیوار پر چپکا مؤدب بیٹھا سن رہا تھا جب قیام کا وقت آیا، مؤدب کھڑا ہوگیا، پھر جب بیٹھے وہ بھی بیٹھ گیا وہ بندر تھا وہابی نہ تھا۔[3]

یہاں بندر بریلوی کے معنی میں ہے ——— احقر کو اس استدلال میں کلام ہے۔ بندر کی فطرت نقل کرنا

---

[1] دیکھئے تہذیب جلد ۲ صفحہ ۲۶۷ [2] جلاء العیون صفحہ ۵۱۲ ایران [3] ملفوظات حصہ چہارم صفحہ ۴

ہے۔ وہ قیام بطریق نقل کر رہا تھا۔ خان صاحب نے اسے بریلوی سمجھ لیا اور کہا وہ وہابی نہ تھا جس حالت میں وہ ہاتھ باندھے ہوگا خانصاحب کے لیے کیا روح پرور منظر ہوگا اور آپ کس وارفتگی سے اسے دیکھ رہے ہوں گے یہ اس وقت کے بریلوی فیصلہ کریں۔

مولانا مصطفےٰ خاں نے سانپ کو بھی بریلوی بتایا ہے۔[1] ان کے ہاں وہ بھی میلاد سنتا تھا۔ مولانا محمد عمر اچھروی ہدہد کو دیوبندی کہا کرتے تھے۔ کیونکہ اس نے سلیمان علیہ السلام کو احطت بما لم تحط (پ ۱۹ النمل) کہا تھا۔ مولوی صاحب کے نزدیک یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی گستاخی تھی کہ کہا جائے آپ یہ بات نہیں جانتے۔ ہدہد پیغمبروں کے علم غیب کا منکر تھا۔ احقر جانوروں کے مذاہب اور فرقوں کا قائل نہیں۔ ان کے ابنائے جنس ہی انہیں بہتر جانیں۔ اور وہی پہچانیں کہ الو کس انداز میں شہدائے کربلا کی عزاداری کرتا ہے یا بندر کس طرح تعظیمی قیام کرتا ہے۔

وللناس فیما یعشقون مذاہب

خلاف ——— کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

ان دورانہ فی السماء اسفا لما فعل باھل بیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔[2]

ترجمہ۔ وہ آسمان میں اس افسوس سے گھومتا ہے کہ حضورؐ کے اہل بیت کے ساتھ لوگوں نے کیا کیا ہے۔

گویا یہ اس سے پہلے زمین پہ چلنے پھرنے والا پرندہ تھا جس نے سانحہ کربلا کے بعد اپنا طور بدل لیا ہے۔

مولانا احمد رضا خاں فرماتے تھے الو شیعوں کے ہاں حلال ہے۔ شیعہ اس کا گوشت بڑے مزے سے کھاتے ہیں۔ شیعہ پھوپھی اور بھتیجی کے ایک خاوند کے نکاح میں جمع ہونے کے بھی قائل ہیں اور وہ اسے جمع بین الاختین کے حکم میں نہیں سمجھتے۔ مولانا احمد رضا خاں لکھتے ہیں:۔

کہاں کا اسلام کیسی ملتِ مجوسیت کو نہال کیجئے
مزے سے اُلو کا گوشت کھا کر پھوپھی بھتیجی حلال کیجئے[1]

خاں صاحب بتلا رہے ہیں کہ شیعیت ایران کی مجوسیت کا ہی ایک حربہ ہے۔ ان کی فقہ میں الو حلال ہے اور مزے دار بھی اور پھوپھی بھتیجی ایک نکاح میں جمع ہو سکتی ہیں۔

---

[1] مصطفیٰ رضا خاں نے مرزا ذاکر بیگ سے ایک سانپ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ منبر کے نیچے بیٹھا میلاد سنتا رہا (دیکھئے ملفوظات حصہ چہارم صفحہ ۴۰) سانپ منبر کے نیچے لیٹے تو ہو سکتا ہے منبر کے نیچے بیٹھا کیسے ہوگا اور بریلوی اسے دیکھتے کیسے ہوں گے اور اس صورت حال میں ان کا میلاد جاری رکھنا یہ بھی بریلویوں کا کمال ہے۔ [2] اصول کافی صفحہ ۲۲۲/۲۲

[3] سیفِ مصطفیٰ صفحہ ۵۷ مؤلفہ مولانا احمد رضا خاں۔

سوال : اصولِ دین کتنے ہیں ان میں اہل السنۃ اور اہل تشیع کا کیا اختلاف ہے۔ کیا یہ صحیح ہے کہ سبائیت نے ہر ایک اصل دین کے ساتھ ایک ایک اپنی پیچ لگائی ہے اور اسلام کے ہر ایک اصول کو اختلافی بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس کا کچھ تاریخی تجزیہ درکار ہے ؟

جواب : اصولِ دین تین ہیں۔ (۱) توحید (۲) رسالت (۳) آخرت

(۱) ——— شیعہ حضرات نے توحید کے چشمہ صافی کو گدلا کرنے کے لیے اس کے ساتھ عدل کا اضافہ کیا۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر عدل واجب ہے۔ اہلسنت عقیدہ رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں ضابطے اس کے ماتحت ہیں وہ خود کسی ضابطے کے ماتحت نہیں۔ چاہے عدل فرمائے چاہے مجرموں کو چھوڑ دے کوئی اس کو پکڑنے والا نہیں۔ بڑے بڑے نیکوں کو سخت آزمائش میں ڈال دے کوئی اس کو روکنے والا نہیں تقدیر اس کے تحت ہے یہ عدل کے خلاف نہیں۔

(۲) ——— رسالت کو واحد سرچشمہ دین سمجھنے کے خلاف انہوں نے امامت کا عقیدہ قائم کیا۔ بارہ امام مامور من اللہ قرار دیئے جن سے خدا تعالیٰ ہمکلام رہا۔ ان کا ماننا پیغمبروں کی طرح فرض ٹھہرا، ان کا انکار کفر قرار پایا۔ اس عقیدے سے رسالت واحد سرچشمہ دین نہ رہا۔ امامت نبوت کے متوازی ایک ویسا ہی منصب ہے اور اس عقیدے سے انسان ختم نبوت کا اعتقاد کھو بیٹھتا ہے

(۳) ——— آخرت کے مقابل انہوں نے رجعت کا عقیدہ گھڑا کہ حشر سے پہلے بڑے بڑے لوگوں اور بڑے بڑے مجرموں کا پھر اس دنیا میں آنا ہوگا یہ دور امام مہدی کا ہوگا۔ اس میں حضورؐ بھی اس دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے اور امام مہدی کی بیعت کریں گے۔ اس دور میں مجرموں کو پھانسیوں پر لٹکایا جائے گا اور ان پر حدیں جاری کریں گے اور یہ عمل قیامت سے پہلے ہوگا۔ عقیدہ رجعت سے اسلام کا عقیدہ آخرت بہت مخدوش ہو جاتا ہے۔

سو شیعہ کے اصولِ دین چھ ہوئے۔ توحید۔ عدل۔ رسالت۔ امامت۔ رجعت اور آخرت۔ مگر ان کے علماء عقائد رجعت کو اصول کا درجہ نہیں دیتے اور اصول دین صرف پانچ بیان کرتے ہیں۔ رجعت پر اعتقاد رکھتے ہیں مگر اسے اصول میں شامل نہیں کرتے۔

اہل سنت کے تین اصولِ دین بڑی وضاحت سے قرآن کریم میں متعدد مقامات پر مذکور ہیں۔ مگر شیعہ کے دو اضافی اصول عدل اور امامت قرآن کریم میں کہیں صراحت سے موجود نہیں کبھی یہ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت سے حضرت علیؓ کی امامت ثابت کرتے ہیں لیکن ہر ذی فہم جانتا ہے کہ ثابت کرنا اور بات

ہے اور دکھلانا اور بات۔ نصوص دکھلائی جاتی ہیں اور فقہی مسائل ثابت کیئے جاتے ہیں۔ شیعہ حضرات کے یہاں جتنا یہ مسئلہ اہم ہے اتنا ہی ان کے علماء اسے قرآن سے دکھلانے میں بے مایہ ہیں۔ بارہ اماموں کی امامت درکنار ان کے نام تک قرآن میں موجود نہیں۔

شیعہ علماء ان ائمہ کو امتی نہیں کہتے۔ کیوں کہ ان کا تعلق خدا سے صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے نہیں براہِ راست بھی قائم رہا ہے اور امتی وہی ہو سکتا ہے جو دین کی ہر ادا پیغمبر سے لے۔ کوئی علم جو دینی نوع کا ہو اور دوسروں کے لیے اس کا ماننا ضروری ہو اسے براہِ راست خدا سے نہ ملے۔ جو ملے صرف نبوّت سے ملے۔

سوال : شیعوں نے یہ بات بہت مشہور کر رکھی ہے کہ حضرت امام حسنؓ کو امیر معاویہؓ نے زہر دلا کر شہید کرا دیا تھا۔ اہلسنت مورخین بھی کیا اس سے متفق ہیں اس کا تفصیل سے جواب دیں؟

جواب : حضرت امیر معاویہؓ کے ذمہ یہ بات لگانا کہ آپ نے حضرت حسنؓ کو زہر دلوایا تھا ایک بڑا بہتان ہے اور کذب محض ——— حضرت امیر معاویہؓ کو اس کی ضرورت کیا پڑی تھی۔ حضرت حسینؓ تاحیات امیر معاویہؓ زندہ رہے۔ انہوں نے امیر معاویہؓ کا کیا بگاڑا تھا جو حضرت امام حسنؓ اگر زندہ رہتے تو امیر معاویہؓ کو کسی خطرے کا سامنا کرنا پڑتا۔ علم سے نابلد لوگ یہ نہیں سوچتے کہ اس میں حضرت معاویہؓ کی کیا ضرورت تھی جو وہ اس کا ارتکاب کرتے۔ خلافت حضرت حسنؓ ان کو دے چکے تھے دونوں بھائی امیر معاویہؓ سے بیعت ہو چکے تھے۔ ان کے وظائف لیتے رہے اور امیر معاویہؓ کی زندگی تک فدک کی آمدنی حضرت حسنؓ کی اولاد اور حضرت حسینؓ کی اولاد کو ملتی رہی۔ حضرت حسنؓ نے مسلمانوں کی دو جماعتوں کو ایک کیا، سلطنت اسلام متحد ہوئی اور پھر تاحیات امیر معاویہؓ اور ان حضرات کے مابین کوئی دل خراش واقعہ پیش نہیں آیا۔ حضرت حسنؓ کی نماز جنازہ حضرت امیر معاویہؓ کے گورنر مدینہ سعید بن العاصؓ اموی نے پڑھائی اور انہیں اس کے لیے حضرت حسینؓ نے آگے کیا۔ شہادت حسنؓ میں اگر کسی طرح امیر معاویہؓ ملوث ہوتے تو حضرت امام حسینؓ امیر معاویہؓ کے گورنر کو کبھی نماز جنازہ کے لیے آگے نہ کرتے۔ حضرت حسینؓ نے سعید بن العاصؓ کو آگے کرتے ہوئے فرمایا:-

لولا السنة لما قدمتك۔[1]

ترجمہ۔ اگر سنت طریقہ نہ ہوتا تو میں تجھے کبھی آگے نہ کرتا (سنت یہ کہ حاکم وقت امامت کرائے)۔

امام حسینؓ اس کے بعد ہر سال امیر معاویہؓ کے پاس جاتے رہے۔ وہ پوری طرح ان کا اکرام کرتے اور انہیں بڑے تحفے اور ہدایا دے کر رخصت کرتے۔ یہ صورت حال بتاتی ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ پر زہر خورانی کا

[1] اسد الغابہ جلد ۲ صـ۱۵ مقاتل الطالبین لابی الفرج جلد ۲ صـ۵۱

الزام کذب محض ہے۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں :-

ولما توفی الحسن کان الحسین یفد الیٰ معاویۃ فی کل عام فیعطیہ ویکرمہ۔[1]

ترجمہ۔ جب حضرت امام حسنؓ فوت ہوئے تو حضرت حسینؓ ہر سال حضرت امیر معاویہؓ کے پاس وفد بن کر جاتے آپ انہیں (حضرت حسینؓ کو) بہت سے عطیے دیتے اور ان کا بڑا اکرام فرماتے۔

مشہور شیعی مؤرخ احمد بن داؤد الدینوری (۲۸۲ھ) لکھتا ہے:-

ولم یر الحسن ولا الحسین طول حیاۃ معاویۃ منہ سوءً فی انفسہما ولا مکروھًا ولا قطع عنہما شیئاً مما کان شرط لہما ولا تغیر لہما عن بر۔[2]

ترجمہ۔ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ نے پوری زندگی حضرت معاویہؓ سے اپنے حق میں کوئی بدخواہی نہیں دیکھی نہ ان کا اپنے بارے میں کوئی ناپسندیدہ عمل دیکھا نہ حضرت معاویہؓ نے کوئی بات جس پر آپ نے انہیں عہد دیا تھا توڑی اور نہ ان دونوں کے ساتھ آپ نے کسی نیکی میں دریغ کیا۔

پہلے مؤرخین جیسے ابن جریر طبری (۳۱۰ھ) خطیب بغدادی (۴۶۳ھ) وغیرہا میں سے کوئی اس واقعہ کو نقل نہیں کرتا۔ حاکم (۴۰۵ھ) نے زہر دیئے جانے کا واقعہ تو نقل کیا ہے مگر زہر دینے کے مجرمین کی کوئی نشاندہی نہیں کی۔ سب سے پہلے ابن اثیر الجزری (۶۳۰ھ) نے اس زہر دینے کی نسبت آپ کی بیوی جعدہ بنت اشعث کی طرف کی ہے اور پھر صیغہ تمریض سے کہا ہے کہ کچھ لوگ اسے امیر معاویہؓ کی طرف منسوب کرتے ہیں اس پر ابن اثیر نے کوئی صحیح روایت پیش نہیں کی نہ اس الزام کی کہیں توثیق کی ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ (۷۲۸ھ) لکھتے ہیں :-

ان معاویۃ سمّ الحسن فہذا مما ذکرہ بعض النّاس ولم یثبت ذٰلک ببیّنۃ شرعیۃ او اقرار معتبر ولا نقل یجزم بہ۔[3]

ترجمہ۔ امیر معاویہؓ نے حضرت حسنؓ کو زہر دیا ہے یہ وہ بات ہے جو بعض لوگوں نے ذکر کی ہے اور یہ بات کسی واضح شرعی دلیل یا اقرار معتبر سے ثابت نہیں۔ اس پر کوئی نقل نہیں ملتی جس پر یقین کیا جا سکے۔

حافظ ابن کثیر (۷۷۴ھ) تو یہ بھی لکھتے ہیں کہ حضرت حسینؓ نے حضرت حسنؓ سے اُن کے آخری وقت میں پوچھا کہ آپ کو زہر کس نے دیا ہے حضرت حسنؓ نے نام بتانے سے انکار کیا اور فرمایا کہ اس کو ترک کر دیں اس کا فیصلہ اللہ کے ہاں ہو گا۔[4]

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۱۵۱ تاریخ ابن عساکر جلد ۴ ص ۳۱۱ [2] الاخبار الطوال ص ۲۲۵ [3] منہاج السنۃ جلد ۲ ص ۲۲۵ [4] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۴۳

علامہ ابن خلدون (۸۰۸ھ) لکھتے ہیں :-

وما ینقل ان معاویۃ دس الیہ السم مع زوجتہ جعدہ بنت اشعث بن قیس فہو من احادیث الشیعہ وحاشا لمعاویۃ من ذلک۔[1]

ترجمہ۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ امیر معاویہؓ نے آپ کو آپ کی بیوی جعدہ بنت اشعث کے ساتھ مل کر زہر دلایا تھا یہ شیعوں کی باتیں ہیں۔ حاشا وکلا امیر معاویہؓ نے ایسا کیا ہو۔

یہ سوال کہ حضرت حسنؓ کی دشمنی کن سے تھی یہ ضرور غور طلب ہے۔ حضرت علیؓ کے ایک بیان سے اس کا کچھ اشارہ ملتا ہے۔ حضرت حسنؓ کو نئی شادیوں کا بہت شوق تھا۔ اسی بناء پر آپ کو حسن مطلاق کہا جانے لگا تھا۔ اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا :-

مازال الحسن یتزوج ویطلق حتی حسبت ان یکون عداوۃ فی القبائل۔[2]

ترجمہ۔ حضرت حسنؓ متواتر شادیاں کرتے رہے اور طلاقیں دیتے رہے یہاں تک کہ مجھے خدشہ گزرا کہ اس اندازِ عمل سے کہیں قبائل میں عداوت کی آگ نہ بھڑک اُٹھے۔

اس پس منظر میں گمان کیا جا سکتا ہے کہ یہ آپ کی کسی بیوی ہی کی سازش ہو گی۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ قرائن سے ملتی ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ کا دامن اس الزام سے بالکل پاک ہے۔ محض مخالفین کی اختراع سے کسی مسئلے کا اثبات نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال : کیا یہ صحیح ہے کہ امیر معاویہؓ نے محمد بن ابی بکرؓ کو قتل کرایا تھا اور حضرت عائشہؓ اپنے بھائی کے غم میں امیر معاویہؓ پر قنوت فجر میں بددعا کرتی رہیں؟

جواب : حضرت علی المرتضیٰؓ کے بھائی جعفر طیارؓ کی بیوہ اسماء بنت عمیس نے حضرت ابوبکرؓ سے نکاح کر لیا تھا اور حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد یہ حضرت علیؓ کے نکاح میں آئیں محمد بن ابی بکرؓ انہی کے بیٹے تھے جن کی پرورش حضرت علیؓ کے ہاں ہوئی۔ جب حضرت عثمانؓ کے خلاف یورش ہوئی تو حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ کے ساتھیوں میں تھے اور محمد بن ابی بکرؓ باغی نوجوانوں کے ہتھے چڑھ کر حضرت عثمانؓ پر حملہ آور ہوا۔ حضرت عثمانؓ نے کہا اگر آج تیرا باپ زندہ ہوتا تو تیرے اس کردار پر کیا کہتا۔ اسے شرم آئی اور پیچھے ہٹ گیا۔ حضرت عائشہؓ بھی اس کے اس کردار سے اس کے خلاف تھیں۔

جنگ صفین کے بعد حضرت علیؓ نے اسے مصر کا والی بنا دیا۔ مصر کے پہلے گورنر عمرو بن عاصؓ تھے۔ حضرت

---

[1] تاریخ ابن خلدون جلد ۲ ص ۱۱۳۹ [2] المصنف لابن شیبہ جلد ۵ ص ۲۵۴

عمرو بن عاصؓ نے محمد بن ابی بکرؓ کے مقابلہ کے لیے معاویہ بن خدیج کو سپہ سالار مقرر کیا۔ اس جنگ میں محمد بن ابی بکرؓ کی وفات ہوئی۔ یہاں سے یہ بات چل نکلی کہ معاویہ بن خدیج الکندی نے محمد بن ابی بکرؓ کو قتل کیا ہے۔ افسوس کہ شیعہ حضرات نے یہ قتل بھی حضرت امیر معاویہؓ کے نام لگا دیا۔ حالانکہ معاویہ بن خدیج اور ہیں اور معاویہ بن ابی سفیان اور — چونکہ مرکزی حاکم حضرت امیر معاویہؓ تھے اس لیے محمد بن ابی بکرؓ کے بھائی حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ اور ام المؤمنین حضرت عائشہؓ اگر بھائی کی ہمدردی میں امیر معاویہؓ کے خلاف ہو گئے ہوں تو اسے تسلیم کیا جا سکتا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ عملی پہلو سے محمد بن ابی بکرؓ کے قتل کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کی ایک دفعہ معاویہ بن خدیج سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے اُسے کہا تو نے میرے بھائی کو ولایت مصر کے لیے قتل کیا ہے۔ اس نے کہا اس لیے نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ قاتلین عثمان کے ساتھ شامل ہوا تھا[1]۔ حضرت عائشہؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کے خلاف بد دعا کی ہو یہ روایت ابو مخنف لوط بن یحییٰ سے مروی ہے اور یہ صاحب شیعہ تھے۔ ان کے شیخ الشیخ عن الشیخ من اہل المدینہ کے نام سے مذکور ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے راویوں اور رافضیوں کی روایت سے حضرت امیر معاویہؓ کے خلاف کوئی الزام قائم نہیں کیا جا سکتا۔ طبری نے یہ روایت اسی شیعہ راوی سے نقل کی ہے۔ یہ بھی کسی طرح لائق تسلیم نہیں۔ والسلام

خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: مالک بن یحییٰ ہمدانی روایت کرتا ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ نے وتر ایک پڑھا کسی نے اس کی اطلاع حضرت ابن عباسؓ کو کر دی۔ آپ نے فرمایا من این تری اخذھا الحماد۔ تو کہاں سے دیکھ رہا تھا گدھے نے ایسا کیا ہے؟ کیا یہ روایت صحیح ہے۔ نیز یہ بتائیں کہ یہاں حضرت ابن عباسؓ نے گدھا کس کو کہا ہے یا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ایک رکعت وتر کوئی بے وقوف ہی پڑھ سکتا ہے۔ کسی سمجھ دار کا یہ عمل نہیں ہو سکتا۔ تُو نے معاویہؓ کو ایسا کرتے کہاں سے دیکھ لیا؟ ایسا نہیں ہو سکتا کہ معاویہؓ ایک رکعت وتر پڑھیں۔ اس واقعہ کی تفصیل درکار ہے کہ یہ جملہ کس نے کہا اور کس کو کہا گیا؟

السائل۔ احمد یار از خان گڑھ

جواب: یہ روایت عمران بن حدیر (ھ) عکرمہ (۱۰۷ھ) سے اور عکرمہ اسے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں۔ عمران بن حدیر سے عطاء بن ابی رباح (۱۱۷ھ) اور عثمان بن عمر (ھ) اسے روایت کرتے ہیں عثمان بن عمر کے طریق میں یہ <u>اخذھا الحماد</u> الفاظ موجود نہیں ہیں اور اگر یہ بات ہو تو اس کا مطلب یہی ہے کہ ایسا بے سمجھی کا کام حضرت معاویہؓ کیسے کر سکتے ہیں؟ ایک رکعت تو کوئی بے وقوف ہی پڑھے گا۔ تم نے کہاں سے دیکھ لیا کہ کوئی بے وقوف ایسا کر رہا ہے۔

اس کے اوپر کے راوی ابو عبداللہ عکرمہ فقہائے مکہ میں سے ہیں ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ خارجی

ذہن رکھتے تھے۔ امیر معاویہؓ کے ساتھ خارجی کیا انصاف کر سکتا ہے۔ یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں خارجی لوگ حضرت علی المرتضیٰؓ، حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت عمرو بن عاصؓ تینوں کے برابر کے دشمن ہیں۔ محدثین نے اگر عکرمہ کی اور روایات قبول کی ہیں تو ضروری نہیں کہ ہم ان کی وہ روایات جو ان حضرات کے مقام کو مشتبہ کریں وہ بھی قبول کر لیں۔ سو یہ الفاظ من این تری اخذھا الحماد عکرمہ مولیٰ ابن عباسؓ کے تو ہو سکتے ہیں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت معاویہؓ کے اچھے تعلقات تھے اور دونوں ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ جب حضرت حسنؓ نے حضرت امیر معاویہؓ سے صلح کر لی اور ان کی خلافت قبول کر لی تو پھر کوئی ہاشمی بھی حضرت معاویہؓ سے دور رہنے کے لیے تیار نہ تھا۔ حضرت ابن عباسؓ بھی آپ کے سلسلہ بیعت میں داخل تھے۔ محدث عبدالرزاق (۲۱۱ھ) روایت کرتے ہیں:-

ان کریباً مولی ابن عباس اخبرہ انہ رای ابن عباس یصلی فی المقصورۃ مع معاویۃ۔[1]

ترجمہ۔ کریب مولیٰ ابن عباسؓ نے بتایا کہ اس نے حضرت ابن عباسؓ کو حضرت معاویہؓ کے ساتھ مقصورہ میں نماز پڑھتے دیکھا ہے۔

پھر حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت معاویہؓ کے بارے میں یہاں تک اعتراف فضیلت کیا ہے۔ آپ نے فرمایا:-

لیس احد منا اعلم من معاویۃ۔[2]

ترجمہ۔ ہم (اس وقت کے موجود صحابہ) میں کوئی بھی حضرت معاویہؓ سے زیادہ دین کا علم رکھنے والا نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث نقل کرنے میں حضرت معاویہؓ کتنے امین اور قابل اعتماد ہیں۔ اس کا جواب بھی حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ملے گا:-

ما کان معاویۃ علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم متھما۔[3]

ترجمہ۔ حضرت معاویہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے میں (کسی کے ہاں) متہم نہیں سُنے گئے۔

اس تفصیل سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ حضرت معاویہؓ کے بارے میں ایسے الفاظ (من این تری اخذھا الحماد) ہرگز نہ کہہ سکتے تھے۔ سو یہ الفاظ نچلے راوی عکرمہ کے ہوں گے جو انہوں نے خارجی ہونے کے ناطے امیر معاویہؓ کے خلاف کہے اور ان کی نسبت حضرت امیر معاویہؓ کی طرف غلط طور پر کر دی ہو گی۔

---

[1] المصنف جلد ۲ ص ۱۴۲ [2] السنن الکبریٰ للبیہقی جلد ۳ ص ۲۶ [3] مسند امام احمد جلد ۴ ص ۱۰۲

کیا عکرمہ خارجی ذہن رکھتا تھا؟

طبقات ابن سعد میں ہے :-

عکرمۃ یظن انہ یری رای الخوارج[1]

ترجمہ: عکرمہ کے بارے میں گمان ہے کہ وہ خارجی ذہن رکھتا تھا۔

حافظ ذہبی نے عکرمہ کو ثقہ لکھنے کے بعد یہ بھی لکھا ہے :-

کذبہ مجاھد وابن سیرین ومالک . . . . قال احمد کان یری رای الخوارج الصفریۃ وقال ابن المدینی کان عکرمۃ یری رای نجدۃ الحروری وقد وثقہ جماعۃ واحتجوا بہ[2]

ترجمہ: مجاہد (۱۰۰ھ) ابن سیرین (۱۱۰ھ) اور امام مالک (۱۷۹ھ) نے اسے کاذب قرار دیا ہے . . . . . امام احمد کہتے ہیں کہ یہ خارجیوں کا عقیدہ رکھتا تھا۔ ابن المدینی بھی کہتے ہیں کہ اس کے عقائد حروریوں کے تھے کچھ لوگوں نے اسے ثقہ کہا ہے اور اس سے سند پکڑی ہے۔

عکرمہ کا حضرت ابن عباسؓ پر جھوٹ باندھنا اتنا عیاں تھا کہ علماء اسے مثال کے طور پر پیش کرتے تھے حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنے شاگرد نافع سے کہتے ہیں :-

اتق اللہ ویحک یا نافع ولا تکذب علی کما کذب عکرمۃ علی ابن عباس[3]

ترجمہ: نافع اللہ سے ڈرو اور مجھ پر کوئی جھوٹ نہ بولنا جس طرح عکرمہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ پر جھوٹ بولے ہیں۔

پھر حضرت سعید بن المسیب (۹۴ھ) اپنے مولیٰ برد کو کہتے ہیں :-

یا برد لا تکذب علی کما کذب عکرمہ علی ابن عباس[4]

ترجمہ: اے برد! مجھ پر کوئی جھوٹ نہ باندھنا جیسا کہ عکرمہ نے حضرت ابن عباسؓ پر جھوٹ باندھا ہے سو اس میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ سخت الفاظ (واقعی اگر ان کے بارے میں ہوں) حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے نہیں عکرمہ خارجی کے وضع کردہ ہیں اور یہ اس لیے لائق تسلیم نہیں کہ یہ الفاظ حضرت معاویہؓ کے خلاف ہیں۔ بدعتی راویوں کی وہ روایت جو اُن کے اس خاص عقیدے کی حمایت میں ہو کسی کے ہاں لائق قبول نہیں اور عبارت بھی اس طرح کی ہے کہ یہ الفاظ خاص حضرت معاویہؓ کے حق میں کہے گئے معلوم نہیں ہوتے۔ واللہ اعلم بالصواب

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

---

[1] طبقات ابن سعد جلد ۵ صفحہ ۲۱۶ ونحوہ فی الکامل لابن عدی جلد ۵ صفحہ ۱۹۰۵ [2] کتاب معرفۃ الرواۃ المتکلم فیہم صفحہ ۱۴۸/۲۴۲ [3] تہذیب جلد ۷ صفحہ ۲۶۷ [4] ایضاً صفحہ ۲۶۸

سوال: ابوسفیان کا ایک بیٹا زیاد عہدِ جاہلیت کے زنا سے تھا قانونی بیٹا نہ تھا۔ امیر معاویہؓ نے اپنی سیاسی قوت بڑھانے کے لیے اسے صحیح النسب ثابت کرنے کی کوشش کی اور اپنا بھائی بنالیا۔ وہ بچہ جو عبید مولیٰ ثقیف کے گھر پیدا ہوا۔ اسے ابوسفیان کے نسب میں لانا حضورؐ کے فرمان الولد للفراش وللعاھر الحجر کے خلاف ہے۔ تاریخ میں اسے زیاد بن ابیہ کہتے ہیں۔ یہ تبھی ہے کہ اس کا نسب معلوم نہ ہو اسے زیاد بن سمیّہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ بھی اسی لیے کہ وہ ثابت النسب نہ تھا۔ امیر معاویہؓ نے اس حرامی کو اپنا مقرب کیوں بنایا اور اسے یہ عزت کیوں دی یہ استلحاق جائز ہے یا ناجائز؟ سائل۔ قائم الدین

جواب: زیاد مذکور ولدالزنا نہیں تھا۔ عہدِ جاہلیت میں کچھ ایسے بھی نکاح بھی ہوتے تھے جو ہمارے قاعدہ نکاح پر پورے نہیں اترتے۔ ایران میں بھی عہدِ اسلام سے پہلے ایک متعہ رائج تھا۔ عہدِ جاہلیت میں اگر عرب بھی ایسا کرتے ہوں تو کون سی تعجب کی بات ہے۔ الولد للفراش وللعاھر الحجر قاعدہ اسلام کا ہے عہدِ جاہلیت کا نہیں ان کے ہاں شادی شدہ عورت سے کوئی متعہ کرے اور بچہ پیدا ہو جائے تو اگر پہلا شوہر اس بچے کے نسب کا دعویٰ نہ کرے اور متعہ کرنے والا اس کے نسب کا مدعی ہو تو اس نکاح جاہلیت کے بچے کو علی وجہ القطع والصراحۃ ولدالزنا نہ کہتے تھے۔ اسلام نے دوسرے مذاہب کے پہلے نکاح وہ جس طرح کے بھی ہوں قائم رکھے ہیں۔

زیاد (کنیت ابوالمغیرہ) طائف میں فتح مکہ کے سال پیدا ہوا۔ مؤرخ ابن خلدون لکھتے ہیں :-

وکان ابوسفیان قد ذھب الی الطائف فی بعض حاجاتہ فاصابھا بنوع من انکحۃ الجاھلیۃ وولدت زیاداً ونسبتہ الی ابی سفیان واقرلھا بہا الا انہ کان یخفیہ[1]

ترجمہ: ابوسفیانؓ اپنے کسی کام کے لیے طائف گئے تھے کہ وہاں آپ نے سمیّہ سے جاہلیت کا ایک نکاح کیا اور اس سے زیاد پیدا ہوا۔ اس عورت نے اس کا نسب ابوسفیانؓ کا بیان کیا۔ ابوسفیانؓ نے بھی اس کا اس کے لیے اقرار کیا۔ ہاں ابوسفیانؓ اس نکاح کو مخفی رکھتے رہے۔

یہ بات مخفی تو رہی لیکن کچھ جاننے والے لوگ موجود تھے اور ابوسفیانؓ کئی لوگوں کے سامنے اس کا اقرار کر چکے تھے اور زیاد اپنے اعلیٰ دماغ اور سیاسی تدبّر کے باعث ایسا بھی نہ تھا کہ اسے نظرانداز کیا جا سکے۔ یہ غلط ہے کہ وہ سوسائٹی میں کوئی عزت نہ رکھتا تھا۔ ایسا ہوتا تو حضرت علی المرتضیٰؓ اسے اپنے ہاں کوئی عزت اور مقام نہ دیتے۔ آپ نے اسے اپنے دور میں فارس کا والی بنایا[2] اور اس نے عہدِ علوی میں آپ کے ساتھ مل کر بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیئے۔

---

[1] تاریخ ابن خلدون جلد ۳ صفحہ ۱۴ [2] اخبار الطوال للدینوری صفحہ ۲۱۹

زیاد صحابی نہ تھا تابعی تھا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں :۔

قال العجلی تابعی ولم یکن یتھم بالکذب۔[1]

ترجمہ عجلی کی رائے سے وہ تابعی تھا لیکن اس پر جھوٹ بولنے کا الزام نہیں ہے۔

اور یہ بھی لکھا ہے :۔

وکان یضرب به المثل فی حسن السیاسة ووفور العقل وحسن الضبط لما یتولاہ۔[2]

ترجمہ۔ زیاد حسنِ سیاست، عقل کی پختگی اور اپنی ذمہ داریوں کے نظم وضبط میں اس مقام پر تھا کہ اسے ان ابواب میں مثل کے طور پر پیش کرتے تھے وہ ضرب المثل شخصیت کا مالک تھا۔

حضرت ابن عباسؓ اس کے بہت معتقد تھے۔ جب فارس اور کرمان کے علاقوں میں شورشیں اٹھیں تو حضرت ابن عباسؓ نے حضرت علیؓ کو مشورہ دیا کہ زیاد بہت پختہ رائے ہے اور سیاسی امور کو جانتا ہے۔ اس صورت حال سے نبٹنے کے لیے اسے کہیں حضرت علیؓ نے ان کا یہ مشورہ قبول کیا اور زیاد نے ان علاقوں میں امن وامان بحال کر دیا۔ یہ ۳۹ھ کے وقائع میں سے ہے۔ حضرت ابو موسےٰ اشعری، مغیرہ بن شعبہ اور عبداللہ بن عامر کے ہاں اس نے مدتوں سیکرٹری کے فرائض سرانجام دیے۔[3] اب اگر حضرت معاویہؓ نے اسے اپنے ساتھ لے لیا تو کون سا آسمان ٹوٹ پڑا کہ پھر سے اس کے نسب پر بحثیں شروع ہو گئیں۔

حضرت معاویہؓ نے اس وقت تک زیاد کو اپنے ساتھ نہیں ملایا جب تک زیاد بن اسماء حرمازی، مالک بن ربیعہ سلولی، منذر بن زبیر اور کئی دوسرے لوگوں نے یہ کوئی گواہی نہ دی کہ یہ واقعی ابوسفیان کا بیٹا ہے جو جاہلیت کے ایک نکاح سے پیدا ہوا ہے۔

منذر بن زبیر کہتے ہیں کہ میں نے یہ بات خود حضرت علیؓ سے سنی تھی۔ آپ کہتے تھے میں گواہی دیتا ہوں کہ ابوسفیان نے زیاد کے اپنا بیٹا ہونے کا اقرار کیا تھا۔

حضرت معاویہؓ فقیہ تھے۔ وہ الولد للفراش و للعاھر الحجر کو عہد اسلامی سے خاص سمجھتے تھے۔ عہد جاہلیت کو وہ اس سے مستثنیٰ کرتے خصوصاً جب کہ پہلا شوہر بچے کا مدعی نہ ہو۔ اسلامی فیصلوں میں آپ نے خود اس حدیث پر عمل کیا ہے اور کرایا ہے۔

ایک شخص نصر بن حجاج السلمی نے حضرت خالد بن ولیدؓ کے بیٹے عبدالرحمٰن کے خلاف مقدمہ دائر کیا۔ دعوےٰ عبداللہ بن رباح مولیٰ عبدالرحمٰن بن خالد بن ولیدؓ کے بارے میں تھا۔ نصر بن حجاج کا کہنا تھا کہ بیٹا میرا ہے اور عبدالرحمٰن نے کہا یہ میرے غلام کے فراش پر پیدا ہوا ہے اور میرا غلام ہے۔ حضرت امیر معاویہؓ نے عبدالرحمٰن کے حق میں فیصلہ

---

[1] الاصابہ جلد ۱ ص ۵۶۳ [2] ایضاً ص ۵۶۳ [3] دیکھیے تہذیب الاسماء للنووی جلد ۱ ص ۱۹۹ المعارف لابن قتیبہ ص ۱۵۱

دیا۔ نصر بن حجاج نے کہا پھر زیاد کے حق میں آپ نے کیسے فیصلہ کر لیا تھا۔ آپ نے فرمایا :۔

قضاء رسول اللہ خیر من قضاء معاویہ۔[1]

ترجمہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ معاویہ کے فیصلے سے بدرجہا بہتر ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کو اس مسئلے (الولد للفراش) سے انکار نہ تھا۔ زیاد چونکہ ایک طرح کے جاہلی نکاح سے پیدا ہوا تھا اور کوئی دوسرا باپ اس کا مدعی نہ تھا اس لیے اس مسئلے کی نوعیت اور تھی۔ آپ نے لمبی بحث کا دروازہ بند کرتے ہوئے فرما دیا کہ تم میرے اس فیصلے کو چھوڑ دو حضورؐ کے فیصلے کو لو۔ یہ بات الزاماً تھی کہ اگر میرا فیصلہ حضورؐ کے فیصلے کے خلاف ہے تو اسے چھوڑنا چاہیئے نہ کہ حدیث رسول کو چھوڑو ——— اور وہ خود استلحاق زیاد کو بوجوہ مذکورہ حدیث مذکور کے خلاف نہ سمجھتے تھے۔ آپ فقیہ تھے اور یہ آپ کا اپنا اجتہاد تھا، اسے بدعت نہیں کہہ سکتے۔ بدعت کی حد صحابہؓ کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔ حضرت معاویہؓ خود کہتے ہیں :۔

وقال (معاویه) انی لا اتکثر بزیاد من قلة ولا اتعزز به من ذلة ولکن عرفت حق اللہ فوضعته موضعه۔[2]

ترجمہ۔ اور آپ نے کہا میں بوجہ قلت کے زیاد کا اضافہ نہیں چاہتا نہ کسی ذلت کے باعث کسی اور عزت کا طلبگار ہوں میں نے الٰہی حق پہچانا ہے اور میں نے اسے حق پہ جگہ دی ہے۔

زیاد نے بھی اس موقعہ پر کہا :۔

ان کان ما شھد الشھود به حقاً فالحمد للہ وان یکن باطلاً فقد جعلتھم بینی وبین اللہ۔[3]

ترجمہ۔ گواہوں نے جو گواہی دی ہے وہ اگر سچ ہے تو میں اس پر الحمد للہ کہتا ہوں اور اگر یہ گواہی غلط ہے تو میں اپنے اور خدا کے مابین ان گواہوں کو ڈھال بناتا ہوں۔

یعنی اس کی (خدا کی) پکڑ آئے تو ان گواہوں پر آئے۔ اس سے زیادہ اور کیا خشیتِ الٰہی کا عنوان ہو سکتا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: حضور رسول برحق کے تین صحابہ حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابو الدرداءؓ اور عبدالرحمٰن بن غنم اشعریؓ امیر معاویہؓ کو خلافت کا اہل نہیں سمجھتے تھے جب پہلے دونوں حضرات امیر معاویہؓ کی طرف سے بطور قاصد حضرت علیؓ کے پاس گئے اور واپسی پر راستے میں بمقام حمص حضرت عبدالرحمٰن بن غنمؓ سے ملے تو حضرت عبدالرحمٰنؓ نے کہا کہ معاویہؓ طلقاء میں سے ہیں۔ ھو من الطلقاء الذین لا تجوز لھم الخلافة۔ اس پر دونوں حضرات نے اپنی رائے حضرت

---

[1] مجمع الزوائد للہیثمی جلد ۵ ص ۱۴ فتح الباری جلد ۱۲ ص ۳۲ [2] تاریخ ابن خلدون جلد ۳ ص ۱۶ ابن جریر طبری جلد ۶ ص ۱۲۳ [3] الاصابہ جلد ۱ ص ۵۶۳

عبدالرحمٰن بن غنم اشعریؓ کے ساتھ کرلی. اب سوال یہ ہے کہ حضرت امام حسنؓ نے خلافت امیر معاویہؓ کے سپرد کر کے حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابوالدرداءؓ اور حضرت عبدالرحمٰن اشعریؓ کی اس رائے سے کیوں اختلاف کیا. خلافت اگر امیر معاویہؓ کو شرعاً نہیں دی جاسکتی تھی تو حضرت حسنؓ نے اس کے خلاف کیوں کیا اور اگر انہیں خلیفہ بنانا جائز تھا تو حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابوالدرداءؓ نے کیسے تسلیم کرلیا کہ خلافت طلقاء کو نہیں مل سکتی ؟

سائل سلیم الرحمٰن خان گڑھ

جواب : حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابوالدرداءؓ کی حضرت عبدالرحمٰن بن غنمؓ سے یہ ملاقات بے شک بعض مؤرخین نے نقل کی ہے لیکن یہ صحیح نہیں عویمر بن عامر ابوالدرداءؓ کا اس سے بہت پہلے دورِ عثمانی میں انتقال ہوچکا تھا. آپ نے حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے اختلاف کا دور نہیں پایا. حافظ ابن عبدالبر الاستیعاب میں لکھتے ہیں کہ گو بعض اہل اخبار نے کہا ہے کہ حضرت ابوالدرداءؓ جنگ صفین کے بعد فوت ہوئے. لیکن صحیح یہ ہے کہ آپ نے سیدنا حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں وفات پائی.

والاکثر والاشہر والاصح عند اہل الحدیث انہ توفی فی خلافۃ عثمان بعد ان ولاہ معاویۃ قضاء دمشق.[1]

ترجمہ. اکثر اور زیادہ مشہور اور زیادہ صحیح بات محدثین کے نزدیک یہ ہے کہ آپ نے خلافتِ عثمانی میں وفات پائی بعد اس کے کہ انہیں معاویہؓ نے دمشق میں قاضی مقرر کیا ہوا تھا.

ابن اثیر جزری بھی لکھتے ہیں :-

ان ابا الدرداء تقدمت وفاتہ عن الوقت الذی بویع فیہ علی فی اصح الاقوال.[2]

ترجمہ. زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ ابوالدرداءؓ کا انتقال اس سے پہلے ہوچکا تھا جب حضرت علیؓ کے لیے بیعت خلافت لی گئی تھی.

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی تہذیب التہذیب جلد ۸ ص۱۷۶ پر عویمر بن عامر ابوالدرداءؓ کے ترجمہ میں آپ کا سنِ وفات ۳۲ ھ لکھا ہے. سو یہ قصہ ہی غلط ہے کہ ان تین صحابہؓ نے حضرت معاویہؓ کو خلافت کے لائق نہیں سمجھا تھا. اس مسئلے میں حضرت حسنؓ کی رائے بالکل صحیح ہے اور لسانِ رسالت سے بھی اس کی تائید موجود ہے. آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ میرے اس بیٹے حسن کے ذریعہ میری اس امت کے دو عظیم گروہوں میں صلح کرائے گا. سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی اس مسئلہ میں حضرت حسنؓ کے ساتھ تھے. سو حضرت معاویہؓ پہ اس مفروضہ واقعہ سے کسی قسم کا اعتراض کرنا ہرگز درست نہیں ہے.

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ

---

[1] الاستیعاب جلد ۳ ص۱۷ [2] اسد الغابہ جلد ۴ ص۳۱۹

سوال : حضرت معاویہؓ حضورؐ کے کب کاتبِ وحی رہے. وہ فتح مکہ کے موقع پر یا اس سے کچھ پہلے اسلام لائے. اس کے بعد جلد ہی حضورؐ کی وفات ہوگئی. آپ حضورؐ کے کب کاتبِ وحی رہے ؟ آپ جب مدینہ آئے ہی نہیں تو کاتبِ وحی کیسے ہوگئے ؟ سائل محمد طفیل از کامونکی گوجرانوالہ

جواب : حافظ ابن حزم اندلسی (۴۵۷ ھ) لکھتے ہیں :-

کان زید بن ثابت من الزم الناس لذلک ثم تلاہ معاویۃ بعد الفتح فکانا ملازمین للکتابۃ بین یدیہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الوحی وغیر ذلک لا عمل لہم غیر ذلک.[1]

ترجمہ. زید ثابتؓ کتابتِ وحی پر سب سے زیادہ ذمہ داری کے ساتھ لگے رہے. فتح مکہ کے بعد پھر معاویہؓ نے بھی اس کام کو لازمی درجے میں اختیار کرلیا. یہ دونوں حضرات حضور کے سامنے ہر وقت موجود رہے کہ کتابتِ وحی ہو یا حضورؐ کی کوئی بات یہ دونوں لکھ لیا کریں. اس کے علاوہ ان کا کوئی اور کام نہ تھا.

یہ صحیح نہیں کہ حضرت معاویہؓ فتح مکہ کے بعد مکہ ہی رہے تھے مدینہ نہ آئے تھے. آپ کا مدینہ منورہ آنا اور حضورؐ کے پاس ہمہ وقت رہنا اور کاتبِ وحی کی یہ خدمات سرانجام دینا ایک ناقابلِ انکار تاریخی حقیقت ہے اور حضرت معاویہؓ کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز.

احقر خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال : بنوامیہ ماسوائے حضرت عثمانؓ کے تاریخ کے پہلو سے متاخرین میں سے ہیں اور بنو ہاشم ان کی نسبت سے متقدم فی الاسلام ہیں. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنوامیہ کو انتم الطلقاء میں داخل فرمایا. کیا بنو ہاشم میں سے بھی کوئی اس صف میں آتا ہے ؟

جواب : یہ واقعہ ۸ھ کا ہے. آپ نے اس موقعہ پر بنوامیہ کو نہیں پورے قریش کو مخاطب کرکے کہا تھا کہ تم سب کو معافی دے دی گئی تم آزاد ہو. طلقاء کا معنی یہ ہے کہ اب تم پر کوئی گرفت نہیں تم کھلے طور پر آزاد ہو. آپ نے اس خطاب میں بار بار یامعشر قریش فرمایا.[2]

ابن خلدون لکھتا ہے :-

ثم من علی قریش بعد ان ملکھم یومئذ وقال اذھبوا فانتم الطلقاء واسلموا.[3]

ترجمہ. پھر آپ نے قریش پر احسان کیا کہ ان پر اس دن قابو پانے کے بعد انہیں کہا تم جاؤ تم آزاد ہو اور مسلمان ہو کر رہو.

---

[1] جوامع السیر لابن حزم الاندلسی ص۲۷ [2] سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص۴۱۲ البدایہ جلد ۴ ص۳۰۱ [3] تاریخ ابن خلدون جلد ۲ ص۵

یہ خطاب خود بتلا رہا ہے طلقاء صرف بنو امیہ نہ تھے۔ مولد کعبہ حکیم بن حزامؓ، ابو سفیانؓ بن الحارث بن عبد المطلب ہاشمی اور عکرمہؓ بن ابی جہل بھی انہی میں تھے۔ سیدنا حضرت علی المرتضیٰؓ کی بہن ام ہانی بھی اسی موقع پہ اسلام لائی تھیں اور طلقاء میں سے تھیں[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد طلقاء کرام کو بھی بڑے بڑے عہدے دیئے۔ عتاب بن اسیدؓ کو مکہ کا والی بنایا۔ عثمان بن طلحہؓ کو کعبہ کا کلید بردار رہنے دیا۔ ابو سفیانؓ بن حرب کو نجران کا عامل بنایا۔ ان کے بیٹے یزید بن ابی سفیانؓ کو علاقہ تیما کا والی بنایا۔ حضرت معاویہؓ کو کتابت وحی کی ذمہ داری سونپی۔ یہ صورت حال پتہ دیتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم تھا کہ یہ لوگ استسلام (اوپرسے ماتحتی قبول کرکے) سے مسلمانوں میں نہیں آئے اسلام میں داخل ہو کر جھکے ہیں۔ آپ کو قرآن کریم کی اس خبر پہ کہ فتح مکہ کے دن لوگ اسلام میں داخل ہوں گے پورا پورا الیقین تھا۔ قرآن کریم کی بشارت ہر وقت آپ کے سامنے تھی:۔

یدخلون فی دین اللہ افواجًا ۝ (پ۳۰ سورۃ النصر)

ترجمہ۔ لوگ فتح مکہ پہ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہوں گے۔

واللہ اعلم بالصواب۔ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: معاویہ کا لفظی معنی کیا ہے؟ صحابہ میں معاویہ بن ابی سفیان کے علاوہ اور کسی صحابی کا بھی یہ نام تھا؟ امیر معاویہؓ اموی تھے کیا کسی ہاشمی نے بھی یہ نام رکھا ہے؟

جواب: عویٰ کے معنی آواز دینے کے ہیں۔ عاواھم کے معنی ہیں اس نے لوگوں کو آواز دی[2]۔ سو معاویہ کے معنی ہیں لوگوں کو آواز دینے والا۔ اس لفظ کے آخر میں تا تانیث کے لیے نہیں۔ اسے اسی طرح سمجھیں جیسے عکرمہ۔ طلحہ۔ ساریہ۔ حمزہ وغیرہ۔ جانوروں کے لیے یہ لفظ استعمال ہو تو مادہ سگ کو کہتے ہیں۔ لیکن یہ استعمال انسانوں پہ منطبق نہیں کیا جا سکتا جیسے جعفر کا لفظ جب جانوروں کے لیے آئے تو اس کے معنی شتر اونٹ کے ہیں۔ لیکن امام جعفر صادقؒ کے معنی اس طرح نہیں کیئے جا سکتے۔

اَعلام میں ابتدائی لفظی معنی مراد نہیں لیے جاتے۔ خصوصًا ان اعلام میں جو منقول عنہ کے درجہ میں ہوں۔ اگر اس نام میں کوئی برائی ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس نام کو ضرور بدل دیتے۔ حضورؐ نے خود یہ نام لے کر حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ کے لیے یہ دُعا فرمائی ہے:۔

اللّٰھم اجعل معاویۃ ھادیًا و مھدیًا۔

---

[1] دیکھیئے تاریخ الخمیس جلد ۲ صفحہ ۱۶۳ [2] دیکھئے قاموس مادہ عوی صفحہ ۸۹۶

۲۔ حضورؐ کے صحابہؓ میں معاویہؓ بن ثور بن عبادہ اور معاویہؓ بن حارث بن مطلب بن عبد مناف بھی تھے[1] حضورؐ نے ان میں سے بھی کسی کا نام نہیں بدلا۔

۳۔ حضرت عبد اللہ بن جعفر طیارؓ حضرت علی المرتضیٰؓ کے بھتیجے تھے انہوں نے اپنے بیٹے کا نام معاویہ رکھا تھا[2]۔
حضرت علی المرتضیٰؓ کے شاگردوں میں ایک شخص معاویہ بن صعصعہ تھا۔ حضرت علی المرتضیٰؓ نے اس کا نام نہیں بدلا۔
حضرت امام جعفر صادقؒ کے شاگردوں میں معاویہ بن سعید الکندی اور معاویہ بن سلمہ النصری[3] سے کون شخص واقف نہیں ہے۔

۴۔ حضرت علی المرتضیٰؓ کے ایک داماد کا نام معاویہ تھا۔ آپ کی صاحبزادی رملہ پہلے ابو الہیاج کے نکاح میں تھیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کا نکاح مروان بن حکم کے بیٹے مروان سے ہوا تھا۔

سوال: کیا یہ صحیح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ معاویہ کو کسی کام کے لیے بُلایا آپ نہ گئے تو حضورؐ نے پھر دوسری بار بُلایا، آپ پھر بھی نہ آئے۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لا اشبع اللہ بطنہ۔ خدا کرے اس کا پیٹ نہ بھرے؟

۱۔ کیا یہ روایت ثقہ راویوں سے مروی ہے یا اس میں کوئی کمزور راوی ہے۔ ۲۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو جواب دیں۔ حضرت امیر معاویہؓ پہلے آپ کے حکم پر کیوں نہ آئے۔ ۳۔ جس طرح آپ نے یہاں معاویہ کے لیے یہ جملہ کہا۔ اس طرح کا کوئی اور جملہ آپ نے کسی اور صحابی کے لیے کہا ہو۔ ۴۔ اگر یہ روایت ضعیف ہے تو صحیح واقعہ کیا ہے اور کہاں لکھا ہے؟

جواب: روایت ضعیف ہے۔ اس کے راویوں میں ایک راوی ابو حمزہ قصاب ہے اس کا نام عمران بن ابی عطا تھا۔ میزان الاعتدال میں اسے ضعیف لکھا ہے[4]۔ ابو زرعہ نے اسے لین الحدیث کہتے ہیں۔

پھر اس روایت میں یہ کہیں نہیں کہ بُلانے والے (ابن عباسؓ) نے امیر معاویہؓ کو اطلاع دی ہو کہ حضورؐ آپ کو بلا رہے ہیں۔ اور پھر معاویہؓ نہ آئے ہوں۔ جب آپ کو بُلانے والے نے اطلاع ہی نہیں دی تو آپ کے ذمہ نہ آنے کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ کسی روایت میں یہ الفاظ نہیں ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے آپ کو کہا ہو کہ حضورؐ آپ کو بُلا رہے ہیں۔ وہ خود ہی انہیں کھانا کھاتے دیکھ کر واپس لوٹتے رہے اور حضورؐ یہ سمجھے کہ معاویہؓ میرے بلانے کے باوجود نہیں آ رہا۔ اس پر آپ نے (بشرطیکہ روایت صحیح ہو) یہ جملہ کہا۔ علم غیب خاصہ باری تعالیٰ ہے

---

[1] الاصابہ لابن حجر جلد ۳ صفحہ ۴۱۱ تاج العروس شرح قاموس جلد ۱۰ صفحہ ۲۵۹ [2] تنقیح المقال جلد ۳ صفحہ ۲۲۲ [3] ایضًا صفحہ ۲۲۴
[4] میزان الاعتدال جلد ۳ صفحہ ۲۳۹

حضرت ابن عباسؓ نے آپ کو نہ بتلایا کہ میں نے معاویہؓ کو آپ کو بلانے کی اطلاع نہیں دی صرف دیکھ کر آ گیا ہوں۔

اس صورت میں حضورؐ نے اگر ایسا کہا بھی ہو تو یہ ایک محض غلط فہمی پر مبنی ہوگا۔ یہ اسی طرح ہے کہ حضورؐ کسی کو سزا دیں اور وہ اس کا مستحق نہ ہو تو حضورؐ کا وہ فعل اس کے حق میں ایک دعائے رحمت اور منقبت بن جاتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

انی اشترطت علی ربی فقلت انما انا بشر ارضی کما یرضی البشر واغضب کما یغضب البشر فایما احد دعوت علیہ من امتی بدعوۃ لیس لہا باھل ان تجعلہا لہ طھورًا وزکاۃ و قربۃ تقربہ بہا منہ یوم القیمۃ[1]

ترجمہ۔ میں نے اپنے رب سے عہد لے رکھا ہے۔ میں نے کہا میں بھی تو انسان ہوں خوشی اور ناراضگی دونوں حالتوں سے گزرتا ہوں جیسے انسان ان دونوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ سو اپنی امت میں سے جس کسی کے خلاف میں نے دعا کی ہو اور وہ اس کا مستحق نہ ہو تو اے اللہ تو اسے اس کے لیے سبب طہارت پاکیزگی اور موجب قرب بنا دے جس سے تو اسے قیامت کے دن متقرب فرمائے۔

اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد امام مسلم نے ابو حمزہ القصاب کی وہ روایت درج کی ہے جو امیر معاویہؓ کے بارے میں ہے کہ خدا اس کا پیٹ نہ بھرے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ امام مسلم کے نزدیک حضرت امیر معاویہؓ اس دعا کے مستحق نہ تھے لیکن جب آپ نے لا اشبع اللہ بطنہ کہہ دیا تو یہ جملہ آپ کے حق میں اب کلمۂ دعا، اور کلمۂ رحمت ہو گیا۔ امام نووی لکھتے ہیں :۔

وقد فھم مسلم من ھٰذا الحدیث ان معاویۃ لم یکن مستحقا للدعاء علیہ فلھذا ادخلہ فی ھٰذا الباب وجعلہ غیرہ من مناقب معاویۃ لانہ فی الحقیقۃ یصیر دعاء لہ۔[2]

ترجمہ۔ امام مسلم اس حدیث سے یہی سمجھتے ہیں کہ معاویہ اس دعا کے مستحق نہ تھے۔ سو آپ اس روایت کو اس باب میں لائے ہیں اور دوسروں نے اسے مناقب معاویہ میں لکھا ہے کیونکہ آپ کا یہ فرمانا اب حقیقت میں معاویہ کے لیے دعائے قرب بن گیا۔

امام نووی نے صحیح مسلم میں اس حدیث پر یہ باب باندھا ہے :۔

باب من لعنہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم او سبہ او دعا علیہ ولیس ھو اھلا لذلک کان لہ زکوٰۃ واجرا ورحمۃ۔[3]

---

[1] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۳۲۴ [2] شرح نووی صفحہ ۳۲۵ [3] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۳۲۳

ترجمہ۔ یہ باب اس کے متعلق ہے جس پر حضورؐ نے زجر کی ہو یا اسے برا کہا یا اس کے خلاف دعا کی ہو اور وہ اس کا اہل نہ ہو تو آپ کا اس کے خلاف ایسی بات فرمانا اس کے لیے گناہوں کے اترنے، اجر پانے اور رحمت کا مستحق ہونے کا سبب بن جاتا ہے۔

عربوں کا اسلوب ہے کہ جب وہ کوئی خلاف توقع عمل دیکھیں تو بات کا رخ موڑنے کے لیے کوئی ایک آدھ سخت جملہ بول جاتے ہیں نہ اس کا مدلول لفظی مراد ہوتا ہے نہ اس کی تمنا ــــــ صرف پہلی بات کی اہمیت پیش نظر ہوتی ہے۔ حضرت معاذؓ نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کی :۔

انا لمواخذون بما نتکلم بہ۔

ترجمہ۔ جو کچھ ہم بولتے ہیں کیا ہم اس پر پکڑے جائیں گے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

ثکلتک امک یا معاذ وھل یکب الناس فی النار علی وجوھھم او علی مناخرھم الا حصائد السنتھم[1]

ترجمہ۔ تیری ماں تجھ پر بین کرے اے معاذ! کیا جہنم میں لوگ منہ کے بل یا نتھنوں کے رخ الٹائے جائیں گے۔ ہاں مگر اپنی زبانوں کی کاٹ سے (یعنی زبان کو سنبھال کر رکھنا از حد ضروری ہے)۔

ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ طلب ہرگز نہ تھی کہ حضرت معاذؓ کی والدہ اس پر روئے یا یہ کہ وہ فوت ہوں۔ اس قسم کی بات میں اس کے واقع ہونے کی دعا نہیں ہوتی۔ کبھی کہہ دیتے ہیں۔ تربت یداہ (اس کے ہاتھ سوکھ جائیں) اسی طرح لا اشبع اللہ بطنہ (اس کا پیٹ نہ بھرے) کے الفاظ کو سمجھ لیجیے۔ پھر بھی الفاظ میں کچھ سختی ہو تو حضورؐ کے فرمان کے مطابق یہ الفاظ اس شخص کے لیے الٹا دعا اور اجر و رحمت بن جاتے ہیں ایسے کلمات اسلوب عرب میں بغیر قصد کے صادر ہوتے ہیں۔

عمدۃ المحدثین ملا علی قاری فرماتے ہیں :۔

ھذا دعاء لا یراد وقوعہ بل عادۃ العرب التکلم بمثلہ علی سبیل التلطف .... لا للقصد الی وقوع مدلولہ الاصلی والدلالۃ علی التماسہ۔[2]

ترجمہ۔ یہ ایسی دعا ہے جس کا وقوع مراد نہیں ہوتا۔ عربوں کی عادت ہے وہ ایسی بات از راہ تلطف کہتے ہیں۔ اس قصد سے نہیں کہ اس کا مدلول اصلی واقع ہو نہ ایسا واقع ہونا ان کی تمنا ہوتی ہے۔

---

[1] رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ مشکوٰۃ صفحہ ۱۴۱ [2] مرقات جلد ۵ صفحہ ۳۷۲

سو حق یہ ہے کہ ایسے الفاظ غیر ارادی کلمات کے زمرہ میں آتے ہیں اور یہ عربوں کا اسلوب بلاغت ہے کہ وہ ایسے موقعوں پر ایسی بات کہہ جاتے ہیں۔ روٹی کھانا یا آہستہ آہستہ کھانا شرعاً ممنوع نہیں۔ فعل مباح پہ بددعا کسی ضابطہ اخلاق میں نہیں آتی۔ سو اسے سنجیدگی پر محمول کرنے بجائے عرب اسلوب پر محمول کرنا ہی بہتر ہے۔ ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے موقع پر حضرت معاویہؓ کے پیٹ کے لیے دُعا نہ کرتے۔ ایک دفعہ حضرت معاویہؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سوار تھے اور آپ کا پیٹ حضورؐ کے بدن پاک سے لگ رہا تھا۔ آپ نے دعا فرمائی۔ اے اللہ! معاویہؓ کے پیٹ کو علم اور حلم سے بھرپور فرما۔ امام بخاری فرماتے ہیں :۔

کان معاویۃ ردف النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا معاویۃ ما یلینی منک قال بطنی قال اللّٰھم املاہ علماً وحلماً۔[1]

اب آپ ہی انصاف کریں کہ اس روایت کے ہوتے ہوئے لا اشبع اللہ بطنہ کو اس کے ظاہر الفاظ پر کیسے محمول کیا جا سکتا ہے۔ پھر جب دیکھا جائے کہ اس روایت کے ان طرق میں جن میں ابوحمزہ القصاب نہیں ہے۔ یہ جملہ سرے سے ہی نہیں۔ تو بات یہاں آکر ٹھہرتی ہے کہ کہیں یہ اس راوی کی زیادتی ہی تو نہیں۔ اس جملے کے بغیر یہ روایت مسند امام احمد جلد اوّل ص۲۹۱ میں موجود ہے۔

اس روایت پر شیعہ اعتراض کرتے ہیں کہ علم کبھی پیٹ میں بھی ہوا ہے۔ اس کا محل تو دل و دماغ ہیں پیٹ نہیں حضورؐ نے یہ دُعا کیسے کی ہو گی۔ اے اللہ! معاویہؓ کے پیٹ کو علم سے بھر دے۔

ہم عرض کریں گے یہ اطلاق بطور محاورے کے ہے۔ کیا شیعہ علماء نہیں جانتے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت علی المرتضیٰؓ سے کرنے کا ارادہ فرمایا تو حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے شکایت کی، حضورؐ علیؓ کا پیٹ بڑا ہے۔ معلوم ہے آپ نے اس کا کیا جواب دیا؟ یہ ملا باقر مجلسی سے پوچھیے۔ وہ کہتا ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا۔ میری پیاری بیٹی! کیا تو نہیں جانتی کہ وہ علم سے بھرا ہوا ہے۔

اما علمت انہ قد ملئ علماً۔[2]

سو اگر علیؓ کا پیٹ علم سے بھرا ہوا تھا تو کیا حضرت معاویہؓ کا پیٹ علم سے نہیں بھر سکتا۔ کچھ تو انصاف کیجیے۔ یہ دونوں بزرگ حضورؐ کے صحابی تھے۔ یہ اس اعتراض کا جواب ہے جو شیعہ امام بخاریؒ کی اس روایت پر کرتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم واحکم فی کل باب۔

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ

---

[1] تاریخ کبیر امام بخاری جلد ۴ ص۱۸ [2] بحار الانوار جلد ۱۰ ص۳۲

سوال : امت کے لیے صحابہؓ کا فہم قطعی درجے میں حجت ہے یا ترجیحی درجے میں۔ فقہاء نے احکام کے لیے جو اصطلاحات قائم کی ہیں ان سے دین کا ہر مسئلہ پوری طرح سمجھ میں آ جاتا ہے۔ اصطلاحات کے قائم ہونے سے پہلے امت کے لیے بنیاد یقین کیا تھی؟

جواب : صحابہ کرامؓ میں اگر آپس میں اختلاف ہو تو آپ جس کی بات چاہیں لے لیں اور ان کے مقابل اپنی بات نہ چلائیں اور اگر صحابہ میں اس موضوع پر قول ثانی موجود نہ ہو تو پھر ہمارے نزدیک فہم صحابہ قطعی درجے میں واجب القبول ہو گا۔ حافظ ابن ہمام اسکندری لکھتے ہیں :۔

لنا القطع بفہم الصحابۃ قبل حدوث الاصطلاحات۔[1]

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال : آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نصاریٰ نجران کو مباہلے کا چیلنج دیا تھا انہوں نے اسے منظور نہ کیا نہ مباہلہ ہوا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی امتی بھی کسی کو مباہلے کا چیلنج دے سکتا ہے؟ اور کیا یہ چیلنج کسی مسلمان کو بھی دیا جا سکتا ہے یا صرف غیر مسلموں کے لیے ہی ہے؟

جواب : ہاں امتی بھی اگر کسی موضوع پر اپنے آپ کو یقین پر تصور کرے اور دوسرے کے بارے میں یقینی طور پر معلوم ہو کہ وہ حقیقت سمجھ رہا ہے مگر ضد کر رہا ہے تو پھر ایسے شخص سے بھی مباہلہ ہو سکتا ہے حافظ ابن کثیرؒ (۷۷۴ھ) آیت تطہیر کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

وقال عکرمۃ من شاء باھلتہ انہ نزلت فی شان نساء النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔[2]

ترجمہ۔ عکرمہ نے کہا یہ آیت حضورؐ کی ازواج کے حق میں نازل ہوئی ہے جو چاہے میں اس سے مباہلہ کرنے کو تیار ہوں۔

حافظ ابن ہمام اسکندری (۸۶۱ھ) التحریر میں ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں۔ آپ کا ترک عول پر دوسرے صحابہ حضرت علیؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ سے اختلاف چلا۔ آپ نے فرمایا :۔

من شاء باھلتہ ان اللہ تعالیٰ لم یجعل فی مال واحد نصفاً ونصفاً وثلثاً۔[3]

ترجمہ۔ جو چاہے میں اس سے مباہلہ کرنے کو تیار ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے کسی مال کے

---

[1] التحریر ص۱۶۵ مصر طبع ۱۳۵۱ھ [2] تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص۴۸۳ [3] التحریر ص۵۲۳ مصر

حصے یوں نہیں ٹھہرائے نصف اور تہائی۔

قرآن کریم میں حاملہ عورت کی عدت وضع حمل تک ہے۔ (دیکھئے پ۲۸ الطلاق آیت ۶) اور دوسری عورتیں جن کے خاوند فوت ہوجائیں ان کی عدت چار ماہ اور دس دن ہے۔ (دیکھئے پ۲ البقرہ آیت ۲۳۴)۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ان لوگوں کے خلاف جو کہتے تھے کہ حاملہ عورت جس کا خاوند فوت ہوجائے اس کی عدت وضع حمل اور چار ماہ دس دن میں سے جو زیادہ ہو اس کے مطابق ہوگی استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں ایسا نہیں سورۂ طلاق (سورۂ نساء صغریٰ) نے پہلا حکم (چار ماہ اور دس دن والا) اس کے حق میں (حاملہ کے حق میں) منسوخ کر دیا ہے۔ علامہ سرخسی (۴۹۰ھ) لکھتے ہیں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا میں اس پر مباہلہ کے لیے تیار ہوں:-

قال ابن مسعود رضی اللہ عنہ فی عدۃ المتوفی عنہا زوجہا اذا کانت حاملاً محتجاً به علی من یقول انہا تعتد بابعد الاجلین فانه قال من شاء باھلته ان سورۃ النساء القصریٰ (واولات الاحمال اجلھن) نزلت بعد سورۃ النساء الطولیٰ (یتربصن بانفسھن) فجعل المتاخر دلیل النسخ۔[1]

سورۃ النساء الطولیٰ سورۃ البقرہ کا ایک دوسرا نام ہے جیسے سورۃ الطلاق کو سورۃ النساء القصریٰ سے بھی موسوم کرتے ہیں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ضروری نہیں کہ پیغمبر ہی مباہلہ کی دعوت دے اُمتی بھی بنا بر یقین کامل اس کی دعوت دے سکتا ہے اور یہ دعوت مسلمانوں کو بھی دی جاسکتی ہے بشرطیکہ وہ بھی اپنے یقین اور قطعیت کے مدعی ہوں۔

مباہلے کا موقعہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نصاریٰ نجران سے پہلے مباحثہ کیا تھا پھر انہیں مباہلہ کا چیلنج دیا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مباہلہ میں وہی آئے جو پہلے مباحثہ میں آچکا ہو۔ جس شخص کو موضوع زیر بحث سے کبھی کوئی پالا نہ پڑا ہو، نہ کوئی مناسبت رہی ہو، نہ کبھی اس نے اس موضوع پہ مباحثہ کیا ہو اس کا مباہلہ کے میدان میں اُترنا ایک خود نمائی کے سوا کوئی درجہ نہیں رکھتا۔ صاحب واقعہ کسی کو اس قسم کا چیلنج دے یہ اور بات ہے۔ قرآن کریم میں پہلے مباحثہ کا ذکر ہے۔ پھر اس پر مباہلہ کی دعوت دی ہے۔

[1] اصول السرخسی صـ۲

ارشاد ہوتا ہے:-

فمن حاجك فيه من بعد ما جاءك من العلم فقل تعالوا... ثم نبتهل۔ (پ۳ المائدہ آیت ۶۱)

ترجمہ۔ سو پھر جو کوئی تجھ سے جھگڑا کرے اس میں بعد اس کے کہ آچکا تمہارے پاس علم تو آپ کہہ دیں آؤ بلا دیں ہم اپنے بیٹے ...... پھر ہم سب التجا کریں (اللہ سے) اور لعنت کریں ان پر جو جھوٹے ہیں۔

سوال، عربی زبان میں کذب کا معنی کیا ہے۔ اردو میں جسے جھوٹ کہتے ہیں کیا یہی اس کا معنی نہیں؟ کذب کیا ہمیشہ گناہ ہوتا ہے یا صرف جھوٹ بولنا گناہ ہے اور کذب کی کوئی دوسری نوع گناہ نہیں؟

جواب: عربی میں کذب صرف جھوٹ بولنے کے معنی میں نہیں کبھی حقیقت تک نہ پہنچنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص دُور سے دیکھ رہا ہے اور کہتا ہے وہاں پانی کا چشمہ ہے۔ قریب آکر پتہ لگتا ہے وہ پانی نہ تھا۔ وہ عربی میں کہتا ہے۔ کذب بصری (میری آنکھ نے خطا کی)۔ تو یہاں کذب جھوٹ کے معنی میں نہیں نہ یہ لفظ صدق کے مقابلے میں ہے۔ ارادۃً غلط بات کہنا یہ تعمد کذب ہے اور یہی صدق کے مقابلہ میں ہے۔ جب ارادہ جھوٹ کے مفہوم میں شرط ہے تو اگر کوئی متکلم کسی لفظ کے معنی بعید کا ارادہ کرلے اور بات اس طرح کرے کہ مخاطب اس کے معنی قریب مراد لے تو یہ بھی متکلم کے حق میں جھوٹ نہ رہے گا۔

کسی شخص نے کسی کے دروازے پر آواز دی۔ صاحب خانہ نے پاس بیٹھے دوستوں سے کہا فلاں آیا ہے۔ دروازہ کھولنے پر پتہ چلا کوئی اور آدمی تھا۔ گھر والے نے کہا۔ کذب سمعی (میرے کان نے خطا کی) تو یہاں کذب جھوٹ کے معنی میں نہ ہوگا۔

جب یہ خطا ہے جس میں قصد نہیں پایا گیا تو ظاہر ہے کہ یہ گناہ نہیں ہوگا اور اس پہ اللہ تعالیٰ مواخذہ نہ فرمائیں گے۔ علامہ خطابی (۳۸۸ھ) معالم السنن میں لکھتے ہیں:-

والعرب تضع الكذب موضع الخطاء فی کلامھا فتقول کذب سمعی وکذب بصری ای زلّ ولم یدرك ما رأی وما سمع۔[1]

ترجمہ۔ اور عرب اپنے کلام میں لفظ کذب خطا کے موقع پر بھی بولتے ہیں کہتے ہیں میرے کانوں نے غلط کہا اور میری آنکھوں نے کذب کہا یعنی لغزش ہوئی اور جو دیکھا اور سُنا اُسے پا نہ سکا۔

[1] معالم السنن جلد ۱ صـ۱۳۵

اور یہ بھی لکھتے ہیں :-

ولم یرد بہ تعمد الکذب الذی ھو ضد الصدق[1]

ترجمہ۔ اس میں ارادہ کذب نہیں پایا گیا جو صدق کی ضد ہے۔

نہایت افسوس ان لوگوں پر ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک ذومعنی بات کو جس میں آپ نے معنی بعید کا ارادہ کیا جھوٹ سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں حضرت ابراہیم نے تین جھوٹ بولے۔ استغفر اللہ کیا بھلا پیغمبر بھی جھوٹ بول سکتا ہے، ہرگز نہیں۔ یہ عبارت محض عربی نہ جاننے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ سو اگر کسی روایت میں یہ الفاظ نظر سے گزریں لم یکذب ابراھیم الا ثلثاً تو اس کا ترجمہ یہ نہ کریں کہ ابراہیمؑ نے تین جھوٹ بولے بلکہ یہ کہیں کہ ابراہیم نے خلاف واقعہ بات تین دفعہ کی (اور وہ بھی مخاطب کے فہم سے نہ کہ ان کی اپنی نیت خلاف واقعہ بات کی تھی۔

کتبہ : خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال : حضرت گنگوہی کی اس بات کو کہ یزید سانحہ کربلا کے باعث فاسق ہوا، بریلوی درست نہیں مانتے وہ اسے بر ملا کافر کہتے ہیں۔ حضرت گنگوہیؒ کی تائید میں کیا کچھ ایسی شہادتیں مل سکتی ہیں کہ صلحا و صحابہ نے بھی کبھی اسے کوئی عزت دی ہو۔ اذا مدح الفاسق اھتزلہ العرش۔ جب کسی کھلے فاسق کی عزت کی جائے تو اس سے عرش کریم کانپتا ہے؟ حضرت گنگوہیؒ نے اسے ولی عہد ہونے کے وقت فاسق نہیں مانا۔ اس کے لیے امیر معاویہؓ کے شخصی تقدس اور مقام صحابیت کے احترام کے سوا کیا کوئی اور دلیل پیش کی جا سکتی ہے؟ بینوا بسند الکتاب۔ سائل۔ زبیر احمد

الجواب ومن اللہ الصدق والصواب : حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں بلادِ روم فتح ہوئے اور مسلمان قسطنطنیہ تک جا پہنچے۔ حضرت امیر معاویہؓ نے یزید کو بحری جنگوں کے لیے خاص طور پر مشاق کرایا تھا۔ آپ نے ۴۹ھ میں بلادِ روم سے جو جنگ کی اس میں امیر لشکر یزید تھا ——— اس کے ساتھ اور کون کون تھے۔ اس کے لیے حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں :-

ومعہ جماعۃ من سادات الصحابۃ منھم ابن عمر وابن عباس وابن زبیر وابو ایوب الانصاری رضی اللہ تعالیٰ عنھم[1]

ترجمہ۔ اور اس کے ساتھ سادات صحابہ کی ایک بڑی جماعت تھی ان میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ بھی تھے عبد اللہ بن عباسؓ بھی تھے عبد اللہ بن زبیرؓ بھی تھے اور حضرت ابو ایوب انصاریؓ بھی تھے۔

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۸ صد ۳۲

اب آپ کیا گمان کر سکتے ہیں کہ اتنے جلیل القدر صحابہؓ کسی فاسق معلن کی قیادت میں جہاد جیسی عبادت میں نکلے ہوں اور پھر کیا حضرت معاویہؓ سے ممکن ہے کہ وہ ان اکابر اصحاب رسولؐ کو کسی فاسق کے جھنڈے تلے آنے کا مشورہ دیں۔ معرکہ قسطنطنیہ میں ہی حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا انتقال ہوا اور یزید نے ہی آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔

وھو الذی صلی علیہ۔[1]

اور یزید نے ہی (ابو ایوب انصاریؓ کی) نماز جنازہ پڑھائی۔

کیا اکابر صحابہ کی موجودگی میں ایک فاسق معلن ایک جلیل القدر صحابی کی نماز جنازہ پڑھا سکتا ہے؟ یہ اس وقت کی بات ہے جب یزید فاسق نہ تھا ——— کیا یہ حضرت گنگوہیؒ کے ارشاد کی تائید نہیں؟ پھر ہم اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ قسطنطنیہ کے اس غزوہ میں حضرت حسینؓ بھی یزید کی قیادت میں جہاد میں شامل تھے۔ ابن کثیر لکھتے ہیں :-

وقد کان فی الجیش الذین غزوا القسطنطینیۃ مع ابن معاویۃ یزید فی سنۃ احدی وخمسین[2]

ترجمہ۔ اور حضرت حسینؓ بھی ان لوگوں میں تھے جنہوں نے یزید کے ساتھ مل کر قسطنطنیہ کی جنگ لڑی۔ یہ ۵۱ھ کا واقعہ ہے۔

اب تابعینؒ کی شہادت بھی لیجئے۔ حضرت محمد بن حنفیہ جو حضرت علی المرتضیٰؓ کے صاحبزادے ہیں، اکابر تابعین میں سے ہیں۔ ان سے اس وقت کے لوگوں نے یزید کے خلاف کچھ باتیں کہیں۔ اس پر آپ نے کہا :-

ما رأیت منہ ما تذکرون وقد حضرتہ واقمت عندہ فرأیتہ مواظباً علی الصلوٰۃ متحریا للخیر یسأل عن الفقہ ملازما للسنۃ۔[3]

ترجمہ۔ میں نے تو اس میں وہ باتیں نہیں دیکھیں جو تم بتلاتے ہو، میں اس کے پاس کتنی دفعہ گیا ہوں اس کے پاس ٹھہرا بھی ہوں میں نے تو اس کو نماز کا پابند اور نیکیوں کا متلاشی ہی پایا ہے مسائل پوچھتا تھا اور سنت کو لازم پکڑتا تھا۔

اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اس وقت یزید کا فسق کسی درجے میں نمایاں نہ تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت معاویہؓ اسے کبھی بھی اپنا ولی عہد مقرر نہ کرتے اور یہ رائے کہ یزید سانحہ کربلا سے پہلے فاسق نہ تھا صرف

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۸ صد ۵۸ [2] ایضاً صد ۱۵۱ [3] ایضاً صد ۲۳۳

حضرت گنگوہیؒ کی نہیں دوسرے اکابر علمائے اہلسنت کی بھی یہی رائے ہے۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بھی لکھتے ہیں:۔

وقتیکہ امیر معاویہؓ یزید را ولی عہد خود کردند فاسق معلن نبود، اگر چیزے کہ کردہ باشد در پردہ باشد کہ امیر معاویہؓ را ازاں خبر نبود۔ علاوہ ازیں حسن تدبیر در جہاد آنچہ کہ از و مشہود شد معروف است [1]

ترجمہ: جس وقت امیر معاویہؓ نے یزید کو اپنا ولی عہد کیا اس وقت وہ فاسق معلن نہ تھا اگر اس نے فسق کا ارتکاب کیا بھی ہو تو پردے میں کیا ہوگا۔ امیر معاویہؓ کو اس کی خبر نہ ہو گی اس کے علاوہ جہاد میں حسنِ تدبیر جو اس سے دیکھنے میں آئی اپنی جگہ معروف ہے۔

حضرت امیر معاویہؓ مجتہد صحابہ میں سے تھے۔ آپ کا خلافت کے باب میں مسلک یہ تھا کہ جو انتظام سلطنت بہتر کر سکے اور جنگوں کو صحیح ترتیب دے سکے اسے ہی آگے کرنا چاہیئے اگر زہد و تقوے اور عزائم الامور میں اور حضراتِ افاضل موجود ہوں پھر بھی اگر کوئی شخص آپ پر اعتراض کرے تو وہ زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکے گا کہ آپ نے ترکِ اولیٰ کیا۔ بہتر تھا کہ آپ اسے حضرت عمرؓ کی طرح ایک کمیٹی کے سپرد کر جاتے۔ ہم اس کے جواب میں کہہ سکتے ہیں ہو سکتا ہے امیر معاویہؓ کا یہ گمان ہو کہ کمیٹی اس مسئلے کو مؤثر درجے میں حل نہ کر سکے گی۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔

استخلاف افضل افضل است نہ واجب لیکن ایں قدر را گناہ نتواں گفت کہ بسبب وشتم امیر معاویہؓ پیش آئیم [2]

ترجمہ: افضل شخص کو خلیفہ بنانا افضل تو ہے لیکن واجب نہیں اور اتنی بات کو (غیر افضل کو خلیفہ بنانے کو) گناہ نہیں کہا جا سکتا: کہ اسے دلیل بنا کر ہم امیر معاویہؓ کو بُرا بھلا کہنے لگ جاویں۔

سو اس پہلو سے کہ حضرت معاویہؓ نے یزید کو ولی عہد بنایا آپ کو قطعاً بُرا بھلا نہیں کہا جا سکتا۔ آپ سیاست میں نہایت مدبر اور دینی سمجھ میں اُونچے درجے کے فقیہ تھے۔ آپ نے حالاتِ پیش آمدہ کے تحت جو کیا وہ ان کا اجتہاد تھا۔ آپ ایک نیک جذبہ سے کلمہ امت کو ایک رکھنا چاہتے تھے۔ اس کا کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا —— آپ کو استخلافِ یزید کے وقت اس کی کسی ایسی بات کا علم نہ تھا جو اہلیت خلافت کے منافی ہو اور غیب کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہوتا ہے۔ بدوں اس کے بتلائے کوئی کیسے غیب

[1] تحقیق و اثبات ص۴۷ [2] مکتوبات مولانا محمد قاسم ص۳۹

کی بات جان سکے۔ اس نے غیب دانی کی چابی کسی کے ہاتھ میں نہیں دی۔ وہ بڑے سے بڑا ولی کیوں نہ ہو اور جلیل القدر صحابی کیوں نہ ہو۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: یزید کے بارے میں جناب احمد رضا خاں کا موقف کیا تھا۔ وہ اسے مسلمان سمجھتے رہے یا کافر؟ بریلوی اس کے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے ہیں؟ سائل۔ محمد شریف از میترانوالی ضلع سیالکوٹ

جواب: مولانا احمد رضا خاں نے ملفوظات حصہ اول میں حسب ذیل تصریح کی ہے:۔

اگر کوئی کافر کہے منع نہ کریں گے اور خود کہیں گے نہیں [1]   واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: کیا یہ صحیح ہے کہ امیر معاویہؓ لوگوں کو اپنے بیٹے کی بیعت کے لیے مجبور کرتے رہے اور حکومت کی طرف سے بیعتِ یزید کے لیے بھاری رشوتیں دی گئیں اور زیاد کا تعاون لینے کے لیے بہت حیلے کیئے گئے اور دھوکہ اور فریب سے کام لیا گیا۔ اس کی تفصیل فرمائیں؟ السائل۔ ضمیر الدین

جواب: ہم اس سلسلے میں مشہور شیعہ مؤرخ احمد بن ابی یعقوب الکاتب الیعقوبی کی شہادت پیش کرتے ہیں۔

ع   مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

یعقوبی ۴۹ھ کے واقعات کے تحت لکھتا ہے:۔

وحج معاویۃ تلک السنۃ فتالف القوم ولم یکرھھم علی البیعۃ۔ [2]

ترجمہ: اور امیر معاویہؓ نے اسی سال حج کیا۔ آپ نے قوم کے دلوں کو جیتا اور ان سے جبراً (یزید کی) بیعت نہ لی۔

مخالفین حضرت معاویہؓ پر الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو بھاری رشوت دے کر اپنا ہمنوا بنا لیا۔ اسے ثابت کرنے کے لیے وہ بے سروپا روایات کا سہارا لیتے ہیں۔ ان روایات کا ایک راوی مؤمل بن اسماعیل ہے۔ حافظ ذہبی (۸۴۸ھ) لکھتے ہیں:۔

قال البخاری منکر الحدیث وقال ابوزرعۃ فی حدیثہ خطاء کثیر۔ [3]

اذا انفرد بحدیث وجب ان یتوقف۔ [4]

[1] ملفوظات حصہ اول ص۱۲۴ [2] تاریخ یعقوبی جلد ۲ ص۲۲۹ [3] میزان الاعتدال جلد ۴ ص۲۲۸ [4] تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص۳۸۱

صحابہ کرامؓ کا تزکیہ قرآن و سنت سے ثابت ہے اور یہ عقیدے کا موضوع ہے۔ جو روایات عقائد کی سرحدوں کو چھوتی ہوں وہ اعلیٰ معیار ثبوت کی ہونی چاہئیں۔ انہیں محض تاریخی روایات نہ سمجھنا چاہیئے۔ ان کے اعتبار سے اسلامی عقائد کی وہ کڑیاں ٹوٹتی ہیں جو کتاب و سنت نے قائم کی ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: حضرت عبدالرحمٰن بن عبد رب کعبہ کہتے ہیں معاویہؓ ہمیں باطل طریقے سے مال کھانے اور لوگوں کو بے جا قتل کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ کیا کسی صحابی سے ممکن ہے کہ وہ لوگوں کو لوٹ کھسوٹ اور قتل و قتال کی دعوت دے۔ بتائیں کیا اس حدیث پر سب محدثین کا اتفاق ہے؟ سائل محمد صدیق کھوکھر لاہور

جواب: حضرت عمرو بن عاصؓ کے بیٹے حضرت عبداللہؓ ایک دفعہ کعبہ کے سائے میں احادیث سنا رہے تھے اور لوگ آپ کے گرد جمع تھے۔ آپ نے ایک حدیث بیان کرتے ہوئے حدیث کا یہ حصہ پڑھا:-

ومن بایع اماماً فاعطاہ صفقۃ یدہ وثمرۃ قلبہ فلیطعہ ما استطاع فان جاء احد ینازعہ فاضربوا رقبۃ الاخر[1]

ترجمہ۔ اور جس نے کسی امام کی بیعت کی اور اس کے ہاتھ میں دست وفا اور دل کا خلوص دیا۔ اسے چاہیئے کہ اس کی پوری اطاعت کرے جہاں تک کر سکے۔ پھر اگر کوئی حکمران اٹھے جو اس کے خلاف ہو تو تم اس دوسرے کی گردن مار دو۔

یہ اس دور کی بات ہے جب حضرت علی اور امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما میں اختلاف زوروں پر تھا۔ عبدالرحمٰن بن عبد رب کعبہ حضرت علی المرتضیٰؓ سے بیعت کئے ہوئے تھے۔ ان کے ذہن میں یہ بات آئی کہ پھر معاویہؓ کی ساری مہم اور ان کا اپنے لشکروں پر مال خرچ کرنا یہ سارا سلسلہ اکل اموال بالباطل اور بے جا قتل و قتال کے ذیل میں آتا ہے۔ ہم جب ایک امام کی بیعت کر چکے تو اب ہم دوسرے کی کیوں سنیں۔ یہ تو اس کی دعوت ہے کہ ہم اپنے آپ کو یونہی ضائع کریں اور فوجی اپنے وظیفے غلط لیتے رہیں۔ عبدالرحمٰن بن عبد رب کعبہ نے اسی ذہن سے حضرت عبداللہ بن عمروؓ (۶۷ھ) سے اس وقت جب وہ مذکورہ حدیث بیان کر چکے۔ کہا:-

ھٰذا ابن عمک معاویۃ یامرنا ان ناکل اموالنا بالباطل ونقتل انفسنا۔[2]

ترجمہ۔ یہ آپکا چچا زاد بھائی ہمیں کہہ رہا ہے کہ ہم اپنے اموال غلط طور پر کھاتے رہیں اور اپنی جانیں یونہی لڑاتے رہیں۔

[1] سنن نسائی جلد ۲ ص ۱۲۵ [2] صحیح مسلم جلد ۲ ص ۱۲۶

اب ظاہر ہے کہ عبدالرحمٰن کا اشارہ حضرت امیر معاویہؓ کے نظم مملکت اور مالی نظام کے غلط ہونے کی طرف نہ تھا۔ اس سیاسی اختلاف کی طرف تھا جو امیر معاویہؓ حضرت علیؓ کے خلاف اختیار کئے ہوئے تھے اور وہ حضرت عثمانؓ کے مظلومانہ قتل کے خلاف ایک اصولی آواز تھی۔ یہ مسئلہ صحابہ میں مجتہد فیہ تھا۔ اور دونوں طرف صحابہ موجود تھے۔ اب جن وجوہ سے ہم حضرت معاویہؓ کو اس اجتہادی موقف کا حق دیتے ہیں۔ اسی جہت سے ان کا اپنے لشکروں پر خرچ کرنا اور لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے کی دعوت دینا لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل اور ارشاد خداوندی ولا تقتلوا انفسکم کے ظاہر سے نکل جاتا ہے کیونکہ ان کے پاس اپنے اس موقف کی تائید میں بہت سی وجوہ ہیں جن کی بناء پر انہیں بطور مجتہد اجتہاد کا حق پہنچتا ہے۔

سو یہ الفاظ کہ معاویہؓ ہمیں حکم دیتے ہیں۔ ان ناکل اموالنا بیننا بالباطل ونقتل انفسنا اپنے ظاہر پر مبنی نہیں۔ یہ راوی عبدالرحمٰن کا اپنا اعتقاد تھا کہ پھر امیر معاویہؓ کے موقف کی حمایت سے یہ بات لازم آتی ہے نہ یہ کہ امیر معاویہؓ کھلے لفظوں میں اکل اموال بالباطل کی تعلیم دے رہے تھے۔ حاشا وکلا ایسا کہنا کسی صحابی سے کیسے ممکن ہے؟ ہرگز نہیں۔ سو یہ سننے والے کا اپنا اندازہ ہے جو ان لفظوں میں بول رہا ہے۔ شارحین حدیث نے یہاں صاف اسے راوی کا اپنا عقیدہ قرار دیا ہے۔

فاعتقد ھٰذا القائل ھٰذا الوصف فی معاویۃ لمنازعتہ علیا۔[1]

ترجمہ۔ اس کہنے والے کے ذہن میں معاویہؓ کے بارے میں یہ بات تھی۔ بایں وجہ کہ وہ حضرت علیؓ سے لڑ رہے تھے۔

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ عبدالرحمٰن اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے مابین یہ آخری بات کانوں کان ہو رہی ہے۔ حدیث کے ختم ہونے پر عبدالرحمٰن ان کے قریب گئے (فدنوت منہ) اور ان سے پوچھا۔ واقعی آپ نے یہ حدیث حضورؐ سے سنی ہے؟ اس کے بعد انہوں نے اپنے احساسات ان سے کہے اور انہوں نے کہا۔ آپ امیر معاویہؓ کی صرف انہی باتوں میں تعمیل کریں جو طاعت الٰہی کے تحت ہوں ——— یعنی اگر آپ پہلے حضرت علیؓ سے بیعت کئے ہوئے ہیں تو اب بے شک معاویہؓ کے لشکروں میں شامل ہوں۔

یہ عبدالرحمٰن بن عبد رب کعبہ (ھ) صحابی نہیں۔ انہوں نے جو بات کہی یہ ان کے اپنے سیاسی احساسات ہیں۔ ان کی کبھی ملاقات امیر معاویہؓ سے ہوئی ہو اور انہوں نے انہیں یہ اکل اموال بالباطل کی ترغیب دی ہو یہ کہیں ثابت نہیں۔ اب محض اتنی وجدانی بات سے ایک جلیل القدر صحابی کی دیانت کو مجروح کرنا یہ

[1] شرح نووی جلد ۲ ص ۱۲۶

کون سا انصاف ہے ؟ یہی وجہ ہے کہ اس آخری حصے کے نقل کرنے پر سب محدثین متفق نہیں ہیں. امام نسائیؒ نے پوری حدیث بیان کی ہے اور عبدالرحمٰن اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی اس گفتگو کو نقل نہیں کیا اور حدیث بیان کر کے لکھ دیا ہے۔ الحدیث متصل[1] یہ اشارہ ہے کہ اس کے آگے حدیث کا کوئی جزو نہیں. سنن ابن ماجہ میں بھی یہ ٹکڑا نہیں ملتا۔[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے رواۃ میں کوئی ایسا راوی ہے جو کبھی اسے روایت کرتا ہے اور کبھی نہیں. پھر عبدالرحمٰن اسے بلفظ جمع نقل کرتا ہے. یأمرنا ان ناکل اموالنا بالباطل ونقتل انفسنا. اور اس کی تصدیق میں عبدالرحمٰن کے سوا ہمیں ایک شخص بھی نہیں ملتا جس نے یہ کہا ہو کہ معاویہؓ نے ہمیں یہ بات کہی ہے ـــــــ عبدالرحمٰن سے نیچے اس کا راوی زید بن وہب کوفی ہے. علماء نے گو اسے ثقہ بھی لکھا ہے لیکن یہ بھی تصریح کی ہے ؛۔

فی حدیثہ خلل کثیر. اس کی روایت میں بہت خلل واقع ہوئے ہیں۔[3]

اب اس کی روایت سے حضرت معاویہؓ کی دیانت پر جرح کرنا کس طرح درست ہو سکتا ہے. اور پھر جب حضرت حسنؓ نے امیر معاویہؓ کی حکومت کو صحتِ خلافت کی سند دے دی تو پھر کیا یہ صورت باقی رہی جس کی عبدالرحمٰن بن عبد ظبر دے رہے ہیں. اور کیا حضورؐ کا ارشاد العبرۃ بالخواتیم صحیح نہیں اور کیا حضرت حسنؓ اور حسینؓ اکل اموال بالباطل کے مرتکب تھے؟ ہرگز نہیں. پھر آپ سوچیں کہ حضرت معاویہؓ کے اموال اور بیت المال کو کس طرح اموال باطلہ کہا جا سکتا ہے. واللہ اعلم بالصواب.

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال : شیعہ کہتے ہیں سنی اہلبیت کو نہیں مانتے. مطلع فرمائیں کہ اہل سنّت کی صحاح ستہ کی کتابوں میں ائمہ اہلبیت کی روایات کیوں نہیں ملتیں ؟ کیا یہ حضرات ثقہ روات نہ تھے ؟ السائل. حافظ سیف اللہ

جواب : یہ الزام غلط ہے صحاح ستہ میں ان حضرات کی مرویات موجود ہیں. اس وقت سنن نسائی میرے سامنے کھلی ہے. اُسے کھولا تو صد۱۸۳ نکلا. اس میں امام زہری (۱۲۴ھ) کی روایت بایں سند ملی ؛۔

عن محمد بن مسلم بن شہاب عن علی بن الحسین عن ابیہ عن جدہ علی ابن ابی طالب قال دخل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعلی فاطمۃ من اللیل فایقظنا للصلوٰۃ ثم رجع الی بیتہ فصلی ھویًا من اللیل فلم یسمع لنا حسًا فرجع الینا فایقظنا فقال قوما فصلیا قال فجلست وانا اعرک عینی واقول انا واللہ

---

[1] سنن نسائی جلد ۲ صد۱۶۵ [2] سنن ابن ماجہ صد۲۹۳ [3] تہذیب التہذیب جلد ۳ صد۴۲۷

مانصلی الا ما کتب اللہ لنا انما انفسنا بیدہ اللہ فان شاء ان یبعثنا بعثنا قال فولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو یقول ویضرب بیدہ علی فخذہ مانصلی الا ما کتب اللہ لنا وکان الانسان اکثر شیء جدلا۔[1]

ترجمہ. زین العابدینؒ اپنے باپ حضرت حسینؓ سے پھر اپنے دادا حضرت علی رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ ایک رات حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے (حضرت علیؓ) اور فاطمہؓ کے پاس آئے اور ہمیں نماز کے لیے جگایا اور اپنے ہاں چلے گئے اور کافی رات تک نماز پڑھتے رہے. جب انہوں نے ہماری طرف سے کوئی آہٹ نہ سُنی تو پھر ہماری طرف آئے اور ہمیں جگایا اور کہا، دونوں اُٹھو اور نماز پڑھو. میں بیٹھ گیا اور اپنی آنکھیں مل رہا تھا اور کہنے لگا ہم بخدا وہی پڑھیں گے جو خدا نے ہم پر فرض کی ہے. ہماری ارواح (بحالت نیند) اسی کے قبضہ میں ہیں. اگر وہ ہمیں اٹھانا چاہے اٹھا دے گا حضورؐ اس پر واپس چل دیئے اور آپ افسوس سے ان پر ہاتھ مار رہے تھے اور (ہمارا جملہ) مانصلی الا ما کتب اللہ لنا (ہم وہی پڑھیں گے جو خدا نے ہمارے لیے لکھ دی ہے) کہہ کر فرما رہے تھے انسان کس قدر جھگڑالو واقع ہوا ہے۔

یہ جنس انسان کے بارے میں ہے. خاص حضرت علیؓ کو جھگڑالو کہنا نہیں. خوارج ان روایات سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں. عرب اسالیب پر جن کی نظر ہے وہ ایسے مقامات کو اچھی طرح جانتے ہیں. ہم یہاں صرف یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ کیا امام زین العابدینؒ اور حضرت حسینؓ کی سندوں سے احادیث صحاح ستہ میں موجود نہیں؟ یقیناً ہیں. واللہ اعلم بالصواب.

کتبہٗ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال : محمد بن ابی بکر حضرت علیؓ کے پروردہ تھے اور حسنؓ وحسینؓ حضرت علیؓ کے اپنے بیٹے تھے. حضرت علیؓ اور حسنؓ وحسینؓ تو آخری وقت تک حضرت عثمانؓ کے خیر خواہ رہے اور محمد بن ابی بکر باغیوں میں شامل رہا. حضرت علیؓ نے اپنے اثر ورسوخ سے اسے کیوں نہ روکا؟ سائل. محبوب احمد

جواب : سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے محمد بن ابی بکر کو مصر کا والی مقرر کیا تھا اور آپ نے اس سلسلہ میں اہلِ مصر کو جو خط لکھا اسے کسی تخریب کار نے بایں الفاظ بدل دیا کہ جونہی محمد وہاں پہنچے تم اُسے قتل کر دو. یہ خط کسی طرح محمد بن ابی بکر کے ہاتھ خط لگ گیا. چونکہ اس پر حضرت عثمانؓ کی مہر لگی تھی. اس نے اس خط کا ذمہ دار آپ

---

[1] سنن نسائی جلد ۱ صد۱۸۳

کو ہی سمجھا اور اسی بنا پر وہ آپ کا ذاتی دشمن ہو چکا تھا۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ عین حملہ کے وقت وہ حضرت عثمانؓ کا سامنا نہ کر سکا تھا اور شرم و حیا سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ والسلام

خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے بیٹے عامر کہتے ہیں حضرت امیر معاویہؓ نے میرے والد حضرت سعدؓ کو بلا بھیجا۔ والد صاحب حضرت علیؓ سے عقیدت رکھتے تھے۔ امیر معاویہؓ نے ان سے پوچھا۔ آپ ابو ترابؓ کو گالی کیوں نہیں دیتے۔ مالک لا تسب ابا تراب۔ والد صاحب نے کہا۔ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے حق میں تین باتیں ایسی سنی ہیں کہ اب میں انہیں کسی طرح برا نہیں کہہ سکتا۔ امیر معاویہؓ نے یہ سب باتیں سنیں اور کوئی جواب نہ دے سکے۔ کیا یہ حدیث صحیح ہے؟ سائل۔ (مولوی) اسد اللہ از جھنگ صدر

جواب: حضرت معاویہؓ اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی یہ ملاقات غالباً مکہ میں ہوئی ہے۔ اس میں امیر معاویہؓ نے حضرت سعدؓ سے وجہ پوچھی کہ وہ علیؓ کے بارے میں خاموش کیوں ہیں اور میرے ساتھ کیوں نہیں ہوتے۔ خونِ عثمانؓ کے بارے میں حضرت علیؓ اپنی ذمہ داری ادا نہیں کر پائے آپ انہیں برا بھی نہیں کہتے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے ـــــ سب کا معنی گالی دینا ہی نہیں برا کہنا اور لاتعلق ہونا بھی اسی ذیل میں آتا ہے اور یہ لفظ عام ہے۔

ابو عبد اللہ محمد بن خلفہ الوشتانی شرح مسلم میں لکھتے ہیں:۔

یحمل السب علی التغییر فی المذهب والرای فیکون المعنی مامنعک من ان تبین للناس خطاءه وان ما نحن علیه اسد واصوب ومثل هذا یسمی سبا فی العرف۔[1]

ترجمہ۔ یہاں لفظ سب اپنے موقف اور رائے کو بدلنے پر محمول کیا جائے گا (گالی کے معنی پر نہیں) پس اس کا مطلب یہ لیا جائے گا آپ کو کس چیز نے روک رکھا ہے کہ لوگوں کے سامنے علیؓ کی خطاء بیان نہ کریں اور یہ بات کہنے سے کہ جس بات پر ہم ہیں وہ زیادہ صحیح اور بہتر ہے۔ عرب عرف میں ایسے موقف کو بھی لفظ سب سے ذکر کر دیتے ہیں۔

(اور ظاہر ہے یہ گالی کا معنی نہیں ہے)۔

لغت حدیث کی مشہور کتاب مجمع البحار میں ہے:۔

المعنی مامنعک ان تخطئه فی اجتهاد وتظهر للناس حسن اجتهادنا۔[2]

[1] اکمال اکمال المعلم ص [2] مجمع البحار جلد ۲ ص ۸۳

ترجمہ۔ اس کا معنی یہ لیا جائے گا کہ آپ کو کس چیز نے علیؓ کے خطاء فی الاجتہاد اور ہمارے صواب فی الاجتہاد کو لوگوں کے سامنے لانے سے روک رکھا ہے۔

پھر اس روایت میں حضرت معاویہؓ نے حضرت سعدؓ کو سب کرنے کے لیے نہیں کہا۔ سب کرنے کی وجہ پوچھی ہے کہ یہ از راہِ تقویٰ و تورع ہے یا کسی خوف کے باعث ہے یا کوئی اور وجہ ہے۔ اگر تورع اور احتیاط ہے تو پھر صحیح ہے اور اگر کوئی اور وجہ ہے تو بتلائیں میں اس کا جواب دے کر آپ کو مطمئن کروں گا۔

حضرت سعدؓ نے صاف صاف حضرت علیؓ کے فضائل ذکر کیے۔ ۱۔ فتح خیبر کا علمبردار ہونا۔ ۲۔ ہارونِ امت ہونا۔ ۳۔ اور حدیثِ کساء میں اہل بیت میں آنا ذکر فرمایا۔ اور امیر معاویہؓ نے ان میں سے کسی کا مناقشہ نہیں کیا۔ آرام سے سنا۔ حضرت سعدؓ ان سے بالکل مرعوب نہیں ہوئے اور بات صاف صاف کہہ دی۔ اس سے پتہ چلا کہ حضرت امیر معاویہؓ کسی کو حضرت علیؓ کو برا کہنے پر مجبور نہیں کرتے تھے اور نہ انہیں حضرت علیؓ کے ان فضائل سے انکار تھا۔ یہ صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے وفا تھی جو انہیں ان کے ناحق خون کے قصاص کے لیے اٹھاتے ہوئے تھی اور وہ ہر ہر صحابی کو واقعات کی روشنی میں مطمئن کرنا اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے۔ حضرت سعدؓ چونکہ اکابر میں سے تھے عشرہ مبشرہ میں سے تھے اور حضرت عمرؓ کی مقرر کردہ کمیٹی کے اصحاب ستہ میں سے تھے۔ اس لیے حضرت معاویہؓ نے ان کو ہم خیال بنانے کے لیے بات چھیڑی اور وجہ پوچھی کہ آپ علیؓ کے خطاء فی الاجتہاد کو لوگوں کو سامنے کیوں نہیں لاتے؟

اگر یہ امیر معاویہؓ کا حکم ہوتا تو کیا حضرت سعدؓ اس دلیری سے حضرت علیؓ کے فضائل ذکر کر سکتے تھے اور کیا پھر حضرت سعدؓ یونہی چلے جاتے۔ افسوس ہمارے دوست بات سمجھتے نہیں اور پراپیگنڈہ جاری رکھتے ہیں کہ امیر معاویہؓ کے حکم سے حضرت علیؓ کو صبح شام گالیاں دی جاتی تھیں۔ استغفر اللہ العظیم

امام نووی شافعی (۶۷۶ھ) لکھتے ہیں:۔

فقول معاویه هذا لیس فیه تصریح بانه امر سعدا بسبه۔ انما سأله عن السبب المانع من السب کانه یقول هل امتنعت منه تورعا او خوفا او غیر ذلك؟ فان کان تورعا واجلالا له عن السب فانت مصیب وان کان غیر ذلك فله جواب اخر۔[1]

ترجمہ۔ حضرت معاویہؓ کی اس بات میں یہ بات نہیں پائی جاتی کہ آپ نے حضرت سعدؓ کو سبِ علیؓ کا حکم دیا ہو۔ آپ نے ان محض اس کا سبب پوچھا کہ آپ علیؓ سے لاتعلق

[1] نووی جلد ۲ ص ۲۷۸

کیوں نہیں ہوتے۔ گویا آپ پوچھ رہے ہیں کہ آپ تورع اور احتیاط کی وجہ سے ایسا نہیں کرتے یا کوئی خوف مانع ہے یا اس کا کوئی اور سبب ہے۔ اگر سبّ سے دُور رہنا از راہِ تورع و احتیاط ہے پھر تو آپ درست ہیں اور اگر کچھ اور بات ہے تو اس کا جواب دوسرا ہے۔

اگر حضرت معاویہؓ واقعی حضرت سعدؓ کو حضرت علیؓ کے بارے میں گالی دینے کا حکم دے رہے تھے تو پھر حضرت سعدؓ ان کے ایسے معتقد کیوں ہو گئے کہ ان کے فیصلوں کو بالکل حق سمجھنے لگے۔ آپ فرماتے ہیں:۔

مارایت احدًا بعد عثمان اقضٰی بحق من صاحب ھذا الباب یعنی معاویہ۔[1]

ترجمہ۔ سعد بن ابی وقاصؓ کہتے ہیں میں نے حضرت عثمانؓ کے بعد حق کا فیصلہ کرنے والا معاویہؓ سے بڑھ کر کسی کو نہیں پایا۔

پھر ایک دفعہ آپ شام گئے تو حضرت امیر معاویہؓ کے ہاں ایک رمضان گزارا۔[2]

حضرت سعدؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے یہ تعلقات بتاتے ہیں کہ آپ کا ان سے پوچھنا مالک لا تسب ابا تراب حضرت علیؓ کو گالی دلوانے کے لیے نہیں تھا اور نہ یہ بات صحیح ہے کہ آپ کے حکم سے (معاذ اللہ) حضرت علی المرتضیٰؓ کو برسرِ منبر گالیاں دی جاتی تھیں۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: حضرت حسن اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کی باہمی صلح کے بارے میں حضورؐ نے جو پیشگوئی فرمائی اس میں یہ الفاظ تو ملتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی دو جماعتوں میں صلح کرائے گا لیکن کیا یہ الفاظ بھی کہیں ہیں کہ مومنوں کی دو جماعتوں میں صلح ہو گی؟ شیعہ کہتے ہیں معاویہؓ مسلمان تو تھے کلمہ گو تھے مگر مومن نہ تھے۔ مومن کبھی مومن سے نہیں لڑتا۔ حضرت علی علیہ السلام مومن تھے ان سے لڑنے والا کیسے مومن ہو سکتا ہے؟

سائل۔ محمد طاہر از شورکوٹ

جواب: حضرت عمارؓ کی (پرورش کرنے والی) والدہ کہتی ہیں ایک دفعہ عمارؓ بیمار ہوئے اور بیماری شدت اختیار کر گئی۔ میں گھبرائی تو عمارؓ نے کہا فکر نہ کریں، میں اس مرض میں مرنے والا نہیں ہوں۔ مجھے میرے محبوب آں سرور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلا دیا ہوا ہے کہ میری موت قتل سے ہو گی (بیماری سے نہیں) حضرت امام بخاریؒ روایت کرتے ہیں:۔

---

[1] تاریخ دول الاسلام للذہبی جلد ۲ صفحہ ۳۲۱ البدایہ جلد ۸ صفحہ ۱۳۳ [2] البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۷۲

ام عمار قالت اشتکی عمار قال لا اموت فی مرضی حدثنی حبیبی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انی لا اموت الا قتلا بین فئتین مومنین۔[1]

ترجمہ۔ ام عمارؓ کہتی ہیں عمارؓ بیمار ہوئے۔ آپ نے کہا میں اس بیماری سے فوت نہ ہوں گا مجھے میرے حبیب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہوا ہے کہ میری وفات قتل سے ہو گی اور وہ مقاتلہ مومنوں کی دو جماعتوں میں ہو رہا ہو گا۔

اس حدیث میں حضرت معاویہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی دونوں جماعتوں کو مومنوں کی دو جماعتوں سے تعبیر کیا ہے۔ مومنین سے ذکر کیا ہے کہ دونوں جماعتیں مومنوں کی ہوں گی —— قرآن کریم میں بھی ہے۔

وان طائفتان من المؤمنین اقتتلوا فاصلحوا بینہما فان بغت احداھما علی الاخریٰ فقاتلوا التی تبغی حتیٰ تفیٔ الیٰ امر اللہ...... الآیہ۔ (پ ۲۶ الحجرات آیت ۹)

ترجمہ۔ اور اگر مومنین کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو۔ اگر ان میں سے ایک دوسرے کے خلاف بغاوت کرے تو تم ان سے لڑو جو بغاوت کرے یہاں تک کہ وہ حق کی طرف لوٹ پڑے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مومن سے لڑنے والے ضروری نہیں کہ کافر ہوں، مومن بھی ہو سکتے ہیں اور جو باغی ہو وہ بھی بغاوت سے ایمان سے نہیں نکلتا مومن رہ سکتا ہے مومن سے کسی اختلاف یا کسی دوسری وجہ سے لڑنا اور بات ہے اور مومن سے بوجہ اس کے ایمان کے لڑنا اور بات ہے۔ جو کسی مومن کو اس لیے مارے کہ وہ مومن کیوں ہے تو وہ بے شک کافر ہے اور اس کی سزا جہنم ہے لیکن وجہ قتل کوئی خارجی سبب ہو تو اس کا حکم اور ہے کفر کا نہیں۔ ومن قتل مومنًا متعمدًا فجزاءہ جھنم۔ اس میں حکم مشتق پر ہے اور یہاں اس کے قتل کا موجب اس کا ایمان ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: دنیا میں مختلف نظامِ حکومت پائے جاتے ہیں کون سا نظامِ حکومت بہتر ہے۔ ۱۔ جمہوریت ۔ ۲۔ ملوکیت۔ ۳۔ اشتراکیت یا کوئی اور؟ نیز بتائیں کہ امیر معاویہؓ کا نظامِ حکومت کونسا تھا؟

جواب: بہترین نظامِ حکومت خلافت ہے۔ اس میں حکم اور قانون کا سرچشمہ اللہ رب العزت کو مانا جاتا ہے حکمران اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول خاتم کی ماتحتی اور نیابت میں انتظام سلطنت کرتے ہیں۔ حکمران کا

---

[1] تاریخ صغیر للبخاری صفحہ ۴۲ طبع ملتان

انتخاب اس معیار کے مطابق جو کتاب و سنت میں دیا گیا ہے عوام کرتے ہیں۔ لیکن جب تک وہ نظم سلطنت کتاب و سنت کے مطابق چلاتے رہیں عوام اسے اُتار نہیں سکتے۔ عوام کو ہر طرح سے چشمہ اقتدار مانا جاتے۔ یہ جمہوریت ہے اور اسے صحیح سمجھنا اور حق جاننا کفر ہے۔

خلافت کے بعد ملوکیت کا درجہ ہے۔ یہ نظام بدترین تو ہو سکتا ہے لیکن کفر نہیں۔ بادشاہ اچھے بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی —— بادشاہت یا ملوکیت بذاتِ خود کوئی بُری چیز نہیں۔ پیغمبروں نے بھی بعض اوقات اس کے درجہ ضرورت کو قبول کیا ہے۔ بنو اسرائیل نے سموئیل پیغمبر کے دور میں ان سے گذارش کی کہ ہم پر کوئی ایسا بادشاہ مقرر کر دیں جس کے ماتحت ہم جہاد کریں۔ انہوں نے باذنِ الٰہی انہیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا ہے اور اس کا تقرر اصولِ سلطنت کے علم اور وجاہت شخصی پر ہوا ہے۔ اگر ملوکیت میں باعتبار ذات کوئی عیب ہوتا تو نہ وہ پیغمبر ان کے لیے کسی بادشاہ کی درخواست کرتے نہ اللہ تعالیٰ لفظ ملک سے ان کی پذیرائی کرتے۔ بلکہ صاف کہہ دیا جاتا ہے کہ ملوکیت ایک بُری چیز ہے تم اس کی طلب کیوں کرتے ہو۔ قرآن کریم میں ہے :-

الم تر الی الملاء من بنی اسرائیل من بعد موسیٰ اذ قالوا لنبی لهم ابعث لنا ملكاً نقاتل في سبيل الله . . . . . ان الله قد بعث لكم طالوت ملكاً . . . . الآیہ (پ۲ البقرہ آیت ۲۴۶)

ترجمہ۔ کیا تم نے دیکھا ایک اسرائیلی جماعت کو موسےٰ کے بعد جب انہوں نے اپنے نبی سے کہا آپ ہمارے لیے ایک بادشاہ ٹھہرائیں تاکہ ہم لڑیں اللہ کی راہ میں ..... ان کے نبی نے انہیں کہا کہ بے شک اللہ نے طالوت کو تمہارے لیے بادشاہ مقرر کیا ہے۔

اسی طالوت کے داماد حضرت داؤد علیہ السلام تھے جنہوں نے جالوت کو قتل کیا تھا۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے پاس بادشاہی اسی طرح آئی تھی۔ ظاہر ہے کہ ملوکیت میں اپنی ذات میں کوئی عیب نہ تھا ورنہ اللہ تعالیٰ لفظ ملوکیت کو کسی پہلو سے بھی پذیرائی نہ دیتے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک اور موقعہ پر بنو اسرائیل پر اپنے احسانات ذکر فرمائے ہیں اور ان میں جس طرح یہ احسان تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں انبیاء پر انبیاء بھیجے۔ یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تم میں بادشاہ بھی بنائے۔ یہ ملوکیت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کی نہیں ان سے پہلے کی ہے۔ جب اسرائیل میں بادشاہت کا نظام چلتا رہا۔ قرآن کریم میں ہے :-

واذ قال موسیٰ لقومه يقوم اذكروا نعمة الله عليكم اذ جعل فيكم انبياء وجعلكم ملوكاً واتاكم ما لم يؤت احداً من العالمين۔ (پ۶ المائدہ ع ۴ آیت ۲۰)

ترجمہ۔ موسےٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو کہا۔ اے قوم میرے انعامات کو یاد کرو جب میں نے تم میں نبی بھی بنائے اور بادشاہ بھی تم میں بنائے اور تمہیں وہ کچھ دیا جو نہ دیا تھا کسی کو جہان میں۔

مسلمانوں میں سلطان صلاح الدین ایوبی سے لے کر اورنگ زیب عالمگیر تک کتنے ایسے بادشاہ ہوئے جن کی بادشاہت آج کل کی جمہوریت سے لاکھوں درجہ اچھی تھی۔ جلالۃ الملک عبدالعزیز پہلے شخص ہیں جنہوں نے سعودی عرب میں صدیوں کی کوتاہی کے بعد اللہ کی حدود پھر سے نافذ کیں۔ ہم مسلمانوں کے نزدیک اصل قانونِ الٰہی کا انصرام اور حکم خداوندی کا انتظام ہے۔ نظام حکومت تو اس کے لیے محض ایک آلہ ہے نہ کہ اصل کہ ہم انہی بحثوں میں اُلجھ کر رہ جائیں اور یہ نہ دیکھیں کہ اصل قانون ہے جس سے اللہ کی مخلوق کو اس کارخانۂ کائنات میں اپنا حق ملتا ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ملوکیت اچھی چیز نہیں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ میرے بعد خلافت تیس سال تک رہے گی پھر بادشاہت ہو جائے گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملوکیت ناجائز ہے ؟

الجواب ومن اللہ الصدق والصواب :

اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ملوکیت ناجائز ہے۔ صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ نظامِ خلافت بہتر ہے اور اولیٰ ہے۔ ملوکیت دوسرے درجے میں ہے۔ ملوکیت میں اگر کوئی بُرا مفہوم پیدا ہوتا ہے تو لفظ عضوض سے نہ کہ ملوکیت کی ذات میں کوئی بُرائی ہے اور اس روایت میں جو جامع ترمذی سے نقل کی جاتی ہے یہ لفظ نہیں ہے۔ اس میں بنو زرقاء کو شر الملوک کہہ کر تو بُرا کہا گیا ہے لیکن لفظ ملوکیت کو عیب نہیں سمجھا گیا ہے۔

كذبوا بنو زرقاء بل هم ملوك من شر الملوك۔[1]

نہایت افسوس ہے کہ اس روایت کو المصنف میں نقل کرتے ہوئے کسی راوی نے یہ الفاظ بھی بڑھا دیئے۔ و اول الملوك معاويه۔[2] راوی اولھم کہہ کر بات بڑھاتا تو اس کی بات بن جاتی لیکن اول الملوک کہنے سے وہ اس میں کوئی برائی داخل نہیں کر سکا۔ پھر اس نے اسے سفینہ کی رائے کے طور پر لکھا ہے، حدیث کے الفاظ کے طور پر نہیں۔

---

[1] جامع ترمذی جلد ۲ ص ۴۶ [2] المصنف لابن ابی شیبہ جلد ۱۴ ص ۱۲۲

ایک اور سوال

بعض احادیث میں بارہ خلفاء کا ذکر ملتا ہے اور بعض دوسری روایات میں کثرت خلفاء کی خبر دی گئی ان کے ہوتے ہوئے یہ تیس سال خلافت والی روایت درست معلوم نہیں ہوتی۔ حضورؐ نے فرمایا:۔

لا نبی بعدی و ستکون خلفاء فتکثر[1]

ترجمہ: میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا اور خلفاء ہوں گے اور بہت سے ہوں گے۔

اس حدیث کی روشنی میں امیر معاویہؓ بھی خلفاء میں آتے ہیں ملوک میں نہیں ـــــ اس کا جواب دعوت میں شائع فرمائیں؟

جواب: یہ حدیث حضرت سفینہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تیس سال والی روایت کے خلاف نہیں۔ اس حدیث میں کہ خلفاء بہت ہوں گے مطلق خلافت مراد ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے آپ کو خلیفہ کہے گا اور تیس سال والی روایت میں خلافتِ نبوت مراد ہے کہ اس دور میں اللہ رب العزت کی اطاعت نبوت کے منہاج پہ کی جائے گی۔ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:۔

انہ اراد فی حدیث سفینۃ خلافۃ النبوۃ ولم یقیدہ فی حدیث جابر بن سمرہ بذلک۔[2]

ترجمہ: حدیث سفینہ میں آپ کی مراد خلافتِ نبوت ہے اور حدیث جابر بن سمرہ میں خلافت کو خلافتِ نبوت سے مقید نہیں کیا گیا۔

حضرت معاویہؓ کا دورِ حکومت خلافت راشدہ اور خلافتِ عامہ کے مابین ایک عبوری دور ہے۔ آپ کی حکومت خلافتِ عادلہ تھی جس میں کتاب و سنت کو آئینی بالادستی حاصل تھی اور عدل و انصاف کی حدود قائم تھیں۔ لیکن اس کا معیار خلافتِ راشدہ سے دوسرے درجہ پر تھا۔ خلفائے راشدین سیرتِ نبوی کے بہت زیادہ قریب تھے۔ روزمرہ کی زندگی میں صبر و ایثار ان کا پیمانہ تھا۔ بشری تقاضوں میں وہ جہد و مشقت سے گزرتے تھے اور مباح امور میں وہ توسع اور فراخی کی راہ سے نہیں توکل اور تقوے کی راہوں پر چلتے تھے۔ حضرت امیر معاویہؓ گو اپنے پورے دورِ خلافت میں کسی خلافِ شرع راہ پر نہیں چلے لیکن مباح امور میں وہ کبھی وسعت سے بھی کام لے لیتے تھے اور وقت گزرنے سے اس توسع کا اوپر کے حلقے میں آ جانا ایک فطری امر تھا۔ حق یہ ہے کہ آپ کا دورِ حکومت خلافت تھا۔ آپ نے حکومت کسی سے وراثت میں نہ لی تھی سیاسی راہ سے آپ اقتدار پر آئے تھے۔ آپ کا پہلا دورِ حکومت حضرت عمر اور حضرت عثمان

---

[1] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۲۶ [2] فتح الباری جلد ۱۳ صفحہ ۱۸۱

رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی نیابت میں تھا اور دوسرا دور حضرت حسنؓ کی صلح سے شروع ہوتا ہے جو ملک کی قومی اور سیاسی سطح پر قائم ہوا تھا۔ ثم ملکاً (کہ خلافت پھر ملوکیت ہو جائے گی) میں لفظ ثم (پھر اس کے بعد) غور طلب ہے اور اس سے وہ حکومت مراد ہوگی جو اس تیس سال کے بعد شروع ہوا اور حضرت معاویہؓ کی حکومت تو تیس سال کے اندر سے شروع ہو چکی تھی۔ گو وہ خلافت تامہ کی صورت میں نہ تھی۔ ہاں خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے حکمران خلفاء اربعہ ہی ہیں۔ خلافتِ راشدہ اور خلافتِ عادلہ کے اس باریک فاصلے کو عقائد نسفی کی شرح نبراس میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مباح امور میں خلفائے اربعہ تحرز اور اجتناب کی راہ سے چلے اور یہ عزیمت کی راہ تھی اور سیدنا حضرت معاویہؓ نے ایسے کئی مواقع پہ توسع اور رخصت کی راہ اختیار فرمائی اور یہ کسی پہلو سے محل اعتراض اور موجبِ طعن نہیں افضلیت اور بات ہے۔

آپ کی حکومت کو اگر کسی پہلو سے ملوکیت بھی کہا جائے تو یہ ایسی ملوکیت تھی جس سے خلافت کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سیدنا حضرت حسن رضی اللہ عنہ خلافت کو ملوکیت کے سپرد کریں۔ اس جہت سے تو ملوکیت کے بانی حضرت حسنؓ ہو جائیں گے کہ انہوں نے خلافت کو ملوکیت کے سپرد کیا اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں ان کا یہ اقدام محل قدح ہوگا محل مدح نہ رہے گا۔ حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک پیشگوئی میں حضرت حسنؓ کے اس اقدام کو محلِ مدح میں ذکر کیا ہے کہ اس امت کی دو فئہ عظیمہ آپ کے اس قدم سے ایک ہو جائیں گی۔ واللہ اعلم و علمہ اتم و احکم۔

کتبہ: خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: حضرت علیؓ کے بعد حضرت حسنؓ کس طرح خلیفہ بنے (۱) حضرت علیؓ نے انہیں نامزد کیا تھا یا (۲) حضرت حسنؓ نے خود اپنے آپ کو خلافت کے لیے پیش کیا تھا یا (۳) قوم نے حضرت حسنؓ کو خلیفہ چنا ـــــ پھر کیا اس وقت کسی نے یہ سوال اٹھایا کہ خلیفہ پوری قوم کا ہونا چاہیئے نہ کہ صرف اسی حلقہ امارت کا جہاں حضرت علیؓ کی حکومت قائم تھی ـــــ اس صورت میں کیا حضرت حسنؓ کی خلافت کو خلافۃ النبوۃ کہہ سکیں گے یا وہ صرف خلافتِ علیؓ کی نیابت تھی؟

سائل: عبدالرشید خان گڑھ

جواب: سیدنا حضرت علیؓ نے آپ کو نامزد نہیں کیا تھا۔ حضرت علیؓ سے زخمی ہونے کے بعد یہ سوال کیا کیا گیا۔ کیا ہم آپ کے بعد حسنؓ کو خلیفہ بنائیں ـــــ آپ نے فرمایا نہ میں ایسا کہتا ہوں نہ انکار کرتا ہوں کہ تم خود بھی اسے نہ بنا سکو۔ ـــــ یہ بات کتابوں میں ضرور ملتی ہے کہ حضرت حسنؓ نے خود لوگوں کو اپنی بیعت کی طرف بلایا اور آپ اس طرح خلیفہ بنے طبقات ابن سعد میں ہے:۔

ثم انصرف الحسن بن علی من دفنه فدعا الناس الیٰ بیعته فبایعوه[1]

خود اپنے آپ کو اقتدار کے لیے پیش کرنا عیب نہ سمجھنا چاہیئے۔ انبیاء علیہم السلام ہر عیب سے پاک سمجھے جاتے ہیں۔ کیا حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیزِ مصر کو نہ کہا تھا۔ اجعلنی علیٰ خزائن الارض انی حفیظ علیم۔ (پ ۱۳ یوسف ع ۷) سو جو لوگ اس روایت کی وجہ سے حضرت حسنؓ پر ہوسِ اقتدار کا الزام لگاتے ہیں۔ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں کیا کہیں گے۔

خلافت پوری قوم پر ہونی چاہیئے۔ یہ سوال اس وقت اس لیے نہ اٹھا تھا کہ اس سے ایک سال پہلے (۴۰ھ میں) حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ میں یہ معاہدہ ہو چکا تھا کہ تا آخری فیصلہ دونوں فریق اپنی اپنی حدود میں رہیں کوئی دوسرے پر چڑھائی نہ کرے۔ ۴۰ھ کو عام الھدنہ (مصالحت کا سال) کہتے ہیں اور ۴۱ھ میں حضرت علیؓ کی شہادت ہوئی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: آپ نے کسی گذشتہ اشاعت میں لکھا ہے کہ خلفاء راشدین مباح امور میں تحرز و اجتناب کی پالیسی اختیار کرتے تھے اور ان کی نظر ہمیشہ عزیمت پر ہوتی تھی لیکن حضرت معاویہؓ بعض ایسے مواقع پر توسع اختیار فرما لیتے تھے اور رخصت پر عمل کرتے تھے اس پر کوئی حوالہ پیش کریں اور بتائیں کہ حضرت معاویہؓ نے کبھی رخصت پر عمل کیا ہو اور افضل کو چھوڑ دیا ہو؟ والسلام السائل۔ عبدالقادر حسن ابدال۔

جواب: صاحب نبراس حضرت علامہ عبدالعزیز پرہاروی لکھتے ہیں:-

ونحن نعترف بان معاویة وان کان عالماً وورعاً عادلاً دون الخلفاء الاربعة فی العلم والورع والعدل کما تری من التفاوت بین الاولیاء بل الملٰئکة والانبیاء فامارته وان کانت صحیحة باجماع الصحابة وتسلیم الحسن الا انھا لیست علیٰ منہاج خلافة من قبله فانه توسع فی المباحات وتحرزعنھا الخلفاء الاربعة.[2]

ترجمہ۔ اور ہم تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ باوجودیکہ بڑے عالم بڑے پرہیزگار اور بڑے انصاف پسند تھے۔ تاہم وہ خلفاء اربعہ سے ان امور میں ان سے نیچے تھے۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح تم اولیاء و ملائکہ اور پیغمبروں میں فرق دیکھتے ہو۔ پس امیر معاویہؓ کی امارت اگرچہ اجماعِ صحابہ اور سپرداری حسنؓ کے باعث بالکل صحیح تھی لیکن وہ

[1] طبقات ابن سعد جلد ۳ ص ۲۵ [2] الناہیہ عن طعن معاویہ ص ۲۴ طبع ملتان

پہلی خلافتوں کے منہاج پر نہ تھی کیونکہ آپ مباحاتِ شرعیہ میں توسع اور گنجائش سے کام لے لیتے اور خلفاء اربعہ اس سے بچتے (ہمیشہ زیادہ تورع اور احتیاط کی جانب اختیار کرتے)۔

حضرت عمرؓ نے وفات سے پہلے خلافت ایک شوریٰ کے سپرد فرمائی تھی۔ بیٹے کو باوجود اہل ہونے کے اس کمیٹی میں نہ رکھا تھا یہ تقوے کی انتہاء تھی۔ حضرت معاویہؓ نے بعض صحابہ کے کہنے اور مشورہ دینے سے اپنے بیٹے کو جانشین نامزد کیا گو بیٹے کو بنانا اسلام میں منع نہیں اور اس کے انکار پر کتاب وسنت میں کوئی نکیر وارد نہیں۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ افضل کام اس مہم کو شوریٰ کے سپرد کرنا تھا جیسا کہ حضرت عمرؓ نے کیا تھا۔ حضرت معاویہؓ نے اسی موقعہ پر جو کیا اس میں آپ نے افضل کو چھوڑ دیا اور افضل کو چھوڑ کر مفضول کو اختیار کرنا شریعت میں منع نہیں ہے۔ سو یہ کسی امرِ ممنوع کا ارتکاب نہیں نہ اس پر حضرت معاویہؓ کو ملامت کیا جا سکتا ہے۔

علامہ ابوالحسن علی بن محمد الماوردی (۴۵۰ھ) لکھتے ہیں:-

وقال الاکثر من الفقھاء والمتکلمین تجوز امامته وصحت بیعته ولا یکون وجود الافضل مانعاً من امامة المفضول اذا لم یکن مقصراً عن شروط الامامة.[1]

ترجمہ۔ اکثر فقہاء اور متکلمین کہتے ہیں (زیادہ درجے کے لوگوں کے ہوتے ہوئے بھی) مفضول کی امامت اور اس کی بیعت جائز ہے اور افضل کا پایا جانا مفضول کی امامت میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ بشرطیکہ وہ شروطِ امامت پورا کرنے سے قاصر نہ ہو۔

اور قاضی ابویعلی محمد بن الحسین الفرا (۴۵۸ھ) اپنی کتاب الاحکام السلطانیہ میں لکھتے ہیں:-

ویجوز ان یعھد الیٰ من ینتسب الیه بابوة او بنوة اذا کان المعھود له علیٰ صفات الائمة لان الامامة لا تنعقد للمعھود الیه بنفس العھد وانما تنعقد بعھد المسلمین.[2]

ترجمہ۔ اور جائز ہے کہ خلیفہ اسے ولی عہد بنائے جو اس کا باپ یا بیٹا ہو بشرطیکہ وہ ولی عہد ان شرطوں کو پورا کرے جو ائمہ میں ہونی چاہیئں کیونکہ امامت صرف اس نامزدگی سے قائم نہیں ہوتی وہ مسلمانوں کی بیعتِ عام سے ہوتی ہے (یعنی ولی عہد بنانا صرف ایک تجویز اور اپنی صوابدید کا اظہار ہے)۔

جو لوگ حضرت معاویہؓ کے استخلافِ یزید سے خوش نہیں وہ حضرت معاویہؓ پر صرف ترکِ افضل کا الزام لگا سکتے ہیں۔ یہ نہیں کہ آپ نے کسی ممنوع شرعی کا ارتکاب کیا ہے۔

[1] الاحکام السلطانیہ ص ۶ [2] الاحکام السلطانیہ ص ۹

قاضی ابوبکر بن العربی (۴۳ ۵ھ) لکھتے ہیں:۔

انا نقول ان معاویة ترك الافضل فی ان یجعلها شوری والا یخص بها احدًا من قرابته فکیف ولدًا۔[1]

ترجمہ۔ ہم کہتے ہیں حضرت معاویہؓ نے اس افضل کو ترک کیا کہ خلافت کو (حضرت عمرؓ کی طرح) شوریٰ میں رکھتے اور یہ اپنے قرابت میں سے کسی کو نہ دیتے چہ جائیکہ بیٹے کو۔

حضرت امیر معاویہؓ کی رائے اس موضوع میں یہ تھی کہ خلافت کے لیے اس شخص کو آگے کیا جانا چاہیے جو قوت کا مالک ہو صاحب الرائے ہو۔ حالات اور وقت کے تقاضوں کو اچھی طرح جانتا ہو۔ گو اسلام لانے میں اور حضرات اس سے سبقت لے گئے ہوں اور زہد و عبادت میں اس سے بڑھے ہوں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:۔

وکان رای معاویة فی الخلافة تقدیم الفاضل فی القوة والرای والمعرفة علی الفاضل فی السبق الی الاسلام والدین والعبادة فلهذا اطلق انه احق۔[2]

ترجمہ۔ حضرت معاویہؓ کی رائے خلافت میں اس شخص کو آگے کرنا تھی جو سلطنت سنبھالنے کی قوت تدبیر اور حالات کو جاننے میں ان سے آگے ہو جو اسلام لانے میں دیانت میں اور عبادت میں اس سے آگے ہیں اور اسی لیے آپ نے اطلاق رکھا کہ زیادہ حقدار وہی ہے۔

علامہ ابن خلدون بھی لکھتے ہیں:۔

وعدل عن الفاضل الی المفضول حرصًا علی الاتفاق واجتماع الاهواء الذی عند الشارع وان کان لا یظن بمعاویة غیر هذا فعدالته وصحبته مانعة من سوی ذلك۔[3]

ترجمہ۔ اور معاویہؓ نے فاضل سے مفضول کی طرف رجوع کیا تاکہ امت زیادہ سے زیادہ متفق رہ سکے اور زیادہ سے زیادہ اجتماع آراء قائم ہو اور امیر معاویہؓ سے اس کے علاوہ اور کسی چیز کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کا عادل ہونا اور صحابی رسول ہونا یہاں کسی بدگمانی کو جگہ دینے سے مانع ہے۔

بقول علامہ ابن خلدون حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہی صورت پیش آئی تھی اور انہوں نے اسی

[1] العواصم من القواصم ص۲۲۲ [2] فتح الباری جلد ۷ ص۳۲۴ [3] مقدمہ ابن خلدون ص۲۱۱ فصل نمبر۳۰

لیے اپنے بیٹے کو نامزد کیا کہ ان کی رائے میں بنو امیہ کو اکٹھا رکھنے کی اس کے سوا کوئی اور راہ نہ تھی کسی اور کو نامزد کرتے تو بنو امیہ اس پر اتفاق نہ کرتے۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ پھر حالات کا رُخ کیا ہوتا۔ اندیشہ تھا کہ شیرازۂ اسلام کہیں بالکل تار تار نہ ہو جائے۔ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:۔

والذی دعا معاویه لایثار ابنه یزید بالعهد دون من سواه انما هو مراعاة المصلحة فی اجتماع الناس واتفاق اهوائهم باتفاق اهل الحل والعقد علیه حینئذ من بنی امیه اذ بنو امیة یومئذ لا یرضون سواهم وهم عصابة قریش واهل الملة اجمع واهل الغلب منهم فاثره بذلك دون غیره ممن یظن انه اولی بها۔[1]

ترجمہ۔ وہ بات جس نے امیر معاویہؓ کو اپنے بیٹے یزید کے ولی عہد بنانے پر آمادہ کیا اور آپ کسی اور کی طرف نہ گئے وہ لوگوں کو اکٹھا رکھنے اور اس وقت بنو امیہ کے اہل حل و عقد کے اس پر متفق رہنے سے پوری قوم کی خواہشات کو مجتمع رکھنے کی مصلحت کے لیے تھا۔ بنو امیہ اس وقت اپنے سوا کسی اور پر راضی نہ ہو سکتے تھے اور وہ قریش کی ایک بڑی قوت تھے اور ملت کی بڑی جمعیت تھے اور غلبہ انہی کا تھا۔ سو آپ نے اس لیے اپنے بیٹے کو اس میں ترجیح دی اور کسی اور کو نہ چنا جس کے بارے میں گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس سے اولیٰ اور بہتر تھا۔

علامہ ابن خلدون ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔

وکذلك عهد معاویة الی یزید خوفًا من افتراق الکلمة بما کانت بنو امیة لم یرضوا تسلیم الامر الی من سواهم فلو قد عهد الی غیره اختلفوا علیه مع ان ظنهم کان به صالحًا ولا یرتاب احد فی ذلك ولا نظن بمعاویة غیره فلم یکن لیعهد الیه وهو یعتقد ما کان علیه من الفسق حاشا الله لمعاویة من ذلك۔[2]

ترجمہ۔ اور اسی لیے امیر معاویہؓ نے یزید کو ولی عہد بنایا۔ مبادا اس بات سے کہ بنو امیہ اپنے سوا کسی اور کو حکومت سپرد کرنے کے لیے راضی نہ تھے پوری امت کہیں ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائے۔ آپ کسی اور کو مقرر کرتے تو وہ (بنو امیہ) اس سے بگڑ جاتے اور یہ بھی ہے۔ کہ ان کا پہلے کا گمان یزید کے بارے میں اچھا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کر سکتا — اور نہ معاویہؓ کے بارے میں اس کے سوا کوئی گمان کیا جا سکتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ

[1] مقدمہ ابن خلدون ص۲۶۳ [2] ایضاً ص۲۶۵

کو یزید کے فسق کا بھی پتہ ہو اور آپ پھر اسے مقرر کریں۔ حاشا و کلّا امیر معاویہؓ ایسا ہرگز نہیں کر سکتے تھے۔

حضرت امیر معاویہؓ سفرِ آخرت پر روانہ ہونے کو تھے جب آپ نے سلطنتِ اسلامی کا یہ اہم فیصلہ کیا ــــ کیا آپ کے سامنے اس وقت دُنیا کی کشش تھی؟ اس کے لیے آپ کے یہ الفاظ آج بھی تاریخ میں محفوظ ہیں جو آپ نے اپنی الوداعی دعا میں کہے:۔

اللّٰھم ان کنت انما عہدت لیزید لما رایت من فضلہ فبلغہ ما املت واعنہ وان کنت انما حملنی حب الوالد لولدہ وانہ لیس باھل فاقبضہ قبل ان یبلغ ذالک۔[1]

ترجمہ: اے اللہ! اگر میں نے یزید کو اس لیے ولی عہد بنایا ہے کہ میں نے اس میں قابلیت دیکھی ہے تو تو اسے اس درجے تک پہنچا جس کی میں نے اُمید باندھی ہے اور اس کی مدد فرما اور اگر مجھے اس پر اس محبت نے آمادہ کیا ہے جو باپ کو اپنے بیٹے سے ہوتی ہے اور وہ اس کا اہل نہیں ہے تو تو اسے اٹھا لے اس سے پہلے کہ وہ اس تک پہنچے۔

کیا آپ اب بھی اس گہرائی تک نہیں پہنچے جس تک اُتر کر حضرت معاویہؓ نے اجتماع کلمہ امت کی فکر کی تھی کہ کہیں آپ کے بعد سلطنت اسلامی کسی غیر مسلم نرغے میں نہ آجائے اور کوئی بیرونی طاقت مسلمانوں کو نہ لپیٹ سکے۔

قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی رائے بھی یہی ہے کہ اس وقت تک یزید کا فسق کہیں ظاہر اور ثابت نہ تھا اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حضرت معاویہؓ جیسے جلیل القدر، فقیہ الامت، کاتبِ وحی صحابی کسی کھلے فاسق و فاجر کو اپنا جانشین مقرر کریں ایسے وقت (آخری وقت میں) تو گنہگار بھی تائب ہو جاتے ہیں اور آخرت نظر آتے ہوئے کون ایسا ارتکاب کر سکتا ہے کہ شریعت کے ایک کھلے باغی کو امت کی گردنوں پر سوار کر جائے اور پھر یہ کام وہ شخص کرے جس کے دست حق پرست پر سیدنا حضرت حسنؓ اور حسینؓ دونوں بیعت کر چکے ہوں۔ حاشا و کلّا ایسا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت گنگوہیؒ لکھتے ہیں:۔

یزید مومن تھا بسبب قتل کے فاسق ہوا۔[2]

حضرت معاویہؓ نے یزید کو خلیفہ کیا تھا اس وقت اچھی صلاحیت میں تھا۔[3]

یزید اوّل صالح تھا بعد حالات کے خراب ہوا تھا۔[4]

---

[1] تاریخ دول الاسلام للذہبی جلد ۲ صـ ۲۶۷ البدایہ جلد ۸ صـ ۸۰ و تاریخ صـ ۵۶ [2] فتاوی رشیدیہ صـ ۶۳ [3] ایضاً صـ ۲۴۲ [4] ایضاً صـ ۲۶۲

سوال: تاریخ میں شیعانِ علی کا ذکر کب سے ملتا ہے۔ نیز بتائیں کہ اس نے ایک مذہبی فرقے کی صورت کب سے اختیار کی؟ یہ بھی بتلائیں کہ اب یہ کسی مذہبی گروہ کا نام ہے یا ایک سیاسی تحریک ہے جو عالمِ اسلام پر عجمی غلبے کے حق میں ہے؟ سائل: (حافظ) محمد الیاس

جواب: الحمد للّٰہ وسلامٌ علی عبادہ الذین اصطفیٰ. اما بعد:۔

تاریخ میں شیعانِ علیؓ سب سے پہلے اس گروہ کو کہا گیا ہے جو حضرت علی المرتضیٰؓ کے خلافت پر آنے سے پہلے لوگوں میں بنو اُمیہ اور بنو ہاشم کے مابین سیاسی فاصلے قائم کرنا چاہتے تھے۔ سیدنا حضرت عثمانؓ بنو اُمیہ میں سے تھے اور حضرت علی المرتضیٰؓ بنو ہاشم میں سے ــــ صحابہؓ کے ہاں دونوں ایک جیسے بزرگ تھے ــــ مگر کچھ لوگوں نے حضرت علیؓ سے پوچھے بغیر ان کے گرد عقیدت کے ایسے دائرے کھینچ لیے تھے کہ خود حضرت علیؓ کو اُن سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا تھا۔ پھر یہ لوگ برسرِ عام حضرت عثمانؓ کے خلاف اُٹھے اور حضرت علی المرتضیٰؓ سے پُوچھے بغیر انہوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف بغاوت کے جھنڈے اُٹھا لیے اور بالآخر آپ کو شہید کر کے دم لیا۔

حضرت علی المرتضیٰؓ اور حضرات حسنینؓ آخر دم تک حضرت عثمانؓ کے ساتھ رہے۔ یہ حضرات خود باغیوں کے خلاف اس لیے نہ اُٹھے کہ اسلام میں امیر المؤمنین کی اجازت کے بغیر کوئی فوجی کارروائی نہ ہو سکتی تھی اور حضرت عثمانؓ اپنی حمایت میں کسی کو لڑنے اور اپنے باغیوں کی سرکوبی کرنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔

حضرت علی المرتضیٰؓ بلاشبہ حضرت عثمان کے وفاداروں میں رہے اور حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد بھی آپ نے ان کے خلاف کوئی ایک کلمہ نہ کہا۔ آپ اپنی خلافت کو انہی حضرات سے متصل سمجھتے تھے اور اسے حضورؐ سے بلافصل نہ جوڑتے تھے۔ لیکن آپ کے اردگرد کچھ ایسے لوگ تھے جو حضرت عثمانؓ کے خلاف شریک بغاوت رہے تھے اور اب وہ کھلے بندوں حضرت عثمانؓ، امیر معاویہؓ اور حضرت عمرو بن عاصؓ کو سبّ و شتم کرتے تھے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو شیعانِ علی میں سے کہتے لیکن عملاً انہیں خاندانِ علی سے کوئی عقیدت نہ تھی۔ یہ شیعانِ علی کا آغاز ہے اور حضرت علیؓ یقیناً ان سے کھلے فاصلے پر تھے۔

عبداللہ بن سبا یہودی نے صفِ اسلام کو توڑنے کے لیے حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت کے آخر میں بغاوت کے کچھ کانٹے بکھیرے۔ اس نے حضرت علیؓ کی طرف داری محض اس لیے کی کہ اس کے بغیر صفِ اسلام کو توڑنا ممکن نہ تھا۔ اسے حبِ علی سے غرض نہ تھی بنو اُمیہ سے بغض درکار تھا اور شوکتِ اسلام کو توڑنا اس کا نقطۂ انقلاب تھا۔

عبداللہ بن سبا نے جن بڑے لوگوں کو حضرت عثمانؓ کے خلاف اُکسایا اُن میں محمد بن ابی بکر بھی آگیا یہ حضرت علیؓ کا پروردہ تو تھا مگر حضرت عثمانؓ کی مخالفت میں بالکل بے راہ ہو گیا تھا۔ حضرت علیؓ کے راستے پر نہ تھا۔ صحابہؓ کے مقابلے میں جب تک صحابہؓ کو نہ لایا جائے عبداللہ بن سبا کی کوئی بات سُنی نہ جا سکتی تھی اور کوئی اس کے پھندے میں نہ آسکتا تھا۔ اس نے یہی کیا کہ حضرت علی المرتضیٰؓ کا نام لے کر یہ اپنی کاروائی کرتا رہا۔ محمد بن ابی بکر کو حضرت عثمانؓ کے خلاف اُکسانے کے لیے حضرت عثمانؓ کے ایک خط میں کچھ جعلی کاروائی کی گئی۔ حضرت عثمانؓ نے محمد بن ابی بکر کو مصر کا والی بنا کر روانہ کیا تو اہل مصر کے نام خط لکھا کہ محمد بن ابی بکر کو والی تسلیم کرو۔ سازش سے خط یوں بنا ڈالا گیا کہ محمد بن ابی بکر کو پہنچتے ہی قتل کر دو —— محمد نے یہ خط پڑھ لیا اور حضرت عثمانؓ کے خلاف ہو گیا۔ تاہم آپ کے آخری وقت میں اُسے شرم آگئی اور وہ پیچھے ہٹ گیا۔

شیعیت کی ابتداء ہو چکی تھی۔ حضرت علیؓ اور ان کے بیٹے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ حضرت عثمانؓ کے وفاداروں اور پہرے داروں میں تھے اور اُن کا ربیب محمد بن ابی بکر سبائیوں کی سازش کا شکار تھا۔ جب یہ مصر میں مارا گیا تو حضرت علیؓ نے فرمایا۔ اگر میں ہاشم بن عتبہ کو مصر کا والی بناتا تو وہ اہل مصر کو کبھی ہلنے نہ دیتا۔ افسوس کہ محمد بن ابی بکر ان کے سامنے ٹھہر نہ سکا۔

وقد اردت تولية مصر هاشم بن عتبة ولو وليته اياها لما خلى لهم العرصة ولا انهزم الفرصة۔[1]

ترجمہ۔ میں نے ہاشم بن عتبہ کو مصر کا والی بنانا چاہتا تھا اور اگر میں اسے مصر کا والی بنا دیتا تو یہ انہیں (اہل مصر کو) کوئی راہ نہ دیتا اور ایک لمحہ بھی پیچھے نہ ہٹتا۔

جس طرح محمد بن ابی بکر سبائیوں کے ہاتھ چڑھا، طبقہ تابعین کے اور کئی لوگ بھی ان کی سازشوں میں شریک ہو گئے۔ ان میں ایک شخص حجر بن عدی بھی تھا جو بظاہر صالح اور پرہیزگار تھا۔ مگر اندر سے وہ سبائی فتنے کا شکار ہو چکا تھا۔ اس وقت تک یہ فتنہ محض ایک سیاسی فتنہ تھا۔ ابھی تک اس نے مذہب کی شکل اختیار نہیں کی تھی۔

حجر بن عدی کوفہ کے قبیلہ کندہ میں سے تھا اور تابعی تھا۔ بعض لوگوں نے اسے صحابی بھی کہا ہے۔ مگر بیشتر محدثین اسے صحابی تسلیم نہیں کرتے۔[2] اس کے اردگرد کچھ اور لوگ بھی تھے جن کا کام حضرت عثمانؓ کے والیوں کو بُرا بھلا کہنا تھا۔ یہ شیعانِ علی تھے مگر حضرت علیؓ نہ ان کے ساتھ تھے اور نہ ان میں سے تھے۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:۔

---

[1] نہج البلاغۃ جلد ۱ ص ۱۱۶ [2] الاصابہ جلد ۱ ص ۳۱۳ [3] البدایہ جلد ۸ ص ۵۰

انهم كانوا ينالون من عثمان ويطلقون فيه مقالة الجور وينتقدون على الامراء ويسارعون في الانكار عليهم ويبالغون في ذلك ويتولون شيعة علي و يتشددون في الدين۔[1]

ترجمہ۔ وہ حضرت عثمانؓ کی شکایت کرتے اور اُن کے بارے میں زیادتی کی بات کہتے تھے ان کے اُمراء پر تنقید کرتے اور ان سے انکار میں جلدی کرتے اس میں مبالغہ کرتے اور ان لوگوں سے دوستی رکھتے جو اپنے آپ کو حضرت علیؓ کی پارٹی بتاتے اور دین میں تشدد کرتے۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد یہ لوگ حضرت علیؓ کے گرد اس چال سے جمع ہوئے کہ یہ لوگ اُن کی کوئی بات چلنے نہ دیتے تھے۔ امیر معاویہؓ کو برسرِ عام بُرا بھلا کہتے اور حضرت علیؓ انہیں کہتے کہ میں تمہارے ان اعمال سے سخت نالاں ہوں۔ شریف رضی (۴۰۴ھ) لکھتا ہے آپ نے انہیں برملا کہا کہ میں تمہارے اس سب وشتم سے سخت بے زار ہوں:۔

وقد سمع قوماً من اصحابه يسبون اهل الشام ايام حربهم بصفين اني اكره لكم ان تكونوا سبابين ...... ولو قلتم مكان سبكم اللهم احقن دمائنا و دمائهم واصلح ذات بيننا وبينهم۔[2]

ترجمہ۔ اور آپ نے اپنی پارٹی بننے والوں میں سے بعض کو اہل شام کے بارے میں بُرا بھلا کہتے سُنا۔ یہ جنگ صفین کے دن تھے۔ آپ نے کہا میں اسے ناپسند کرتا ہوں کہ تم اہلِ شام کو بُرا بھلا کہو —— کاش کہ تم انہیں بُرا کہنے کی بجائے یہ دُعا کرتے۔ اے اللہ ہماری اور ان کی جانوں کو بچا اور ہمارے اور ان کے مابین اچھے حالات پیدا کر۔

شیعی مؤرخ دینوری لکھتا ہے کہ یہ لوگ حجر بن عدی، عمرو بن الحمق اور ان کے ساتھی تھے انہوں نے اُلٹا حضرت علیؓ سے کہا:۔

لم تمنعنا من شتمهم ولعنهم؟

آپ نے فرمایا:۔

كرهت لكم ان تكونوا شتامين لعانين ولكن قولوا اللهم احقن دمائنا ودمائهم واصلح ذات بيننا وبينهم۔[3]

---

[1] البدایہ جلد ۸ ص ۵۰ [2] نہج البلاغۃ جلد ۱ ص ۴۲۴ [3] اخبار الطوال ص ۱۶۵

ترجمہ۔ مجھے ناپسند ہے کہ لعنت کرنے والے اور (اہل شام کو) گالی دینے والے ہو اس کی بجائے تم یہ کہو اے اللہ ہمارے اور اُن کے خون بچا اور ہم میں اور اُن میں حالات اچھے پیدا کر۔

اپنی زور آوری سے انہوں نے حضرت علیؓ کا یہ حال کر رکھا تھا کہ آپ کو جب صحابہؓ نے کہا کہ جن لوگوں نے حضرت عثمانؓ پر چڑھائی کی آپ انہیں پکڑتے کیوں نہیں تو آپ نے فرمایا :۔

انی لست اجہل ما تعلمون ولکن کیف لی بقوۃ والقوم المجلبون علی حد شوکتہم یملکوننا ولا نملکہم۔[1]

ترجمہ۔ میں اس سے ناواقف نہیں جو تم جانتے ہو لیکن میری طاقت ہی کب ہے (کہ میں انہیں پکڑ سکوں) اور وہ اپنی پوری شوکت سے چھائے ہوئے ہیں وہ ہم پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں ہم ان پر حکومت نہیں کر رہے۔

حضرت علیؓ کی بے بسی تھی جو انہوں نے آپ کے پورے ماحول پر مسلط کر رکھی تھی لیکن یہ لوگ دل سے حضرت علیؓ اور ان کے خاندان کے خیر خواہ نہ تھے۔ اس خاندان کی خیر خواہی کا دم اسی حد تک بھرتے جس حد تک بنو امیہ کو بُرا بھلا کہنے کا انہیں موقع مل سکے حبِ علی سے غرض نہ تھی محض بغضِ معاویہؓ درکار تھا اور ایسی پالیسی تھی کہ قومی بے وفائی پر۔ یہ آج تک ضرب المثل چلی آرہی ہے۔

جب حضرت حسنؓ نے سیدنا امیر معاویہؓ سے صلح کی اور خلافت اُن کے سپرد کر دی تو جو شخص حضرت حسنؓ کو سب سے پہلے اعتراض کرنے کے لیے ملا وہ یہی حجر بن عدی تھا۔ اس نے ان الفاظ میں حضرت حسنؓ کو مخاطب کیا :۔

یا ابن رسول اللہؐ لوددت انی مت قبل ما رأیت، اخرجتنا من العدل الی الجور فترکنا الحق الذی کنا علیہ ودخلنا فی الباطل الذی کنا نھرب منہ و اعطینا الدنیّۃ من انفسنا وقبلنا الخسیسۃ التی لم تلق بنا۔[2]

ترجمہ۔ اے حسنؓ میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ میں مر جاتا اور اس صورت (صلح) کو نہ دیکھتا ـــــ تُو نے ہمیں عدل سے نکال کر ظلم کی طرف جھونک دیا ہے ہم نے اس حق کو جس پر ہم تھے چھوڑ دیا ہے۔ ہم اس باطل میں داخل ہو چکے ہیں جس سے ہم بھاگتے تھے اور ہم نے اپنے نفوس کو کمینگی دی ہے اور ہم نے وہ خفت قبول کر لی ہے جو ہمیں اب تک نہ آئی تھی۔

---

[1] اخبار الطوال ص۲۱۵ [2] ایضاً ص۲۲۰

ذرا غور کیجیے حضرت حسنؓ کو اس نیک کام پر (جس پر حضورؐ نے انہیں سید فرمایا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں میں صلح کرائے گا) جابر اور ظالم کہنے والا انہیں تارکِ حق کہنے والا انہیں داعیٔ باطل کہنے والا کیا دل کی گہرائیوں سے اولادِ رسول کی تعظیم کرنے والا ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ پھر معلوم نہیں شیعہ علماء حجر بن عدی کے بارے میں کیوں نرم گوشہ رکھتے ہیں۔

حجر بن عدی کی یہ تمام کوششیں حبِ علی یا خاندانِ رسول کی عظمت کے لیے ہرگز نہ تھیں۔ یہاں حبِ علی سے غرض نہ تھی۔ صرف بغضِ معاویہ درکار تھا۔ یا بنو امیہ اور بنو ہاشم کے خاندانی فاصلوں کو اور بڑھانے کی ایک یہودیانہ سازش تھی۔

پھر اس شخص نے حضرت حسنؓ کی مخالفت میں حضرت حسینؓ کو کھڑا کرنے کی بھی کوشش کی۔ حجر بن عدی عبیدہ بن عمرو کو ساتھ لے کر حضرت حسینؓ کے پاس آیا اور کہا :۔

دع الحسن ما رای من ھذا الصلح واجمع الیک شیعتک من اھل الکوفۃ و غیرھا ولنی وصاحبی ھذہ المقدمۃ فلا یشعر ابن ھند الا ونحن نقارعہ بالسیوف۔[1]

ترجمہ۔ آپ حسنؓ کا ساتھ چھوڑ دیں اور انہوں نے جو یہ صلح کی ہے اُسے رہنے دیں۔ کوفہ اور دوسرے علاقوں سے اپنے ساتھیوں کو جمع کریں اور مجھے اور میرے اس ساتھی کو یہ کام سپرد کریں معاویہؓ کو پتہ ہی اس وقت چلے جب ہم تلواریں لے کر اس پر جا پہنچیں۔

اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ شیعہ کا عقیدۂ امامت اس وقت تک قائم نہ ہوا تھا۔ ورنہ وہ لوگ حضرت حسینؓ کو حضرت حسنؓ کے مقابلہ میں لانے کی کوشش نہ کرتے۔ عقیدہ امامت اس کی اجازت نہیں دیتا کہ دوسرے امام کو چھوڑ کر ــــ وہ تیسرے امام پر آ جائیں ــــ آگے حضرت حسینؓ کا جواب بھی سُنیں ــــ

حضرت حسینؓ نے اس کی بات نہ مانی اور فرمایا :۔

انا قد بایعنا وعاھدنا ولا سبیل الیٰ نقض بیعتنا۔[2]

ترجمہ۔ بے شک ہم نے (امیر معاویہؓ کی) بیعت کر لی ہے اور (ان سے) عہد باندھا ہے۔ اب ہمارے پاس اپنی بیعت کو توڑنے کی کوئی راہ نہیں (اسے توڑنے کا کوئی جواز نہیں)۔

اس صورت حال سے پتہ چلتا ہے کہ حجر بن عدی باوجود لبادہ زہد و عبادت کے قانون کی نظر میں مفسد تھا۔ دورِ اوّل کی شیعیت یہی تھی اور ان کا موضوعِ سیاست بنو امیہ اور بنو ہاشم کے اختلافات کو

---

[1] اخبار الطوال ص۲۲۰ [2] ایضاً ص۲۲۰

بڑھانا اور بنوامیہ سے نفرت پھیلانا تھا۔ حضرت عمرؓ کے دور میں اس نے جنگ قادسیہ میں حصہ لیا تھا اور جنگ صفین میں حضرت علی المرتضیٰؓ کے طرفداروں میں تھا لیکن حضرت معاویہؓ کے دور میں یہ مفسدین میں تھا اور حضرت حسنؓ اور حسینؓ کی پالیسی کو کھلے بندوں غلط کہتا۔ اس کی ہر کوشش ہوتی کہ جس طرح بھی بن پڑے حضرت حسنؓ کی صلح کو سبوتاژ کیا جائے۔

کوفہ میں امیر معاویہؓ کے امیر مغیرہ بن شعبہؓ (۵۰ ھ) صحابی رسول تھے۔ جب وہ خطبہ دیتے تو یہ درمیان میں[1] بول پڑتا۔ آپ درگزر سے کام لیتے۔ حضرت مغیرہؓ کے بعد زیاد والیٔ کوفہ ہوا تو اس نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے حضرت امیر معاویہؓ کے پاس بھیج دیا۔ اس پر الزام یہ تھا کہ اس نے خلیفۂ وقت کو کھلم کھلا بُرا بھلا کہا ہے اور امیر کوفہ سے مقابلہ شروع کر رکھا ہے اور کہتا ہے کہ خلافت حضرت حسین کو دی جانی چاہیئے[2] یہ بنوامیہ اس پر کیوں مسلط ہوئے ہیں۔

ابن جریر طبری لکھتا ہے :۔

ان حجرًا جمع الیہ الجموع واظہر شتم الخلیفۃ ودعا الی حرب امیر المومنین وزعم ان ھٰذا الامر لا یصلح الا فی آل علی بن ابی طالب ووثب المصر واخرج عامل امیر المومنین ...... وان ھٰؤلاء النفر الذین معہ ھم رؤوس اصحابہ وعلی مثل رایۃ۔[3]

ترجمہ۔ بے شک حجر بن عدی نے اپنے پاس لوگوں کو جمع کر لیا ہے۔ خلیفہ وقت کو بُرا بھلا کہنا اعلانیہ شروع کر دیا ہے۔ امیر المؤمنین سے جنگ کرنے کی دعوت دے دی ہے اور یہ عقیدہ بنائے بیٹھا ہے کہ حکومت حضرت علیؓ کی اولاد کے سوا اور کسی طرف نہ جائے۔ شہر پر وہ آدھمکا ہے اور امیر المومنین کے عامل کو وہاں سے نکال دیا ہے ...... اور یہ لوگ جو اس کے ساتھ ہیں وہ بھی اسی رائے اور عقیدہ پر ہیں۔

اس پر حضرت معاویہؓ نے شہادت طلب کی۔ سب نے گواہی دی کہ حجر بن عدی نے حکومت سے محاربہ قائم کر رکھا ہے :۔

فشہدوا کلھم ان حجرًا اجتمع الجموع واظہر شتم معاویۃ ودعا الی حربہ۔[4]

ترجمہ۔ سب گواہوں نے گواہی دی کہ حجر فوجوں میں آ لگا ہے معاویہؓ کو کھلی گالی دیتا ہے

---

[1] دیکھئے البدایہ جلد ۸ صفحہ ۵۰ [2] انہ سب الخلیفۃ وانہ حارب الامیر وانہ یقول ان ہذا الامر لا یصلح الا فی آل علی ابن ابی طالب صفحہ ۵۱ [3] طبری صفحہ ۱۵۰ جلد ۶ [4]

اور اپنی علیحدہ پارٹی بنا لی ہے۔

ان گواہوں میں حضرت وائل بن حجر، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے بیٹے، حضرت طلحہؓ کے بیٹے، اور بھی کئی لوگ تھے۔ قانونِ شریعت کی رو سے یہ اور اس کے ساتھی گردن زدنی تھے۔ اسلام میں مسئلہ امن اور سلامتی سلطنت کو اولیت دی گئی ہے۔ گو حضرت معاویہؓ بہت حلیم الطبع تھے اور سیاسی انتقام پسند نہ کرتے تھے لیکن اب ان باغیوں کے قتل کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ عذراء کے مقام پر ان چھ افراد کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیا گیا۔[1]

حضرت ام المومنینؓ کو اس صورتِ حال کا تفصیلی علم نہ تھا۔ انہوں نے حضرت معاویہؓ سے حجر بن عدی کی سزا کا شکوہ کیا تو حضرت معاویہؓ نے فرمایا :۔

لست انا قتلتھم انما قتلھم من شھد علیھم۔[2]

ترجمہ۔ میں نے انہیں قتل نہیں کیا ان کے قتل کا باعث وہ لوگ ہیں جنہوں نے اُن پر (بغاوت کی) گواہی دی ہے۔

ایک اور روایت میں ہے :۔

وجدت فی قتلہ صلاح الناس وخفت من فسادھم۔[3]

ترجمہ۔ اس کے قتل میں عوام کا فائدہ تھا اور مجھے اندیشہ تھا کہ ان کا حال اور بگڑے گا۔

حضرت ام المؤمنینؓ نے کہا :۔

این غاب عنک حلمک حین قتلت حجرًا فقال حین غاب مثلک من قومی۔[4]

ترجمہ۔ اے معاویہؓ تمہارا حلم (بردباری) کہاں گیا تھا جب تم نے حجر بن عدی کے قتل کا حکم دیا تھا؟ آپ نے کہا جب آپ جیسی ہستیاں دور تھیں تو یہی ہونا تھا۔

تاریخ گواہ ہے کہ پھر جو ہونا تھا ہو کر رہا۔ انما نحکم بظواھر الشریعۃ واللہ یتولی السرائر۔

ان تفصیلات سے پتہ چلتا ہے کہ شیعیت ابتداء میں صرف ایک سیاسی گروہ بندی کی صورت میں تھی اور امامت کا عقیدہ ابھی ان میں نہ آیا تھا۔ حکومت کے آسمانی حق کا عقیدہ انہیں ایران سے ملا جو ساسانی بادشاہوں کو حکومت کا آسمانی حق دیتے تھے۔

شیعیت جب سیاسی میدان میں نہ ٹھہر سکی تو اس نے ایک مذہبی شکل اختیار کی اور خاندانِ رسالت

---

[1] یہ چھ حجر بن عدی، شریک بن شداد، صیفی بن فسیل، قبیصہ بن ضبیعہ، معرز بن شہاب اور کرام بن حسان تھے۔ [2] طبری جلد ۶ صفحہ ۱۵۶ [3] تاریخ الاسلام ذہبی جلد ۲ صفحہ ۲۷۶ [4] البدایہ جلد ۸ صفحہ ۵۵

کے آسمانی حق امامت کا عقیدہ وضع کرلیا۔ یورپ کے مستشرقین بھی لکھتے ہیں کہ شیعیت کی زیادہ تر دلالتیں عجمی ہیں۔ ان کی اصل الاصول ان کی کتاب الکافی ہے جو محمد بن یعقوب الکلینی (۳۲۹ھ) نے لکھی۔ اُن کی دوسری حدیث کی کتابیں اس کے بعد کی ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مذہب باقاعدہ صورت میں چوتھی صدی میں مرتب ہونا شروع ہوا۔ ان کے سلسلۂ امامت کے گیارہویں فرد امام حسن عسکری تیسری صدی ہجری کے وسط میں فوت ہوئے اور ائمہ کی روایات ابھی جاری تھیں کہ بارہویں امام المولود (۲۵۴ھ) بھی غیبت صغریٰ میں چلے گئے۔ اہل سنت کے ہاں یہ دور امام بخاریؒ (۲۵۶ھ) اور امام مسلمؒ (۲۶۲ھ) کا دور تھا اور ان کا دین اس سے ڈھائی سو سال پہلے مکمل ہو چکا تھا اور اس کے بعد وہ کسی آسمانی مامور کے قائل نہیں رہے۔

موجودہ دور میں شیعہ زیادہ تر اثنا عشری ہیں۔ اہلسنت رواۃ حدیث میں اگر کہیں کوئی شیعہ راوی ہے تو وہ اثنا عشری نہیں۔ اثنا عشری شیعوں کی روایات اہل سنت محدثین قبول نہیں کرتے۔ الّا یہ کہ انہیں اس کے عقیدہ کا پتہ نہ چلے۔ اس دور میں شیعہ کا تعارف زیادہ تر ایک مذہبی گروہ کی حیثیت سے ہے۔ لیکن ان کی سیاسی سرگرمیوں کو نظرِ غائر سے دیکھا جائے تو یہ اب بھی ایک سیاسی تحریک کی صورت میں کام کرتے نظر آئیں گے اور یہ ہر وقت منتظر ہیں کہ کب امام مہدی کا ظہور ہو جو عالم اسلام پر عربوں کے موجودہ غلبے سے انہیں نجات دلائے۔ ان کا بس چلے تو یہ حرمین شریفین میں بھی سیاسی نعرے لگا دیں جو عبادت کی جگہیں ہیں۔ جہاں داخل ہونے والا ہمیشہ کا امن پاتا ہے۔

یہ ایک مختصر تبصرہ ہے جو آپ کے سوال کے مختلف پہلوؤں کو شامل ہے وللتفصیل مقام آخر۔

واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔ کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: حضرت حسنؓ جب فوت ہوئے تو اس کا حضرت امیر معاویہؓ پر طبعی اثر کیا رہا؟ ایک صاحب نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ جب امیر معاویہؓ کو حضرت امام حسنؓ کی وفات کی خبر پہنچی تو آپ کے پاس مقدام بن معدیکرب اور ان کے ساتھ دو اور ساتھی تشریف فرما تھے۔ حضرت مقدام نے یہ خبر سُن کر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا ایک شخص نے اس پر تعجب کیا اور کہا۔ کیا تم اسے کوئی مصیبت خیال کرتے ہو؟ دوسرے نے کہا یہ ایک چنگاری تھی جسے خُدا نے بجھا دیا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ روایت صحیح ہے تو کیا حضرت امیر معاویہؓ وفات حسنؓ سے خوش ہوئے تھے۔ اس کی تفصیل درکار ہے؟

سائل۔ عصمت اللہ خانیوال

جواب: یہ غلط ہے جب حضرت امام حسنؓ کی وفات کی خبر حضرت امیر معاویہؓ کو ملی تو آپ کے پاس حضرت

عبداللہ بن عباسؓ بیٹھے تھے۔ آپ ہاشمی ہونے کے ناطے حضرت حسنؓ کے اقرباء میں سے تھے۔ حضرت معاویہؓ نے یہ خبر سُنتے ہی ہی حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے تعزیت کی اور حضرت ابن عباسؓ نے بھی بہت اچھے کلمات جواباً کہے۔ اس روایت کے ہوتے ہوئے کسی کمزور اور بے بنیاد روایت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

حافظ ابن کثیر دمشقی (۷۷۴ھ) جو اہلِ دمشق کو زیادہ جاننے والے ہیں روایت کرتے ہیں:۔

فلما جاء الکتاب بموت الحسن بن علی اتفق کون ابن عباس عند معاویۃ و عزّاہ فیہ باحسن تعزیۃ وردّ علیہ ابن عباس ردّاً حسناً کما قدمنا۔[1]

ترجمہ۔ جب حضرت حسنؓ بن علیؓ کی وفات کا خط آیا تو اتفاق سے حضرت ابن عباسؓ امیر معاویہؓ کے پاس موجود تھے۔ حضرت معاویہؓ نے ان سے حضرت حسنؓ کی وفات پر بڑے اچھے الفاظ میں تعزیت کی اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بھی نہایت اچھے الفاظ میں اس کا جواب دیا جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔

امیر معاویہؓ نے حضرت ابن عباسؓ کو یہ بھی کہا:۔

لا یسوءک اللہ ولا یحزنک فی الحسن بن علی فقال ابن عباس لمعاویۃ لا یحزننی اللہ ولا یسوءنی ما ابقی اللہ امیر المؤمنین۔[2]

ترجمہ۔ تمہیں خدا تکلیف سے بچائے اور حسن بن علی کے بارے میں غمگین نہ ہونے دے۔ اس پر حضرت ابن عباس نے کہا۔ اللہ تعالیٰ مجھے غمگین نہ ہونے دیں گے اور مجھے کوئی تکلیف نہ ہونے دیں گے جب تک امیر المؤمنین (حضرت معاویہؓ) زندہ ہیں۔

مقدام بن معدیکرب (۸۷ھ) کی روایت جو آپ نے لکھی ہے بقیہ ابن الولید سے مروی ہے وہ جس سے عن (سے) کہہ کر روایت کرے محدثین اس کا اعتبار نہیں کرتے۔

قال ابو مسہر احادیث بقیۃ لیست نقیہ فکن منہا علی تقیۃ..... قال ابن خزیمہ لا احتج ببقیہ۔[3]

ترجمہ۔ بقیہ کی روایت کردہ احادیث ستھری نہیں اُن سے بچ کر رہنا..... ابن خزیمہ کہتے ہیں میں بقیہ کی روایت سے سند نہیں لیتا۔

اور امام بیہقی کہتے ہیں:۔

اجمعوا علی ان بقیۃ لیس بحجۃ۔[4]

---

[1] البدایہ جلد ۸ صفحہ ۱۳۶ [2] ایضاً صفحہ ۱۳۸ [3] میزان الاعتدال جلد ۱ صفحہ ... [4] تہذیب التہذیب جلد ۱ صفحہ ۴۷۸

ترجمہ. محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ بقیہ روایت میں لائق احتجاج نہیں ہے۔

پھر یہ کہنے والا کہ کیا تم حضرت حسنؓ کی وفات کو مصیبت سمجھتے ہو؟ کون تھا روایت میں جو اسے قال فلاں سے ذکر کیا گیا ہے. اسے حضرت معاویہؓ کا قول بتانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ پھر معلوم نہیں یہ کہنے والا کون تھا جمرۃ اطفأ اللہ. اتنا تو پتہ چلتا ہے کہ وہ بنو اسد میں سے تھا لیکن کون تھا اس کا پتہ نہیں مل سکا. معلوم ہوتا ہے یہ تینوں باتیں ان تین آنے والوں کے مابین ہی ہوئی ہیں. حضرت معاویہؓ ان میں شامل نہیں ہوئے.

پھر اس روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت مقدام نے اس ناراضگی میں کہ حضرت معاویہؓ کی مجلس میں ایسی باتیں کیوں ہوئیں حضرت معاویہؓ پر کچھ الزامات لگائے جن میں ایک اعتراض ریشم پہننے کا تھا. یہ الزام دوسری شہادت کے قطعاً خلاف ہے. حضرت امیر معاویہؓ نے خود کئی دفعہ خطبہ جمعہ میں بیان فرمایا کہ شریعت میں مردوں کے لیے ریشم پہننا حرام ہے[1] پھر یہ بات حضرت مقدام نے نہ صرف اس شخص کو غصہ دلانے کے ارادہ سے کہی جیسا کہ اس روایت میں تصریح ہے. وہ اپنی بات سے حضرت معاویہؓ کو خوش کرنا چاہتا تھا. اور حضرت مقدام اسے اس عبارت پر غمگین کرنا چاہتے تھے. واللہ اعلم

پھر روایت مذکورہ میں یہ الزام بایں الفاظ منقول ہے :-

قال فواللہ لقد رأیت ھذا کلہ فی بیتك یا معاویۃ.

ترجمہ. مقدام نے کہا بخدا میں نے یہ سب کچھ آپ کے گھر میں ہوتا دیکھا ہے اے معاویہؓ۔

یہ روایت امام بیہقی نے بھی روایت کی ہے[2] مگر اس میں یہ جملہ نہیں ہے. کسی راوی نے یہ الفاظ بڑھا دیئے ہیں.

اس صورت میں ہم اصولاً پابند ہیں کہ اس روایت کو ترجیح دیں جس سے صحابہؓ کے بارے میں قرآنی فیصلے (کہ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے) کی تائید ہوتی ہو. امام نووی فرماتے ہیں :-

فان مامورون بحسن الظن بالصحابۃ ونفی کل رذیلۃ عنھم واذا انسدت الطرق نسبنا الکذب الی الرواۃ۔[3]

ترجمہ. ہم صحابہؓ کے بارے میں حسنِ ظن اور ان سے ہر برائی کی نفی کرنے کے مکلف ہیں اور جب کسی سند سے اس کی راہ نہ ملے تو اس الزام کو ہم کذب راوی پر محمول کریں گے.

سو بہتر یہی ہے کہ حضرت مقدام کی اس روایت کو بقیۃ بن الولید راوی کی وجہ سے لائق اعتبار نہ مانا

---

[1] دیکھیے مسند امام احمد جلد ۴ صہ۹۲ صہ۱۰۱ سنن نسائی جلد ۲ صہ۲۴۲ لمصنف لابن ابی شیبہ جلد ۸ صہ۳۰۶ [2] سنن کبریٰ صہ۲۷۴
[3] شرح مسلم جلد ۲ صہ۹۰

جائے اور حافظ ابن کثیر کی روایت کو ترجیح دی جائے کہ حضرت حسنؓ کی وفات کو حضرت امیر معاویہؓ نے واقعی ایک صدمہ جانا تھا.

آپ حضرت حسنؓ سے تو خوش تھے کہ انہوں نے خلافت اُن کے سپرد کر دی تھی اور پھر کوفہ میں رہائش بھی ترک کر دی تھی جو مفسدین کا مرکز تھا. اپنے بھائی حضرت حسینؓ کو بھی آپ نے اس صلحِ معاویہؓ کا پابند کیا ہوا تھا آپ کی وفات سے آپ کو یہ اندیشہ تو لاحق ہو سکتا ہے کہ آئندہ حضرت حسینؓ ان کے بارے میں کس پالیسی پر چلتے ہیں. اس میں آپ کے لیے خوشی کی کوئی بات نہیں. جب اسدی نے یہ کہا کہ یہ ایک چنگاری تھی جو خدا نے بجھا دی ہے محض خوشامد کے طور پر کہی ہو گی اور ظاہر ہے کہ یہ حضرت امیر معاویہؓ کا اندازِ فکر نہ تھا.

پھر یہ کہنا کہ حضرت امیر معاویہؓ نے اُسے رد کا کیوں نہیں. یہ صرف حضرت مقدام کے احترام میں تھا کہ جب وہ ان کے ساتھ حضرت معاویہؓ کے پاس آیا ہے تو نامناسب ہے کہ آپ اسے ٹوکیں. اس کی تردید آپ کے خیال میں حضرت مقدام کے ذمہ تھی اور وہ آپ نے کی.

حضرت معاویہؓ کے گھر میں ریشم اور سونا کون پہنتا تھا اس کی نشاندہی کی جائے. اس کی روایت میں وضاحت نہیں اور یہ بات مسلم ہے کہ حضرت معاویہؓ خود تو نہیں پہنتے تھے وہ تو علی الاعلان اس کے خلاف روایات پیش کرتے تھے. واللہ اعلم بالصواب

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال : کیا یہ صحیح ہے کہ حضرت علیؓ کا اپنے والیوں پر مکمل کنٹرول نہ تھا ان کے والی اپنے علاقوں میں ظلم کرتے تھے مگر حضرت علیؓ ان کو روکتے نہ تھے. کیا یہ صحیح نہیں کہ آپ کے عامل جاریہ بن قدامہ نے نجران میں اُن لوگوں کو جلا ڈالا جو امام مظلوم حضرت عثمانؓ کے حق میں صدا بلند کرتے تھے. کیا یہ جلانا سزا شرعی ہے؟ اگر نہیں تو کیا حضرت علیؓ کو خلیفہ راشد کہا جا سکتا ہے؟ کیا وہ شخص خلیفہ کہلا سکتا ہے جس کی دشمنوں پہ گرفت نہ ہو؟

سائل. خورشید عباس - ملتان

جواب : یہ صحیح ہے کہ حضرت علی المرتضیٰؓ کا اپنی افواج پر مکمل کنٹرول نہ تھا ان میں وہ لوگ بھی گھس آئے تھے جو حضرت عثمانؓ کے خلاف شریکِ بغاوت تھے اور حضرت علیؓ ان سے سخت بیزار تھے. مگر یہ ایک مجبوری تھی جو وقتی طور پر حضرت علیؓ کی حکومت کو عارض ہوئی. لیکن چونکہ آپ کی بیعت کرنے والے زیادہ تر وہ لوگ تھے جنہوں نے حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کی بیعت کی تھی. اس لیے آپ اس تسلسل

سے مسلسل تھے اور اپنے وقت کے خلیفۂ راشد تھے۔ آپ حضرت عثمانؓ کے قاتلوں سے ہرگز ہرگز راضی نہ تھے۔ انہیں گرفت میں نہ لینا یا نہ لے سکنا یہ ایک وقتی مجبوری تھی۔ آپ خود فرماتے ہیں :۔

کیف لی بقوۃ والقوم المجلبون علیٰ حد شوکتہم یملکوننا ولا نملکھم۔[1]

ترجمہ۔ میرے پاس اس کی طاقت کہاں ہے اور جو لوگ اپنی پوری طاقت سے چھائے ہوئے ہیں یہ ہم پر حکومت چلا رہے ہیں ہم ان پر کیا حکومت چلائیں۔

اور آپ کو یہ تسلیم تھا کہ خلیفہ وہی ہونا چاہیئے جو ظالموں اور باغیوں پر ہاتھ ڈال سکے۔ قوی اس کے نزدیک کمزور ہو اور کمزور قوی ——— کہ اپنا حق طلب کر سکے۔ آپ نے فرمایا:۔

ایھا الناس ان احق الناس بھذا الامر اقواھم علیہ واعلمھم بامر اللہ فیہ۔[2]

ترجمہ۔ اے لوگو! خلافت کا سب سے زیادہ حقدار وہی ہے جو ان سب میں قوت میں زیادہ ہو اور حکمِ خداوندی کو اس باب میں سب سے زیادہ جاننے والا ہو۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے بھی اپنے خطبہ خلافت میں حکومت کی یہ ذمہ داری بتلائی تھی کہ ملک کا قوی ترین آدمی بھی حکومت کے ہاں کمزور ہو۔ حکومت اس پر اس کے ظلم کے خلاف ہاتھ ڈال سکے۔

جاریہ بن قدامہ نے نجران میں لوگوں کو نہیں جلایا تھا اس نے ان کے گاؤں جلائے تھے۔ ہاں ان لوگوں کو اس نے قتل کیا تھا لیکن جلایا نہ تھا۔ ابن کثیر لکھتے ہیں :۔

فسار حتیٰ بلغ نجران فحرق بھا وقتل اناسا من شیعۃ عثمان۔[3]

ترجمہ۔ وہ چلا یہاں تک کہ نجران پہنچا اس نے اس بستی کو جلایا اور وہاں ان لوگوں کو قتل کیا جو اپنے آپ کو حضرت عثمانؓ کی پارٹی کہتے تھے۔

رہا یہ امر کہ حضرت علیؓ نے اس ظلم عظیم پر جاریہ بن قدامہ کے خلاف کوئی کارروائی کیوں نہ کی؟ ——— سو یہ بات یاد رکھیئے کہ جو لوگ اپنے عہدے کا غلط استعمال کریں اسلام میں انہیں عہدے سے تو ہٹایا جا سکتا ہے لیکن ان پر ان کے اس وقت کے غلط فیصلوں کے خلاف کیس نہیں چلایا جا سکتا ورنہ کوئی شخص حکومت کے کسی عہدے کو قبول نہ کرے گا۔ سپریم کورٹ، ہائی کورٹ کے ججوں کی دی ہوئی سزا کو تو ختم کر سکتا ہے لیکن ہائی کورٹ کے ان ججوں کے خلاف کوئی کیس دائر نہیں کرتا کہ انہوں نے ایسا فیصلہ کیوں لکھا۔ اپنے عہدوں کو اپنی صوابدید کے مطابق استعمال کرنا یہ اس عہدے کا آئینی حق ہے اگر کوئی اسے غلط استعمال کرے تو اسے اس کے عہدے سے ہٹا دو۔ یہ نہیں کہ اس نے ایسا فیصلہ

[1] نہج البلاغۃ جلد ا صـ۲۱۵ [2] ایضاً صـ۳۲۱ [3] البدایہ جلد ۷ صـ۳۲۲

کیوں لکھا تھا؟

حاکم اپنی صوابدید کے مطابق عمل نہ کر سکے تو وہ حکومت خاک کرے گا۔ سو حضرت معاویہؓ یا حضرت علی المرتضیٰؓ اپنے والیوں کے ایسے مظالم کے خلاف اگر کوئی کارروائی نہیں سکے تو اسے اس صورتِ مسئلہ پر محمول کرنا چاہیئے۔ نہ یہ کہ تم یہ کہنے لگ جاؤ کہ حضرت علیؓ خلیفۂ راشد نہ تھے یا یہ کہ حضرت معاویہؓ خلیفۂ عادل نہ تھے ایسا ہرگز نہیں ——— صحابہ کرامؓ اللہ اور اس کے رسول برحق کے ہر حکم کو اپنی رائے اور صوابدید سے مقدم سمجھتے تھے۔

جاریہ بن قدامہ پر لوگوں کو جلانے کا جو الزام ہے وہ یہاں کا نہیں کوفے کے علاقے کا ہے وہاں بنو تمیم کے ہاں حضرت معاویہؓ کا ایک قاصد عبداللہ بن عمرو حضرمی ٹھہرا ہوا تھا جو انہیں حضرت عمرو بن عاص کا ساتھ دینے کے لیے کہنے آیا تھا ——— ان دنوں وہاں حضرت علی المرتضیٰؓ کی طرف سے زیاد علاقے کا والی تھا۔ زیاد اور بنو تمیم کا اختلاف ہوا تو حضرت علیؓ نے جاریہ بن قدامہ تمیمی کو وہاں بھیجا۔ اس نے اس قاصد اور عبداللہ بن عمرو حضرمی اور اس کے ساتھیوں کو جو چالیس سے زیادہ تھے زندہ جلا دیا تھا۔

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں :۔

وقصدہ جاریۃ فحصرہ فی دار ھو وجماعۃ معہ ..... فحرقھم بالنار۔[1]

ترجمہ۔ جاریہ بن قدامہ نے عبداللہ بن عمرو حضرمی کا تعاقب کیا اور اسے اور اس کے ساتھیوں کو ایک جگہ محصور کر لیا اور پھر انہیں آگ سے جلا دیا۔

حافظ شمس الدین الذہبی بھی لکھتے ہیں :۔

فاحرق علیہ الدار فاحترق فیھا خلق۔[2]

ترجمہ۔ سو اس نے گھر کو ہی آگ لگا دی جس میں بہت سے لوگ جل گئے۔

کیا حضرت علیؓ نے جاریہ قدامہ کو اس غیر شرعی اقدام پر کوئی سزا دی؟ نہیں۔ لیکن اس پر ہم حضرت علی المرتضیٰؓ کو ملزم نہیں کر سکتے۔ افسران کو اس قسم کی غلطیوں پر ہٹایا تو جا سکتا ہے لیکن ان پر اس قسم کے واقعات سے قصاص عائد نہیں کیا جا سکتا۔ عہدے کے غلط استعمال پر عام سزا نہیں دی جا سکتی۔

حضرت علیؓ کا یہ جرنیل جاریہ بن قدامہ اس قدر ظالم تھا کہ جب یہ مدینہ آیا تو حضرت ابوہریرہؓ جو ان دنوں مسجد نبوی کے امام تھے وہاں سے چلے آئے جب تک یہ جاریہ وہاں رہا آپ واپس نہیں آئے جب وہ چلا گیا تو حضرت ابوہریرہؓ واپس مدینہ لوٹ آئے اور مسجد نبوی میں حسب سابق نماز پڑھانے

[1] البدایہ جلد ۷ صـ۳۱۶ [2] تاریخ الاسلام للذہبی جلد ۲ صـ۲۱۴

لگے حضرت علیؓ کا یہ عامل یقیناً بڑا ظالم تھا۔

ثم خرج منصرفاً الی الکوفۃ وعاد ابوھریرۃ فصلی بہم[1]

ترجمہ۔ پھر یہ مدینہ سے کوفہ جانے کے لیے نکلا اور حضرت ابوہریرہؓ پھر مدینہ چلے آئے اور لوگوں کو نماز پڑھانے لگے۔

اب ان تمام مظالم کو حضرت علیؓ کے ذمہ لگانا یا بسر بن ارطاۃ کے مظالم کو حضرت معاویہؓ کے ذمہ لگانا صرف انہی لوگوں کا کام ہو سکتا ہے جو حکومت کی ذمہ داریوں، اسلام کے قانونِ قصاص اور بلووں میں ہوئے فسادات اور واقعاتِ قتل کے قانونی تقاضوں کو نہ سمجھتے ہوں۔

حضرت علیؓ یقیناً خلیفہ راشد تھے اور حضرت معاویہؓ اپنے عہدِ خلافت میں بلاشبہ خلیفہ عادل تھے حضرت علیؓ کے عہد میں ان کا انکارِ خلافت محض ایک شبہے کی بناء پر تھا۔ اور ظاہر ہے کہ شبہے کا فائدہ ہمیشہ ملزم کو ملتا ہے۔ یہ وہ بین الاقوامی قانون ہے جسے کوئی عدالت مسترد نہیں کر سکتی۔ واللہ اعلم

حضرت معاویہؓ کے عامل بسر بن ارطاۃ نے جب یمن حضرت عبید اللہ بن عباسؓ سے لینا چاہا۔ اور حضرت عبید اللہ بن عباسؓ کوفہ چلے آئے اور یمن اور حجاز پر حضرت معاویہؓ کا قبضہ ہو گیا تو حضرت معاویہؓ نے بسر بن ارطاۃ کی کسی زیادتی پر اُن سے مؤاخذہ نہیں کیا۔ حکومتیں ایسے حالات میں اپنے والیوں کو تبدیل تو کر دیتی ہیں لیکن ان پر تعزیرات جاری نہیں کرتیں۔

حضرت علی المرتضیٰؓ کے عامل الاشتر نے جب لوگوں کو حضرت امیر معاویہؓ کے خلاف بھڑکایا تو بنو فزارہ کا ایک آدمی اربہ نامی کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے کوئی اعتراض کیا تو اشتر نے لوگوں کو کہا "اسے پکڑو جانے نہ پائے" اور لوگوں نے اسے وہیں مار مار کر ہلاک کر دیا[2] حضرت علیؓ نے اشتر پر قصاص عائد نہیں کیا اور چونکہ یہ قتل بے جا تھا اس لیے بیت المال سے اس کی دیت ادا کر دی سو حضرت علیؓ پر اس پہلو سے کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ وہ یقیناً خلیفۂ راشد تھے۔ عاملوں کی غلطی میں خلیفہ کی نیت کو مجروح نہیں کیا جا سکتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: کیا یہ صحیح ہے کہ حضرت معاویہؓ کے عامل بسر بن ارطاۃ نے حضرت عبید اللہ بن عباسؓ کے دو بچوں (عبد الرحمٰن اور قثم) کو قتل کر ڈالا ـــــ ان بچوں کا کیا قصور تھا؟ سائل۔ عبد الرحمٰن ملک

جواب: یہ بات طبری نے ضرور نقل کی ہے۔ لیکن حافظ ابن کثیر نے اس پر اعتراض کیا ہے فرماتے ہیں:۔

---

[1] ابن جریر طبری جلد ۶ ص ۸۱ [2] البدایہ جلد ۷ ص ۳۲۲ [3] دیکھئے وقعۃ صفین لنصر بن مزاحم الشیعی ص ۱۰۶

وفی صحتہ عندی نظر[1] اور اس کے صحیح ہونے میں مجھے کلام ہے۔

پھر ان حالات کو نقل کرنے والے اور حضرات بھی ہیں۔ مگر وہ بچوں کے قتل کے اس واقعہ کو ذکر نہیں کرتے[2] سو ہمیں یہ تسلیم نہیں کہ بسر بن ارطاۃ نے ایسا کیا ہو ـــــ اگر ایسا ہوا ہوتا تو حضرت عبید اللہ بن عباسؓ کسی طرح حضرت معاویہؓ سے راضی نہ رہ سکتے تھے۔ وہ اس وقت وہاں موجود تھے جہاں حضرت حسنؓ اور حضرت امیر معاویہؓ میں صلح ہو رہی تھی۔ انہوں نے وہاں یہ سوال نہ اٹھایا تھا کہ ان کے بچے کیوں بے گناہ مارے گئے تھے۔ اتنے اہم واقعہ پر وہ کیسے خاموش رہ سکتے تھے۔

شیعہ علماء تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ حضرت عبید اللہ بن عباس اس صلح سے پہلے حضرت معاویہؓ سے مل گئے تھے اور حضرت حسنؓ کے لشکر کو بلا قائد چھوڑ آئے تھے، رجال کشی میں ہے:۔

مر بالرایۃ ولحق بمعاویۃ وبقی العسکر بلا قائد ولا رئیس[3]

ترجمہ۔ آپ حضرت معاویہؓ سے آملے اور آپ کا لشکر (جس کے آپ حضرت علیؓ کی طرف سے قائد تھے) بلا قائد اور سردار رہ گیا۔

سو اگر یہ واقعہ (بچوں کے قتل کا) کہیں عمل میں آیا ہوتا تو حضرت عبید اللہ بن عباس حضرت معاویہؓ سے نہ ملتے اور کیا آپ پھر یہ کہہ سکتے تھے:۔

ان ابن عباس قال للہ در ابن ھند ولینا عشرین سنۃ فما اذانا علی ظھر منبر ولا بساط صیانۃ منہ لعرضہ واعراضنا ولقد کان یحسن صلتنا ویقضی حوائجنا[4]

ترجمہ۔ ابن ہند کتنے اچھے ہیں ہم پر بیس سال کے قریب حکمران رہے۔ آپ نے ہمیں نہ منبر پر نہ فرش پر کبھی کوئی اذیت نہ دی۔ اپنی عزت اور ہماری عزت کی حفاظت کے طور پر ـــــ آپ ہمارے تعلق کا پورا لحاظ کرتے اور ہماری ضرورتیں پوری کرتے۔

سو اگر حضرت معاویہؓ کے دور میں اس قدر ظلم ہوتا تو کیا حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ ان کے وظائف قبول کرتے اور ان کے ہاتھ میں بیعت کا ہاتھ دیتے؟ حقیقت یہ ہے کہ ایسی داستانیں بیشتر وضعی ہیں اور یہود کی ایجاد ہیں جنہیں کمزور راوی اچک لیتے ہیں اور روایت کرنے لگ جاتے ہیں۔ وللتحقیق مقام آخر۔ واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم واحکم فی کل باب۔

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

---

[1] البدایہ جلد ۷ ص ۳۲۲ [2] دیکھئے الاصابہ لابن حجر جلد ۲ ص ۳۱۴ طبقات لابن سعد جلد ۷ ص ۱۳۰ تاریخ خلیفہ بن خیاط جلد ۱ ص ۱۸۲ [3] رجال مامقانی جلد ۲ ص ۲۳۹ [4] انساب الاشراف للبلاذری جلد ۴ ص ۶۱

سوال: کیا یہ کسی حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ہو عذراء کے مقام پر کچھ لوگ قتل کئے جائیں گے ان کے اس قتل بے جا پر اللہ تعالیٰ اور فرشتے بہت ناراض ہوں گے ــــ اور کیا یہ صحیح ہے کہ معاویہؓ نے حجر بن عدی اور ان کے ساتھ پانچ اور آدمیوں کو وہاں قتل کرایا تھا؟ کیا یہ درست ہے کہ حضرت حسن بصری بھی ابن عدی کے قتل پر حضرت معاویہؓ سے نالاں تھے؟

جواب: یہ حدیث صحیح نہیں۔ بنائی گئی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:-

سیقتل بعذراء ناس یغضب اللہ لھم واھل السماء۔[1]

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:-

ھذا اسناد ضعیف منقطع۔[2]

ہاں ایک روایت میں حضرت حسن بصری سے یہ ناراضگی منقول ہے۔ لیکن جس روایت میں یہ منقول ہے اس کا ایک راوی ابو مخنف لوط بن یحییٰ ہے اور وہ سخت شیعہ تھا۔ امیر معاویہؓ کے بارے میں آپ اس سے کس حق گوئی کی امید رکھ سکتے ہیں۔ حضرت حسن بصری تو صحابہ کے باہمی نزاع میں دخل دینا ہی پسند نہ کرتے تھے۔ انہوں نے ایسی بات کب کہی ہوگی:-

وقد سئل الحسن البصری عن قتالھم؟ فقال قتال شھدہ اصحاب محمد و غبنا و علموا وجھلنا و اجتمعوا فاتبعنا و اختلفوا فوقفنا۔[3]

ترجمہ۔ حضرت حسن بصریؒ سے صحابہ کے باہمی قتال کے بارے میں پوچھا گیا۔ آپ نے فرمایا یہ وہ جنگیں ہیں جن میں صحابہ موجود تھے اور ہم غائب تھے اور وہ اُن کے حالات جانتے تھے اور ہم ان سے بالکل ناواقف ہیں جن جن امور میں وہ اکٹھے رہے ہم ان کے پیرو ہیں اور جن جن امور میں وہ مختلف ہوئے ہم ان میں توقف اختیار کرتے ہیں (کسی کو بُرا نہیں کہتے)۔

کتبہ، خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: عمرو بن حمق کے قتل کا ذمہ دار کون ہے؟ کہا جاتا ہے یہ شخص فتح مکہ کے دن اسلام لایا۔ لیکن کیا اس کا بھی کوئی ثبوت ملتا ہے کہ اس نے حضورؐ کی زیارت کی ہو یا کبھی یہ آپ کی مجلس میں آیا ہو؟ بعد میں اس کا

---

[1] المعرفۃ و التاریخ للبستوی ص۳۲۰ [2] البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص۵۵ [3] تفسیر قرطبی جلد ۱۶ ص۳۲۲

کردار کیا رہا ہے؟ سائل۔ خُبیب احمد جمال

جواب: عمرو بن حمق ان چار میں سے ہے جنہوں نے حضرت عثمانؓ پر وار کیا تھا۔ ابن سعد لکھتا ہے:-

کان فی من سار الی عثمان واعان علی قتلہ۔[1]

ترجمہ۔ یہ ان میں تھا جنہوں نے حضرت عثمانؓ پر چڑھائی کی تھی اور اُن کے قتل پر اعانت کی۔

حافظ ابن کثیر بھی لکھتے ہیں:-

کان احد الاربعۃ الذین دخلوا علی عثمان۔[2]

ترجمہ۔ یہ ان چار میں سے ایک تھا جو حضرت عثمانؓ پر حملہ آور ہوئے۔

یہ حجر بن عدی کے ساتھیوں میں سے تھا۔ جب حجر بن عدی اپنے پانچ ساتھیوں کے ساتھ گرفتار ہوا تو یہ عمرو بن حمق موصل کی طرف فرار کر گیا۔ امیر موصل نے اسے گرفتار کیا اور امیر معاویہؓ کو لکھ بھیجا۔ آپ نے فرمایا:-

انہ زعم انہ طعن عثمان تسع طعنات بمشاقص ونحن لا نعتدی علیہ فاطعنہ کذلک ففعل بہ ذلک فمات فی الثانیۃ۔[3]

ترجمہ۔ اس کا کہنا ہے کہ اس نے حضرت عثمانؓ پر نُو زخم لگائے تھے اور ہم اس پر کوئی زیادتی نہیں چاہتے تم بھی اسے بھالے کے نُو زخم ہی لگانا۔ اس عامل نے اسی طرح کیا۔ مگر وہ دوسرے حملے میں ہی مرگیا۔

اور یہ روایت بھی ہے:-

ھرب الی الموصل فدخل غاراً فنھشتہ حیۃ فقتلتہ وبعث الی الغار فی طلبہ وجدوہ میتاً۔[4]

ترجمہ۔ وہ موصل کی طرف بھاگ گیا اور وہاں ایک غار میں گھُس گیا۔ وہاں ایک سانپ اس پر لپکا اور اس نے اسے مار ڈالا جب لوگ اس کی تلاش میں غار پر گئے تو اسے مُردہ پایا۔ پھر اس کا سر کاٹا گیا اور انہوں نے اُسے امیر معاویہؓ کے پاس بھیج دیا۔[5]

وذلک انہ لدغ فمات فخشیت الرسل ان تتھم بہ فقطعوا رأسہ فحملوہ۔[6]

ترجمہ۔ اور وہ اس طرح کہ اسے سانپ نے ڈسا اور وہ مرگیا۔ قاصد ڈرے کہ انہیں اس سلسلہ میں کسی شبہ سے نہ دیکھا جائے سو انہوں نے اس کا سر کاٹا اور وہ خود اسے لے کر وہاں گئے۔

---

[1] طبقات جلد ۶ ص۱۵ [2] البدایہ جلد ۸ ص۴۸ [3] تاریخ الاسلام ذہبی جلد ۲ ص۲۳۵ طبری جلد ۹ ص۱۴۸
[4] کتاب الثقات لابن حبان جلد ۳ ص۲۷۵ [5] البدایہ جلد ۸ ص۴۸ [6] المعرفۃ والتاریخ للبستوی جلد ۲ ص۸۱۳

سوال : اس وقت دُنیا میں مسلمان اور کافر دونوں بڑی بڑی طاقتیں ہیں۔ ہندو بدھ اور عیسائی دنیا میں بڑی بڑی تعداد میں پھیلے ہیں۔ گو اکثریت مسلمانوں کی ہے مگر عیسائی بھی کوئی کم نہیں ہیں۔ پھر مسلمان سُنی اور شیعہ میں تقسیم ہیں۔ دنیا میں نوّے فیصد سنّی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب بارہویں امام حضرت مہدی ظاہر ہوں گے تو کیا وہ سنی مسلمانوں کو ساتھ لے کر کافر قوتوں کا مقابلہ کریں گے یا ان کی صورتِ عمل کچھ اور ہو گی؟

سائل : منظور سبطین از راولپنڈی

الجواب : اہل سنّت عقائد کے مطابق حضرت محمد مہدی جو اس دنیا کے آخری حکمران ہوں گے پیدا ہوں گے وہ دنیوی اسباب اور تائیدِ ایزدی سے اس مقام پہ پہنچیں گے۔ وہ کوئی خفیہ مخلوق نہیں جو اچانک آ ظاہر ہوں گے۔ شیعہ عقیدہ کے مطابق وہ موجود ہیں اور امام غائب ہیں اور تمام اثنا عشری ان کے منتظر ہیں۔ انہوں نے ان کے نام کے جامع المنتظر بھی بنا رکھے ہیں۔ اس وقت شیعہ عقائد کے مطابق وہ کسی غار میں چھپے ہوئے ہیں۔

شیعہ گو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ وہ دوسرے کافروں کی نسبت سنّیوں کے زیادہ دشمن ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ امام مہدی تشریف لا کر پہلے سنّیوں کا صفایا کریں گے پھر کہیں وہ کافروں سے نبٹیں گے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اہل سنّت کو دوسرے عام کفار سے بھی زیادہ بُرا سمجھتے ہیں۔ سو جو سنّی مولوی انہیں بھائی بھائی کہتے ہیں یہ بھائی پہلے ان مولویوں پر ہی ہاتھ اُٹھائیں گے۔

ملّا باقر مجلسی لکھتا ہے :۔

وقتی کہ قائم ظاہر شود پیش از کفار ابتداء بہ سنّیاں خواہد کرد با علماء ایشاں و ایشاں را خواہد کشت۔[1]

ترجمہ۔ جب حضرت مہدی ظاہر ہوں گے وہ دوسرے کافروں سے پہلے سنّیوں کے علماء سے ابتدا کریں گے اور انہیں اور ان کے علماء کو پہلے قتل کریں گے۔

ملا باقر مجلسی شیعہ کا کوئی عام مصنف نہیں اسے یہ اپنے مسلک کا خاتم المحدثین سمجھتے ہیں اور اس کی کتابیں ان کی قم، نجف اشرف، مشہد اور طہران کے کتب خانوں کی زینت اور ان کے مجتہدین کا ملجاء و ماویٰ ہیں۔ کیا اب بھی کوئی مسلمان ان پہ اعتماد کر سکتا ہے۔ بریلوی علماء کو اس وقت ان سے زیادہ خطرہ ہو گا کیونکہ عوام میں سُنی وہی مشہور ہیں۔

والسلام

خالد محمود عفا اللہ عنہ

---

[1] حق الیقین جلد ۲ صد ۵۲۷

سوال : شیعہ مسلمان ہیں یا کافر؟ اگر مسلمان ہیں تو وہ امام مہدی کی قیادت میں پہلے سنّیوں کو کیوں قتل کریں گے؟

سائل : محمد الیاس جہلم

الجواب : آپ کو یہ فکر تو پڑ گئی کہ شیعہ مسلمان یا کافر۔ کبھی ان سے بھی پوچھا کہ اہل سنّت مومن ہیں یا کافر۔ وہ اہل سنّت کو ہرگز مسلمان نہیں سمجھتے۔ اور عام اہل سنّت تو درکنار وہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ جیسے کامل مومنین کو بھی کافر کہتے ہیں۔ ملا باقر مجلسی حضرت زین العابدینؒ کے حوالے سے لکھتا ہے، کسی نے ان سے کہا :۔

مرا خبر دہ از حال ابوبکر و عمر۔ مجھے ابوبکر اور عمر کے حال کی خبر دو۔

حضرت فرمود۔ ہر دو کافر بودند و ہر کہ ایشاں را دوست دارد کافر است۔[1]

ترجمہ۔ آپ نے فرمایا یہ دونوں کافر تھے جو ان کو کافر رکھے وہ بھی کافر ہے۔

افسوس کہ ملا باقر مجلسی اس وقت یہ بھول لے ہوئے ہیں کہ حضرت علیؓ ان دونوں کو دوست رکھتے تھے اور ان کے پیچھے نمازیں بھی پڑھتے تھے۔

ملاجی پہلے بھی یہ کہہ آئے ہیں :۔

و اعتقاد ما در برأت آنست کہ بیزاری جویند از بُت ہائے چہار گانہ یعنی ابوبکر و عمر و عثمان و معاویہ و زنان چہار گانہ یعنی عائشہ و حفصہ و ہند و ام الحکم و از جمیع اشیاع و اتباع ایشاں و آنکہ ایشاں بدترین خلق خدایند۔[2]

ترجمہ۔ اور تبرا میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ چار بُتوں یعنی ابوبکر و عمر و عثمان اور معاویہ اور چار عورتوں سے اور ان کے سب ساتھیوں اور پیروں سے اظہار بیزاری کریں اور یہ کہ یہ بدترین مخلوق ہیں۔ (استغفر اللہ)

جو شخص سیدنا حضرت ابوبکرؓ اور سیدنا حضرت عمرؓ کو حضرت علی مرتضیٰؓ سے افضل جانے جیسا کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں) اثنا عشریوں کے ہاں وہ ناصبی ہے اور ناصبی کے بارے میں ملا باقر مجلسی پہلے کہہ آئے ہیں :۔

آں بدتر است از ولد الزنا بدرستیکہ حق تعالیٰ خلقے بدتر از سگ نیافریدہ است و ناصبی نزد خدا خوار تر از سگ است۔[3]

ترجمہ۔ ناصبی ولد الزنا سے بھی بدتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کتے سے زیادہ بدتر کسی چیز کو نہیں

---

[1] حق الیقین جلد ۲ صد ۵۲۲ [2] ایضاً صد [3] ایضاً صد ۵۱۶

بنایا لیکن ناصبی خدا کے ہاں کتے سے بھی زیادہ خوار ہے۔

سنی جب اپنا مقام معین کریں گے کہ شیعہ کے ہاں وہ کیا ہیں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اثنا عشری شیعوں کو صفِ اسلام میں جگہ دی جاسکتی ہے یا نہیں۔ والسلام خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال : شیعوں کو مسلمانوں کی مسجدوں میں نماز پڑھنے کی اجازت دی جاسکتی ہے یا نہیں؟

جواب : شیعوں کو اپنی مسجدوں میں نماز پڑھنے کی اجازت دینے سے پہلے یہ تو معلوم کریں کہ وہ نماز کے متصل بعد میں کیا پڑھتے ہیں۔ پھر آپ خود فیصلہ کریں ان کا خاتم المحدثین ملا باقر مجلسی لکھتا ہے:۔

باید بعد از ہر نماز بگوید :۔

اللّٰھم العن ابابکر وعمر وعثمان ومعاویۃ وعائشۃ وحفصہ وھند وام الحکم۔[1]

ترجمہ۔ اے اللہ ان چار مردوں پر اور ان چار عورتوں پر (استغفر اللہ العظیم) لعنت کر (نام ذکر کرتے زبان رکتی ہے اور قلم لرزتا ہے)

کیا آپ پسند کریں گے کہ آپ کی مسجدوں میں یہ ناپاک لوگ یہ ناپاک کلمے کہیں اور اس بدگوئی کا نام عبادت رکھیں۔ ان کے لیے مسجد نہیں باڑہ چاہیے۔ جہاں جانوروں پر وہ کیسی آواز نکالیں، کوئی گرفت نہیں ہوتی۔

سوال : امیر معاویہؓ نے حضرت علیؓ کی ولایت کا انکار کیا۔ اس لیے شیعہ انہیں (معاذ اللہ) کافر کہتے ہیں مطلع کریں کیا شیعہ کے ہاں ولایتِ علی کا انکار کفر ہے؟ سائل: محمد رمضان از بھکر

جواب : حضرت یونس علیہ السلام خدا کے برگزیدہ پیغمبر تھے اور پیغمبر سے لمحہ بھر کے لیے بھی کفر صادر نہیں ہو سکتا۔ مشہور شیعہ مفسر فرات بن ابراہیم الکوفی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتا ہے کہ آپ نے فرمایا :۔

ان اللہ تبارک وتعالیٰ عرض ولایۃ علی ابن ابی طالب علی اھل السمٰوات و الارض فقبلوھا ما خلا یونس بن متّٰی فعاقبہ اللہ وحبسہ فی بطن الحوت لانکارہ ولایۃ امیر المؤمنین۔[2]

---

[1] عین الحیوۃ ص۵۹۹ مطبوعہ طہران [2] تفسیر فرات ص۹۴ طبع نجف ۱۳۵۴ھ

ترجمہ۔ اللہ تعالیٰ نے ولایتِ علی آسمانوں اور زمین پر پیش کی۔ سب نے اسے مان لیا لیکن حضرت یونس بن متّٰی نے اسے قبول نہ کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا دی اور انہیں مچھلی کے پیٹ میں قید کر دیا۔

اس کی وجہ انکار ولایتِ علی سے انکار کرنا تھا۔ یہاں تک کہ وہ وہاں مدتوں آیت کریمہ پڑھتے رہے۔ سو اگر یونس علیہ السلام کا ولایت علی سے انکار کرنا کفر نہیں تو حضرت معاویہؓ کا اس سے انکار کیسے کفر سمجھا جاسکتا ہے۔ شیعہ کتب عقائد میں بھی حضرت علیؓ کی مخالفت کو فسق کہا ہے کفر نہیں سمجھا گیا۔[1]

والسلام۔ خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال : شیعہ مسلمات کی رُو سے حضرت ابوبکرؓ کے مومن ہونے پر دلیل قائم فرماویں۔ اُمید ہے کہ آپ اس میں حضرت ابوبکرؓ کے اسلام لانے کی روایات نہیں لائیں گے۔ کیونکہ شیعہ کے ہاں ایمان اور اسلام میں فرق ہے۔ عام مسلمانوں کو وہ مسلمان تو مانتے ہیں مگر مومن نہیں مانتے۔ مومن وہ اپنے شیعوں کو ہی کہتے ہیں؟ سائل : (مولانا) عبدالقادر از حسن ابدال

جواب : اثنا عشری شیعوں کے علامہ علی بن مطہر الحلی (۷۲۶ھ) کشف المراد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا :۔

اٰمنت قبل ان اٰمن ابو بکر واسلمت قبل ان اسلم۔[2]

ترجمہ۔ میں ابوبکرؓ کے ایمان لانے سے پہلے ایمان لایا اور ان کے اسلام لانے سے پہلے میں نے اسلام قبول کیا۔

اس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے ایمان اور اسلام دونوں کا جدا جدا اثبات ہے سو یہاں ایمان اسلام کے معنی میں نہیں اپنے حقیقی شرعی معنوں میں ہے اور انہی معنی میں حضرت ابوبکرؓ ایمان لائے۔ ثانیاً حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو اپنے ساتھ ایمان اور اسلام دونوں میں جمع فرمایا ہے سو جس معنی میں حضرت علیؓ مومن تھے اسی مفہوم میں حضرت ابوبکرؓ بھی مومن ٹھہرے اور جس مفہوم میں حضرت علی مسلمان تھے اسی مفہوم سے حضرت ابوبکرؓ بھی مسلمان تھے۔

رہا آپ کا یہ دعوے کہ آپ پہلے ایمان لائے یہ آپ اپنے علم کے اعتبار سے کہہ رہے ہیں۔ بہت ممکن ہے آپ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پہلے سے ایمان لانے کا علم نہ ہوا ہو آپ بچے تھے اور

---

[1] دیکھئے تجرید الاعتقاد ص۲۵۰ طبع قم [2] کشف المراد فی شرح تجرید الاعتقاد ص۲۴۲

بچوں کو بعض اوقات بڑوں کی باتوں پر اطلاع نہیں ہوتی۔ پھر یہ روایت بھی تو شیعہ کتب کی ہی ہے، جو اہل سنت پر حجت نہیں ہو سکتی۔ ہاں اس بات میں یہ شیعوں پر حجت ضرور ہے کہ شیعہ مسلمات میں حضرت ابوبکرؓ کے مومن ہونے کا اس میں کھلا اقرار ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: شیعہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کو خدا نے خلیفہ بنایا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت نے آپ کی خلافت سے انکار کر دیا۔ حضور رسالت مآبؐ نے بھی آپ کو خلیفہ بنانا چاہا لیکن حضورؐ کی بیوی اماں عائشہؓ نے آپ کو خلیفہ نہ بننے دیا۔ زبردستی اپنے والد کو مصلّٰی رسول پر امامت کے لیے کھڑا کر دیا۔ اس اعتراض کی وضاحت فرمائیں؟

سائل: زنگ الٰہی از قصور

الجواب: یہ بات غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانا چاہا اور امت نے انکار کر دیا۔ شیعہ روایات میں بات اس کے برعکس ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا تھا کہ آپ کے بعد خلیفہ حضرت علیؓ ہوں، مگر اللہ تعالیٰ نے انکار کر دیا اور حضورؐ کو کہا، آپ کا حق نہیں آپ امت پر کسی کو والی بنائیں امت کا والی وہ ہو جسے امت چنے۔ تاکہ وہ امت کے سامنے اپنی کارگردگی کا جوابدہ ہو سکے۔ اگر وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا مقرر کردہ ہو گا۔ تو ظاہر ہے کہ امت کبھی اس پر انگلی نہ اٹھا سکے گی اور کبھی امت کے سامنے جوابدہ نہ ہو گا۔ حکومت اس کے ہاتھ میں ہونی چاہیئے جو اپنی رعایا کے سامنے اپنے امورِ سلطنت کا جوابدہ بھی ہو سکے۔ امام محمد باقر قرآنی آیت لیس لک من الامر شیٔ (پ۴ آل عمران ع ۱۴ آیت ۱۲۸) کی تفسیر میں فرماتے ہیں:-

ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم حرص ان یکون الامر لامیر المؤمنین علیہ السلام من بعدہ فابی اللّٰہ[1]

ترجمہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ آپ کے بعد ولی الامر حضرت علی ہوں لیکن اللہ تعالیٰ نے انکار کر دیا (اور فرمایا لیس لک من الامر شیٔ)۔

اس آیت میں آپ کو بتلایا گیا کہ ولی الامر مقرر کرنے میں آپ کو اپنی مرضی لوگوں پر مسلط کرنے کا حق نہیں امت جس کو خود آگے کرے وہ امت کا نمائندہ ہو گا اور وہی امیر المومنین ہو گا وہ اپنے نظم حکومت میں پوری قوم کے سامنے جوابدہ ہو گا۔ قوموں میں عملی سیاست کی روح یہی ہے۔ خالد محمود عفا اللہ عنہ

---

[1] تفسیر فرات صف۱۹ طبع نجف اشرف

سوال: اللہ اور اس کے رسول کی معیت صرف مومنوں کے لیے ہے یا یہ شرف و مرتبہ کافروں اور منافقوں کو بھی مل سکتا ہے۔ ۲۔ صحابی حضورؐ کے پاس بیٹھنے والے مومنین کو ہی کہا جاتا ہے یا یہ لفظ پاس بیٹھنے والے منافقین پر بھی بولا جا سکتا ہے۔ ۳۔ یہ جو فقہاء لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کی صحابیت کا منکر کافر ہے۔ کیوں کہ یہ نص قرآن سے ثابت ہے۔ اس سے ان کو مومن ماننا بھی لازم آتا ہے یا مطلق صحبت اور ہمنشینی مراد ہے؟

سائل: (قاری) مقبول الرحمٰن توحید نگر لاہور

الجواب: اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پاک کی معیت کافروں، منافقوں اور غافلوں کے لیے نہیں۔ قرآن پاک پ۶ المائدہ ع ۲ میں ہے:-

وقال اللّٰہ انی معکم لئن اقمتم الصلوٰۃ وآتیتم الزکوٰۃ وآمنتم برسلی وعزرتموھم۔

ترجمہ: اور کہا اللہ تعالیٰ نے میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم قائم رکھو نماز اور دیتے رہے زکوٰۃ اور ایمان لاؤ میرے رسولوں پر اور ان کی مدد کرتے رہو۔

اس سے یہی سمجھ میں آ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معیت کا شرف مومنین کے لیے ہے دوسروں کے لیے نہیں۔ اسی طرح حضورؐ کی معیت پانے والوں کو کہا۔ اشداء علی الکفار۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ خود کافروں میں سے نہیں ہو سکتے اور ساتھ ہی فرمایا رحماء بینھم کہ آپس میں یہ ایک دوسرے کے خیرخواہ ہوں گے۔ یہ بینھم کا لفظ کفار کے مقابلہ میں ہے:-

محمد رسول اللّٰہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم۔

(پ۲۶ الفتح ع ۴ آیت ۲۹)

۲۔ صحابی اسے کہتے ہیں جس نے بحالتِ ایمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ظاہری آنکھ سے دیکھا ہو۔ محض خواب اور کشفی حالت میں دیکھنے والے صحابیت کو نہیں پا سکتے، اصطلاح شرع میں پاس بیٹھنے والے کافر یا منافق پر یہ لفظ صادق نہیں آ سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو منافقین کی ہمنشینی سے روک دیا تھا۔

فلا تقعد بعد الذکریٰ مع القوم الظالمین۔ (پ۷ الانعام ع ۸ آیت ۶۸)

ترجمہ: تو یاد آنے کے بعد کافروں کی معیت میں مت بیٹھ۔

سو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس حکم الٰہی پر عمل نہ کریں اور ظالمین و غافلین مدتوں آپ کی معیت میں رہیں۔

۳۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صحابیت جس کا منکر کافر ہے صرف صحبت مطلقہ نہیں۔ اللہ اور اس

کے رسول برحق کی معیت میں ہونے کا نام ہے۔ آپ کی صحابیت حضورؐ کے ساتھ بحالت ایمان تھی۔ بلا ایمان کوئی شخص اللہ اور اس کے رسول خاتم کی معیت سے سرفراز نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم میں ہے:۔

الا تنصروہ فقد نصرہ اللہ اذ اخرجہ الذین کفروا ثانی اثنین اذ ھما فی الغار اذ یقول لصاحبہ لا تحزن ان اللہ معنا (پ۱۰ التوبہ ع ۶)

ترجمہ۔ اگر تم مدد نہ کرو اس رسول کی تو اس کی مدد اللہ کر چکا۔ جب اس کو کافروں نے (مکہ سے) نکالا تھا وہ دوسرا تھا دو میں کا جب وہ دونوں غار میں تھے جب وہ (رسول) اپنے صاحب سے کہہ رہا تھا غم نہ کر، بے شک اللہ ہمارے (ہم دونوں کے) ساتھ ہے۔ پھر اتاری اللہ تعالیٰ نے اس پر تسکین۔

یہاں پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نہ صرف صحابیت منصوص ہے بلکہ آپ کا اللہ اور اس کے رسول پاک کی معیت پائے ہوئے ہونا بھی نص قرآن میں موجود ہے۔ سو جو شخص حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا صحابی رسول اور مومن اور اللہ اور اس کے رسول کا معیت یافتہ ہونا نہ مانے وہ مسلمان نہیں مانا جا سکتا۔ کیونکہ وہ قرآن پاک کا منکر ہے۔ فقہا نے تصریح کی ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی صحابیت کا منکر کافر ہے۔

یہ غار کی صحبت اگر مطلق ہمنشینی ہوتی تو اس میں فضیلت کی کوئی بات نہیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایک فضیلت شمار فرمایا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں اخلاص و ایمان کی معیت مراد ہے اور یہ وہ نصرت نبوی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے دوسرے کل انسانوں کی نصرت نبوی پر فائق کیا ہے۔ الا تنصروہ فقد نصرہ اللہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب حضرت علیؓ کو سورۂ براۃ دے کر مکہ بھیجنے لگے تو حضرت ابو بکر صدیقؓ کو یہ کہہ کر تسلی دی:۔

اما ترضیٰ یا ابا بکر انک صاحبی فی الغار[1]

ترجمہ۔ کیا تو اس سے راضی نہیں کہ تو میرا غار کا ساتھی ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ غار کی صحبت ایک بڑی فضیلت تھی اور یہ تبھی ہو سکتا ہے کہ یہاں مطلق ہمنشینی مراد نہ ہو۔ ایمان و اخلاص کے ساتھ یہ دونوں غار میں اللہ کی معیت میں ہوں۔ اس مقام صحابیت کا انکار قرآن کا انکار ہے اور یہ واقعی کفر ہے۔ والسلام

خالد محمود عفا اللہ عنہ

---

[1] تفسیر فرات ص ۵۹

سوال: شیعہ قرآن پاک کو اس موجودہ ترتیب کے اعتبار سے صحیح نہیں مانتے۔ ہو سکتا ہے وہ اس آیت کو جس میں حضرت ابو بکرؓ ثانی اثنین میں شمار کئے گئے ہیں محرف مانتے ہوں۔ کیا اس صورت میں بھی حضرت ابو بکر صدیقؓ کی صحابیت کا منکر کافر شمار ہوتا ہے؟

جواب: قرآن پاک کا منکر بھی تو کافر ہی ہے۔ خواہ ایک آیت کا انکار کیوں نہ کرے۔ اگر کوئی شخص قرآن مجید کو اس کی موجودہ ترتیب میں صحیح نہ مانے تو وہ ایمان بالقرآن نہ ہونے کے باعث مسلمان نہیں رہے گا۔

کتبہ: خالد محمود عفا اللہ عنہ

اور شیعہ کے ہاں موجودہ قرآن کا انکار متواترات میں سے ہے۔ جس طرح اہل سنت کے ہاں قرآن کریم کی آیت آیت متواتر ہے۔ شیعہ کے ہاں موجودہ قرآن کا محرف اور مبدل ہونا متواتر ہے۔ ان کے گیارہویں صدی کے محقق ملا محسن کاشانی (۱۰۹۰ھ) لکھتے ہیں:۔

المستفاد من جمیع ھذہ الاخبار وغیرھا من طریق اھل البیت علیھم السلام ان القرآن الذی بین اظھرنا لیس بتمامہ کما انزل علی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ بل منہ ما ھو خلاف ما انزل اللہ ومنہ ما ھو مغیر محرف وانہ قد حذف عنہ اشیاء کثیرۃ منھا اسم علی علیہ السلام فی کثیر من المواضع ومنھا لفظۃ آل محمد صلی اللہ علیہ غیر مرۃ ومنھا اسماء المنافقین فی مواضعھا ومنھا غیر ذالک وانہ لیس ایضاً علی الترتیب المرضی عند اللہ وعند رسولہ صلی اللہ علیہ وسلم وبہ قال علی بن ابراھیم[1]

ترجمہ۔ ان سب احادیث اور اہل بیت کی دیگر روایات سے یہی ثابت ہے کہ یہ قرآن جو اس وقت ہمارے سامنے ہے یہ پورا نہیں۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا تھا بلکہ اس میں

۱۔ ایسی باتیں ہیں جو اللہ کے نازل کردہ کلام کے خلاف ہیں اور
۲۔ ایسی بھی ہیں جن میں تبدیلی کی گئی اور وہ تحریف شدہ ہیں اور
۳۔ اور ان میں سے بہت چیزیں نکال دی گئی ہیں۔ انہی میں سے حضرت علی کا نام بھی تھا جو بہت سے مقامات میں تھا اور انہی میں لفظ آل محمد بھی تھا جو کئی جگہ تھا اور
۴۔ انہی میں کئی مقامات پر منافقین کے نام بھی تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی باتیں تھیں

---

[1] تفسیر الصافی، ج ۱، ص ۳۲

اور یہ بات بھی ہے کہ موجودہ قرآن اس ترتیب پر نہیں جو اللہ اور اس کے رسول کے ہاں پسندیدہ تھی اور یہی بات (مشہور مفسر) علی بن ابراہیم نے کہی ہے۔

علی بن ابراہیم القمی (۳۰۷ھ) ان کے قدماء میں سے ہے۔ شیخ مفید (۴۱۳ھ) اور شیخ مرتضیٰ (۴۳۶ھ) اس کے بعد کے ہیں۔ یہ اگر تحریف کا انکار کریں اور موجودہ قرآن کو محرف ماننے والے کو کافر بھی نہ کہیں تو ظاہر ہے کہ ان کا یہ انکار تقیہ پر مبنی ہوگا۔ ان کے چھٹی صدی ہجری کے ثقہ شیعی عالم ابو منصور احمد الطبرسی لکھتے ہیں :-

ولو شرحت کلما اسقط وحرف وبدل مما یجری هٰذا المجری وطال وظهر ما تحظر التقیة اظهاره من مناقب الاولیاء ومثالب الاعداء۔[1]

ترجمہ۔ اور اگر میں تمہارے سامنے کھول دوں کہ کیا کچھ قرآن سے نکالا گیا اور بدلا گیا اور اس میں تحریف کی گئی تو بات لمبی ہو جائے گی، تقیہ جس کے اظہار کو روکتا ہے۔

یہاں تقیہ کا لفظ قابل غور ہے، تقیہ مانع رہا کہ یہ لوگ قرآن پاک کی زیادہ غلطیاں نہ نکالیں ورنہ ان کے ہاں دلائل تحریف کی کوئی کمی نہ تھی۔

علی بن ابراہیم القمی سے بھی پہلے کے مفسر علامہ فرات بن ابراہیم الکوفی کھلے بندوں تحریف قرآن کے قائل ہیں اور اس وقت تک کسی شیعہ عالم نے تحریف قرآن کا انکار نہ کیا تھا۔ چار منکرین تحریف ان کے بعد کے ہیں اور وہ نظریہ ضرورت کے تحت اس کا انکار کر رہے ہیں۔ اور علامہ محمد بن یعقوب الکلینی (۳۲۸ھ) ائمہ سے بطریق تواتر موجودہ قرآن میں تحریف کا اقرار کرتے ہیں۔ علامہ فرات دو واسطہ سے علی بن ابراہیم القمی کے استاد ہیں اور مفسر قمی علامہ کلینی کے استاد ہیں۔ علامہ فرات بن ابراہیم لکھتے ہیں۔ امام باقر نے ایک آیت اس طرح پڑھی :-

ان اللّٰہ اصطفیٰ اٰدم ونوحاً واٰل ابراهیم واٰل محمد علی العالمین۔

موجودہ قرآن کریم میں آل محمد کے الفاظ نہیں آل عمران کے الفاظ ہیں۔ عمران حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نانا کا نام تھا۔ شیعوں نے چاہا کہ یہاں حضرت عیسیٰ کے نانا کا نہیں حضرت حسینؓ کے نانا کا نام ہو۔ انہوں نے آل عمران کو لفظ آل محمد سے بدل دیا۔ اس پر علامہ فرات لکھتے ہیں :-

اُدخل حرف مکان حرف۔[1]

ترجمہ۔ آل عمران کے الفاظ آل محمد کی جگہ (قرآن میں) داخل کر دیئے گئے ہیں۔

[illegible] ۴۵۴ ... ۲ ... ۱۸

علی بن ابراہیم القمی کہتے ہیں اصل قرآن میں آل عمران اور آل محمد دونوں الفاظ تھے۔[1]

شیعہ متاخرین بھی یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ علی بن ابراہیم القمی اور فرات بن ابراہیم دونوں میں سے کون سچا ہے، ہم تو ان میں سے کسی کو سچا نہیں سمجھتے۔ جو قرآن کریم کو صحیح اور محفوظ کتاب نہ مانے وہ کیسے مسلمان ہو سکتا ہے۔ قرآن ہی تو اسلام کی بنیاد ہے۔ اب علامہ کلینی (۳۲۸ھ) سے بھی سنیئے، کس طرح ائمہ اہلبیت کے نام پر جھوٹ گھڑتے جا رہے ہیں :-

عن جابر قال سمعت اباجعفر علیه السلام یقول ما ادعی احد من النّاس انه جمع القراٰن کله کما انزل الا کذاب وما جمعه وحفظه کما نزّل اللّٰه تعالیٰ الا علی ابن طالب والائمة من بعده علیه السلام۔[2]

ترجمہ۔ جابر سے روایت ہے اس نے کہا میں نے امام باقر سے سنا لوگوں میں سے کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے سارا قرآن اس طرح جمع کیا ہو جیسا کہ یہ اترا تھا۔ جو ایسا دعویٰ کرے وہ کذاب ہوگا۔ اس کو نزول کے مطابق نہ کسی نے جمع کیا نہ کسی نے یاد کیا، مگر علی ابن ابی طالب نے اور ان کے بعد آنے والے ائمہ نے۔

قرأ رجل علی ابی عبد اللّٰه علیه السلام وانا استمع حروفاً من القراٰن لیس علی ما یقرؤها الناس فقال ابو عبد اللّٰه علیه السلام کف عن هذه القراءة اقرأ کما یقرأ الناس حتی یقوم القائم فاذا قام القائم قرء کتاب اللّٰه عز وجل علی حده واخرج المصحف الذی کتبه علی علیه السلام۔[3]

ترجمہ۔ حضرت امام جعفر صادق کے سامنے ایک شخص نے قرآن پڑھا اور میں ایسے حروف سنتا رہا جو لوگوں کے قرآن پڑھنے کے مطابق نہ تھے۔ حضرت امام نے فرمایا اس طرح نہ پڑھ، اسی طرح پڑھ جس طرح لوگ پڑھتے چلے آ رہے ہیں، یہاں تک امام مہدی کا نزول ہو، جب آپ آئیں گے تو اس وقت قرآن کریم اپنی اصل پر پڑھا جائے گا اور وہ قرآن لایا جائے گا جو حضرت علی نے لکھا تھا۔

ولقد عهدنا الیٰ اٰدم من قبل فنسی ولم نجد له عزما۔ (پ ۱۶ : طٰہ آیت ۱۱۵)

ترجمہ۔ اور آدم کو ہم نے پہلے ہی ایک حکم دیا تھا پس وہ اس کو بھول گئے اور ہم نے ان میں پختگی نہ پائی۔

---

[1] دیکھئے تفسیر قمی ص ۵۴ طبع تہران [2] اصول کافی کتاب الحجہ جلد ۱ ص ۲۲۸ [3] اصول کافی جلد ۲ ص ۶۳۲

کافی میں جناب امام جعفر صادق سے خدا تعالیٰ کے اس قول کے بارے میں منقول ہے کہ واللہ! جناب رسولِ خدا پر یہ آیت اس طرح نازل ہوئی تھی :۔

ولقد عهدنا الیٰ اٰدم من قبل كلمات فی محمد وعلی وفاطمة والحسن والحسین والائمة من ذریتهم (فنسی) هٰکذا واللّٰه نزلت علیٰ محمد صلی اللّٰه علیه وسلم۔[1]

ترجمہ۔ اور آدم کو ہم نے پہلے سے محمد، علی، فاطمہ، حسن، حسین اور ان کی ذریت کے ائمہ کے بارے میں حکم دیا تھا۔ سو آدم علیہ السلام بھول گئے۔ خدا کی قسم حضورؐ پر یہ آیت اسی طرح نازل ہوئی تھی۔

اب علامہ علی بن ابراہیم القمی اور اس دورِ آخر کے ملا مقبول دہلوی کے چند حوالے اور پڑھیئے :۔

ثم یأتی من بعد ذٰلك عامٌ فیه یغاث الناس وفیه یعصرون۔

(پ۱۲ : یوسف آیت ۴۹)

ترجمہ۔ پھر اس کے بعد ایک ایسا برس آئے گا کہ جس میں لوگ سیر و سیراب ہو جائیں گے اور جس میں وہ نچوڑیں گے۔

تفسیر قمی میں جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آنجناب امیر المومنین علیہ السلام کے سامنے ایک شخص نے یہ آیت یوں تلاوت کی۔ حضرت نے فرمایا۔ وائے ہو تجھ پر کیا نچوڑیں گے ؟ آیا خمر نچوڑیں گے ؟ اس شخص نے عرض کی۔ یا امیر المؤمنین پھر میں اسے کیوں کر پڑھوں ؟ فرمایا۔ خدا نے یوں نازل فرمائی ہے :۔

ثم یأتی من بعد ذٰلك عام فیه یغاث الناس وفیه یُعصرون۔[2]

یعنی یعصرون کو مجہول بتلایا، جس کے معنی ہیں اس کو بادلوں سے پانی بکثرت دیا جائے گا۔

حاشیہ ترجمہ مقبول میں آیت پر لکھا ہے :۔

شراب خور خلفاء کی خاطر یُعصَرُون کو یَعصِرون سے بدل کر زیر و زبر کیا گیا۔[3]

ذٰلك بانهم کرهوا ما انزل اللّٰه فاحبط اعمالهم۔ (پ۲۶ سورۂ محمد : آیت ۹)

ترجمہ۔ یہ اس لیے کہ اللہ نے جو کچھ اُتارا۔ اس سے انہوں نے نفرت کی پس اس نے بھی ان کے اعمال اکارت کر دیئے۔

---

[1] اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۴۱۶ [2] حاشیہ ترجمہ مقبول صفحہ ۶۳۷ [2] تفسیر قمی صفحہ ۱۹۲ [3] ترجمہ مقبول صفحہ ۷۹۴

تفسیر قمی میں جناب امام محمد باقر سے منقول ہے کہ جبریل امین نے جناب رسولِ خدا کو یہ آیت یوں پہنچائی تھی :۔

ذٰلك بانهم کرهوا ما انزل اللّٰه فی علی یہ اس لیے کہ انہوں نے اسے ناپسند کیا جو اللہ نے علیؑ کے بارے میں اُتارا۔ مگر مرتدین نے نام اڑا دیا۔[1]

واصحاب الیمین۔ ما اصحاب الیمین۔ فی سدرٍ مخضود وطلحٍ منضود۔

(پ۲۷ ، سورۃ الواقعہ آیت ۲۹)

ترجمہ۔ اور داہنے ہاتھ والے کیا کہنے داہنے ہاتھ والوں کے۔ وہ بغیر کانٹوں کے جھکی ہوئی بیریوں بیریوں میں ہوں گے اور تہ بہ تہ کیلوں میں۔

ترجمہ مقبول کے حاشیہ پر ہے :۔

کسی شخص نے جناب امیر المومنین کے سامنے وطلحٍ منضود پڑھا تو حضرت نے فرمایا کہ طلح کا کیا موقع ہے اصل تو یہاں طلع ہے۔ جیسے خدا تعالیٰ فرماتا ہے ونخل طلعها هضیم کسی نے عرض کی۔ پھر حضور اسے بدل کیوں نہیں دیتے۔ فرمایا آج اس کا موقع نہیں کہ قرآن مجید کی اصلاح کر کے عوام الناس کو ہیجان میں لایا جائے۔ ائمہ علیہم السلام میں سے یہ حق مخصوص جناب صاحب الامر (امام مہدی) علیہ السلام کا ہے کہ قرآن مجید کو اسی حد پر پڑھوائیں گے جس حد پر وہ زمانہ جناب رسولِ خدا میں پڑھا جاتا تھا۔[2]

ان شواہد کی روشنی میں یہ تصور تک نہیں کیا جا سکتا کہ اثنا عشری شیعہ موجودہ قرآن پر ایمان رکھتے ہوں اور اسے اسی ترتیب سے کلام الٰہی سمجھتے ہوں۔ ان کا جو کوئی فرد موجودہ قرآن پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتا ہے وہ تقیہ کی آڑ میں ایسا کہتا ہے اور ہمارے نزدیک وہ صریح جھوٹ بولتا ہے۔ اگر اس کا دلی اعتقاد یہ ہوتا تو کیا وہ علامہ فرات بن ابراہیم الکوفی، علامہ علی بن ابراہیم القمی، علامہ محمد بن یعقوب الکلینی سے لے کر ملا باقر مجلسی اور ملا مقبول دہلوی تک تمام اثنا عشری شیعہ علماء کو تحریف قرآن کے جرم میں کافر نہ سمجھتا۔ یہ وہ میزان ہے جس سے ان کے اندر کی بات باہر آ جاتی ہے کہ وہ خود بھی تحریف قرآن کا عقیدہ رکھتے ہیں، مگر تقیہ کے باعث اس کا انکار کرتے ہیں۔

واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم

کتبہ۔ خالد محمود عفا اللہ عنہ

---

[1] ترجمہ مقبول صفحہ ۱۰۱۱ [2] حاشیہ ترجمہ مقبول صفحہ ۱۰۶۷

سوال: شیعہ علماء اہلسنت پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ انبیاء کی تعظیم نہیں کرتے۔ انہیں وہ نوع بشری میں اپنے جیسا انسان سمجھتے ہیں۔ اپنے ثبوت میں وہ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کی یہ عبارت پیش کرتے ہیں:۔

انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات با عامہ در نفس انسانیت برابر اند و در حقیقت و ذات ہمہ متحد[1]

کیا یہ حوالہ صحیح ہے اور کیا اس سے انبیاء کی کھلی توہین لازم نہیں آتی۔ گو کہنے والا ان معانی کا التزام نہ کر رہا ہو؟

سائل۔ عبدالغنی از سنت نگر لاہور

الجواب: یہ حوالہ صحیح ہے۔ جو بات حضرت مجدد الف ثانیؒ نے لکھی ہے قرآن کریم کے بالکل مطابق ہے شیعہ قدماء بھی سب اسی عقیدہ کے تھے کہ انبیاء علیہم السلام نفس انسانیت میں عامۃ الناس کے شریک ہیں۔ ان کی فضیلت ان کی ذات سے نہیں ان کی صفات کاملہ کی بناء پر ہے مشہور شیعہ عالم علی ابن مطہر الحلی (۷۶۲ھ) لکھتے ہیں:۔

افراد الامۃ مشارکون لہ فی الانسانیۃ ولوازمہا فلولا المعجزہ لما تمیز عنہم[2]

ترجمہ۔ امت کے تمام افراد آپ کے ساتھ انسانیت اور اس کے لوازمات میں شریک ہیں، معجزات نہ ہوں تو وہ ان میں پہچانے بھی نہ جا سکیں۔

بتایئے کیا یہ وہی بات نہیں جو حضرت امام ربانی نے کہی ہے۔ اور قرآن پاک کا بیان بھی یہی ہے آپ کہہ دیں کہ میں بھی اسی طرح انسان ہوں جیسے تم۔ قل انما انا بشر مثلکم۔

سوال: جناب رسالتمآبؐ نے ۲۳ سالہ کار نبوت کے بعد امت کے لیے علم اور حکم چھوڑا۔ آپ بوقت وفات ایک سلطنت کے سربراہ بھی تھے اور خدا کے آخری پیغمبر بھی۔ سو ترکہ رسول میں علم اور حکم دونوں تھے۔ آپ نے فرمایا میں تم میں کتاب و سنت چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ یہ کیوں نہ کہا، میں تم میں کتاب و سنت اور حکومت چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ میرے بعد کتاب و سنت سے علم چلے اور خلافت سے حکومت چلے؟

مدینہ کی اسلامی حکومت آپ کی قائم کردہ تھی۔ آپ نے اسے اپنے ترکہ میں ذکر کیوں نہ فرمایا۔ یہ کسی دلیل کی محتاج نہیں۔ بدیہیات میں سے ہے کہ آپ نے اپنے ترکہ میں کتاب و سنت اور حکومت چھوڑیں۔ اس کی تفصیل فرمائیں کہ وراثت انبیاء کیا ہے؟

سائل محمد طیب از بورے والا

---

[1] مکتوبات جلد ا صـ۳۲۹ [2] کشف المراد صـ۲۱۹ شرح تجرید الاعتقاد

جواب: علم میں وراثت چلتی ہے۔ شاگرد اُستاد کے علمی وارث ہوتے ہیں۔ حکومت میں وراثت نہیں ہوتی حکومت قائم کرنا لوگوں کی اپنی ضرورت ہے، وہ خود اس کا اہتمام کریں۔ علم اُوپر سے آتا ہے، حکومت نیچے سے آتی ہے۔ علم کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول خاتم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور حکومت کا سرچشمہ عوام، جو اپنے سربراہ کا انتخاب کرتے ہیں۔ سو یہ بات صحیح ہے کہ حکومت میں وراثت نہیں، علم میں وراثت ہے جسے سند بھی کہتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر حضرت علیؓ کو خلیفہ بنایا ہوتا تو آپ یہ نہ فرماتے کہ میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ بلکہ یہ کہتے کہ تین اور ان میں حکومت بھی ذکر فرماتے کہ اسے ذمہ داری سے سنبھالنا میری اس محنت کو ضائع نہ کرنا —— آپ کا اپنے ترکہ میں حکومت کا ذکر نہ کرنا بتلاتا ہے کہ آپ نے حضرت علیؓ کو اپنا جانشین ہرگز مقرر نہ کیا تھا۔

امتیں اپنا نظام حکومت خود قائم کرتی ہیں، علم انہیں پیغمبروں سے ملتا ہے۔ حضرت علیؓ کو حضورؐ سے علم کی وراثت ملی تھی حکومت کی نہیں۔ ایک دفعہ حضورؐ نے آپ سے کہا۔ انت اخی و وارثی۔ تو میرا دین میں بھائی بھی ہے اور وارث بھی۔ تو حضرت علیؓ نے پوچھا۔

ما الذی ارث منک یا رسول اللہ۔

ترجمہ۔ اے اللہ کے رسول! میں آپ سے کیا وراثت پاؤں گا۔

تو آپ نے فرمایا:۔

ما ورثت الانبیاء من قبلی۔

ترجمہ۔ جو چیز مجھ سے پہلے انبیاء کرام وراثت میں دیتے رہے۔

قال وما ورثت الانبیاء من قبلک قال کتاب ربہم وسنۃ نبیہم[1]

ترجمہ۔ حضرت علیؓ نے کہا آپ سے پہلے انبیاء وراثت میں کیا دیتے آئے؟ حضور رسالتمآبؐ نے فرمایا۔ اپنے رب کی کتاب اور ان کے نبی کی سنت۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ انبیاء کی وراثت علم میں چلتی ہے مال میں نہیں، نہ حکومت میں، اور یہ کہ حضور نے اپنے ترکہ میں حکومت کو ذکر نہیں فرمایا۔ یہ امت کی اپنی ضرورت تھی جو انہوں نے امرھم شوریٰ بینھم کے تحت قائم کی اور یہ گویا خدا کی طرف سے ہی ایک نظام اور ایفاء عہد استخلاف تھا جو آیت کریمہ امرھم شوریٰ بینھم کے تحت عمل میں آیا۔

---

[1] تذکرۃ الخواص صـ۸۲

یہ جو بعض روایات میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا: میں تم میں دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترت (اولاد) تو یہاں اللہ کی کتاب اپنے وسیع معنوں میں ہے اور یہ سنت کو بھی شامل ہے اور عترت کو چھوڑنے سے مراد ان کے لیے حسن سلوک کی استدعا ہے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی سیرت گواہ ہے کہ وہ کس طرح قرآن کریم اور عترتِ رسول کو ساتھ ساتھ لے کر چلے اور حضرت معاویہؓ بھی نہایت محبت اور فیاضی سے حضرت حسن اور حسین سے داد و دہش اور تحائف و عطایا کا معاملہ کرتے رہے۔

حکمرانوں کے لیے رعایا کو دنیا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ حضرت ابوبکرؓ کو فدک کی زمین دینے میں بھی کوئی مالی اور عملی وقت نہ تھی نہ وہ خود اس زمین کے محتاج تھے۔ یہ صرف ایک اصول کی پاسداری تھی جس کی وجہ سے آپ نے حضرت سیدہؓ اور حسنین کریمینؓ کو باغِ فدک کی آمدنی تو دی لیکن پیغمبروں کی مالی وراثت نہ چلنے کے اصولِ شرعی کو ٹوٹنے نہ دیا اور فرمایا: میرے مال میں سے جو تم چاہو لے لو۔ لیکن میں حضورؐ کی بات کے خلاف نہیں کر سکتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہٗ: خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیوں کے سلسلہ میں حضرت عثمانؓ کے دامادِ رسول ہونے میں بحث چل رہی ہے شیعہ کہتے ہیں لے پالک بیٹی کے خاوند کو بھی شفقۃً داماد کہہ دیتے ہیں۔ حضرت عثمانؓ اگر حقیقۃً دامادِ رسول تھے تو بتلائیں کبھی کسی نے انہیں حضرت علی علیہ السلام کا ہمزلف کہا یا حضرت علیؓ نے کبھی کہا ہو:۔

یا عثمان انت همزلفی۔ اے عثمانؓ تو میرا ہمزلف ہے۔

شیعہ بڑے زور سے ایسا حوالہ مانگ رہے ہیں اگر کہیں ہمزلفی کی روایت ہو تو اس کی نشاندہی فرمائیں؟

سائل: فدا حسین از گجرات

جواب: ہم زلف وہ ہیں جو دو بہنوں کے مختلف خاوند ہوں۔ وہ آپس میں ہم زلف کہلاتے ہیں کہ ان کی بیویاں آپس میں بہنیں لگتی ہیں۔ ہمزلف عربی کا لفظ نہیں ہے۔ جس شیعہ مولوی نے اس روایت کا مطالبہ کیا ہے کہ کسی نے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو ہمزلف کہا ہو۔ وہ عربی سے بالکل ناواقف معلوم ہوتا ہے یا عثمان انت همزلفی کا مطالبہ جاہل کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔

عربی میں اس رشتے کے لیے کوئی اصطلاح رائج نہیں۔ اس مفہوم کا ترجمہ کرتے ہوئے اس کے لیے شریکٌ فی الصهرية یا شریکٌ فی الختنية کے الفاظ کہے جا سکتے ہیں۔ اثنا عشری شیعوں کے ثقہ عالم علامہ علی بن المطہر الحلی (۷۶۲ھ) حکیم طوسی کی کتاب تجرید الاعتقاد کی شرح میں لکھتے ہیں:۔

وعثمان وان شارکه فی کونه ختناً لرسول الله صلی الله علیه وسلم الا ان فاطمه علیها السلام اشرف بناته۔[1]

ترجمہ۔ اور عثمان اگرچہ حضرت علیؓ کے ساتھ حضورؐ کے داماد ہونے میں شریک ہیں لیکن اس لحاظ سے حضرت علیؓ کا شرف ہے کہ آپ کی اشرف بنات فاطمہؓ آپ کے نکاح میں تھی۔

کیا یہاں حضرت عثمانؓ کے لیے صریح طور پر حضرت علیؓ کے ساتھ شریک فی الختنیۃ کے الفاظ موجود نہیں؟ رہا حضرت سیدہ فاطمہؓ کا شرف کہ آپ حضورؐ کی اشرف البنات ہیں، یہ ایک دوسری بحث ہے۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ آپس میں ہمزلف تھے۔ یہ حقیقت بالکل بے غبار ہے۔

حضرت فاطمہؓ اگر اشرف البنات ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی صاحبزادی حضرت سیدہ زینبؓ بلاشبہ خیر البنات ہیں اور خود آپ کے لیے لسانِ شریعت سے یہ الفاظ منقول ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

خیر بناتی اصیبت فیّ۔[2]

ترجمہ۔ میری یہ بیٹی خیر البنات ہے جس نے میری خاطر بہت سی تکلیفیں دیکھیں۔

شرف اپنی ذات میں بہت اونچی نسبت ہے۔ لیکن خیر وہ اچھائی ہے جو دوسروں تک متعدی ہوتی ہے صرف اپنے میں محدود نہیں ہوتی۔

ہم علامہ حلی کے اس استدلال سے اتفاق نہیں کرتے کہ چونکہ حضرت فاطمہؓ اشرف البنات ہیں اس لیے بحیثیتِ داماد حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ سے فائق ہوں ان کے نکاح میں اگر اشرف البنات ہے تو ان کے نکاح میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیاں یکے بعد دیگرے رہیں اور تاریخ بتاتی ہے کہ پوری نسلِ آدم میں ایک شخص ایسا نہیں گزرا جس کے نکاح میں کسی پیغمبر کی دو بیٹیاں رہی ہوں۔

واللہ اعلم و اعلمہ اتم و احکم۔

کتبہ۔ خالد محمود عفا اللہ عنہ

استفتاء

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیانِ شرع متین مندرجہ ذیل مسائل دوازدہ[12] کے بارے میں پیشِ نظر رہے کہ سائل اہلسنت والجماعت عقیدے سے تعلق رکھتا ہے اور اسی کے مطابق جوابات کا طالب ہے۔

ابراہیم محمد زمکا متعلم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

---

[1] شرح تجرید ص۲۴۹ [2] مجمع الزوائد جلد ۹ ص۱۱۲

(۱) اُمتی کی صحیح تعریف کیا ہے ؟

(۲) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو امتی کہہ سکتے ہیں یا نہیں ؟ یہ امتی ماننا جزوِ ایمان ہے یا نہ ؟

(۳) حضرت عیسیٰ علیہ السلام بعد نزول نبی رہیں گے یا نہ ؟ اگر ان کو کوئی نبی نہ مانے تو کیا وہ اسلام سے خارج ہوگا؟

(۴) حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بعد نزول وحی آئے گی یا نہیں ؟ اگر آئے گی تو وہ وحی نبوت ہوگی یا وحی الہامی؟

(۵) حضرت عیسیٰ علیہ السلام بعد نزول مثل دیگر انبیاء کے معصوم تسلیم کئے جائیں گے یا نہیں ؟

(۶) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حسب سابق نبی کی حیثیت سے ماننے میں اور ان پر وحی آنیکے قائل ہونے سے ختم نبوت کے مسئلہ پر اثر پڑنے کا اشکال صحیح ہے یا غلط ؟

(۷) جو یہ کہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام شریعت محمدیہ ہی کا اتباع کریں گے مگر امتی نہ ہوں گے تو وہ اسلام سے خارج ہوگا یا نہیں ؟

(۸) حضرت ابوبکر صدیقؓ افضل الامۃ ہیں یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام جنہوں نے دنیوی زندگی میں حضورؐ کو بحالتِ ایمان معراج کی رات دیکھا تھا ؟

(۹) حضرت امام مہدی اور حضرت عیسیٰ ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں یا یہ دو علیحدہ علیحدہ اشخاص ہیں ؟

(۱۰) حضرت عیسیٰ کا قبلہ تو بیت المقدس تھا۔ آپ نازل ہونے کے بعد کس طرح حج کریں گے اور مکہ آئیں گے ؟

(۱۱) کیا یہ حدیث صحیح ہے۔ لوکان موسیٰ وعیسیٰ حیین لما وسعہما الا اتباعی۔ اگر یہ حدیث ہو تو کیا اس میں صاف مذکور نہیں کہ حضرت عیسیٰ اب زندہ نہیں ہیں ؟

(۱۲) حضرت عیسیٰ کے نازل ہونے پر یہود و نصاریٰ ہر دو ملتیں ختم ہو جائیں گی تو کیا حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی کے فقہی امتیازات باقی رہیں گے یا نہیں یا سب کا مسلکِ فقہی بھی ایک ہو جائے گا ؟

آپ کے سوالوں کے جوابات درج ذیل ہیں :

حامداً ومصلیاً ومبسملاً امابعد :-

(۱) امت سے مراد مقتدی ہیں۔ جو لوگ کسی مقتدا کی اقتداء پر جمع ہوں وہ اس کے امتی ہوں گے۔ جس طرح نخبہ کے معنی منتخب کے اور رحلہ کے معنی مرحول الیہ کے ہیں۔ اسی طرح لفظ امت فُعلۃ کے وزن پر مفعول کے معنی میں ہے۔ جس کی امامت کی گئی وہ امت ہے۔

اقتداء کرنے والے جب کسی مقتداء پر اتفاق کرلیں تو جماعت بنتی ہے۔ اس پہلو سے امت اور جماعت الجیل من الناس کو کہا جاتا ہے۔ حق پہ جمع ہونے والے افراد بھی ایک امت شمار ہوتے ہیں کما نص علیہ صاحب

القاموس۔ لیکن یہ معنی مجازی ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو جن لوگوں کے لیے آپ کی بعثت ہوئی وہ سب آپ کی امت ہیں۔ آپ جن لوگوں کے لیے پیشوا قرار پائے وہ سب آپ کی امتِ دعوت ہیں اور مکلف ہیں کہ آپ کی بات مانیں۔ جنہوں نے مان لیا وہ امتِ اجابت بن گئے۔ امتِ اجابت سے مراد وہ لوگ ہیں جو آپ کی دعوت اور آپ کی تعلیمات پر جمع ہو گئے۔ امتی وہ ہے جس کو علم دین پیغمبر سے ملے اور پیغمبر وہ ہے جسے علمِ دین خدا سے ملے۔ اگر کوئی امتی دعوےٰ کرے کہ مجھے علم خدا سے ملتا ہے اور علم دینی نوعیت کا ہے تو وہ امتی ہونے سے نکل جاتا ہے۔ اب اس کے لیے دو ہی صورتیں ہیں یا وہ پیغمبر ہو یا کذاب ـــــ اُمتی وہ کسی صورت میں نہیں رہا۔

(۲) حضرت عیسیٰ علیہ السلام مستقل صاحبِ شریعت اور صاحبِ امت نبی تھے۔ قیامت سے پہلے دُنیا میں ایک دفعہ پھر تشریف لائیں گے۔ آپ کے بعد حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ کی امت ختم ہو گئی۔ نئے نبی پر نئی امت بنتی ہے۔ جب نیا نبی آئے تو ایک اور امت بن جاتی ہے۔ اب اس دور کے لیے صاحبِ امت نبی حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مگر چونکہ پہلے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ابھی وفات نہیں آئی اور قیامت سے پہلے آپ کی دوبارہ تشریف آوری بھی مقدر تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت کو ایک درجے میں باقی رکھا، وہ درجہ اہل کتاب کا ہے۔ آپ چونکہ شریعتِ تورات کے بھی کسی حد تک پیرو تھے اس لیے اہلِ تورات کو بھی اہلِ کتاب میں رکھا گیا۔ یہود و نصاریٰ دونوں امتیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دوبارہ تشریف آوری پر آپ پر تشریف لے آئیں گی اور مسلمان ہو جائیں گی۔ اسیطرح حضرت عیسیٰ کی امت کلیۃً ختم ہو جائے گی۔ سب اہل کتاب آپ پر صحیح تفصیل سے ایمان لاکر امتِ محمدی میں شامل ہو جائیں گے اور یہ دور دورِ محمدی ہوگا۔ قرآن کریم میں ہے :-

وان من اھل الکتاب الا لیؤمنن بہ قبل موتہ ویوم القیامۃ یکون علیھم شھیدا۔ (پ۶: النساء ع ۲۲)

ترجمہ۔ اور اہل کتاب سے کوئی باقی نہ رہے گا مگر یہ کہ وہ حضرت عیسیٰ پر ان کی وفات سے پہلے وہ ضرور ایمان لے آئے گا اور آپ قیامت کے دن ان پر گواہ ہوں گے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک صاحبِ امت نبی جب صاحبِ امت نہ رہے اور زندہ بھی ہو تو وہ کس درجے میں شمار ہوگا۔ کیا وہ نبی ہوگا یا اپنے وقت کے نبی کا تابع ہوگا ؟ جواب یہ ہے کہ وہ اپنی پوری امت کے ساتھ امت محمدی میں شامل ہو جائے گا اور اپنے اسی نئے دور زندگی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کرے

گا اور آپ کی امت ہو کر رہے گا۔ نبی ہونے کے باوجود اس کی نبوت نافذ نہ ہوگی۔ یہ نہیں کہ ان حالات میں ان سے نبوت واپس لے لی جائے۔ شرح مواقف میں ہے :-

لا یتصور عزلہ عن کونہ رسولاً۔[1]

ترجمہ۔ آپ کے رسالت سے معزول کئے جانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی تشریف آوری کے فوراً ساتھ مسلمانوں کی امامت فرماتے تو اس میں دورِ محمدی کے ختم ہونے کا ایہام تھا۔ آپ دوسری تشریف آوری پر پہلی نماز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی کی اقتداء میں پڑھیں گے اور اس سے آپ خود بھی امتی ہو جائیں گے۔ آپ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی کی اقتداء کرنا گویا اعلان ہوگا کہ یہ دور دورِ محمدیؐ ہے اور پچھلے ایک نبی کے آنے پر بھی وہ دورِ محمدیؐ ہی رہے گا۔ تاہم آپ رسالت سے معزول نہ ہوں گے جب موت پر بھی رسالت منقطع نہیں ہوتی، تو اگر موت بھی نہ آئی ہو تو رسالت کے ختم ہونے کا سوال بالکل بے موقع ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کریم ہے۔ کوئی مرتبہ عطا کر کے چھین لینا اس کی شانِ کریمی کے خلاف ہے۔ سو حق یہ ہے کہ ان کی آمدِ ثانی پہ نبوت آپ سے مسلوب نہ ہوگی، صرف اس کا حکم نافذ نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ دور دورِ محمدی ہے اور اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی روحانی بادشاہی ہے۔ ایک بادشاہ کسی دوسرے ملک میں جائے تو وہ بادشاہ تو رہتا ہے لیکن اس کی بادشاہی وہاں نافذ نہیں ہوتی۔ اس کا حکم نہیں چلتا، وہاں اسی کی بادشاہی ہی چلے گی جس کا وہ ملک ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے نبی کے الفاظ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے اس دورِ ثانی میں نبی اور وحی کے الفاظ حدیث شریف میں ملتے ہیں۔
حضرت نواس بن سمعانؓ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

ثم یأتی عیسیٰ قوم قد عصمھم اللہ منہ فیمسح عن وجوھھم ویحدثھم بدرجاتھم فی الجنۃ فبینما ھو کذلک اذا اوحی اللہ الی عیسیٰ علیہ السلام ...... ثم یھبط نبی اللہ عیسیٰ علیہ السلام واصحابہ الی الارض فلا یجدون فی الارض۔[2]

اس حدیث میں صریح طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے وحیِ خداوندی آنے اور آپ کے لیے نبی اللہ کے الفاظ ملتے ہیں۔

[1] شرح مواقف صد ۷۶۲ [2] مسلم شریف جلد ۲ صد ۴۰۱

(۴) معلوم رہے کہ یہ قانونی وحی نہیں کہ آپ اس کی تصدیق کی کسی کو دعوت دیں اور اس پہ ایمان لانا ضروری قرار پائے۔ بلکہ یہ وحی عملی ہے، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر حجت ہوگی اور آپ اس کے مطابق عمل کریں گے۔ اس قسم کی وحی کے لیے جبرئیل کی آمد کا کتبِ حدیث میں کہیں ذکر نہیں ملتا۔ سو یہ وحیِ الہامی ہے وحیِ رسالت نہیں نزولِ جبرئیل بہ پیرایہ وحی قیامت تک کے لیے مسدود ہے۔ آپ شریعت کے طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت پر عمل پیرا ہوں گے اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو تورات و انجیل کے ساتھ قرآن و حدیث کی تعلیم بھی دے دی تھی۔ قرآن کریم میں ہے :-

ویعلمہ الکتاب والحکمۃ والتوراۃ والانجیل۔ (پ۳، آل عمران)

ترجمہ۔ اور اللہ تعالیٰ عیسیٰ ابن مریم کو سکھائے گا قرآن و حدیث اور تورات و انجیل۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ دورِ محمدی پانا نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ آپ کو قرآن و حدیث کی تعلیم نہ دیتے۔ کتاب و حکمت قرآن کے محاورے میں کتاب و سنّت کا نام ہے۔

قدوۃ المتکلمین الشیخ ابو منصور البغدادیؒ (۴۲۹ھ) لکھتے ہیں :-

کل من اقر بنبوۃ نبینا محمد اقر بانہ خاتم الانبیاء والرسل واقر بتابید شریعتہ ومنع من نسخھا وقال ان عیسیٰ علیہ السلام اذا نزل من السماء ینزل بنصرتہ شریعۃ الاسلام۔[1]

ترجمہ۔ ہر وہ شخص جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار کر لیا۔ اس نے مان لیا کہ حضور خاتم الانبیاء والرسل ہیں۔ اس نے مان لیا کہ آپ کی شریعت ہمیشہ تک رہے گی کبھی منسوخ نہ ہوگی سو اس نے یہ بھی مان لیا کہ حضرت عیسیٰ جب آسمان سے نازل ہوں گے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی نصرت کے لیے آئیں گے اپنی نبوت کی دعوت نہ دیں گے۔

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ لکھتے ہیں :-

اجتہاد حضرت روح اللہ موافق اجتہاد امام اعظم خواہد بود نہ آنکہ تقلید ایں مذہب خواہد کرد کہ شانِ او ازاں بلند تر است کہ تقلید علمائے امت فرماید۔[2]

ترجمہ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اجتہاد امام ابو حنیفہؒ کے اجتہاد کے موافق ہوگا نہ یہ کہ وہ حنفی مذہب کے مقلد ہوں گے آپ کی شان اس سے بہت بلند ہے۔ آپ اس اُمت کے علماء کی تقلید کریں۔

[1] اصول الدین صد ۱۶۳ [2] مکتوبات دفتر دوم مکتوب ۵۵ صد ۱۱ لکھنؤ

اس عبارت سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ آپ عام علماء امت کی طرح اس امت میں شامل نہیں ہیں۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ طے شدہ ہے کہ آپ روایۃً اور اجتہاداً شریعت محمدی کے تابع ہی ہوں گے۔ ایک دوسرے مکتوب میں حضرت مجدد الف ثانی رح لکھتے ہیں:۔

عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کہ نزول خواہد نمود عمل بشریعت او خواہد کرد و بعنوان امت او خواہد بود[1]

اس میں تصریح ہے کہ آپ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہوں گے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام آمد ثانی پر ایک جلالی شان سے تشریف لائیں گے۔ سب یہود و نصاریٰ آپ پر ایمان لے آویں گے۔ آپ کی تشریف آوری علامات قیامت میں سے ہوگی۔ سو یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی شخص اس آمد ثانی پر آپ پر ایمان نہ لائے۔ قرآنی آیت لیؤمنن بہ قبل موتہ میں آپ پر صحیح ایمان لے آنے کی خبر دی گئی ہے۔ اس وقت کوئی کافر نہ رہے گا۔ ہر کچے پکے مکان میں کلمۂ اسلام داخل ہو جائے گا۔

(۵) معصومیت لوازم رسالت میں سے ہے اور یہ لوازم ذات میں سے ہے۔ جب نبوت آپ سے مسلوب نہیں تو ظاہر ہے کہ عصمت بھی آپ سے منتفی نہ ہوگی۔ آپ سے کوئی ایسا عمل سرزد نہ ہوگا جو نبی کی شانِ عصمت کے خلاف ہو۔

(۶) آپ کی دوبارہ تشریف آوری عقیدہ ختم نبوت کے ہرگز خلاف نہیں۔ سیدنا ملا علی قاری رح (۱۰۱۴ھ) لکھتے ہیں:۔

اقول لا منافاۃ بین ان یکون نبیًّا و یکون متابعًا لنبینا صلی اللہ علیہ وسلم فی بیان احکام شریعتہ و اتقان طریقتہ و لو بالوحی الیہ کما یشیر الیہ قولہ صلی اللہ علیہ وسلم لو کان موسیٰ حیًّا لما وسعہ الا اتباعی ای مع وصف النبوۃ والرسالۃ والا مع سلبھما لا یفید زیادۃ المزیۃ فالمعنی انہ لا یحدث بعدہ نبی لانہ خاتم النبیین السابقین۔[2]

ترجمہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر موسےٰ علیہ السلام بھی زمین پر زندہ ہوتے تو انہیں بھی میری اتباع کے سوا چارہ نہ تھا یعنی وہ نبوت اور رسالت سے موصوف ہونے کے باوجود میری اتباع کرتے۔ کیونکہ نبوت اور رسالت کے بغیر حضرت موسےٰ کے آپ کا مطیع ہونے سے حضور تاجدار ختم نبوت کے مطاع ہونے میں کسی فضیلت کا اظہار نہیں ہوتا۔ حالانکہ یہ مقام مدح ہے۔ پس واضح ہوا کہ حضرت

---

[1] دفتر دوم مکتوب نمبر ۶۷ صفحہ [2] مرقات جلد ۵ ص ۵۶۴

عیسیٰ علیہ السلام کی آمد ثانی پر اُن کا نبی ہونا آیت "خاتم النبیین" اور حدیث "لا نبی بعدی" کے خلاف نہیں۔ ان دونوں کا صحیح مطلب جو امت نے سمجھا ہے یہی ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا۔

(۷) حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی اس آمد ثانی پر نبی بھی ہوں گے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی بھی۔ امتی نہ بھی کہیں تو حرج نہیں معین تسلیم کرنا اور آپ کو تابع شریعت محمدی ماننا ضروری ہوگا۔ جو یہ کہے کہ آپ شریعت محمدی کا اتباع تو کریں گے لیکن امتی نہ ہوں گے وہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔

آپ کی ذات گرامی میں چونکہ یہ دونوں وصف شامل ہوں گے۔ یعنی نبی بھی اور امتی بھی۔ تو مناسب تھا کہ اس امت میں افضل الامۃ علی الاطلاق حضرت ابو بکر صدیق رض ہی سمجھے جائیں۔ اس واسطے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف امتی نہیں، ساتھ نبی بھی ہوں گے، گو ان کی نبوت نافذ نہ ہوا اور جو افراد صرف امت ہیں ان سب کے سردار حضرت ابو بکر صدیق رض ہی ہیں۔

(۸) آپ کے لیے امتی ہونا یا معین الامۃ ہونا علماء اسلام کے ہاں مختلف فیہ تعبیر رہیا ہیں۔ کسی نے آپ کے امت ہونے کا انکار کیا اور معین الامۃ وغیرہ کی تعبیر اختیار فرمائی۔ سو اس اختلاف کے پیش نظر مناسب تھا کہ آپ کو علی الاطلاق افضل الامۃ کہا جائے۔ سو اس خطاب کے لائق حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی رہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری امت کا حشر آپ کے ساتھ ہوگا۔ دیگر سب امتیں اپنے اپنے نبی کے ساتھ ہوں گی۔ قرآن کریم میں ہے:۔

فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشہید و جئنا بک علیٰ ھٰؤلاء شہیدا۔

(پ ۵، النساء ع ۶)

ترجمہ: پھر کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہی دینے والا لائیں گے اور آپ کو ان لوگوں پر احوال بتانے والا کر کے لائیں گے۔

اس آیت کی روشنی میں پتہ چلتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا حشر اپنی امت سابقہ کے ساتھ ہی ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں نہ ہوگا۔ الا یہ کہ بعض علماء کی بات مان لی جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے دو حشر ہوں گے۔ یہ قول بے شک موجود ہے جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ان کی آمد ثانی پر ایمان لائیں گے گو اس کے مابعد وہ لوگ امت محمدیہ میں داخل ہو جائیں گے اور آپ کی امت ختم ہوگی۔ لیکن ان کے ایمان لانے کی گواہی قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی دیں گے۔

جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:۔

وان من اهل الکتاب الا لیؤمنن به قبل موته ـ ویوم القیامة یکون علیهم شهیدا۔ (پ۶ : النساء ۲۲)

ترجمہ۔ اور کوئی نہ رہے گا اہل کتاب سے مگر یہ کہ ضرور ایمان لائے گا عیسیٰ پہ اس کی موت سے پہلے اور وہ قیامت کے دن ان پہ گواہ ہوگا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے علیحدہ حشر پر جو آپ کا اپنی امت کے ساتھ ہوگا ایک اور شہادت ملتی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک اور حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں :۔

فاقول کما قال العبد الصالح وکنت علیهم شهیدا ما دمت فیهم[1]

ترجمہ۔ سو میں کہوں گا وہی بات جو عبدِ صالح (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) پہلے کہہ چکے ہوں گے کہ میں ان پہ (عیسائیوں پہ) اسی مدت تک گواہ تھا جب تک میں ان میں رہا۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ اپنی امت پہ گواہی دیں گے گو وہ اس دور تک کی ہی ہو جب تک وہ ان میں رہے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت پہ گواہی دیں گے۔ حضرت عیسیٰ کے لیے قال کا صیغہ ماضی اقول کی نسبت سے ہے کہ حضور جب یہ کہیں گے اس وقت حضرت عیسیٰ اپنی بات کہہ چکے ہوں گے۔ حضرت عیسیٰ اپنی آمدِ ثانی کے بعد کے کسی حال پر اس لیے گواہی نہ دیں گے کہ یہ دورِ محمدیؐ ہے۔ اس پر کوئی اور نبی گواہی کیسے دے سکتا ہے۔ حضرت عیسیٰ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں شامل ہوں گے۔

ملحوظ رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں تشبیہ صرف اس میں ہے کہ حضرت عیسیٰ بھی اس وقت تک کے گواہ ہوں گے جب تک وہ ان میں رہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی وقت تک کے حالات براہِ راست دیکھے ہوں گے، جب تک آپ ان میں رہے۔ باقی رہی اگلی بات کہ بعد کے حالات دونوں پیغمبروں کے اپنے اپنے تھے اور دونوں کی توفی اپنے اپنے طور پہ ہوئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توفی پہلے زندہ اُٹھا کر ہوئی اور حضورؐ کی اس کے بغیر، سو اس میں یہاں تشبیہ نہیں ہے مشبہ اور مشبہ بہ میں کسی پہلو سے تشبیہ ہو جائے تو ارادہ تشبیہ پورا ہو جاتا ہے۔ ہر پہلو سے مشابہت ضروری نہیں۔ کما لا یخفی علی من له ادنی معرفة فی العلم۔

(۹) حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت امام مہدی دو علیحدہ علیحدہ شخصیتیں ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اُتریں گے اور حضرت مہدی اس امت میں پیدا ہوں گے، مگر شیعہ حضرات کا عقیدہ ہے کہ امام مہدی کی

[1] صحیح بخاری جلد ۲ صـ ۶۶۵

ولادت نہیں ہوگی، ظہور ہوگا۔ ولادت اُن کی ہزار سال پہلے سے ہو چکی ہوئی ہے اور اس وقت وہ کہیں چھپے ہوئے ہیں۔ آپ قیامت سے پہلے ظہور کریں گے۔ اہلسنّت والجماعت کے عقیدہ میں امام مہدی عام انسانوں کی طرح پیدا ہوں گے۔ کسی غار سے نہ نکلیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :۔

کیف انتم اذا نزل فیکم ابن مریم فامکم منکم[1]

ترجمہ۔ تمہارا کیا حال ہوگا جب ابن مریم تم میں اُتریں گے اور تمہاری امامت وہ کرائے گا جو تم میں سے ہوگا۔

پھر دونوں کا امامت کے لیے ہمکلام ہونا بھی حدیث میں مذکور ہے۔ جب حضرت عیسیٰ کہیں گے کہ یہ اس امت کا اعزاز و اکرام ہے کہ امامت اسی کی رہے تو اس سے صریح طور پہ دونوں کا علیحدہ علیحدہ شخصیت ہونا مفہوم ہوتا ہے۔

(۱۰) حضرت عیسیٰ علیہ السلام پہلے اسرائیلی نبی تھے۔ اسرائیلی شریعت میں بیت اللہ شریف کا حج نہیں۔ کعبہ مشرفہ اسماعیلی تعمیر ہے اور اسی کی تولیت اور تعمیر اس سلسلہ میں رہی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسماعیلی ہیں۔ اور آپ کی شریعت میں حج اسی گھر کا قصد کرنا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی اس آمدِ ثانی پہ اس گھر کا حج اور عمرہ کریں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آپ فج روحا کے مقام سے احرام باندھیں گے اور تلبیہ پکاریں گے۔ آپ نے فرمایا :۔

والذی نفسی بیده لیهلن ابن مریم بفج الروحاء حاجا او معتمرا او لیثنیهما۔[2]

ترجمہ۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ ابن مریم ضرور لبیک پکاریں گے فج روحاء کے مقام سے حج کا تلبیہ یا عمرے کا یا وہ دونوں کو جمع کریں گے۔

اس سے واضح طور پہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت علیہ السلام نازل ہونے کے بعد شریعتِ محمدیؐ کی اتباع کریں گے۔ نماز میں بیتُ اللہ شریف کا رُخ کریں گے اور اسی کے گرد طواف فرمائیں گے اور آپ حضورؐ کی تابعداری کرنے والے ایک فرد ہوں گے۔ اس حیثیت میں آپ انہیں حضورؐ کا امتی بھی کہہ سکتے ہیں اور آپ کی شریعت کا متبع اور معین بھی —— یہ مختلف تعبیرات ہیں۔ حقیقت اپنی جگہ ایک ہے کہ یہ دور دَورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور آپ کے دور میں اس زمین پر حضرت موسیٰ بھی زندہ ہوتے تو آپ کو ان کی اتباع سے چارہ نہ تھا حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی فرماتے ہیں :۔

[1] صحیح مسلم جلد ۱ صـ ۸۷ [2] صحیح مسلم جلد ۱ صـ ۴۰۸

والذی نفس محمد بیدہ لو اصبح فیکم موسیٰ ثم اتبعتموہ، وترکتمونی لضللتم انتم حظی من الامم وانا حظکم من النبیین[1]

ترجمہ: قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر تم میں موسیٰ آجائیں اور تم ان کی پیروی کرو اور مجھے چھوڑ دو تم گمراہ ہو گے۔ امتوں میں تم میرا حصہ ہو اور نبیوں میں میں تمہارا حصہ ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی فرماتے ہیں:۔

والذی نفسی بیدہ لو اتاکم یوسف وأنا فیکم فاتبعتموہ وترکتمونی لضللتم[2]

ترجمہ: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر تمہارے پاس حضرت یوسف ؑ بھی آجائیں اور میں تم میں موجود ہوں اور تم اس کی اتباع کرنے لگو اور مجھے چھوڑ دو، پھر بھی تم گمراہ شمار ہو گے۔ (گو ایک پیغمبر کی اتباع کر رہے ہو گے)۔

۱۱ یہ روایت کہ اگر موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام زندہ ہوتے تو انہیں میری اتباع کے سوا چارہ نہ تھا حدیث کی کسی کتاب میں موجود نہیں اور نہ اس کی کوئی سند صحیح یا ضعیف کہیں ملتی ہے۔ اگر یہ روایت ثابت بھی ہوتی تو معنی یہی تھا کہ یہ دونوں پیغمبر اگر اس زمین پر زندہ ہوتے تو انہیں میری شریعت کی اتباع ہی کرنی پڑتی۔ ظاہر ہے کہ زمین پر دونوں حضرات میں سے کوئی زندہ نہیں۔ حضرت موسیٰ تو ویسے ہی وفات پا چکے ہیں، رہے حضرت عیسیٰ تو وہ آسمان پر زندہ ہیں نہ کہ زمین پر۔ اور جب زمین پہ اتریں گے تو وہ حضور کی اتباع ہی کریں گے اور واقعی انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے چارہ نہ ہو گا۔ حدیث کے جو اصل الفاظ ملتے ہیں، صرف اتنے ہیں:۔

لو کان موسیٰ حیًا ما وسعہ الا اتباعی رواہ احمد والبیہقی[3]

اور حضرت ملا علی قاری نے شرح شفا میں بھی اس پر بحث کی ہے۔ اور پھر شرح فقہ اکبر میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ شرح فقہ اکبر کے مصری نسخے اور ہندی نسخے میں اختلاف ہے۔ ایک نسخے میں لو کان موسیٰ وعیسیٰ کے الفاظ ہیں۔ اور ایک نسخہ میں صرف لو کان موسیٰ حیًا کے الفاظ ہیں۔ ایسے موقع پہ حدیث کی اصل کتابوں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ محدث عبدالرزاق (۲۱۱ھ) امام احمد (۲۴۱ھ) امام بیہقی (۴۵۸ھ) صرف موسیٰ کا ذکر کرتے ہیں۔ مشکوٰۃ شریف میں بھی یہی ہے۔ اب ملا علی قاری (۱۰۱۴ھ) کی نقل میں اگر کہیں موسیٰ اور عیسیٰ

---

[1] المصنف لعبد الرزاق جلد ۲ صفحہ ۱۱۳ [2] ایضاً صفحہ ۱۱۴ [3] مشکوٰۃ صفحہ ۳۰

کے الفاظ ملیں تو ظاہر ہے کہ اصل کتابوں کی روشنی میں اس کی اصلاح کی جائے گی۔ پھر جب شرح فقہ اکبر کا دوسرا نسخہ بھی اس سے اختلاف کرے تو وہی نسخہ صحیح سمجھا جائے گا جو پہلوں کے مطابق ہو۔ پھر ملا علی قاریؒ خود اس میں اپنی کتاب شرح شفاء کا بھی حوالہ دیتے ہیں۔ اس کی طرف مراجعت کریں تو اس میں بھی صرف لو کان موسیٰ کے الفاظ ملتے ہیں موسیٰ و عیسیٰ کے الفاظ نہیں۔

سو شرح شفا کی طرف مراجعت کرنے سے شرح فقہ اکبر طبع ہند کا نسخہ صحیح قرار پاتا ہے۔ پس حدیث میں صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے حضرت عیسیٰ کا نہیں اور اگر ہو بھی تو ہم اس کی مراد پہلے واضح کر آئے ہیں۔

(۱۲) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دوبارہ تشریف آوری پر مسلمانوں کا فقہی مسلک ایک ہو گا یا وہ اسی طرح مختلف مسالک پر عمل کرتے رہیں گے، جس طرح کہ آج مختلف چار طریق عمل رائج ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا کامل نمونہ صحابہ کرامؓ ہیں، جب صحابہؓ کے دور میں بھی جو اس امت کے بہترین افراد تھے مختلف فقہی مسلک قائم رہے تو ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمدِ ثانی پر بھی یہ مختلف پیرایہ عمل قائم رہیں گے۔ اس لیے کہ ان میں صرف افضل و مفضول کا فرق ہے —— حق و باطل کا فاصلہ نہیں —— حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی سنن میں بہت وسعت تھی۔ اگر آپ کی ہر ادا امت کے مختلف طبقوں میں معمول بہ رہے اور آپ کی ہر سنّت زندہ و قائم ہو تو اس سے آپ کی شریعت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ صحابہ کرامؓ بے شک معیارِ حق ہیں۔ حضرت عیسیٰ کی آمدِ ثانی پر اگر مختلف فقہی مسلک ایک ہو جائیں تو امت کا یہ نقشہ عمل پھر صحابہؓ کی ترتیب پر نہ ہوا۔ حضرت عیسیٰ کے طریق پر معمول بہ ٹھہرے گا اور یہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ آپ تابع شریعتِ محمدیؐ ہوں گے اور ظاہر ہے کہ شریعتِ محمدی کے اصل علمبردار صحابہ کرامؓ ہیں۔ اس لیے انہی کا نقشہ عمل تا قیامِ عالم باقی رہے گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پہلی نماز میں حضرت مہدی کی اقتدا کرنا اس طرف مشیر ہے کہ شریعتِ محمدی کی تفصیلات میں آپ صحابہ کرامؓ کے نقشہ عمل کی ہی تائید کریں گے اور فقہی مسالک میں وہی اندازِ عمل قائم رہے گا جو صحابہ کرامؓ کے دور میں تھا۔ یہ اور بات ہے کہ حضرت مسیح کا اپنا فقہی مسلک کسی امام کے اجتہاد سے توارد رکھتا ہو اور اس کے مطابق ہو۔ اور یہ صحیح ہے کہ وہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے موافق ہو گا۔

واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم

خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال : قرآن شریف میں صحابہ کی یہ فضیلت ذکر کی گئی ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ رحیم اور خیر خواہ ہیں۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ آپس میں لڑے اور یہاں تک لڑے کہ خونریزی تک نوبت پہنچی۔ قرآن کریم اور تاریخ میں تطبیق کی کیا راہ ہے ؟ ہم طلبہ اس میں سخت پریشان ہیں ؟ عبدالرؤف از خانیوال

الجواب : آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تقریباً ربع صدی تک صحابہ کرامؓ میں آپس میں کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ نہ خونریزی تک نوبت پہنچی۔ لوگوں نے اس طویل مدت میں اُن میں رحماء بینھم کی شان بڑی تفصیل سے دیکھی اور زندگی بھر قرآن کریم کی اس بات کی تصدیق کرتے رہے۔ پھر اس مدت میں صحابہ کی تعداد آہستہ آہستہ کم ہوتی رہی۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو صحابہؓ اپنی اس تعداد سے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوڑے تھے دسواں حصہ بھی باقی نہ رہے تھے۔ اس وقت مسلمانوں میں ۸۵ فی صد اگلی نسلوں کے لوگ تھے اور صحابہؓ بہت کم رہ گئے تھے۔ اب اگر ان دس پندرہ فی صد بزرگوں میں جنگوں تک نوبت پہنچی تو اس سے اس کثیر صف صحابہ کو کیسے بھلایا جا سکتا ہے۔ جو زندگی بھر دلالت مطابقی سے اشداء علی الکفار رحماء بینھم کا مظہر بنے رہے اور دُنیا نے اس پر چشم دید شہادتیں دیں۔

——— اور پھر ان میں سے بھی جو اس وقت زندہ تھے سب کے سب ان جنگوں میں شامل نہیں ہوئے ایک فریق ایسا بھی رہا جو کسی کے ساتھ شامل نہ ہوا اور دونوں کو خیر خواہانہ طور پر لڑائی سے روکتا رہا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) لکھتے ہیں :۔

وکان من الصحابة فریق لم یدخلوا فی شیٔ من القتال[1]

ترجمہ۔ صحابہ میں ایسے لوگ بھی تھے جو ان میں سے کسی جنگ میں شامل نہیں ہوئے۔

اور ان جنگوں میں حصہ لینے والے بھی وہ لوگ تھے جنہوں نے ان شامل نہ ہونے والوں کو کسی زور سے اپنے ساتھ شامل ہونے پر مجبور نہیں کیا۔ یہ جنگوں سے پیچھے رہنے والے دوسروں کی نسبت قلیل تھے یا کثیر۔ اسے شرح عقیدہ طحاویہ میں دیکھئے۔ شارح رقمطراز ہے :۔

وقعد عن القتال اکثر الاکابر[2]

ترجمہ۔ اور اکثر اکابر صحابہ ان خون ریز جنگوں سے ایک طرف رہے۔

شرح مواقف میں اس بحث میں کہ خارجیوں نے کن کن کی تکفیر کی۔ ان قعدہ عن القتال کا بھی ذکر آتا ہے[3]۔ اب آپ ہی بتائیں کیا تاریخ کا یہ نقشہ صحابہ کی اس مجموعی شان سے جو قرآن کریم میں مذکور ہوئی۔ معارض قرار دیا جا سکتا ہے ؟ اور جو ان میں اختلافات ہوئے وہ رائے اور فہم کے اختلاف سے ہوئے

---

[1] الاصابہ جلد ۲ صد ۵۰۲ [2] شرح عقیدہ طحاویہ صد ۴۳۱ [3] شرح مواقف صد ۷۵۷

بدنیتی کسی کے شاملِ حال نہ تھی۔ اگر کسی نے کسی کو خطا پر کہا ہے تو وہ ظنی جہت سے ہے۔ یقینی طور پر ہم کسی کو خطاء پر نہیں کہہ سکتے :۔

لا یجوز ان ینسب الیٰ احد من الصحابة خطاء مقطوع به اذ کانوا کلھم اجتھدوا فیما فعلوہ وارادوا اللہ عز وجل وھم کلھم لنا ائمة وقد تعبدنا بالکف عما شجر بینھم[1]

ترجمہ۔ یہ جائز نہیں کہ صحابہ کے ان اختلافات میں ہم کسی طرف اس طرح خطا کی نسبت کریں جو یقینی طور پر ہو (قطعی خطا ان میں سے کسی کی طرف منسوب نہیں کی جا سکتی) ہر ایک نے جو کچھ کیا اپنے اجتہاد سے کیا اور سب کی مراد اللہ تعالیٰ کو خوش کرنا تھا اور وہ صحابہ سب کے سب ہمارے پیشوا ہیں۔ ان کے اختلافات سے زبان کو بند رکھنے میں ہم خدا کی رضا جانتے ہیں۔

حضرت شیخ سید عبدالقادر جیلانی (۵۶۱ھ) اس باب میں تفویض کے قائل معلوم ہوتے ہیں آپ کہتے ہیں اُن کے اختلاف کو اللہ کے سپرد کیا جائے اور خطاء و صواب کے فیصلے ہم خود نہ کریں :۔

تسلیم امرھم الی اللہ عز وجل علیٰ ماکان وجریٰ من اختلاف علی وطلحة والزبیر وعائشة ومعاویه رضی اللہ عنھم[2]

ترجمہ۔ ان کا معاملہ جیسا بھی رہا اسے اللہ کے سپرد کیا جائے۔ حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت عائشہ، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے معاملات کا یہی حکم ہے۔

ذرا اُوپر چلئے۔ حضرت حسن بصریؒ (۱۱۰ھ) جو حضرت علی مرتضیٰؓ کے خلیفہ بتائے جاتے ہیں۔ ان کا مسلک بھی توقف ہی معلوم ہوتا ہے :۔

قتال شھدہ اصحاب محمد وغبنا وعلموا وجھلنا واجتمعوا فاتبعنا واختلفوا فوقفنا[3]

ترجمہ۔ یہ ایک ایسا قتال تھا جس میں حضورؐ کے صحابہ سامنے تھے اور ہم وہاں نہ تھے انہوں نے معاملے کو جانا اور ہم ناواقف رہے جس پر یہ متفق رہے ہم نے اس کی پیروی کی۔ اور جب یہ اختلاف میں آئے تو ہم نے توقف کیا۔

ان میں محقق (جو صواب پر ہو) پہچان بھی لیا جائے تو دوسری جانب کسی پر اعتراض کرنا جائز نہ ہوگا

---

[1] الجامع الاحکام القرآن جلد ۱۶ صد ۳۶۱ [2] غنیة الطالبین صد ۱۴۰ [3] الجامع لاحکام القرآن جلد ۱۶ صد ۳۲۲

کیونکہ وہ مجتہد مخطی کی صورت میں ایک اجر پھر بھی پا رہا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) لکھتے ہیں اس پر اہل سنت والجماعت کا اجماع ہے:-

واتفق اهل السنة على وجوب منع الطعن على احد من الصحابة بسبب ما وقع لهم من ذٰلك ولو عرف المحقق منهم لانهم لم يقاتلوا في تلك الحروب الا عن اجتهاد۔[۱]

ترجمہ۔ اور اہل سنت کا اس پر اجماع ہے کہ صحابہ سے اس سلسلہ میں جو کچھ بھی واقع ہوا ہو اس کے باعث اس میں سے کسی پر اعتراض کرنے کو روکنا واجب ہے۔ اگرچہ ان میں راہ صواب والا پہچان بھی لیا جائے۔ کیونکہ وہ ان جنگوں میں اجتہاد کے باعث الجھے ہیں (کہ امت مسلمہ کی بھلائی کس میں ہے) اپنے نفوس یا خود غرضی کی راہ سے نہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگردوں میں ابو میسرہ عمرو بن شرجیل کا خواب سنیئے۔ آپ کہتے ہیں میں نے دیکھا کہ میں جنت میں ہوں اور میں نے اپنے سامنے خیمے لگے دیکھے۔ میں نے پوچھا یہ کن کا ڈیرہ ہے؟ مجھے بتایا گیا ذی الکلاع اور حوشب کا —— یہ دونوں جنگ صفین میں حضرت معاویہؓ کی طرف سے لڑتے ہوئے مارے گئے تھے —— میں نے پوچھا حضرت عمارؓ اور ان کے ساتھی کہاں ہیں؟ —— جواب ملا اپنے آگے دیکھو۔ میں نے پوچھا۔ یہ کیسے؟

قلت كيف وقد قتل بعضهم بعضاً۔ قال فقيل انهم لقوا الله فوجدوه واسع المغفرة۔[۲]

ترجمہ۔ ان میں سے تو بعض نے بعض کو قتل کیا تھا؟ کہنے والے نے کہا جب یہ خدا کے حضور پہنچے تو انہوں نے اس کی مغفرت کو وسیع پایا۔

اللہ کی وسیع مغفرت سے مراد نیات پر فیصلے کرنا ہے۔ نیک نیت خطا کار بھی اس کے ہاں ایک اجر پالیتا ہے۔ بشرطیکہ اس نے نفس سے نہیں سوچ وبچار سے کوئی راہ اختیار کی ہو —— یہ سب معاملات اور اختلافات کچھ اس طرح واقع ہوئے کہ یہ حضرات اپنی اصل سے نہیں ہٹے، نہ امت سے کٹے، خونریزی پر بھی اترے تو امت کی بقا کے لیے —— اور پھر مہادنت پر آئے تو وہ بھی امت کی اصلاح کے لیے اور پھر آپس میں متحد ہوئے تو وہ بھی اپنی اصل سے وفا کے لیے —— ان کے اختلافات کو

... ۲۹۱، کتاب السنن لسعید بن منصور

مشاجرات اسی لیے کہتے ہیں کہ درخت ایک ہی رہا جس کے گرد یہ جمع تھے۔ بس اس کی ٹہنیاں اور پتے آپس میں ٹکراتے رہے۔ باہر سے کوئی ان کے تار نہیں ہلا رہا تھا، نہ یہ کہ ان کے دل پاک نہ تھے۔

ہم حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (۱۰۰ھ) کی اس نصیحت پر اس بحث کو ختم کرتے ہیں:-

امر اخرج الله ايديكم منه ما تعملون السنتكم فيه۔[۱]

ترجمہ۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے (اے اس وقت کے میرے ساتھیو) تمہارے ہاتھوں کو ایک طرف رکھا۔ اب تم اپنی زبانوں کو اس میں چلا رہے ہو؟

واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم

خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عین حیات حضورؐ کے علاوہ اور کون کون حضرات آپ کی علمی نیابت کرتے تھے اور لوگ دین کی باتوں کے لیے ان کی طرف رجوع کرتے؟

الجواب: خلفائے راشدینؓ چاروں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سعادت معہد میں مفتی سمجھے جاتے تھے اور لوگ دینی مسائل کے لیے ان حضرات کی طرف رجوع کرتے اور جب تک کوئی زیادہ اہم بات نہ ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔

كان ابوبكر وعمر وعثمان وعلى يفتون على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم۔[۲]

ترجمہ۔ یہ چاروں حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بھی شرعی فتوے دیتے تھے۔

ان میں حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ زیادہ مشتغل بالعلم تھے۔ ان کے علاوہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ بڑے مراجع علم تھے۔

حافظ ابن قیمؒ (۷۵۱ھ) لکھتے ہیں:-

كان المكثرون منهم سبعة عمر وعلى وعبد الله بن مسعود وعائشة ام المؤمنين وزيد بن ثابت وعبد الله بن عمر وعبد الله بن عباس۔[۳]

ترجمہ۔ ان میں زیادہ مشتغل بالعلم سات تھے اور وہ یہ ..... حضرات تھے۔

[illegible]

حضرت امام ابو یوسفؒ (۱۸۲ھ) صحابہ کے دو علمی حلقوں کی نشاندہی کرتے ہیں. ہر حلقے کے لوگ علمی مہمات میں اپنے ساتھیوں کی طرف مراجعت کرتے تھے. ام المومنینؓ سب کے لیے مشترک مرکزِ علم تھیں. صحابہ کرام میں چھ حضرات زیادہ مراجع علم بنے ا۔

تفقه من اصحاب النبی صلی علیہ وسلم ستة رهط ثلثة منهم یلقی بعضهم علی بعض وثلثة منهم یلقی بعضهم علی بعض فکان ابن مسعود وعمر بن الخطاب وزید بن ثابت یلقی بعضهم بعضًا وکان علی وابو موسیٰ وابی ابن کعب یلقی بعضهم علی بعض[1]

ترجمہ. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں چھ فقہ میں مرکز تھے. تین آپس میں مل کر چلتے اور تین اور تھے وہ بھی آپس میں مل کر چلتے. پہلے تین حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ ہیں یہ آپس میں ملتے. اور دوسرے تین حضرت علیؓ، حضرت ابو موسےٰ اشعریؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ ہیں.

حضرت جابرؓ اور حضرت ابوالدرداءؓ بھی اپنی جگہ بلند پایہ علمی مرجع تھے. حضرت امیر معاویہؓ بھی فقہ میں صاحبِ مذہب تھے اور بہت سے تابعین اور تبع تابعین ان کی فقہی راہوں پہ چلے ہیں ان میں اُن کی پیروی جاری ہوئی. رضی اللہ عنہم اجمعین.

واللہ اعلم بالصواب. خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال : کلمے کے دو جزو ہیں. (۱) لا الٰہ الا اللہ (۲) محمد رسول اللہ. شیعہ اس میں تیسرا جُزو علی ولی اللہ بھی ملاتے ہیں. جواباً مطلع فرمائیں؟ سائل. سید افتخار احمد از کرشن نگر لاہور

الجواب : کون نہیں جانتا کہ ارکانِ اسلام پانچ ہیں. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا. بنی الاسلام علی خمس اسلام کی بنا پانچ ارکان پہ ہے. پہلا رکن کلمہ قبولِ اسلام ہے اور باقی چار عبادات ہیں. نماز. زکوٰۃ. روزہ اور حج ـــــ یہ جو پہلا رکن ہے اس کے دو ہی جزو ہیں. لا الٰہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ ساتھ تیسرا جزو کوئی نہیں. دیکھئے اصول کافی جلد اول ص۴۷۲ طبع لکھنؤ ـــــ حضرت خدیجۃ الکبریٰ کو مسلمان کر کے حضورؐ نے ان سے جو اقرار کروایا تھا اس میں دو ہی جزو تھے. ولایتِ علی کا کوئی تیسرا جزو نہ تھا. دیکھئے حیات القلوب ملا باقر مجلسی جلد ۲ ص۴۷۷ ـــــ حضرت علیؓ نے جب اسلام قبول کیا تو آپ نے ان سے بھی ولایتِ علی کا یہ

[1] کتاب الآثار ص۲۱۲

تیسرا اقرار نہ لیا تھا. سو کلمے کے یہی دو جزو ہیں اور اذان میں بھی ایمان کی شہادتیں دو ہی ہیں. ایک اللہ کے بارے میں اور دوسری حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے بارے میں ـــــ اور نماز جنازہ میں بھی اللہ اور اس کے بعد تیسری تکبیر میں حاضر میت کی باری آجاتی ہے. یہاں ولایت علی کی باری نہیں آتی. پہلی تکبیر کے بعد اللہ رب العزت کا حق، (جو ثنا کے کلمات میں کہا جاتا ہے) دوسری کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حق (جو درود و سلام کی صورت میں عرض کیا جاتا ہے) اور تیسری تکبیر کے بعد میت کا حق (جو مرنے والے کے لیے دعا ر مغفرت ہے) اور چوتھی کے بعد سلام پھیر دیا جاتا ہے. یہ سب اعمال اسی کلمہ اسلام کے گرد پہرہ دے رہے ہیں جس کے دو جزو ہیں.

نجران کے نصاریٰ جب مدینہ منورہ آئے اور نماز سے فارغ ہوئے تو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پُوچھا. الیٰ ما تدعون تم کس بات کی دعوت دیتے ہو تو آپ نے فرمایا :۔

شهادة ان لا الٰه الا اللّٰه وانی رسول اللّٰه وان عیسیٰ ابن مریم عبد مخلوق یاکل ویشرب[1]

ترجمہ. اس بات کی شہادت کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور یہ کہ عیسیٰ ابن مریم اللہ کے بندے اور مخلوق ہیں کھاتے بھی ہیں اور پیتے بھی ہیں.

بتایئے کہاں اس میں ولایت علی کی شہادت ہے؟ کلمہ وہی ہے. لا الٰہ الا اللّٰه محمد رسول اللّٰه اور باقی اپنے پچھلے دین سے علیحدگی کا اعلان ہے.

عمرو بن قیس نے میدانِ جنگ میں کیا کلمہ پڑھا اور مسلمان ہوئے اور پھر وہ کافروں کے ہاتھوں مارے گئے. حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بدوں تیسرے جزو کلمہ (ولایت علی) شہید فرمایا. یہ شیعہ عقیدے کے مطابق کلمے کا تیسرا جزو کہاں گیا. فاعتبروا یا اولی الابصار.

علامہ قمی لکھتے ہیں. اس نے بس یہی کہا تھا :۔

واللّٰه انی اشهد ان لا الٰه الا اللّٰه وان محمد رسول اللّٰه ثم مات فقال رجل من اصحاب رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وآله ان عمروا قد اسلم فهو شهید فقال ای واللّٰه شهید[2]

اب بتایئے اس میں تیسری شہادت (ان علیًا ولی اللّٰه) کہاں ہے؟

اصول کافی جلد ص ص جلد ص ص اور فروع کافی جلد ۳ ص۳۰۵. ص۱۲۱، ص۱۲۳، ص۱۳۶ جلد ۴ ص۲۶، ص۱۸۲ میں دو ہی شہادتوں کا ذکر ہے.

[1] تفسیر قمی ص۵۶ [2] ایضاً ص۶۲

قرآن کریم کا پیرایہ بیان بھی کلمے کے دو جزو ہیں اور اللہ تعالیٰ انہی کے ماننے والوں کو مومن کہتے ہیں۔

انما المومنون الذین اٰمنوا باللہ ورسولہ واذا کانوا معہ علیٰ امر جامع لم یذھبوا حتیٰ یستاذنوہ۔ (پ۱۸: النور ع ۹)

ترجمہ۔ ایمان والے وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر اور جب وہ ہوتے ہیں اس کے پاس[1] کسی مشترکہ کام میں (جیسے جمعہ، جہاد یا مجلس مشاورت وغیرہ) تو چلے نہیں جاتے جب تک آپ سے اجازت نہ مانگیں۔

دیکھئے اس میں کلمہ کے دو جزو ہی بتائے گئے ہیں اور اصول بتایا گیا ہے کہ مومنین حضورؐ کے پاس کسی اجتماعی کام کے لیے حاضر ہوں تو آپ کے پوچھے بغیر کہیں نہ جائیں۔

علامہ علی بن ابراہیم القمی (۳۰۷ھ) نے اسے واقعہ احد سے جوڑا ہے جو سورۂ آل عمران میں ہے اور اس سے وہ تحریف قرآن پہ استدلال کرتا ہے:۔

فھذہ الاٰیۃ فی سورۃ النور واخبار احد فی سورۃ اٰل عمران فھذا دلیل علیٰ ان التالیف علیٰ خلاف ما انزلہ اللہ۔[2]

ترجمہ۔ یہ آیت سورۂ نور میں ہے اور احد کی خبریں سورۂ آل عمران میں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کریم کی تالیف نزول کے مطابق نہیں ہوئی ہے۔

قمی نے قرآن کریم کی تالیف میں جو گڑبڑ ثابت کی ہے اسے سر دست رہنے دیں، تحریف قرآن شیعہ عقیدہ ہے۔ اصل بات کلمہ کی ہو رہی تھی کہ اس میں شہادتین ہیں یا مومن ہونے کے لیے ولایت علی کی شہادت بھی ضروری ہے۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ جب ایمان لائی تھیں انہوں نے یہی کلمہ پڑھا تھا جس میں دو شہادتیں ہیں وہ اس امت کی پہلی مومنہ ہیں۔ اگر وہ ولایت علی کے اقرار کے بغیر مومن ہو سکتی ہیں۔ تو آج اقرار شہادتین سے کیوں کوئی مومن نہیں ہو سکتا۔ غزوات حیدری میں حضرت خدیجہؓ کے ایمان لانے کا یوں ذکر ہے:۔

شربت خوشگوار کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ سے کام و زبان اپنی کو ذائقہ ایمان بخشا پھر حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ظاہرا حضرت علی ابن ابی طالب سے بھی یہی فرمایا۔[3]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت علیؓ سے اس کلمہ کا اقرار کرانا اس لیے تھا کہ آپ حضرت علیؓ کو

---

[1] مومنین ہر وقت حضورؐ کے پاس نہیں ہوتے اور نہ حضورؐ ہر وقت ان کے پاس ہوتے تھے۔ ہاں جب مومنین حضورؐ کے پاس ہوں تو آپ سے بغیر پوچھے کہیں نہ جائیں۔ [2] تفسیر قمی ص۴۲۲ [3] غزوات حیدری ص۲۹

اس کلمہ سے اس امت میں داخل فرمائیں۔ آپ حضرت خدیجہؓ کے بعد مسلمان ہونے تھے۔

اللہ رب العزت کے عرش پر یہی کلمہ لکھا ہے۔[1] حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نقش نگین بھی یہی تھا۔[2] جس میں صرف دو شہادتیں ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام نے عرش پہ یہی کلمہ اسلام لکھا دیکھا تھا[3] اور اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں میں اسی اقرار کی آواز لگانے کا امر فرمایا تھا۔

ملا باقر مجلسی لکھتا ہے:۔

وحی نمود کہ اے محمد برو بسوئے مردم و امر کن ایشاں را کہ بگویند لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔[4]

ترجمہ۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں جائیں اور انہیں امر کریں کہ وہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہیں۔

شیعہ کی عام متداول کتاب تحفۃ العوام ص۵۸ پر یہی کلمہ لکھا ہے۔ مومن ہونے کے لیے ولایت علی کا اقرار لازم کرنا دین میں ایک بڑی تحریف ہے۔

خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: نماز جنازہ کی کتنی تکبیریں ہیں اور ان میں کتنے حقوق کی ادائیگی ہے؟

(خواجہ) اویس احمد شبلی۔ کرشن نگر لاہور

الجواب: نماز جنازہ میں صرف تین حقوق کی ادائیگی ہے۔

۱۔ حق باری تعالیٰ ۲۔ حق رسالت محمدیہ ۳۔ حق میت

پہلی تکبیر کے بعد سبحانک اللھم کے الفاظ سے، دوسری تکبیر کے بعد حق رسالت درود شریف کے الفاظ سے اور تیسری تکبیر کے بعد حق میت دعائے جنازہ کے الفاظ سے ادا کیا جاتا ہے۔ دعائے جنازہ اصل میں یہی ہے جس کے لیے ارشاد نبوت ہے۔ اذا صلیتم علی الجنازۃ فاخلصوا الدعاء۔ کہ جب تم کسی میت کی نماز جنازہ پڑھو تو اس کے لیے بڑے اخلاص سے دعا مانگو۔ فاخلصوا میں فا تفریع کی ہے تعقیب کی نہیں کہ جنازہ تو یونہی چلنے دو اور بعد جنازہ دعا اخلاص سے مانگو۔ (استغفر اللہ) یہ اخلاص نماز جنازہ کے اندر مطلوب ہے بعد کے لیے نہیں۔ دعا مانگنے کے بعد پھر تکبیر کہیں اور سلام پھیر دیں۔ یہ کل چار تکبیریں ہوئیں۔

---

[1] حیات القلوب جلد ۲ ص۸ [2] تاریخ الائمہ ص۶ [3] حیات القلوب جلد ۲ ص۱۲۵ [4] ایضاً ص۳

حضرت علی المرتضیٰؓ کی والدہ کی نمازِ جنازہ حضورؐ نے پڑھائی تھی اور اس پہ چار تکبیریں ہی کہیں[1] حضرت حسنؓ نے حضرت علیؓ کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور چار تکبیریں ہی کہیں[2]۔ امام بیہقی کہتے ہیں:-

اجتمع اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی بیت ابی مسعود الانصاریؓ فاجمعوا علی ان التکبیر علی الجنازۃ اربع[3]

ترجمہ. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ نے حضرت ابو مسعود الانصاریؓ کے مکان پہ (تکبیرات جنازہ کے موضوع پہ) مجلسِ مشاورت کی سب کا اتفاق اس پہ ہوا کہ جنازہ کی تکبیریں چار ہیں۔

نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں:-

چار تکبیروں سے قصداً کم و بیش کرنا بدعت ہے[4]

شیعہ فقہ میں جنازہ کی تکبیرات

محمد بن حسن طوسی (۴۶۰ھ) امام باقر (۱۱۴ھ) سے روایت کرتا ہے:-

آپ سے پوچھا گیا. ھل فیہ شیء موقت. کیا اس میں کوئی عدد معین ہے؟ آپ نے فرمایا، نہیں. آنحضرتؐ نے مختلف تکبیرات سے جنازے پڑھے ہیں اور پانچ اور چار تکبیریں بھی کہیں ہیں.

آپ فرماتے ہیں، پھر پانچ سے زائد تکبیرات متروک ہوگئیں اور اس پر اجماع ہے اور اب صرف پانچ اور چار تکبیریں لائق عمل رہ گئیں. کسی میت پہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم چار تکبیریں کہتے اور کسی پہ چار کہتے.[5]

یہ شیعہ کی اپنی اختراع ہے کہ آپ مومنوں کے جنازہ پہ پانچ تکبیریں کہتے اور منافقوں کے جنازہ پہ چار ـــ افسوس کہ ان لوگوں نے یہ نہ سوچا کہ قرآن کریم میں تو اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو منافق کی نمازِ جنازہ پڑھانے سے کلیتہً روک دیا ہوا ہے. اب یہ منافق کی نمازِ جنازہ میں چار تکبیریں کیوں باقی رہیں. اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہیں:-

لا تصل علی احد منھم مات ابدا ولا تقم علی قبرہ. (پ ۱۰، التوبہ)

ترجمہ. اور آپ ان میں سے جو مرے کبھی کسی کی نمازِ جنازہ نہ پڑھیں اور نہ کبھی اسکی قبر پہ دعا کے لیے کھڑے ہوں.

---

[1] دیکھئے جمع الفوائد جلد ۲ صفحہ ۴۰۸ [2] دیکھئے طبقات ابن سعد جلد ۳ صفحہ ۲۵ مستدرک حاکم جلد ۳ صفحہ ۱۴۳
[3] سنن کبریٰ جلد ۴ صفحہ ۳۷ [4] مدور الاہلہ صفحہ ۹۱، صفحہ ۹۲

سو یہ مومن اور منافق کی نمازِ جنازہ پہ پانچ اور چار تکبیروں کا اختلاف جانا ہا اور ان میں یہ تطبیق کی راہ ہرگز نہیں.

علل الشرائع صفحہ ۳۰۲ میں بھی ہے:-

ثم کبر الرابعۃ وانصرف ولم یدع للمیت.

ترجمہ. پھر آپ نے چوتھی تکبیر کہی اور سلام پھیر دیا اور میت کے لیے دعا نہ کی.

یہ عجیب نمازِ جنازہ ہے کہ میت کے لیے دعا ہی نہ ہو. آخر لوگ جمع کس لیے ہوئے تھے.

اب شیعوں کی صرف ایک تاویل باقی ہے اور وہ ہے از راہِ تقیہ چار تکبیریں کہنا:-

اما ما یتضمن من الاربع تکبیرات فمحمول علی حال التقیہ لانہ مذھب جمیع من خالف الامامیہ[1]

ترجمہ. اور جو نماز چار تکبیروں کی ہوتی تھی سو یہ تقیہ کی وجہ سے تھا کیونکہ یہ ان تمام کا مذہب ہے جو امامیہ کے خلاف ہیں.

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تقیہ کی تہمت لگانا شیعہ مذہب کی سیاہ ترین تصویر ہے. بھلا خدا کے مامور بھی کبھی تقیہ کرتے ہیں؟ ہرگز نہیں ـــ انبیاء و مرسلین بھی تقیہ کرنے لگیں تو حق ظاہر کیسے ہوگا؟ اور حضورؐ کو تو حفاظت کی گارنٹی دے دی گئی تھی. پھر آپ کو ڈر کس کا تھا؟

واللہ یعصمک من الناس. (پ ۶ المائدہ ع ۱۰)

ترجمہ. اور اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے بچائے رکھیں گے.

ہم جنازہ کی چار تکبیروں کو تقیہ پہ محمول نہیں کرتے. تاہم ان روایات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عام عمل چار تکبیروں کا ہی تھا اور پانچ تکبیروں والی نمازِ جنازہ شاید کبھی کسی کونے میں چھپ چھپا کر پڑھتے ہوں. (استغفر اللہ العظیم) واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم

خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: سنا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ کی چار سیدھی انگلیاں لمبائی میں ایک ترتیب سے تھیں. یہ نہیں کہ پہلی انگلی چھوٹی ہو دوسری بڑی تیسری پھر چھوٹی اور چوتھی اس سے بھی چھوٹی جیسا کہ

---

[1] استبصار صفحہ ۴۷۵

ہماری عام طور پر ہوتی ہیں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ان چار انگلیوں میں یہ انداز کیوں تھا اور اس میں کیا حکمت یا اشارہ تھا؟ سائل۔ (حافظ) خبیب احمد جمال موضع ککھری نزد ملیسی

جواب : یہ صحیح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیاں ۱۔ مشیرہ ۲۔ وسطی ۳۔ بنصر اور ۴۔ خنصر ایک ترتیب سے تھیں۔ مشیرہ سب سے بڑی۔ وسطی اس سے چھوٹی۔ خنصر اس سے چھوٹی اور بنصر اس سے چھوٹی تھی۔ یہ آپ کے دستِ مبارک میں آپ کی چار خلافتوں کی ترتیب ہے۔ مشیرہ اس لیے سب سے بڑی تھی کہ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں کسی کمی کا کوئی تصور راہ نہ پا سکے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب یہ فرماتے کہ میں، ابوبکر اور عمر حشر کے دن اکٹھے اٹھائے جائیں گے تو آپ اسے اپنی تین انگلیوں کے اشارہ سے واضح فرماتے۔ انگوٹھے کے ساتھ دو انگلیاں ان دو بزرگوں کا نشان ہوتیں۔ علامہ قرطبی الجامع لاحکام القرآن میں حضورؐ کا مذکورہ ارشاد ان لفظوں میں نقل کرتے ہیں۔

احشر انا وابوبکر وعمر یوم القیٰمۃ ھٰکذا ۔ ۔ ۔ ۔ واشار باصابعہ الثلاث۔[1]

ترجمہ۔ میں ابوبکر اور عمر قیامت کے دن اکٹھے اٹھائے جائیں گے اور آپ نے اپنے تین انگلیوں سے اشارہ فرمایا۔

حضرات شیخین کریمین کو یہ شرف حاصل ہوا کہ حضورؐ کی انگلیوں نے ان کی نمائندگی کی۔ سو پہلی انگلی کا لمبا ہونا آپ کی پہلی خلافت (جو بلا فصل تھی) کے سب سے اعلیٰ و اکمل ہونے کی طرف اشارہ تھا۔

اس میں حضرت عثمانؓ کے نظرانداز ہونے کا ابہام راہ نہ پائے۔ ان کی تو حضور صلی اللہ وسلم نے بیعت رضوان کے موقع پر اپنے پورے دستِ مبارک سے نمائندگی کی تھی اور اپنے ہاتھ کو ان کا ہاتھ قرار دیا تھا یہ سیدنا حضرت عثمانؓ کی وہ منزلت ہے کہ کوئی دوسرا اس میں آپ کے برابر نہیں۔

نوٹ : ہم نے پہلی انگلی کے لیے سبابہ کا لفظ اس لیے استعمال نہیں کیا کہ یہ بحث حضورؐ کی انگلی کی تھی۔ اور لفظ سبابہ اپنے اندر کوئی اچھے معنی نہیں رکھتا۔ علامہ قرطبی نے بھی یہی تعبیر اختیار کی تھی :۔

وروی عن اصابع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان المشیرۃ منہا کانت اطول من الوسطیٰ ثم الوسطیٰ اقصر منہا ثم البنصر اقصر من الوسطیٰ۔

ھذا ما سنح لی واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

خالد محمود عفا اللہ عنہ

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۲ صفحہ ۱۵

سوال عبقات پڑھنے کا موقع ملا ہے ماشاء اللہ مطالعہ شیعیت میں یہ حرف آخر ہے لیکن اس میں جو قادیانی مباحث لکھے ہیں اگر وہ نہ ہوتے تو یہ کتاب ایک موضوع پر رہتی۔ ملتمس ہوں کہ نئے اڈیشن میں قادیانیوں کے رد کو اس کتاب سے علیحدہ کر دیں۔ اس میں زیادہ فائدہ ہوگا؟ سائل : عبداللطیف انور

الجواب : مرزا غلام احمد قادیانی کی تحریک دراصل شیعہ تحریکوں کی ہی ایک کڑی ہے۔ شیعیت میں چھپے مہدی کے تصور نے بہت سے لوگوں کو مہدی بننے کا شوق دیا —— محمد علی باب کی تحریک اور بہاء اللہ ایرانی کی تحریک بھی دراصل اسی شیعہ عقیدے کی صدائے بازگشت تھیں۔ مرزا غلام احمد بھی ابتداء میں اسی راستے پر چلا ہے۔ سو قادیانیت کو بھی اس پہلو سے شیعیت کی ایک بدلی ہوئی صورت کہہ سکتے ہیں۔ مرزا غلام احمد نے مصر کے ایک مشہور محقق علامہ رشید رضا مصری کو ایک خط لکھا اور اس میں اپنے دعاوی کا ذکر کیا۔ علامہ رشید رضا نے وہ خط اور اس کا رد اپنے رسالہ المنار میں دے دیا۔ مرزا غلام احمد نے پھر اپنی تحریرات میں علامہ رشید رضا کو بہت برا بھلا کہا اور اسے سیہزم فلا یریٰ (اسے شکست ہوگی اور پھر وہ کہیں دکھائی نہ جائے گا) کے لفظوں سے موت کی دھمکی دی اور گمان کیا کہ یہ وحی ہے جو اسے خدا کی طرف سے ملی ہے۔

علامہ رشید رضا لکھتے ہیں :۔

وتوعدنی بقولہ عنی "سیہزم فلا یریٰ" وزعم ان ھٰذا نبأ وحی جاءہ من اللہ جل وعلا وقد کان ھو الذی انہزم ومات۔

کان ھٰذا الرجل یستدل بموت المسیح ورفع روحہ الی السماء کما رفعت ارواح الانبیاء علی انہ ھو المسیح الموعود بہ ولا یزال اتباعہ یستدلون بذلک وقد جری علی طریقۃ ادعیاء المہدویۃ من شیعۃ ایران (کالباب والبہاء) فی استنباط الدلائل الوہمیۃ علی دعوتہ من القرآن ۔ ۔ ۔ ۔ وھو یجد عن جاہلی اللغۃ وفاقدی الاستقلال العقلی من یقبل منہ کل دعویٰ۔[1]

ترجمہ۔ اس شخص نے مجھے میرے بارے میں یہ کہہ کر ڈرایا کہ یہ عنقریب پسپا ہوگا۔ پھر کہیں دیکھا نہ جا سکے گا (میری موت کی پیشگوئی کر دی) اور گمان کیا کہ یہ وحی کی خبر ہے جو اسے خدا جل وعلا سے ملی ہے اور بات یوں نکلی کہ وہ خود ہی پسپا ہوا اور مر گیا۔

یہ شخص (اپنے لیے) موت مسیح سے مسیح موعود ہونے پر استدلال کرتا تھا اور اس بات

---

[1] تفسیر المنار جلد ۶ صفحہ ۵۸

ہے کہ حضرت مسیح کی روح بھی اسی طرح آسمانوں میں چلی گئی ہے جس طرح اور انبیاء کے ساتھ ہوا۔ — اور اس کے پیرو اس بات سے برابر استدلال کرتے چلے آرہے ہیں اور مرزا غلام احمد اس میں ایران کے شیعہ مدعیانِ مہدویت کے طریق پر چلا ہے — اپنے دعوے کے وہی دلائل قرآن سے اخذ کرتے ہیں . . . . اور جو لوگ عربی زبان سے جاہل ہیں اور ان کی عقل اپنی جگہ قائم نہیں۔ ان میں ایسے بھی ہیں جو اس کے ہر دعوے پر اس کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں۔

سو اس میں کوئی شک نہیں کہ قادیانیت ایک بگڑی ہوئی شیعیت کا ہی دوسرا نمود ہے۔ سو عبقات میں ان پر تنقید اپنے موضوع سے باہر نہیں — اور یہ بات تو آپ سے مخفی نہ ہوگی کہ عبقات کوئی مستقل کتاب نہیں۔ ہفت روزہ دعوت لاہور کے باب الاستفسار (جو مختلف موضوعات پر ہوتے تھے) کی ہی ایک مجموعی پیش کش ہے۔ فیتقبل اللہ منا ومنکم۔

خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: مرزا غلام احمد قادیانی اپنے آپ کو مسیح موعود کہتا ہے کیا یہ صحیح ہے؟ اور عربی میں کیا موعود کے معنی جس کے بارے میں وعدہ دیا گیا تھا ملتے ہیں اس کی وضاحت کیجئے؟

سائل، محمد اسماعیل از شجاع آباد

جواب: موعود کے معنی جو وعدہ کیا گیا کے ہیں جیسے مقتول کے معنی ہیں جو قتل کیا گیا — موعود کا یہ معنی نہیں جس کے بارے میں وعدہ کیا گیا۔ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں وہ مسیح ہوں جس کے بارے میں (دوبارہ آنے کا) وعدہ کیا گیا تھا تو اسے عربی میں یوں کہنا ہوگا۔ انا المسیح الموعود بہ اگر وہ کہتا ہے انا المسیح الموعود۔ تو عربی زبان کے اعتبار سے درست نہیں ہوگا۔

مصر میں جب یہ بات پہنچی کہ ہندوستان میں ایک شخص نے وہ مسیح ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ جس کا (احادیث میں) وعدہ کیا گیا تھا تو ان لوگوں نے اسے المسیح الموعود بہ کے لفظ سے ذکر کیا مسیح موعود سے نہیں اور کوئی عربی دان کسی شخص کے بارے میں موعود کا لفظ استعمال نہیں کر سکتا۔ یہ مطلق اسم مفعول نہیں سوائے مسیح موعود نہیں کہا جا سکتا اور کوئی عربی دان کسی شخص کے بارے میں مسیح موعود نہیں کہہ سکتا اس کے ساتھ بہ کا صلہ ضروری ہے۔ سو یہاں المسیح الموعود بہ چاہیئے۔

۲۔ مرزا غلام احمد قادیانی اپنے آپ کو خود مسیح موعود لکھتا ہے اور عربی میں بھی اپنے آپ کو المسیح الموعود کہتا ہے۔ اپنے خطبہ الہامیہ میں کہتا ہے،

والعبد المنصور والمہدی المعہود والمسیح الموعود۔[1]

علامہ رشید رضا مصری ایک مقام پہ مرزا غلام احمد کے اس دعوئے مسیحیت کا یوں تذکرہ کرتے ہیں۔

وظہر فی الہند رجل اٰخر سلمی ادعیٰ انہ ہو المسیح الموعود بہ وہو غلام احمد القادیانی۔

ترجمہ۔ ہندوستان میں ایک اور بیوقوف نکلا جس نے دعوے کیا کہ وہ مسیح موعود بہ ہے اور . . . . .

کان ہذا الرجل یستدل بموت المسیح ورفع روحہ الی السماء کما رفعت ارواح الانبیاء علیٰ انہ ہو المسیح الموعود بہ۔[2]

ترجمہ۔ یہ شخص مسیح کی وفات سے . . . . استدلال کرتا ہے کہ المسیح الموعود بہ وہ خود ہے۔ سو مرزا غلام احمد قادیانی کا یہ کہنا کہ وہ مسیح موعود ہے علمی اعتبار سے بالکل غلط ہے۔ اسے مسیح موعود بہ کہنا چاہیئے تھا۔

خالد محمود عفا اللہ عنہ

سوال: تاریخ میں اہل السنۃ کا لفظ کن کے بالمقابل ہے اور اہل حق سے مراد کون لوگ ہیں؟

سوال از مولانا محمد قاسم صاحب (فیروالی)

جواب: سنت کے مقابلے میں حدیث کی کتابوں میں جو لفظ وارد ہے وہ بدعت ہے سو اہل سنت کا لفظ اہل بدعت کے بالمقابل ہے۔ ماضی بعید میں جو فرقے بدعت فی العقائد میں ممتاز ہوئے تھے۔ ان میں معتزلہ شیعہ اور خوارج زیادہ معروف ہوئے۔ سو ان دنوں اہل سنت کا لفظ شیعہ اور معتزلہ کے مقابل استعمال ہوتا رہا ہے۔ ماضی قریب میں کچھ لوگ بدعت فی الاعمال کی راہ سے بھی اہل بدعت کہلاتے ہیں سو ان دنوں اہل سنت اور اہل بدعت کے الفاظ دیوبندی اور بریلوی مکتب فکر کے پیروؤں میں بھی بالمقابل استعمال ہوتے ہیں

اہل بدعت کے لیے تاریخ میں کہیں اہل اہواء (خواہشات کے بندوں) کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ اسی طرح اہل سنت کے لیے اہل الحق کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ اہل حق کا اولین دستہ

---

[1] خطبہ الہامیہ ص۱۸ تقطیع کلاں [2] تفسیر المنار جلد ۲ ص

صحابہ کرامؓ ہیں اور جو اہل فقہ ان کے پیچھے پیچھے چلے سب اسی قافلہ اہل السنۃ کے پیرو ہیں۔ علامہ ابن حزم لکھتے ہیں:۔

واهل السنة الذين نذكرهم اهل الحق ومن عداهم اهل البدعة فانهم الصحابة رضى الله عنهم ومن اتبعهم من الفقهاء جيلاً فجيلاً الى يومنا هذا[1]

ترجمہ۔ اور اہل سنت جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں یہی اہل حق ہیں اور ان کے سوا جو لوگ ہیں وہ اہل بدعت ہیں اور وہ اہل سنت اہل حق صحابہ کرامؓ ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین اور جو اہل فقہ ہیں سے ان کی پیروی میں طبقہ بہ طبقہ آج تک چلے آ رہے ہیں۔

اور امام ابوالمنصور البغدادی بھی لکھتے ہیں:۔

ولسنا نجد اليوم من فرقة الامة منهم على موافقة الصحابة رضى الله عنهم غير اهل السنة والجماعة من فقهاء الامة۔[2]

ترجمہ۔ اور ہم تفرق امت کے اس حال میں صحابہ کرام کے موافق اہل السنۃ والجماعۃ فقہاء امت کے سوا اور کسی کو نہیں پاتے۔

قرآن کریم نے حشر کے دن کے دو طبقوں کی خبر دی ہے ایک وہ جن کے چہرے اس دن روشن ہوں گے اور دوسرے وہ جن کا نشان سیاہی ہو گا۔

يوم تبيض وجوه وتسود وجوه۔ (پ۴ آل عمران ع ۱۱)

صحابہ کرامؓ نے اپنی تفسیر میں روشن چہروں سے مراد اہل السنۃ والجماعۃ ہی لیے ہیں اور سیاہ چہروں سے مراد اہل بدعت حضرت عبداللہ بن عمرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں:۔

تبيض وجوه اهل السنة وتسود وجوه اهل البدع۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی فرماتے ہیں:۔

تبيض وجوه اهل السنة والجماعة وتسود وجوه اهل البدع والضلالة۔

اور سیدنا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی حضورؐ سے نقل کرتے ہیں[3]

آپ یہ نہ کہیں کہ یہ صرف عبادلہ ثلثہ کی ہی روایت ہے نہیں۔ حضرت علی مرتضیٰؓ بھی چوتھے نمبر

---

[1] کتاب الفصل جلد ۲ ص ۱۱۳ [2] الفرق بین الفرق ص ۱۹۰

[3] دیکھیے کتاب التبصیر فی الدین للعلامۃ الاسفرائنی ص ۱۱۱ مصر

میں ان کے ساتھ ہیں:۔

فاما اهل السنة فالمتمسكون بما سنه الله لهم ورسوله۔[1]

ترجمہ۔ سو اہل السنۃ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کی قائم کی باتوں سے تمسک کرنے والے ہیں اور الجماعۃ سے مراد ہم لوگ ہیں (یعنی صحابہ کرام) میں اور میرے ساتھ آنیوالے۔

اس میں حضرت علی المرتضیٰؓ نے اپنے کو جماعت صحابہ کے ساتھ شمار کیا ہے ساتھ رہنے والے الجماعۃ کہلاتے ہیں اور ساتھ چھوڑنے والے شیعہ ــــ گروہ بندی کر کے جماعت سے نکل جانا یہ شیعیت ہے اور حضرت علیؓ اس شیعیت سے کوسوں دور تھے۔ آپ برملا کہتے تھے اہل السنۃ والجماعۃ میرا اور میرے ماننے والوں کا ہی نام ہے۔ اما اهل الجماعة فانا ومن اتبعني۔[2]

پھر آپ نے اس میں دو تمسک ہی ذکر کئے ہیں ایک خدا کے فرمان سے اور دوسرا رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے ــــ آپ نے کہیں ایک امام یا بارہ اماموں سے تمسک کرنے کی دعوت نہیں دی۔ نہ کوئی ایسا سلسلہ امامت پیش فرمایا جو تمام مسلمانوں کے لیے واجب التمسک ہو۔ بس آپ کے نزدیک اقرار شہادتین دو ہی ہیں ایک اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور دوسری حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور ان کے بعد کوئی سلسلہ امامت نہیں ہے۔ نہ کلمے میں یہ تیسری شہادت داخل ہے۔

اس پر ہم اس جواب کو ختم کرتے ہیں۔ والله اعلم وعلمه اتم واحكم۔

تم الكتاب المستطاب بهذا السوال والجواب والحمد لله فى كل باب۔

پروف ریڈنگ: محمد امجد خاں عباسی بی۔ایس سی ابدالی روڈ سنت نگر لاہور

---

[1] کتاب الاحتجاج للطبرسی ص ۹ نجف اشرف [2] ایضاً